ہماری ویب ای بُک

مسرت اللہ جان

MUSARRAT ULLAH JAN

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Musarrat Ullah Jan"
at Hamariweb.com

ریمنڈ ڈیوس کیس غیرت کی ضرورت کیوں

امریکی شہری ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں دو افراد کے قتل اور گاڑی کی ٹکر سے تیسرے کی ہلاکت کے واقعے کے بعد پورا ملک میڈیا اور سیاسی جماعتوں نے سر پر اٹھا لیا اور یہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ریمنڈ کی رہائی قومی غیرت کا جنازہ ہوگا چند مخصوص لوگوں کی طرف سے بھی تیز بیان آتے رہے ہیں ۔ویسے عام آدمی کو نہ تو غیرت کی فکر ہے اور نہ ہی اسے ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری اور رہائی سے کوئی مقصد ہے کیونکہ اسے نان نفقے کے چکر کے گھن چکر بنا کر رکھا ہے اور انہیں اس کے علاوہ کچھ اور سوجھتا بھی نہیں اور غیرت بھی ان لوگوں کو آتی ہے جن کے پیٹ نیم بھرے ہوں بھوکے پیٹ والوں سمیت بھرے پیٹ والوں کو غیرت بہت ہی کم آتی ہے ۔

ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے آخر ہماری یہ غیرت اس وقت کہاں غائب ہو گئی تھی جب نئی حکومت جو ماشاءاللہ جمہوری بھی ہے اور ان کے منہ سے کبھی کبھار کوئی بات غلطی سے عوامی مسائل کے حوالے سے ان کے منہ سے نکل آتی ہے کہ دور میں ہی کالے پانی والے یعنی ری سیکورٹی والے ہماری سیکورٹی فورس کے جوانوں کو ٹریننگ دیتے رہے اور ان کیلئے سامان بھی یہی کالے پانی والے بھجواتے رہے خیبر پختونخواہ کے مختلف علاقوں سمیت ہمارے مختلف ایئر بیس انہی لوگوں کے

زیر اثر تھے اور ابھی بھی ان کے جہاز انہی ایئر پورٹوں سے اڑتے رہے ہیں اس وقت ہماری غیرت کہاں مر گئی تھی۔ غریبوں کے درد کا رونا رونے والے حکمران بشمول سندھی و پنجابی کارڈ کھیلنے والے سیاستدان بابوئوں کو یہ نظر نہیں آتا جب غریب لوگ بیوی بچوں کو قتل کرکے خودکشی کرتے ہیں یا پھر مہنگائی اور بیروزگاری کی وجہ سے اپنے بچوں کو بیچنے پر مجبور ہوتے ہیں اور انہی واقعات کے دوران یہ سیاستدان بیرون ملک دوروں پر اپنے خاندان والوں ` دوستوں ` یاروں اور اب تک بیٹیوں کو بھی انہی کتوں کی طرح زندگی گزارنے والوں کے ٹیکس سے حاصل کردہ آمدنی پر عیاشی کیلئے باہر لے جاتے ہیں اور ان کی تصاویر اخبارات میں ہم دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ دیکھو ہماری ملک کی نمائندگی کیسی ہورہی ہے اس وقت نہ تو ہمیں غیرت آتی ہیں اور نہ ہی ہمارے حکمرانوں کو جو دوسروں کے پیسوں پر عیاشی کرتے ہیں کہ ان کے اپنے بچے عیاشی کرتے ہیں اور کمی کمین کے اولادیں انہی اوقات میں انہیں اچھی لگتی ہیں ۔

سب سے اہم بات جب اسی امریکہ سے امداد لینے کیلئے ہمارے حکمران گریبان پھاڑ کر کشکول لیکر جاتے ہیں اور اپنے آپ کو معتبر بنانے کیلئے انہی کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور تو اور ہمارے نوجوان گرین کارڈ کیلئے کیا کچھ نہیں کرتے امریکہ کی مخالفت میں نعرے لگانے والے اپوزیشن کے سیاسی رہنماء جو کسی زمانے میں ان کیلئے جہاد بھی کرتے رہے ہیں جبکہ ایک صاحب جنہیں ان

کی مخصوص پگڑی کی وجہ سے ویزا دینے سے انکار کیا گیا تب انہوں نے عافیہ کی دکانداری شروع کرتے ہوئے امریکہ کی مخالفت میں نعرے لگانا شروع کر دیئے وہ نوجوان جو امریکی ویزے کیلیئے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں اور جب انہیں کچھ ہاتھ نہیں آتا تو مخالفت میں نعرے لگانے شروع کر دیتے ہیں انہی اوقات میں ہم سب کی غیرت کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔یقیناً ہمارے بہت سارے دوستوں کو یہ باتیں بری بھی لگتی ہوں گی لیکن ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے والے مولویوں کی بھی غیرت اس وقت مصلے کے نیچے کہیں غائب ہو جاتی ہیں کیونکہ ڈالر کی اپنی ایک قوت ہے جو ہر کسی کی زبان کو خاموش کر سکتی ہیں ایسے وقت میں کچھ لوگ کہیں کہ ان سب چیزوں میں ہمارا مفاد ہوتا ہے کہیں سیکورٹی اداروں کا مفد اور کہیں پر ایلیٹ کلاس کا مفاد اور کہیں پر امریکہ مردہ باد کہہ کر پیسے لینے والوں کا مفاد اگر ہمیں اپنا مفاد اتنا ہی عزیز ہے کہ ہم اوپر دی گئی صورتحال ڈالروں کیلیئے برداشت کر سکتے ہیں تو پھر ہمیں ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کو بھی بخوشی قبول کرنا چاہیے کیونکہ جہاں ہمارا مفاد ہوتا ہے تو وہ لوگ خاموش ہوتے ہیں اور جہاں ان کا مفاد وابستہ ہو تو ہمیں خاموش رہنا چاہئیے کیونکہ ایسی غیرت کو دور سے سلام جو صرف اپنے مفاد کیلیئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے ۔

ویسے بھی ہمارے ہاں چند نام کی مسلمانی کے دعوے کرنے والے مذہبی پارٹیاں

اور عوامی حقوق کے دعوے کرنے والے سیاستدان موجود ہیں جو ملک میں کوئی بھی سنگین صورتحال کی صورت میں یا تو بیرون ملک دورے کرنے لگتے ہیں یا پھر ملک میں کوئی مشکل صورتحال پیش آنے کی صورت میں انہیں عمرے اور حج بہت یاد آتے ہیں پشتو ضرب المثل " م زر ما ٹول زما " تو سمجھتے ہیں لیکن جب ان پر برا وقت آتا ہے تو انہیں غیرت قومی مفاد نامی چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔یا کچھ اپنی دکانداری چمکانے والے کچھ تجزیہ نگار جو کبھی اگر فوج میں تھے تو ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ تھی سب کچھ کرتے رہے لیکن اب چونکہ ریٹائرڈ ہوگئے ہیں اور ان کی اوقات ختم ہو گئی ہیں تو اپنے آپ کو یہ بطور ایکسپرٹ ظاہر کرکے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوششوں یں معروف عمل ہوتے ہیں پیسوں کی دوڑ میں آگے نکلنے والے ان نام نہاد تجزیہ نگاروں کو قومی غیرت اس وقت یاد آتی ہے جب انہیں احساس ہوتا ہے کہ انہی کے جونئیر اب بڑے فیصلے کرنے لگے ہیں اور وہ پاکستان کی بھوکی ننگی عوام کی طرح " ×××× سویلین " بن چکے ہیں۔

دل پر ہاتھ رکھ رکھئیے اور غیرت اور بے غیرتی کو درمیاں میں سے نکال لیں جتنی بھی رقم دیت کے طور پر ریمنڈ ڈیوس کیس میں لوگوں کو ادا کی گئی پاکستان کی تاریخ میں کبھی ادا کی گئی ہے یہاں تو میں نے لوگوں کو بم دھماکوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے جن کیلئے کیمرے کے سامنے تین لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن انہیں کتوں کی طرح خوار کرنے کے بعد

ایک لاکھ روپے کی ادائیگی بڑے احسان جتلا کرکے کی جاتی ہیں ایسے میں اگر ایک پاکستانی کو اس کے اوقات سے بڑھ کر رقم ملی تو اس میں نہ تو عوام کو حسد کرنیکی ضرورت ہے کہ اتنے ان کو مل گئے اور ہم تو ویسے کے ویسے رہ گئے نہ ہی سیاستدانوں کو غیرت کھانے کی ضرورت ہے کہ انہیں اس میں کمیشن نہیں ملا اور نہ ہی مولویوں کو منبروں پر بیٹھ کر ڈالروں کی باتیں کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم تو وظیفہ لیکر گزارہ کر رہے ہیں اور ہمارے مقتدی کو اتنی رقم مل گئی - ویسے ایک بات یہ بھی ہے اگر ریمنڈ ڈیوس کیس میں ان کے رشتہ دار پیسے نہ بھی لیتے تو پھر بھی ریمنڈ ڈیوس رہا ہو جاتا اور فنڈز کوئی اور لے جاتا - سو اگر کسی کا بھلا ہوا تو اچھا ہوا اب اس میں اتنی غیرت کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے -

دنیا کی سیر کا شوق اور ہماری اوقات

بچپن سے یہی آرزو تھی کہ پوری دنیا کی سیر کروں اور یہی میری سب سے بڑی آرزو تھی ۔کچھ لکھنے پڑھنے سے شغل ہوا اور علی سفیان آفاقی کے سفر نامے پڑھے تو اس شوق اور آرزو میں اور بھی تیزی آئی ۔ پھر جب زندگی تھپیڑے عملی زندگی میں لانے کا سبب بنے تو پھر ڈالر کمانے کیلئے باہر نکل جانے دور آیا اور یہی باتیں میں اپنی والدہ) امی (کو کہتا تھا کہ بہت جلد ڈالر کمانے جاؤنگا لیکن وائے قسمت ۔ڈالر ہم ٹی وی پر دیکھتے رہے کہ یہی ڈالر ہے ۔

جب 1997 ء میں پشاور کے ایک مقامی اخبار میں سپورٹس رپورٹنگ کا آغاز کیا تو پھر ایک اور راستہ ملا کہ چلو سپورٹس رپورٹنگ کے بہانے ہمیں بھی کہیں کا ویزہ مل جائیگا کیونکہ اسی سپورٹس رپورٹنگ کے بہانے بہت سارے نام نہاد صحافی بن کر ملک سے باہر چلے گئے اور اپنے گھر والوں کیلئے ڈالر بھیجتے رہے ہمیں بھی یہی آرزو تھی کہ چلو اسی بہانے ملک سے نکل جانے کا موقع مل جائیگا لیکن چونکہ ایک تو اپن میں انا اور خودداری کچھ زیادہ ہے اسی وجہ سے جو صاحب لوگوں کو سپورٹس کے نام پر باہر لے جانے میں ایکسپرٹ تھے ان کے آگے پیچھے ہونا اور اس کی خوشامد کرنا ہم سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہم ان کے

ڈیمانڈ پوری کر سکتے تھے کسی زمانے میں بہت زیادہ حالات خراب ہوئے لیکن سر جھکا کر لیس سر کرنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے میں پھر پیچھے رہ گیا لیکن پھر بھی میں پاسپورٹ ہر وقت تیار رکھتا تھا کہ چلو اگر کوئی غلطی سے آفر کردے تو پاسپورٹ کی وجہ سے نہ رہ جاؤں ۔

اپنے گھر والوں کیساتھ دوستوں ، رشتہ داروں میں بڑے فخر سے کہتا تھا کہ بہت جلد باہر جاؤنگا اور میری طبعیت کی انتہائی سادہ) امی (سن کر گھبرا جاتی تھی کہ گھر کا سب سے بڑا بیٹا اگر جائیگا تو کیا بنے گا میرے سامنے تو نہیں کہتی لیکن دعا کرتی تھی کہ میرے بیٹے کو کہیں سکون ملے تاکہ یہ باہر جانے کا نام نہ لے ۔میں بھی صرف لمبی لمبی چھوڑتا تھا کہ بس بہت جلد میرا کام ہو جائیگا اور پھر باہر جاؤنگا لیکن حقیقت یہی تھی کہ " کچھ بھی نہیں تھا " ۔ ۔والدہ نے اپنے ڈر اور خوف کی وجہ سے منگنی کردی تاکہ میرا بیٹا منگنی کے بعد کچھ تو سدھر جائیگا اور باہر جانے کا نام نہیں لے گا لیکن منگنی کے بعد بھی یہی حال رہا میری بیگم جو اب چار بچوں کی ماں ہے کا کہنا ہے کہ منگنی ہونے کے بعد جب خاندان کے دوسرے لوگ مجھے یہی کہتے تھے کہ تمھارا منگیتر تو باہر جانے کے چکر میں ہے تو میں روپڑتی تھی کہ میرے منگیتر صاحب میرا خیال بھی نہیں کرتے ۔اور اسی بناء پر ہر وقت ڈرتی رہتی تھی اور اسی ڈر میں شادی ہو گئی۔

2004 ء میں جب شادی ہوئی تو پھر پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھا لیا اور ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئی کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا تاہم کبھی کبھار باہر جانے کا دورہ پڑ جاتا تھا اور پاسپورٹ کی تجدید کرتا کہ ضرورت توپڑ جائیگی لیکن حقیقت میں دو پاسپورٹ تو بغیر کسی ملک کے ویزے کے اپنی معیاد پوری کر گئے اور میری یہ آرزو آرزو ہی رہی کہ کسی ملک کا ویزہ سٹمپ میرے پاسپورٹ پر لگ جائے -شادی کے بعد بیگم پوچھتی کہ اب بھی باہر جائوگے تو میں کہہ دیا کرتا تھا کہ ہاں اب تو ضرور جائونگا اور کسی انگریز میم سے شادی کرونگا -اس پر بیگم غصے میں آجاتی اور کہتی کہ ہاں ہاں ادھر سے نکلوگے تو شادی کروگے اور وہاں انگریز لڑکیاں بھی تمھارے لئے انتظار کر رہی ہے کہ "خان صاحب" پشاور سے آئینگے اور ان کیساتھ ہم شادی کرینگے - کبھی کبھار بیگم کی یہ باتیں سن کر اور بھی چڑھ لگ جاتی تھی -تاہم انگریز لڑکی سے شادی کی باتیں کرنے کے بعد میری بیگم کی تیوری چڑھ جاتی تھی سو میں خاموش رہ جایا کرتا تھا - ویسے ہم پٹھان عورتوں کے معاملات میں کچھ سخت اور دوغلے ہیں اور یہی حقیقت ہے ہماری اپنی ماں بہن اور بیوی کا معاملہ ہو تو ہم اور طرح کی سوچتے ہیں لیکن کسی اور کی ماں بہن اور بیوی کے بارے میں ہماری سوچ دوسری ہوتی ہے -خیر باتیں کہاں کی تھی اور کہاں پہنچ گئیں-باہر نکلنے کیلئے بہت ساری کوششیں کیں لیکن کوئی موقع ہاتھ نہ آیا - شعبہ صحافت میں ہونے کی وجہ سے

بہت اونچی پوسٹوں پر تعینات لوگوں سے تعلقات بنے لیکن یہاں بھی انا اور خود داری تھی اس لئے ان معاملات پھر بھی پیچھے رہے -

شادی سے کچھ عرصہ قبل میرے ایک دوست جو آج کل امریکہ میں ہے انٹرنیٹ پر ایک لڑکی سے گپ شپ کی اور اس کیساتھ ایسا تعلق بنا لیا کہ امریکہ سے لڑکی آئی یہاں شادی کی اور پھر اپنے ساتھ میرے دوست کو بھی امریکہ لے گئی - حالانکہ اس کے مقابلے میں انٹرنیٹ جتنا زیادہ میں استعمال کرتا تھا شائد ہی کوئی کرتا رہا ہو - مقامی اخبار میں چھپنے والے آئی ٹی کا سیکشن انچارج ہونے کی وجہ سے دس سے بارہ گھنٹے تک آن لائن خبریں پڑھنا اور پھر اسے ٹرانسلیٹ کرنا بھی میری ذمہ داری تھی لیکن وائے رے قسمت انگریز لڑکی تو چھوڑیں کسی افریقی ملک کی حبشی خاتون نے بھی لفٹ نہیں کرائی اور میرا یہ ارمان دل ہی میں رہا - شادی کے بعد تو زندگی کی دوڑ دھوپ نے سمجھنے کا موقع نہیں دیا چوری چھپے صحافت کی تنخواہ میں پیسے بھی جمع کئے صحافت کے شعبے سے وابستہ لوگوں کو اندازہ ہوتا ہے کہ صحافت کے شعبے میں "حلال" کمائی کتنی ہوتی ہے اور اس پر کیسے گزارا کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی اپنی " حلال " کی کمائی سے قسطیں ڈال دی لیکن جتنے ویزے کیلئے بینک میں ضروری ہے اتنے مجھ سے جمع نہیں ہو سکتے -

میری ایک خاتون صحافی دوست جسے ہم بھائی سمجھتے ہیں کچھ عرصہ قبل ایک بین

الاقوامی سیمینار میں شرکت کیلئے باہر جا رہی تھی اس وقت اس نے شادی نہیں کی تھی اسے میں نے کہا تھا کہ " یا تو اپنے لئے شوہر ڈھونڈ لو " یا پھر میرے لئے بیوی ڈھونڈ لو مگر واپس مت آؤ اور دنیا کی سیر کرو۔ مگر موصوفہ نے نہ تو اپنے لئے کوئی غیر ملکی۔ " شوہر دیکھا اور نہ ہی میرے لئے کوئی غیر ملکی لڑکی دیکھی سو یہاں پر بھی فیل ہو گئے اور ہم نے دل پر پتھر رکھ دیا کہ دنیا کی سیر ہمارے قسمت میں نہیں۔

امن، دکانداری اور ہمارا تھائی لینڈ میں ٹریننگ کیلئے منتخب ہونا

کسی زمانے کے صوبہ سرحد اور موجودہ دور کی صوبہ خیبر پختونخواہ کے حالات ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں زیادہ خراب ہے جس کی وجہ افغانستان کا سرحدی علاقہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی وابستگی اور افغان مہاجرین کی آبادکاری بھی ہے میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔بحیثیت صحافی ٹی وی سے وابستگی کے بعد زیادہ تر میں نے دھماکوں اور دہشت گردی سے متعلق واقعات کی کوریج کی ہے اور اسی مقصد کیلئے صوبے کے مختلف علاقوں میں بھی گیا 2009ء کا سال اس حوالے سے انتہائی ابتر رہا کہ ہفتے یا دو ہفتے بعد لازماً ایک دھماکہ ہوا کرتا تھا جس کی کوریج کے دوران جب میں معصوم شہریوں کو دھماکوں میں متاثر ہوا دیکھتا تھا تو میری وہ حالت ہوتی کہ بیان سے باہر ہے جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوتا تو میں گھر جا کر سب کو کہہ دیتا کہ ایک گھنٹے کیلئے کوئی مجھ سے بات نہ کرے کیونکہ جو واقعات میں دن میں دیکھا کرتا وہی میرے ذہن میں ہوتے اور ان چیزوں کو بھلا دینا بہت مشکل ہوا کرتا تھا۔

ان حالات میں بہت سارے لوگوں نے امن کے نام پر ادارے بنالئے اور امن کے نام پر بہت سارے فنڈز ان کو ملے ان فنڈز سے لوگوں نے بڑی بڑی کوٹھیاں بنا لی

لیکن خیبر پختونخواہ کے لوگ امن کے متلاشی رہے اور امن لانے والے امن کیلئے صرف بیانات جاری کرتے رہے۔ حالات اب بھی وہی ہے لیکن کچھ بہتری آئی ہے اور دعا ہے کہ ہمارے ملک کی حالت مزید بہتر ہو۔

جن حالات سے لوگ امن کے نام پر ادارے بنا رہے تھے انہی حالات میں امن کے حوالے سے میں نے انٹرنیٹ پر سرچنگ شروع کردی تھی تاکہ صورتحال کا اندازہ ہو ایسے میں تھائی لینڈ کے ایک ادارے نے صحافیوں کیلئے امن انقلاب کے نام سے ایک ٹریننگ دیکھی جس کیلئے میں نے درخواست بھیجی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ پاکستان سے مجھے منتخب کرلیا گیا یہ ٹریننگ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک اور چنگ مائی میں ہونا تھی جو آرگنائزر تھے ان کا یہ کہنا تھا کہ آپ کو ٹکٹ بھی ہم دینگے اور رہائش کا بندوبست بھی ہم کرینگے۔

ان حالات میں دل نے کہا کہ یہی تو موقع ہے کہ باہر نکل کر سیر کرنے کا سو میں نے بسم اللہ کہہ کر ہاں کردی اور پاسپورٹ کی نقول بھجوا دی۔اس وقت میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ میرے پاسپورٹ کا دورانیہ ختم ہو رہا ہے۔جب تھائی لینڈ سے مکمل طور پر اوکے رپورٹ آئی اور میں نے پاسپورٹ دیکھی تو اس پر دورانیہ ختم ہونے والا تھا۔ ایسے میں اپنے ایک دوست جو وکیل بھی ہے کیساتھ رابطہ کیا اور پاسپورٹ کی تجدید کیلئے درخواست دیدی۔ ہمارے اپنے ملک میں

کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنانا تو جیسے بڑا جرم ہے یہ شکر ہے کہ وہاں پر چھوٹے سے قد کے ایک بہت بڑے آفیسر جو فرض شناس اور ایماندار تھے، کے ذریعے سے پاسپورٹ کی تجدید کا سلسلہ شروع ہوا ورنہ تو پاسپورٹ آفس میں حال یہ تھا کہ حیات آباد میں واقع بلڈنگ پر پرانا پھٹا جھنڈا تھا جو کہ اب بھی موجود ہے اور باہر جانے والے خواہشمند افراد کی ایک لائن لگی ہوئی تھی جو کبھی ایجنٹوں کے چکر میں پڑے دکھائی دیتے تھے اور کبھی قطاروں میں کھڑے ہو کر تصدیق کے عمل سے گزر رہے تھے۔ یہاں وہ حال ہوتا ہے کہ دیکھنے اور محسوس ہی کیا جاسکتا ہے بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی غریب اور ناخواندہ شخص کو پاسپورٹ دفتر میں کام کرنے والے قصائیوں سے بچائے جو کہ الٹی چھری سے گردن کی سائیڈ سے لوگوں کو ذبح کرتے ہیں اور لوگ مجبوراً اپنا جائز کام نکالنے کیلئے ذبح ہونا پسند کرتے ہیں۔ ویسے قصائی تو میرے نانا بھی تھے اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے ان کی زندگی میں میرے صرف ایک ماموں ہی اس شعبے سے وابستہ ہوئے باقی تو بینک ملازمت اور تجارت کرتے رہے نانا کی دکان پر میں بھی کسی زمانے میں ان کے ساتھ بیٹھ جایا کرتا تھا ان کی چھری کی کاٹ میں نے دیکھی تھی لیکن پاسپورٹ دفتر میں جو چھری اہلکاروں اور ان کے ایجنٹوں کے پاس ہوتی ہے ایسی صفائی تو میرے نانا کی چھری میں بھی نہیں تھی۔

پاسپورٹ تو بن گیا انہی دنوں میں متعلقہ ادارے نے مجھے تھائی لینڈ سے لیٹر بھی بھجوا دیا کہ ویزے کیلئے اپلائی کروگے تو یہ سپورٹنگ کاغذات میں شمار ہوگا۔ بس اسی کے بعد دوستوں سے قرضے لینا شروع کردیئے کہ بینک اکاؤنٹ میں کچھ رکھوانا ہے اور پھر سفارتخانے کو دکھانا ہے کہ ہم آپ کی ملک کی سیر کرنے جارہے ہیں۔ ایسے میں ایک صحافی دوست جو کچھ عرصہ قبل تھائی لینڈ سے ہوکر آئے تھے ان سے مشورہ کیا انہوں نے ہدایت کی کہ بینک میں زیادہ مالیت کے پیسے دکھانا ضروری نہیں بلکہ ایسا کرو کہ ایک ہفتے میں دس ہزار نکال دو اور پھر اگلے بیس ہزار جمع کروادو۔ اس کیلئے تو آسان تھا کیونکہ موصوف تین اداروں کیساتھ کام کررہے تھے لیکن میرے جیسے کیلئے بہت مشکل کیونکہ جتنی تنخواہ ملتی تھی اتنے تو میرے گھر کے اخراجات تھے لیکن پھر بھی کسی حد تک اپنے آپ کو اسلام آباد میں تھائی لینڈ کے سفارتخانے میں ویزے کیلئے اپلائی کرنے کیلئے تیار کرلیا۔

تھائی ویزے کا حصول اور اسلام آباد کا سفر

تھائی لینڈ کے ویزے کے حصول کیلئے میرے صحافی دوست نے مجھے ہدایت کی کہ اپنے اکاؤنٹ میں کچھ رقم رکھ لو تاکہ جس وقت سٹیٹمنٹ کی ضرورت ہو تو اس میں کچھ رقم موجود ہوں اور سفارتخانے والے تمھیں کنگلا نہ سمجھیں۔میں نے بھی یہ سن کر دوستوں سے قرض لینا شروع کردی تاکہ کم از کم تھائی لینڈ سفارتخانے والے کنگلا نہ سمجھیں ورنہ اس سے تو میری بڑی بے عزتی ہوجاتی خیر میرے دوست بھی میرے طرح کنگلے ہی تھے دس بیس ہزار روپے بھی ایسے احسان کرکے دے رہے تھے جیسے لاکھوں روپے دے رہے ہوں لیکن میں نے ان سے رقم لیکر بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادی تاکہ بینک بیلنس ظاہر ہو۔

میرے صحافی دوست اس وقت ایک ٹی وی چینل میں سکرپٹ رائٹر تھے اور اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے جب میں نے اسے کہا کہ میں نے ویزے کیلئے اپلائی کرنا ہے تو اس نے کہاکہ میں نے بھی اپلائی کرنا ہے ساتھ ویزے کیلئے اپلائی کرتے ہیں - میں خوش ہوگیا کہ چلو ایک سے دو بھلے۔

اسی دوست کے کہنے پر انٹرنیٹ سے تھائی ویزہ کیلئے ویزہ فارم ڈاؤن لوڈ کردیئے جو بہت سوچ سمجھ کر اور ڈر ڈر کر پر کردیئے جیسے میں امریکی صدر سے

ملاقات کیلئے درخواست دے رہا ہوں حالانکہ اس سے قبل کتنے امتحانات دیئے کبھی اتنا ڈر ڈر کے امتحان کے فارم بھی پر نہیں کئے اس وقت میرے صحافی دوست جمشید خان اپنے گھر آئے ہوئے تھے اس نے مجھے کہا کہ پیر کے دن میں نے واپس ڈیوٹی پر جانا ہے تو ساتھ چلتے ہیں ویزہ فارم بھی جمع کرلینگے اور میں پھر دفتر چلا جاؤنگا اور تم اپنے گھر واپس آجانا۔ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنالیا ساتھ یہ منصوبہ بندی بھی کرلی کہ وقت پر نکلنا ہے تاکہ لیٹ نہ ہوں -

پیر کی صبح چھ بجے میں نے اپنے دوست کو فون کیا کہ اٹھ جاؤ اور تیاری پکڑو لیکن مجال ہے کہ جو جمشید خان فون اٹھائے میں نے پانچ مرتبہ فون کیا اور میرے دل کا زور ختم ہوا تو اس وقت دوست نے فون اٹھا کر جواب دیا کہ اٹھ گیا ہوں اور تیاری کر رہا ہوں بس تم پشاور کے بس ٹرمینل پہنچ جاؤ میں تیار ہونے کے بعد گھر سے روانہ ہوا اس وقت اندھیرا ابھی تھا اور میں ڈر رہا تھا کہ جس طرح کے حالات ہیں اگر کسی نے روڈ کنارے پاسپورٹ لے لیا اور ساتھ میں وہ پیسے بھی لئے جو جیب میں رکھے ہیں تو پھر کیا ہوگا لیکن اللہ تعالٰی نے خیر کردی اور میں ٹرمینل پہنچ گیا پچیس منٹ میں ٹرمینل پہنچ گیا اور دوست کا انتظار کرنے لگا۔ پشاور سے اسلام آباد کیلئے صبح سویرے فلائنگ کوچز سڑک کنارے کھڑی کی جاتی ہیں تاکہ جو لوگ جلدی میں ہوں وہ گاڑی میں بیٹھ جائے

اور روانہ ہوں زیادہ تر اسلام آباد میں روزگار کے سلسلے میں مقیم افراد ان کوچز میں جاتے ہیں یہ کوچز روڈ کنارے کھڑی ہوتی ہیں جس کے باعث بعض اوقات ٹریفک بھی جام ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ڈرائیور وہاں پر تعینات ٹریفک اہلکاروں کو صبح کا ناشتہ کراتے ہیں اس لئے ان اہلکاروں نے بھی آنکھیں بند کی ہوتی ہیں۔اور انہیں ان گاڑیوں کی بے قاعدگی نظر نہیں آتی۔

خیر ایک کوچ میں بیٹھ گیا اور اپنے دوست کیلئے سیٹ بھی بک کردی کہ وہ پہنچ جائے گا تو ساتھ چلے جائینگے لیکن مجال ہے کہ موصوف کا پتہ بھی چلا ہو۔ ایک گاڑی مسافروں سے بھر گئی اور پھر گاڑی کا ڈرائیور آکر مجھے کہنے لگا کہ بھائی اگر نہیں جانا ہے تو سیٹ چھوڑ دو اور میں نے شرم کے مارے وہ گاڑی چھوڑ دی دل ہی دل میں اس دوست کو وہ سنا رہا تھا کہ اگر وہ اب بھی سن لے تو کان بند کرلے۔ خیر دوسرے کوچ میں بیٹھ گیا اور یہی تہیہ کیا کہ اگر نہیں پہنچا تو اکیلے اسلام آباد جا کر تھائی ویزے کیلئے اپلائی کرلونگا لیکن شکر ہے کہ دس منٹ کے اندر وہ دوست بھی پہنچ گیا اس وقت ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو گئی اور ہم بوندا باندی کے مزے لیتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ میرا دوست مجھے بتا رہا تھا کہ تمھارے چھ بجے فون کرنے کی وجہ سے میری بیگم کی آنکھ کھل گئی تھی اور چونکہ میں ایک ہفتے بعد آتا ہوں اپنے گھر اس لئے بیگم نے مجھ پر بہت غصے کئے کہ یہ تمھارا کیسے دوست ہے جسے یہ تمیز نہیں کہ کس وقت

فون کرنا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جس طرح تم اس کے فون پر جلدی جلدی بھاگ کر جارہے ہوں اس سے تو مجھے مسرت اپنی سوتن لگ رہی ہے۔ یہ سن کر غصہ بھی آیا کہ ایک تو وقت پر اٹھا دیا اور آگے سے یہ حال ہے لیکن مجھے پتہ تھا کہ میرا یہ دوست بیگم کے مقابلے میں ذرا کمزور ہے اس لئے میں نے بھی سن لی کہ چلو ہمیں کون سی سے بے عزتی لگنی ہے ۔

کراچی کمپنی اسلام آباد میں کوچ سے اترے اس وقت وہاں سے ایک ٹیکسی حاصل کی اور اسے تھائی لینڈ کے سفارتخانے جانے کا کہا موصوف ہمارے کپڑے اور حالت دیکھ کر کہنے لگا کہ کرایہ تین سو روپے ہوگا حالانکہ ڈیڑھ سو روپے کرایہ تھا میں نے اپنے دوست کو پشتو میں کہا کہ اسے دیکھو شائد یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم کہیں کے چوہدری ہیں جس پر ٹیکسی ڈرائیور ہنسنے لگا میں نے پوچھا ہنس کیوں رہے ہو تو اس نے پشتو میں جواب دیا کہ خیر ہے بھائی آپ اپنے علاقے کے ہیں جتنی مرضی دیدے لیکن بیٹھ جائیں اس کی پشتو سن کر حیران بھی ہوا لیکن شکرادا کیا کہ اور کچھ نہیں کہا ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا ۔

مجھے یاد ہے کہ جب 1998 ء میں اسلام آباد کے ایک نیوز ایجنسی میں کام کر رہا تھا اس میں زیادہ تر لوگ کشمیر کے تھے جب وہ کوئی راز کی بات کرتے تو کشمیری زبان میں کرتے ان کی دیکھا دیکھی ہم پشاور کے کچھ دوستوں نے باتیں

پشتو زبان میں کرنا شروع کردی پھر کشمیری لوگوں کو برا لگتا کہ یہ پشتو میں کیا بات کرتے ہیں جب انہیں سمجھ نہیں آتی تو پھر کہتے تم ہمیں گالیاں دیتے ہوں پشتو میں ۔ پھر مجبورا ہم رابطے کی زبان اردو پر آجاتے اور ہم بھی انہیں کہتے کہ رابطے کی زبان بولو گے تو ہم بھی اردو بولیں گے ورنہ ہم سے یہ امید مت رکھو کہ تم کشمیری زبان میں بات کرو اور ہم پشتو میں بات نہ کرے سو وہ لوگ بھی ہماری وجہ سے اردو پر آگئے۔

خیر کہاں کی بات کہاں تک آئی ٹیکسی ڈرائیور کیساتھ گپ شپ کی تو پتہ چلا کہ تخت بھائی کا رہائشی ہے اور کئی سالوں سے راولپنڈی میں مقیم تھا اسی وجہ سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ پٹھان ہے موصوف یہ جان کر زیادہ شکایات شروع کردی کہ دونوں صحافی ہے اور وہ ملکی حالات کا رونا رونے لگا میں نے اپنے دوست کو اشارہ کیا کہ چپ رہو زیادہ باتیں مت کرو اور صرف سنو ٹیکسی ڈرائیور نے بیس منٹ میں تھائی سفارتخانے پہنچا دیا لیکن اتنی باتیں صبح سویرے کی کہ مجھے تو پروا نہیں تھی لیکن میرے دوست نے ناشتہ نہیں کیا تھا اس کے سر میں درد ہوگیا اس وقت میں نے اپنے دوست کو اور بھی چھیڑا کہ تم زن مرید ہو تمھاری بیوی نے تمھے ناشتہ نہیں دیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ گھر میں تمھاری کتنی اوقات ہے اور وہ غریب ہنس رہا تھا کہ اگر اور کچھ کہا تو مزید بے عزتی ہونی ہے ۔

تھائی لینڈ کے سفارتخانے پہنچے اندر داخل ہونے سے قبل سیکورٹی گارڈ نے موبائل فون رکھوا دیئے جیسے اس میں ہم بم فٹ کرکے لے جارہے ہوں اور ساتھ ہی چٹ دی کہ واپس آکر چٹ دکھا دینا اور اپنا موبائل لے لینا۔ اندر چلے گئے تو ایسا لگا جیسے سارے پاکستان کے لوگ تھائی ویزے کے خواہشمند ہیں بہت زیادہ لوگ آئے ہوئے تھے ریسپشن پر ایک پاکستانی موٹی عورت بیٹھی تھی اور انتہائی بد اخلاقی سے لوگوں سے سوال کررہی تھی جب میری باری آئی تو کاغذات دیکھ کر کہنے لگی کہ تمھارے کاغذات نامکمل ہیں اور واپس پھینک دیئے میں نے پوچھا کونسے کاغذات ضروری ہے تو کوئی جواب نہیں دیا اور کہا کہ پیچھے ہٹو کسی اور کو موقع دو۔ سخت غصہ آیا کہ نہ تو بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ ہی معلومات دے رہی ہے پیچھے ہٹ کر وہاں پر موجود لوگوں سے معلومات حاصل کی کہ اور کیا ضروری ہے ان کی طرف سے معلومات کی روشنی میں درخواست لکھی یہ الگ بات کہ اس وقت میرے بال پوائنٹ نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ایک صاحب سے منت کرکے بال پوائنٹ لیا کہ درخواست لکھنی ہے کاغذات مکمل کرنے کے بعد دوبارہ لائن میں کھڑا ہوگیا اور آدھ گھنٹے بعد نمبر آیا تو کاغذات دیکھنے کے بعد مجھ سے مطالبہ کیا کہ چھ ہزار روپے دو اتنی رقم کا سن کر میرے تو دماغ بھک سے اڑ گیا کہ یہ کیا آن لائن انٹرنیٹ پر دو ہزار روپے فیس لکھی ہے اور مجھ سے چھ ہزار روپے مانگے جارہے ہیں لیکن شکر ہے کہ جیب میں پیسے تھے فیس تو جمع

کروادی لیکن دل کا حال اللہ جانتا تھا میرے دوست کی جب باری آئی تو اس نے کاغذات جمع کروادیئے تو اسے کہا گیا کہ تمھیں فیس دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم سیاح ہو میں حیران رہ گیا یا اللہ کیا ماجرا ہے میں ٹریننگ کیلئے جا رہا ہوں تو مجھ سے دوگنے بھی زیادہ پیسے لئے اور جو سیاحت کیلئے جا رہا ہے تو اس سے کوئی فیس نہیں غصہ تو بہت آیا لیکن خاموش رہا کرتا بھی کیا۔ تھائی سفارتخانے کے اہلکاروں نے ہدایت کی کہ ایک ہفتے بعد واپس آکر اپنا پاسپورٹ لے جانا جس وقت سیکورٹی اہلکاروں سے واپس موبائل فون لے رہے تھے جو کہ نجی سیکورٹی کے اہلکار تھے نے میرے دوست کو کہا کہ اب تو ہمیں بھی خوش کردو میں نے پوچھا کس چیز کی خوشی میں تو میرے دوست نے اسے کہا کہ ویزہ لگ جائیگا تو پھر تمھیں خوش کردونگا۔اور وہ سیکورٹی گارڈ سائیڈ پر ہوگئے مجھے بہت غصہ آیا کہ اس کو دیکھو جیسے ہمارے پاس کروڑوں کا مال ہے اور ان رشوت خوروں کیلئے ہم نے رکھا ہو میں نے اپنے دوست سے کہا کہ چلو جاتے ہیں ان کی شکایت کرتے ہیں تو دوست نے کہا کہ چھوڑ یار کس کس کو روکو گے یہاں کا سسٹم ہی خراب ہے اور ۔میں اس کی بات سن کر خاموش ہوگیا کہ اس کی بات سچی تھی

اس وقت میرے دوست کی بیوی کا فون آیا دوست نے اپنی بیگم کو بتایا کہ مجھ سے پیسے نہیں لئے اور مسرت سے چھ ہزار روپے فیس لی ہے تو اس کی بیگم بہت خوش ہوئی کہ تمھارے اس دوست نے صبح سویرے میری نیند خراب کی تھی سو اللہ تعالیٰ

نے اس سے بدلہ لے لیا اس کی بات سن کر میں نے اپنے صحافی دوست کو مزاح میں کہا "کہ " تمھاری بیگم پہنچی ہوئی بزرگ ہے آئندہ خیال رکھونگا

اس وقت دوست نے کہا کہ ملائشیاء ویزے کیلئے بھی معلومات کرنی ہے تو چلو وہاں سے بلیو ایریا میں واقع ایک پوائنٹس پر گئے جہاں پر ملائشیا کے ویزہ فارم جمع ہو رہے تھے وہاں سے معلومات حاصل کی کہ پندرہ سو روپے ویزہ فیس ہے سو میرے دوست نے کہا کہ تھائی ویزہ لگنے کے بعد ملائیشیاء کا ویزہ بھی لگوا دینگے تاکہ پاسپورٹ پر ایک اور مہر بھی لگ جائے وہاں پر ناشتہ کیا اور دوست کیساتھ اسلام آباد کے مختلف مقامات پر آوارہ گردی کی جس کے بعد وہ دوست اپنے دفتر روانہ ہوگیا اور میں پشاور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا موٹر وے پر صوابی کے مقام پر پہنچا تھا کہ اس وقت موبائل فون پر اطلاع ملی کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو اس کے سیکورٹی گارڈ نے گولی ماردی ہے گھر سے فون آیا کہ کہاں ہو میں نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا اس واقعے پر دل بہت اداس ہوا اور عجیب سا ذہنی تناؤ لیکر واپس پشاور پہنچ گیا۔

انتظار ویزے کا اور ہمارا اونچی اونچی چھوڑنا

تھائی لینڈ کے ویزے کیلیئے درخواست تو دی تھی اور اب دل میں یہ ڈر تھا کہ کہیں میرا ویزہ درخواست مسترد نہ ہو جائے لیکن پھر بھی دوستوں کو یہ ظاہر کر رہا تھا کہ بھائی جی میں اب جانے والا ہوں گھر میں بیگم کے سامنے بڑا اترا اترا کر کہہ رہا تھا کہ بس ویزہ لگنے کی دیر ہے اور میں جانے والا ہوں حالانکہ سچی بات تو یہ تھی کہ ویزہ پروسیس میں تھا اور ابھی اس کا جواب بھی نہیں آیا تھا۔ بیگم اور والدہ کیساتھ بڑی اونچی اونچی چھوڑتا تھا کہ بس جا رہا ہوں ۔ ایک دن بیگم غصے میں آ گئی اور کہنے لگی کہ " اب کس لئے جا رہے ہو اپنے بچوں کی مستقبل کا سوچو اپنے آپ سے بچہ بنایا ہوا ہے " غصہ تو بہت آیا لیکن چونکہ شریف آدمی ہو اس لئے کچھ کہا تو نہیں لیکن ماتھے پر دو تین دن بارہ بجائے تا کہ بیگم کو پتہ چل سکے کہ میری بھی کوئی اوقات ہے ۔

جس وقت میں ویزے کیلیئے فارم جمع کر رہا تھا اس وقت ایک دوست جس کے سالے کی ٹریول ایجنسی ہے وہاں سے بکنگ کی تھی اور اس نے ایسے ٹکٹ دیا تھا جیسے میں نے ٹکٹ خریدا ہو اس وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ ویزہ لگ گیا تو آپ ہی سے ٹکٹ لینا ہے ۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ ویزے کا جواب آ جائے گا جس صحافی

دوست کو پاسپورٹ واپس لینے کیلیئے رسید دی تھی اس نے مقررہ وقت گزرنے کے بعد مجھے فون کیا کہ بھائی جی مجھ سے رسیدیں گم گئی ہیں اس لئے کچھ کرو" غصہ تو بہت آیا کہ لاپرواہی کی انتہا ہوتی ہے پہلی مرتبہ اس کو کام کا کہا تھا اور اس صاحب نے یہ حال کر دیا شکر ہے کہ میں نے رسید اس کو دیتے ہوئے اس کی نقل نکال لی تھی میں نے تو اپنی رسید اس کو پہنچا دی لیکن اس صاحب نے اپنی رسید بھی کہیں گم کر دی تھی میں نے اس سے کہا کہ جیسا بھی کرنا ہے تمھارا کام ہے لیکن مجھے پاسپورٹ واپس کرنا ہے اور وہ ہنستے ہوئے رسید لیکر چلا گیا کہ پرواہ مت کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔

ٹریول ایجنسی والے دوست کے پاس ٹکٹ لینے کیلیئے جس دن جانا تھا اسی دن پشاور کے علاقہ شگئی ہندکیان میں نامعلوم دہشت گردوں نے ٹرانسفارمر کے نیچے بم رکھا تھا جو سکول سے واپس آنیوالی سوزوکی گاڑی سے ٹکرا گیا اور اس میں دو خواتین بہنیں جو اساتذہ تھیں جاں بحق ہو گئیں میں کوریج کیلیئے وہاں پر چلا گیا اور یہ ہماری قسمت کہ دوران کوریج ایک کے بعد دوسرا دھماکہ ہو گیا تقریبا چار فٹ ہماری ٹیم کے دھماکہ ہوا اور اس دھماکے نے میرا وہ حال کر دیا کہ جیسے جان نکل گئی ہوں اللہ تعالیٰ نے بچانا تھا سو بچ گیا لیکن تین دن تک دماغ اپنی جگہ پر نہیں تھا سو ان حالات میں ٹکٹ کی کنفرمیشن کرنا بھول گیا اور ٹریول ایجنسی بھی نہیں گیا مزے کی بات یہ ہے کہ میرے دوست کا سالا

یہ

سمجھا کہ میں ٹکٹ نہیں لے رہا اس نے میری کنفرمیشن نہیں کروائی اور ٹکٹ کا مقررہ وقت بھی گزر گیا۔

رشتہ داروں کو میرے دھماکے میں بچ جانے کی اطلاع ملی تو لوگوں نے خیریت کیلئے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیئے کہ شکر ہے کہ تم بچ گئے ہو اور اسی چکر میں ٹکٹ لینا بھول گیا انہی دنوں میں میرا پاسپورٹ بھی واپس مل گیا جب پہلی مرتبہ تھائی لینڈ کا ویزہ اپنے صاف ستھرے اور نئے نکور پاسپورٹ پر دیکھا تو دل بہت خوش ہوا کہ چلو پاسپورٹ تو گندہ ہو گیا لیکن کسی غیر ملک کی سٹمپ تو لگ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں کسی شخص کا پاسپورٹ جس پر متعدد ممالک کے ویزے لگے ہو بڑی حسرت سے دیکھا کرتا تھا اور پاسپورٹ ملنے کے بعد میں خوش ہو گیا کہ چلو جی آج سے آغاز ہو گیا اور بہت جلد انشاء اللہ میرا پاسپورٹ بھی ویزوں سے بھر جائیگا اور ہمیں بھی کوئی حسرت سے دیکھے گا۔ تھائی لینڈ کا ویزہ لگنے کے بعد دو تین صحافی دوستوں کو فخریہ انداز میں پاسپورٹ دکھایا اور ان کی آنکھوں میں حسرت دیکھ کر اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنے لگا جیسے میں نے بڑا تیر مارا ہو۔ جب پاسپورٹ مل گیا تو یاد آیا کہ ٹکٹ لینا ہے جب اس دوست کے پاس چلا گیا کہ ٹکٹ تو اس نے وہ سنائی کہ تم انتہائی لاپرواہ آدمی ہو ایسے تو کوئی کام نہیں ہوتا یعنی میری خوب کلاس لی ۔ لیکن مجھے بھی پاسپورٹ پر ویزہ مل گیا تھا میں نے ایک کان سے سن لیا

اور دوسرے کان سے نکال لیا اور میں نے اس سے کہا کہ بھائی جیسا بھی ہو ٹکٹ کا بندوبست اب تم نے ہی کرنا ہے۔ اس نے دیگر ایئر لائنز میں چیک کیا تو پتہ چلا کہ ٹکٹ تو موجود ہے لیکن ٹکٹ کے چارجز زیادہ ہونگے اور جو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے مجوزہ چارجز سے دس ہزار زیادہ تھے۔ صحافی کا تنخواہ میں چکر لگانا بڑی بات ہے اور دس ہزار لوگوں کیلئے اتنی بڑی رقم نہیں لیکن میرے جیسے بندے کیلئے بہت بڑی رقم تھی اور ہے بھی۔ اسی وجہ سے خود آن لائن ایئر لائن کی ویب سائٹ چیک کرنا شروع کردی کہ پتہ تو چل جائیگا اور تھائی ایئر لائنز کی ویب سائٹ پر چیکنگ کے دوران پتہ چلا کہ دو روز قبل ٹکٹ موجود ہے اور ٹکٹ چارجز بھی مناسب ہے سو انٹرنیٹ پر آن لائن کنفرم کرنے کے بعد ٹریول ایجنسی کے دوست کو فون کیا کہ اسی دن میں میری کنفرمیشن کروالے میں آکر ٹکٹ لیتا ہوں جلدی سے بینک کا چکر لگایا وہاں سے پیسے نکالے اور ٹریول ایجنسی چلا گیا کہ ٹکٹ کنفرم کروالوں۔

ٹریول ایجنسی میں ایک ایسا سادہ بندہ ملا جو میری طرح پہلی مرتبہ دوبئی جارہا تھا اور اس کا ٹکٹ لینے آیا تھا اس کو دیکھ کر اپنے آپ سے دل خوش ہوا کہ ایسے سادہ لوگ جا سکتے ہیں تو ہم تو پھر بھی " سادہ لوگوں میں کچھ رنگین ہے " کے مصداق کچھ سمجھ بوجھ تو رکھتے ہیں۔ ٹکٹ کنفرم ہوگیا اور وہیں سے گھر والوں کو فون کیا کہ میرے سارے پرانے جینز دھو لو کیونکہ دو دن بعد

فلائٹ ہے ساتھ ہی متعلقہ ادارے کو بھی ای میل کر دیا کہ میں آپ کے مجوزہ تاریخ سے دو دو قبل بنکاک پہنچ رہا ہو اس لئے کسی کو بنکاک ائیرپورٹ بھیج دو کیونکہ مجھے معلومات حاصل نہیں جواب میں انہوں نے ریپلائی کیا کہ آنا ہے تو بسم اللہ آ جائے لیکن دو دن قبل آنے سے آپ نے اپنا خرچہ کرنا ہوگا ہم آپ کے ذمہ دار نہیں ہونگے - یہ سن کر تو اور بھی حالت پتلی ہو گئی لیکن پھر شکر ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے گیسٹ ہاؤسز چیک کرنا شروع کر دیئے کہ کہاں پر سستے گیسٹ ہاؤسز ہونگے یہ اللہ کا شکر ہے کہ دس ڈالر میں ایک روز میں کمرے کی سہولت دینے والے گیسٹ ہاؤسز کا پتہ چلا جس سے دل بہت خوش ہوا سارے ایڈریسز پرنٹ نکال کر رکھ لئے کہ وہاں پر سہولت ہو گئی ساتھ ہی بنکاک کے موسم کے بارے میں انٹرنیٹ پر معلومات حاصل کی کہ آنے والا ہفتہ کیسے ہوگا -

ایک صحافی دوست کو فون کیا کہ مجھے کل تک اس کا کیمرہ چاہیئے کیونکہ میں نے اپنے ساتھ کیمرہ لیکر جانا ہے اور پھر فلائٹ کی تیاریوں میں مصروف عمل ہو گیا --

یاد رفتگان - مکرم خان عاطف بھی بچھڑ گیا

مجھے مکرم خان کا وہ گلہ ہمیشہ یاد رہے گا جو اس نے میرے مہمند ایجنسی سے واپسی کے بعد مجھ سے کیا تھا کہ " یار پشتو میں میرے لئے انٹرویو تو لے لیتے " یا پھر جاتے وقت مجھے بتا دیتے اور میں شرم کے مارے اس کو جواب نہیں دے سکا -آج میرے دوست صحافی مکرم خان مہمند کو مسجد سے نماز مغرب کے بعد فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا چہرے اور سر پر گولیوں کے نشانات لئے مکرم خان ہم سب سے یہ سوال کر رہا ہے کہ آخر میرا قصور کیا تھا کہ مجھے نشانہ بنایا گیا-

مکرم خان عاطف سے میرا تعلق اس وقت بنا جب میں نے ٹی وی چینل کو جوائن کیا اس وقت مکرم خان ہم سے ایک سال سینئر میں تھا دفتر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئی لیکن سلام دعا کی حد تک رابطہ رہا-مکرم خان سے میرا تعلق اور ذہنی ہم آہنگی مختلف دھماکوں کی کوریج کے دوران بنی اور میرا بہترین دوست بنا ہر ایک سے تعلق رکھنے والا مکرم خان طبعیت میں بہت شوخ بھی تھا لیکن یہ شوخی صرف قریبی دوستوں سے تھی اور مجھے یہ فخر ہے کہ میں مکرم خان کا دوست رہا ہوں-

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب آفتاب شیرپاؤ ایف سی کے جوانوں کے پاس آؤٹ پریڈ میں مہمان تھے اور میری ملاقات مکرم خان سے ہوئی اس دن ہم سرکار کے مہمان تھے لیکن شبقدر چونکہ اس کا اپنا علاقہ تھا تو اس نے مہمانداری کی حد کر دی تھی اور یہی سے ہمارا تعلق بن گیا۔

مئی 2011ء میں شبقدر میں ہونیوالے ایف سی پر خودکش حملوں کی کوریج کیلئے میں پشاور سے شبقدر گیا تھا اور اس دوران ہمارا تعلق اور بھی مضبوط ہوگیا ۔ا مجھے اس بات کا بھی تجربہ ہے کہ جب کسی دوسرے سٹیشن سے آنیوالا صحافی کسی اور کے سٹیشن میں جا کر رپورٹنگ کرتا ہے تو اسی سٹیشن کے صحافی برا مانتے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ پورے دن کی رپورٹنگ کے دوران کبھی غلطی سے بھی مکرم خان میرے نزدیک نہیں آیا کہ میں نے رپورٹنگ کرنی ہے۔ بلکہ میرے ساتھ پورا دن تعاون کرتے ہوئے گزرا اور جب ہم وہاں سے نکلنے لگے تو زبردستی ہمیں مہمان بنا لیا اور کہا کہ " یار اب تو تمھاری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے اب میرے مہمان ہو " اور مہمانوں کیلئے میرے جان بھی حاضر ہے اس دن عجیب سی اداسی تھی اور بازار بھی بند تھے لیکن مکرم خان نے بطور میزبان- کہاں کہاں سے کھانے کا بندوبست کیا۔ اسی دن کی کوریج میں مکرم خان کی اطلاع پر میرے ساتھی کیمرہ مین عامر علی شاہ نے تیزی کی اور اسی کی وجہ سے ہم نے شبقدر ایف سی قلعے میں شہید اہلکاروں کی فلم بھی ہم نے بریک کر دی تھی حالانکہ

وہاں پر ہماری گرفتاری کا بھی خدشہ تھا ۔اپنے علاقے میں مقبول مکرم خان سے آج تک اسی علاقے میں رہنے والے کسی بھی صحافی نے دہشت گردی سے لیکر عام واقعات تک کوئی رپورٹ.بریک نہیں کرسکا اور ہمیشہ.بروقت اور صحیح رپورٹنگ کی۔

سیکورٹی فورسز مہمند ایجنسی میں اپنی کارکردگی دکھانے کیلئے پشاور سے صحافیوں کی ٹیم لیکر گئی تھی مہمند ایجنسی میں رپورٹنگ کے بعد میں شبقدر کے راستے واپس آرہا تھا کہ مکرم خان کا فون آگیا کہ یار میرے لئے پشتو میں وہاں سے فوجی کمانڈر سے کوئی بات لی ہے تو میں نے انکار میں جواب دیا ساتھ ہی گلہ بھی کیا کہ " ظالم مجھے تو بتا دیتے میرے راستے سے جارہے ہو میں بھی ساتھ جاتا " ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کام تو تم نے کرلیا ہے اب شبقدر بازار میں اتر جاؤ میرے مہمان بنو بعد میں واپس پشاور چلے جانا اور میں نے ہنستے ہوئے معذرت کیا کہ " ابھی ہم سیکورٹی فورسز کے مہمان ہیں" اور پھر اس نے معذرت قبول کی اور کہا کہ خیر ہے کہ پھر آجانا۔

شبقدر سے مہمند ایجنسی کے راستے میں پولیس چیک پوسٹ پر ہونیوالے دوسرے دھماکے کی کوریج کیلئے میں پشاور سے پہنچا تو میں نے جینز کیساتھ قمیص پہنی تھی مکرم خان اپنے ساتھی کیمرہ مین کیساتھ وہاں موجود تھا مجھے موقع پر ڈی

وی دینے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہوگیا اس وقت ہمارے ایک اور دوست جس کا تعلق بھی قبائلی علاقے سے ہے اور مقامی ٹی وی کیساتھ منسلک ہے شمس مومند بھی وہاں پر پہنچ گئے رپورٹنگ کے بعد پولیس وہاں سے نکل گئی تو شمس نے مکرم خان کو مخاطب ہو کر کہا کہ یار " مسرت کو دیکھ لو اس نے کونسے کپڑے پہنے ہیں " جینز پہن کر . یہاں آگیا ہے اور مکرم خان ہنستا رہا اور مجھے آواز دی کہ " یہ کیا کر رہا ہے کیا یہ صحیح ہے " اور میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ یار اس کو کیا پتہ آج کل یہ سٹائل چل رہا ہے کہ لمبی قمیص اور اور ساتھ میں جینز پہنتے ہیں کیا تمھیں پتہ نہیں ہے - اور پھر یہ دونوں مجھے چھیڑتے رہے کہ یار یہ پشاور والے بھی عجیب ہے جو چیز سمجھ میں نہیں آتی اسے سٹائل کا نام دیتے ہیں اور میں ان کو کہتا رہا کہ تم لوگوں کو سٹائل کا پتہ نہیں کام ختم کرنے کے بعد مکرم خان نے زبردستی ہمیں کھانے کیلئے روکنے کی کوشش کی اسی ملاقات میں مکرم خان نے گلہ بھی کیا کہ یار میری تنخواہ کم ہے اور میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ " لگے رہو منا بھائی " اور ہنس مکھ مکرم خان خاموش ہوگیا.

چونکہ اپنے ادارے کیلئے زیادہ تر کرائمز اور کورٹس کی خبریں میں ہی کرتا ہوں گذشتہ دنوں کرک میں زیادتی کا نشانہ بننے والی عظمی کیس میڈیا پر آگیا تو مکرم خان نے مجھے فون کیا کہ یار مجھے اس فیملی کا نمبر چاہیئے

کیونکہ کچھ لوگ اس کی مالی مدد کرنا چاہتے ہیں ان دنوں عظمی ایوب کے بھائی کو قتل کیا گیا تھا اور میں نے مکرم خان کو نمبر بھیج دیا تو مجھے ء" مننہ " کا میسج واپس مل گیا۔

اپنے کام سے مخلص مکرم خان کی خوبیوں کے بارے میں لکھنا چاہوں تو شائد میری ہمت جواب دے لیکن لکھنا ختم نہ ہو ۔

زندگی کے کچھ معاملات میں بحیثیت صحافی بہت حساس ہوں لیکن جس شعبے سے ہم تعلق رکھتے ہیں اس میں ہمیں مجبورا ڈاکٹروں کی طرح بے حسی پیدا کرنی پڑتی ہے کیونکہ پھر جانبداری پیدا ہوتی ہے اور صحافت کا غیر جانبدارانہ کردار متاثر ہوتا ہے مکرم خان ہمیشہ سے غیر جانبدار رہا اور غیر جانبدارانہ رپورٹنگ سے ہی اپنی پہچان کرائی ۔آج مکرم خان کی موت کے بعد بھی صحافیوں کو دھمکیاں مل رہی ہیں کہ اگر کسی نے احتجاج کیا تو ان کو بھی نشانہ بنا دیا جائیگا ۔ بحیثیت صحافی میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ " قلم " کی حرمت پر قسم کھاتا ہے تو وہی ذات باری تعالی اس قلم کی حرمت کی پاسداری کرنے والوں کا مددگار بھی ہے اور اس فانی دنیا کا کوئی وقت مقرر نہیں اس بات پر بحیثیت مسلمان میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے اس کی زیادتی کا حساب لے گا اور ہم دن قیامت کا دن ہوگا جب ہر کوئی اپنے نامہ اعمال لیکر اس کے دربار میں کھڑا ہوگا۔ میرے دوست مکرم خان تمھارا حساب اللہ تعالیٰ لے گا۔

تھائی لینڈ کی تیاریاں اور پشاور صدر میں دھماکہ

تھائی لینڈ جانے سے دو دن قبل اپنی بیگم کیساتھ بیٹھا ہوا تھا اور گپ شپ لگا رہا تھا بیگم نے پوچھا کہ سچ مچ تم جا رہے ہوں یعنی میری بیوی کو ابھی تک یقین نہیں تھا کہ میں باہر جا رہا ہوں جب میں نے کہا کہ بالکل اب تک سب کچھ کنفرم ہوگیا ہے تو میرے جواب سے اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی پھر پوچھا واپس کب آؤگے تو میں نے جواب دیا کہ دس دن گزاروں گا پھر آؤنگا اس کے چہرے پر کچھ خوشی دیکھنے کو ملی کہ میں واپس آؤنگا پھر بیگم کو تنگ کرنے کیلئے مزید کہا کہ کوشش کرونگا کہ کسی انگریز لڑکی سے شادی کروں کیونکہ وہ تو سفید ہوتی ہے اور انہیں میک اپ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی دوسرے وہ جیولری کے چکر میں بھی نہیں ہوتی سو خرچہ بھی نہیں کرنا پڑے گا جس پر بیگم نے فوری جواب دیا کہ بالکل کرو میری طرف سے اجازت ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میری جیسی تمھیں بالکل نہیں ملے گی جس پر میں نے اسے تنگ کرنے کیلئے کہا کہ تمھاری جیسی دوسری سے شادی بھی نہیں کرنی ۔ میں نے اسے چھیڑنے کیلئے مزید کہا کہ اسلام نے مجھے چار کی اجازت دی ہے تو بیگم نے دوبارہ جواب دیا کہ بالکل چار شادیاں کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جیسے میرے حقوق ہونگے ویسے دوسروں کو بھی دوگے تب کرنا۔ ویسے بات بیگم نے پتے کی کہی تھی لیکن اس کے سامنے تو اقرار نہیں کرسکتا تھا ۔

ویسے عجیب بات ہے کہ میری بیگم چار بچوں کی ماں بن گئی ہیں لیکن ابھی تک اس کو مجھ پر اعتبار کرنا نہیں آیا ۔

اسی شام کو والدہ کیساتھ بیٹھ کر گپ شپ کر رہا تھا کہ والدہ جو کہ والد کی وفات کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھی شوگر اور بلڈ پریشر نے والدہ کو چلنے پھرنے سے بھی کسی حد تک محدود کر دیا ہے گپ شپ کرتے ہوئے یکدم رونے لگی مجھے کہا کہ بیٹے خیال کرنا تمھارے تو بچے ہیں ایسا نہ ہو کہ باہر کے چکر میں اپنے گھر کو بھول جاؤ میں نے جواب دیا کہ نہیں امی کبھی ایسا سوچنا بھی مت بس میرے لئے دعا کرنا کیونکہ میرا تو کوئی اور نہیں ۔ میں تھائی لینڈ جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا اور بہنوں نے فون کیا کہ کب جا رہے ہوں چونکہ اپنے گھر میں میرا پہلا بیرونی سفر تھا اس لئے میرے ساتھ میرے گھر والے اور رشتہ دار بھی کسی حد تک ایکسائٹڈ تھے جس دن شام کی فلائٹ تھی اس دن بہنوں نے فون کیا کہ کہیں نکلنا نہیں ہم ملنے آ رہے ہیں ۔

دنیا میں ماں کے بعد بہن کا بڑا مقام ہے یہ وہ رشتہ ہے جس کی قدر ہم لوگ نہیں کرتے لیکن جس گھر میں بہنیں نہ ہوں اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھیں بھائیوں کی چھوٹی سے خوشی میں خوش ہونیوالی بہنیں بھائی کیلئے بہت محبت رکھتی ہیں بھائیوں کی محبت میں بہت ظلم برداشت کرتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی

بہت بڑی نعمت ہوتی ہیں بھائیوں کیلیۓ بہنوں کی بڑے دل ہوتے ہیں دل میں بہت خوش ہوا کہ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اللہ تعالی نے بہنیں تو دی ہیں جو میری خوشی میں شریک ہونے کیلیۓ آرہی ہیں۔

جس دن فلائٹ تھی اس دن میں دفتر کیلیۓ صبح سات بجے روانہ ہوا دفتر جیسے ہی پہنچ گیا اس وقت بیٹھا تھا کہ اطلاع آئی کہ دھماکہ ہوا ہے چونکہ ہمارا دفتر پشاور صدر میں ہے اور صدر کی نزدیک دھماکے کی آواز سنائی گئی تھی پہلی اطلاع آئی کہ غربی تھانے کو نشانہ بنایا گیا ہے وہاں تک ہمارے دفتر سے تقریبا ایک کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے میں فوری طور پر بھاگ کر وہاں پہنچا لیکن کچھ نہیں تھا ایک دوست نے فون پر اطلاع دی کہ نوتھیہ میں سکول کے باہر دھماکہ ہوا ہے وہاں پہنچ جاؤ وہاں سے بھاگتے ہوئے نوتھیہ بازار پہنچا جہاں پر ایدھی کی گاڑی موقع پر جانے کیلیۓ جارہی تھی چونکہ ان لوگوں سے رابطہ پہلے سے تھا اس لئے ایدھی کی ایمبولینس میں بیٹھ گیا کہ جلدی پہنچ جاؤں کیونکہ کیمرہ مین نے بعد میں پہنچنا تھا موقع پر پہنچ گیا تو اطلاع آئی کہ چونکہ آپ نے نکل جانا ہے اس لئے آپ یہاں سے ہسپتال نکل جائیں دوسرا رپورٹر وہاں پہنچ رہا ہے اسی ایمبولینس میں جس میں زخمی بچوں کو لے جایا جارہا تھا بچوں کیساتھ ان کے والدین بیٹھے تھے معصوم چار سال سے لیکر سات سال تک کے چار بچے تھے جو دھماکے کے باعث زخمی ہوگئے تھے انکی آنکھوں میں آنسو تھے

اور والدین ان کے پریشان تھے وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سکول کے سامنے بھی دھماکہ ہوتا ہے نامعلوم افراد نے سکول کے سامنے گدھا گاڑی میں بم نصب کیا تھا جو پھٹ گیا تھا اور اس سے متعدد بچے زخمی ہو گئے تھے ان میں دو بچے بھی جاں بحق ہو گئے تھے ہسپتال پہنچا وہاں کی کارروائی لائیو ٹی وی پر دی چونکہ ٹی وی پر زیادہ تر لائیو کوریج ہوتی ہیں اس لئے ہسپتال کی صورتحال سے ناظرین کو آگاہ کیا اسی دوران ڈائیو کو فون کیا اور اپنے لئے اسلام آباد کیلئے بکنگ کی پھر دفتر فون کیا کہ کسی اور کو بھیج دو کیونکہ میں جارہا ہوں دوسرا دوست ہسپتال کوریج کیلئے آگیا پھر وہاں سے بینک آگیا جہاں میرا اکاؤنٹ تھا کہ روپوں کی جگہ ڈالر لے لونگا - بینک پہنچا جہاں پر متعلقہ کاؤنٹر سے ڈالر لینے کیلئے رابطہ کیا تو اس نے بڑی رعونت سے جواب دیا کہ یہ ایکسچینج نہیں ہے اور میرے تیس ہزار روپے میرے منہ پر پھینک دیئے مجھے ساتھ میں یہ بھی کہا کہ ہاں تم ڈالر جمع کر سکتے ہو لیکن ہم تمھیں نہیں دے سکتے -

مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی کہ ٹھیک ہے کہ تیس ہزار روپے کی تمھارے لئے کوئی وقعت نہیں ہوگی لیکن میرے ساتھ روا رکھے جانے والے رویئے نے بہت دلبرداشتہ کیا میں وہاں پر موجود تھا کہ ایک موٹی پیٹ والا شخص وہاں آیا اسی بندے نے جس نے میرے ساتھ بدتمیزی سے بات کی تھی اس کے سامنے اٹھ گیا اس

کیلئے چائے کا کہا اور پھر گپ شپ کے دوران اسے میرے سامنے ڈالروں کا بنڈل دے دیا اور میں اپنے آپ کو گالیاں دیتا ہوا نکل آیا کہ ہم جیسے لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں جن کے پاس زیادہ ہے ان کی یہاں پر عزت ہوتی ہے۔

دلبرداشتہ ہو کر اسی بینک سے نکل کر نزدیکی ایکسچینج چلا گیا جہاں پر تیس ہزار روپے دیئے تو اس صاحب نے 350 ڈالر دیئے اس وقت عجیب سا لگ رہا تھا کہ میرے تیس ہزار روپے کی وقعت یہی ہے وہاں سے پیدل پریس کلب تک روانہ ہوا کہ دوست سے کیمرہ لے لونگا اس کو فون کیا کہ کیمرہ پہنچا دو لیکن ایک بات جو ہر ایک کوئی مانے گا کہ جب آپ کی ضرورت ہوتی ہے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں ہو پاتا سو پریس کلب میں دوست کا انتظار کرنے کے باوجود کیمرہ نہیں آیا اور دوست میں آرہا ہوں کی گردان کرتا رہا دو بج گئے لیکن دوست نہیں آیا پھر مجھے غصہ آیا کہ تھائی لینڈ میں کیمرہ لے جانا ضروری تو نہیں پھر گھر سے بھی فون آرہے تھے کہ بہنیں آئی ہیں تمھارے انتظار میں بیٹھی ہیں جلد گھر پہنچ جاؤ۔

راستے میں گھر جاتے ہوئے خیال آیا کہ میرا بیگ تو خراب ہوا ہے اب کیا کروں وہاں سے ہشتنگری پہنچا جہاں پر افغانستان سے آنیوالے ملٹری بیگ اور دوسرا سامان مل رہا تھا وہاں پر امریکی فوج کا بیگ لیا اور گھر پہنچا اس دن تین

بجے کے قریب دوپہر کا کھانا کھایا بہنوں اور بچوں کیساتھ کھانے کا اپنا مزا آیا صحافت کا میدان بھی عجیب سا ہے کبھی گھر والوں کیساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا صبح ناشتے کا موقع تو ملتا ہے وہ بھی بچوں کیساتھ ` ہمارے گھر میں داجی گل (والد) کی عادت تھی کہ اکیلے کھانا کھاتے تھے باقی سب لوگ ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں یہی عادت والد کی مجھ اور میرے والد کو بھی ورثے میں ملی ہیں گھر کی خواتین اور بچے الگ کھانا کھاتے ہیں اور ہم الگ جس کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں بھائی صحافت سے وابستہ ہے اور کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں اس لئے جب بھی گھر آئے تو کھانا کھا لیا سو اس دن کھانے کا بہت مزہ آیا۔ شیو کیا اور گھر سے نکلا تو اس وقت بہنوں سے قرآن شریف کا ختم میرے لئے کیا والدہ سے گلے ملا بچوں کو پیار کیا والدہ نے قرآن سر پر رکھا کہ بیٹا قرآن کے سائے میں نکلو گھر سے نکلتے وقت بیگم کو دیکھا جو گھر والوں سے دور دیوار سے لگ کر کھڑی تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی جب میں نے اسے دیکھا تو اس نے منہ موڑ لیا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے مجھے اداس کر دیا گھر سے نکلنے کے بعد رکشے میں بیٹھ گیا کہ ڈائیو ٹرمینل پہنچ جاؤں اتنا سست رکشہ ڈرائیور تھا میں ڈر رہا تھا کہ کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں لیکن شکر ہے کہ اس نے بروقت ٹرمینل تک پہنچا دیا -

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے پٹھان دو

رکشہ ڈرائیور نے تو بس ٹرمینل میں پہنچا دیا شکر ہے کہ ڈائیو نامی کمپنی وقت کی پابندی کرتی ہے تاہم اپنے بندوں کو آگے لانے کیلئے جن مسافروں نے پہلے ایڈوانس میں رجسٹریشن کی ہوتی ہے انہیں نمبر تبدیل کرکے پیچھے بٹھایا جاتا ہے چونکہ میری عادت ہے کہ ہر جگہ دوسرے یا تیسرے سیٹ پر بیٹھ جاؤں لیکن متعلقہ کمپنی والوں نے مجھے اور سیٹ نمبر دے دیا اب غصہ یا انکار بھی نہیں کرسکتا۔ خیر بیگ لیکر جب گاڑی میں داخل ہونے لگا تو سیکورٹی گارڈ نے ایسی تلاشی لی جیسے میں اپنے ساتھ بم لیکر جارہا ہوں میں نے بھی یہاں اپنی صحافت جھاڑی لیکن سیکورٹی گارڈ کا کہنا تھا کہ ہمیں آرڈر ہے کہ کوئی بھی ہو تلاشی لیکر چھوڑنا ہے اس لئے آپ تلاشی دینگے آپ کو اچھا لگے یا برا۔ میں نے ان سے کہا کہ ظالموں تین دفعہ تو تم لوگ تلاشی ٹرمینل میں داخلے کے وقت لے چکے ہو لیکن سیکورٹی گارڈ بھی میری طرح ہی پٹھان تھا۔

خوچہ ایک بات سمجھتا تھا اس نے مجھے اچھی طرح ٹھونک کر دیکھا اور بس میں جانے کی اجازت دی بس کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے اسے کہا کہ " بڑے خوش قسمت ہو کہ میری تلاشی لی اور وہ بھی اتنی بدتمیزی کیساتھ " اتنی بدتمیزی

کیساتھ میری تلاشی کوئی لیتا تو دیکھ لیتا متعلقہ سیکورٹی گارڈ نے مجھے دیکھا اور پھر " ہونہہ "
کہہ کر خاموش ہوگیا۔

بس میں بیٹھا تو بہت خوشی ہوئی کہ چلو سفر کا آغاز تو ہوگیا لیکن جس وقت گاڑی اسلام آباد کیلئے روانہ ہو گئی اس وقت اپنا خاندان یاد آگیا والدہ ` بچے اور بیوی بہت یاد آنے لگے کہ ان کے بغیر میرے دن کیسے گزرے گیں کچھ دیر عجیب سی خاموشی تھی اور دل اداس ہوگیا لیکن پھر میں نے دل کو ڈھارس دی کہ تم کونسے سالوں کیلئے جا رہے ہوں ٹریننگ کے بعد واپس یہاں ہی آنا ہے سو اداس خان مت بنو انجوائے کرو۔

نوشہرہ تک کا سفر خاموشی سے گزرا وہاں پہنچا تو ٹرمینل میں پندرہ منٹ کا بریک تھا جیسے ہی روانہ ہوا تو ایک صحافی دوست کا فون آیا کہ اس کی بیٹی نے قرآت میں انعام حاصل کیا ہے اور اس کیلئے انعام کا اعلان وفاقی حکومت نے کیا ہے لیکن اب وہ نہیں دے رہے کیا کرنا چاہیے میں نے اسے بتا دیا کہ بھائی میں تو راستے میں ہوں اور باہر جا رہا ہوں ہاں ہمارا ایک مشترکہ دوست جو اس وقت اسلام آباد میں ہے اس کا نمبر اسے دے دیا کہ اس سے رابطہ میں کرتا ہوں اور تمھارا مسئلہ بتا دیتا ہوں تم وہاں پہنچ جاؤ تو وہ اس سلسلے میں تمھاری مدد کرے گا اس نے شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا دوران گفتگو میں نے اپنے

دوست کو بتا دیا کہ میں ٹریننگ کیلئے تھائی لینڈ جارہا ہوں جو اس وقت میرے ساتھ بیٹھے
- ایک مسافر نے سن لی تھی

فون بند کرنے کے بعد اس نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ کارخانو مارکیٹ پشاور کا تاجر ہے اس کے چار بیٹے ہیں جن میں دو اس وقت انگلینڈ میں بزنس کر رہے ہیں جبکہ ایک روس میں ہے اور ایک یہاں کارخانو میں اس کی جگہ پر بزنس کر رہا ہے اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم بھی تھائی لینڈ جارہے ہو میں نے کہا کہ ہاں تو اس نے جواب دیا کہ ہاں میں بھی جارہا ہوں ہم نے دوبارہ ہاتھ ملایا کہ چلو " خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے پٹھان دو" - مسافر کا کہنا تھا کہ میں تھائی لینڈ دوسری مرتبہ جارہا ہوں اور کئی ملکوں کا سفر کر چکا ہوں بقول اس کے پیسہ میں نے بہت کما لیا ہے اب میرا دل کرتا ہے کہ میں دنیا گھوموں اور زندگی انجوائے کروں - کیونکہ میرے مرنے کے بعد تو ویسے بھی یہ سب کچھ ختم ہوگا تو کیوں نہ زندگی کو انجوائے کرو - کارخانو کے اس تاجر کی عمر 55 سال تھی اور اس نے پینٹ شرٹ پہنی تھی لیکن اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری طرح شلوار قمیض پہننے والا بندہ ہے اور لمبے عرصے بعد اس نے پینٹ پہنی ہے اس لئے کچھ غیر مطمئن لگ
- رہا تھا

اسی گپ شپ میں راولپنڈی تک پہنچ گئے وہاں سے ایئر پورٹ کیلئے ٹیکسی لی ساتھ

ہی بیٹھ گئے شکر ہے کہ ایئر پورٹ تک آسانی سے پہنچ گئے ورنہ اگر پشاور میں ہوتے تو اتنے سیکورٹی ناکوں سے نکلتے اور اتنے سوالات پوچھے جاتے کہ ہمارا ناکوں میں دم نکل جاتا لیکن اللہ کی شان کہ جس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ ہم بیٹھ گئے وہ پشتو میں بقول " رونے والی مشین" تھی بجلی کی لوڈشیڈنگ ` مہنگائی سے اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور بغیر ہمیں سنے ہمیں بچوں کی سکول کی فیس کرایہ ` شادی ` غمی کا خرچہ تک بتا دیا اس میں یہ بھی بتا دیا کہ میرا تو ٹیکسی میں گزارا نہیں ہوتا اس کے خیال میں جیسے ہم سیٹھ تھے جب میں نے اس سے پوچھا کہ سیاست میں کون اچھا ہے تو اس نے اپنی تقریر کا رخ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے سیاسی لیڈر کی طرف موڑ دیا اور وہ تعریفیں کی اگر ایسی تعریفیں وہ اللہ تعالی کی کرتا تو یقینا اس کی جان ٹیکسی سے چھوٹ جاتی لیکن شکر ہے کہ ایئرپورٹ ہم پہنچ گئے اور ہماری جان چھوٹ گئی ۔ مجھے تو نہیں پتہ کہ ایئرپورٹ پر انٹر نیشنل مسافروں کیلئے کون سی جگہ ہے لیکن وہ مسافر آگے ہوا اور میں اس کے پیچھے پیچھے ایئرپورٹ میں داخل ہوگیا ۔

اسلام آباد ائیرپورٹ اور رشوت کے چکر میں مسافروں کی ذلت

اسلام آباد ائیرپورٹ کے انٹرنیشنل فلائٹس کے لاؤنج میں اپنے پٹھان دوست کے پیچھے داخل ہوگیا۔ مزے کی بات جس وقت دروازہ کھول کر داخل ہورہا تھا اس وقت بھی ایک پٹھان سیکورٹی گارڈ نے کہا کہ سامان چیک کرواؤ۔ مجھ سے پہلے میرے دوست کو روکا گیا اور اس سے پاسپورٹ لیا اس دوران ان کی گفتگو شروع ہوئی میں دور تھا لیکن سمجھ نہیں آیا کہ دونوں کے درمیان کیا بات ہورہی ہے جس وقت میری باری آئی تو اسی بندے نے میرا پاسپورٹ لیا اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو میں نے جواب دیا کہ تھائی لینڈ `پھر پوچھا کس لئے جارہے ہوں کیا کروگے میں نے جواب دیا کہ ٹریننگ کیلئے جارہا ہوں پھر اسی نے سوال کیا کہ کیا کرتے ہوں میں نے جواب دیا کہ صحافی ہوں اور ٹی وی کیساتھ وابستہ ہوں۔ دوران گفتگو متعلقہ سیکورٹی گارڈ کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے میں اس کا غلام ہوں لیکن جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو مجھے کہا کہ " ٹھیک ہے ٹھیک ہے جی آپ جائیں " جب میں نے سوال کیا کہ میرے اس دوست کو کیوں روکا ہے تو مجھے کہا کہ تم چلے جاؤ۔ یہ آجائینگے۔

میں نے اپنا بیگ اٹھا لیا اور تھائی ائیر لائنز کے کاؤنٹر پر چلا گیا وہاں بہت رش لگی ہوئی تھی ایک سیکورٹی اہلکار نے بڑی رعونت سے مجھے کہا کہ کدھر

جارہے ہوں اور کونسے کلاس میں ہو۔ میں نے جواب دیا کہ تھائی ایئر لائنز میں بنکاک جانا ہے اور غریب صحافی ہوں اتنی اوقات نہیں کہ بزنس کلاس میں جاؤں اس لئے اکانومی کلاس میں جارہا ہوں ۔پھر اس نے جواب دیا کہ اچھا جاؤ پھر اکانومی کلاس کے لائن میں کھڑے ہو جاؤ ۔

جس وقت تھائی ایئر لائنز کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں دو لڑکیاں بیٹھی تھی جو بورڈنگ کارڈ دے رہی تھی میرا پاسپورٹ مجھ سے لے لیا اور پوچھا کہ پہلے کبھی تھائی لینڈ گئے ہو یا پہلے بھی گئے ہوں ۔آنکھیں اس کی چینی لوگوں کی طرح چھوٹی اور ماتھا چوڑا تھا یعنی تھائی لینڈ والوں نے بھی پاکستان میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسی لڑکیاں بھرتی کی تھی جیسے ان کے آباؤ واجداد تھائی لینڈ سے تعلق رکھتے ہوں ۔ ایک محترمہ نے سوال کیا کہ کس لئے جارہے ہوں میں نے رٹا رٹایا جواب دیا کہ ٹریننگ سیشن کیلئے جارہا ہوں پھر پوچھا گیا کہ کتنے ڈالر ہیں میں نے جواب دیا کہ جتنے ضروری ہیں اتنے لے کر جارہا ہوں ۔پھر محترمہ نے سر اٹھا کر مجھ سے سوال کیا کہ ہوٹل کی بکنگ ہے میں نے نفی میں جواب دیا کریڈٹ کارڈ کے بارے میں پوچھا گیا اتنے سوال کرنے کے بعد بھی محترمہ نے مجھ سے کہا کہ ایک منٹ میں صاحب سے پوچھ کر آتی ہوں اسی وقت وہ صاحب بھی کاؤنٹر پر آگئے محترمہ نے میرا پاسپورٹ ان کو دیا اور ایسے انداز میں کہا کہ " یہ صاحب پہلی مرتبہ تھائی لینڈ جارہے ہیں " انداز ایسے تھا جیسا کہ " شکل سے

بھوکا لگنے والا یہ بندہ پہلی مرتبہ تھائی لینڈ جارہا ہے کہیں غائب نہ ہوجائے " اس صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے چہرے پر معصومیت لانے کی کوشش کی حالانکہ صحافی ہونے کی وجہ سے یہ کام مشکل تھا لیکن شائد میں اس کوشش میں کامیاب ہوااور اس صاحب نے کہاکہ اوکے بورڈنگ کارڈ جاری کرو۔ اس چھوٹی آنکھوں والی محترمہ نے بورڈنگ کارڈ جاری کردیا میں سمجھاکہ بڑا تیر مار لیا ہے میں نے اپنے پٹھان دوست کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نظر نہیں آئے ۔اس وقت چھوٹے بھائی کا فون آگیا کہ امیگریشن سے نکل گئے ہو کہ نہیں میں نے کہاکہ نہیں ابھی یہاں ہوں۔

پاسپورٹ چیکنگ کا عمل شروع ہوا تو ایک عورت جو نام کی عورت تھی لیکن اللہ بچائے اتنی موٹی عورت میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی یہ الگ بات کہ اب ایک خاتون وزیر جو کہ اچھی خاصی صحت کی حامل ہے کے مقابلے کی تھی نے انتہائی نخوت بھرے لہجے میں پاسپورٹ لیا پوچھا کہاں جارہے ہوں جواب تو دیا لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا کہ یہ عورت کیسے اٹھتی ہوگی کیسے اس کا میاں ہوگا وہ اس کیساتھ کیسے گزارا کرتا ہوگا ۔اس وقت میں نے اللہ کا شکرادا کیا کہ اگر میری بیوی ایسی ہوتی تو اللہ توبہ ۔ یکدم اس عورت نے مجھے کہاکہ واپس جاؤ اگر وہ ایف آئی اے والے ہمارے بڑے افسر آپ کو کہیں تو تب آپ جا سکتے ہیں ورنہ نہیں ۔پھر واپس آگیا اور ایک اور صاحب سے ملا اس سے

تعارف کروایا سوال و جواب کا پندرہ منٹ کا سیشن ہوا پھر مجھے اوکے رپورٹ ملی۔ میں اس وقت دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یا اللہ یہ کیسا عمل ہے کیوں اس طرح ہو رہا ہے لیکن خاموشی سے ہر حکم پر عمل کرتا رہا دوبارہ اسی موٹی عورت کے پاس گیا اسے کہا کہ تمھارے صاحب نے اوکے رپورٹ دی ہے تبھی اس نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگا دیا اور مجھے کہا کہ اندر چلے جاؤ۔

پھر سکینگ کا عمل شروع ہوا بیگ کی تلاشی کے بعد میری تلاشی تین مرتبہ جسمانی اور کمپیوٹر کے ذریعے لی گئی پینٹ کی بیلٹ تک اتار لی گئی شکر ہے کہ اتنے تک رہے یہاں سے فارغ ہو کر اوپر لاؤنج میں چلا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تقریبا پینتالیس منٹ ان لوگوں نے اس عمل میں خوار کیا اور پھر رویہ بھی ان کا ایسا تھا کہ جیسے "اپنے کھیت میں دوسرے کا جانور پکڑ و اور اس کو مار مار کر بھگا دو" یعنی اس طرح کا عمل میرے ساتھ کیا گیا۔ میں ابھی لاؤنج میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ کچھ وقت بعد میرا پٹھان دوست بھی میرے پیچھے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔

میں نے پوچھا کہ خیریت ہے کیونکہ اس کے ماتھے پر بارہ بج رہے تھے اور منہ سے پشتو میں وہ "خوبصورت گالیاں" نکل رہی تھی جس کو سننا بھی بڑے دل گردے کی بات ہے میں نے کہا کہ پانی پی لو پھر بات کرو لیکن اس نے جواب دیا کہ یہ

کہتے " مجھ سے 100 ڈالر مانگ رہے تھے اس دوست کے بقول میرا گناہ کیا ہے کہ "
میں 100 ڈالر آپ کو دوں تو ایف آئی اے والوں کا موقف تھا کہ تم سیر کرنے
جارہے ہوں تو ہمارا بھی کچھ تو حق ہے لیکن میرے پٹھان دوست نے کہا کہ میں تو نہیں
دے رہا آخر مجبور ہو کر ایف آئی اے والوں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ سن کر میرا دماغ کا
پارا بھی گھوم گیا کہ یہ "حرام کھانے والے "کیسے کیسے طریقوں سے لوگوں کو تنگ کرتے
ہیں پھر مجھے بھی احساس ہوا کہ مجھے آگے پیچھے دوڑانے کا مطلب بھی یہی تھا کہ "خوچہ
کچھ خرچہ نکالو " لیکن ہمارا بھی دماغ پٹھانوں والا ہے سب کو اپنی طرح سمجھ رہے تھے۔
افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ کیا ان لوگوں کو تنخواہ نہیں ملتی جو اس طرح کر رہے
ہیں میرے اس دوست کے بقول یہاں ہر ایک کی اپنی دکانداری ہے اور ہزاروں روپے
۔ اسی چکر میں مسافروں سے نکلوائے جاتے ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں
کچھ وقت تو ہم دونوں ملکی صورتحال پر بات کرتے رہے جب غصہ ذرا ٹھنڈا ہو گیا تو ایئر
پورٹ لاؤنج کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ زیادہ تر تھائی لینڈ کے لوگ ہیں جو نئے سال کی
آغاز میں اپنے گھر جارہے ہیں میرا دوست نماز کیلئے چلا گیا اور میں نے ایک شخص جو کہ
لاؤنج میں تین کرسیوں پر سامان رکھ کر چار کرسیوں پر لیٹ گیا تھا سے سوال کیا کہ
بھائی کیا ہوا ہے کہ تم یہاں لیٹے ہوں تو اس نے قومی ایئر لائن کی شان میں وہ "
گلکاریاں " کی کہ چھ گھنٹے

لیٹ ہے اور ابھی بھی پتہ نہیں کس وقت جائے سو یہاں لیٹ کر اپنا وقت گزارنے پر مجبور ہیں۔بقول اس مسافر کہ میں دوسرے ایئر لائنز کی جہازوں میں سفر کرتا ہوں لیکن اس دفعہ قومی ایئر لائن کی محبت جاگ اٹھی تھی جو ٹکٹ لیا لیکن اب ایسا عمل ہوا کہ میرے آئندہ آنیوالے تین نسلوں کی بھی توبہ کہ میں نے قومی ایئر لائن کی جہاز کا ٹکٹ لوں۔

دو گھنٹے بعد آواز آئی کہ تھائی لینڈ والے مسافر لائن میں لگ جائے یہ آواز سننا تھا کہ سب لوگ جو خاموش بیٹھے تھے ایک دم بھاگ دوڑ میں لگ گئے میں سمجھا کہ جہاز میں سیٹ کم ہیں اس لئے ہر کوئی ایسے بھاگ رہا ہے ہر پاکستانی دوسرے پاکستانی کو کچل کر آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ جو غیر ملکی کھڑے تھے وہ قطار میں کھڑے تھے میں نے اپنے پٹھان دوست کو آواز دی اور لائن میں کھڑے ہوگئے اس چھوٹی آنکھوں والی محترمہ نے بورڈنگ کارڈ لیا نصف کرکے مجھے واپس کیا اور میں جہاز کی طرف جانے کیلئے ایئرپورٹ ٹرمینل میں چلنے والی گاڑی میں پہنچ گیا اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور میں سوچ میں اپنے گھر پہنچ گیا کہ اس وقت اگر گھر میں ہوتا تو آدھی نیند کی ہوتی۔

تھائی ایئر لائنز کے ایئر ہوسٹسز اور بنکاک ایئرپورٹ

اسلام آباد ایئرپورٹ آتے ہوئے یہ خواہش تھی کہ جس پٹھان دوست کیساتھ آیا ہوں وہ میرے ساتھ ہی بیٹھے اور میں اس کے تجربے سے مستفیض ہو جاؤں لیکن میری بدقسمتی کہ اسے بورڈنگ کارڈ پہلے ملا تھا اس لئے جہاز میں آگے بیٹھ گیا جبکہ میری سیٹ پچھلے سیٹوں پر تھی ۔جس وقت اعلان ہوا کہ بنکاک جانیوالے مسافر لائن میں لگ جائیں تو اللہ کی شان ہماری پاکستانی بھائی ایسے بھاگے لائن کی طرف جیسے کہ جہاز میں سیٹیں ختم ہو جائینگی وہ دھکم پیل ہم نے دیکھی میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ چونکہ ہم خیبر پختونخوا والے لوگ ہر شعبے میں پیچھے ہیں اس لئے اگر ہم بھاگ کر جلدی بیٹھنے کی کوشش کریں تو کوئی تک بنتی ہیں لیکن اللہ کی شان پنجاب کے مختلف علاقوں سے آنیوالے لوگوں نے وہ دھکم پیل کی کہ مجھے تو حیرانی ہوئی ۔ وہ تو شکر ہے کہ سیکورٹی اہلکار کھڑے تھے اور لائن میں مسافروں کو کھڑا کر رہے تھے اور ہم سارے پاکستانی اسلام آباد ایئرپورٹ پر لائن سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے کہ جلدی نکل جائیں جبکہ جو غیر ملکی ہمارے ساتھ جہاز میں جار رہے تھے آرام سے ہم لوگوں کی دھکم پیل کو دیکھ رہے تھے ۔

تھائی ایئر لائنز کی جہاز میں بیٹھے تو رنگوں کی بہار آگے پیچھے جارہی تھی

ائیر ہوسٹس نے چار رنگوں کے کپڑے پہنے تھے اور جس طرح ہم لوگ معافی مانگتے ہیں اسی انداز میں ہاتھ میں ائیر ہوسٹسز نے ہاتھ باندھے تھے ہر آنیوالے کو " سوادی کاپ کہہ رہی تھی یعنی یہ ان کی ہیلو تھی جو وہ ہم مسافروں کو کہہ رہی تھی۔جس وقت میں " اپنے سیٹ پر بیٹھ گیا اس وقت ایک دوسرا پٹھان میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا اس کے بیٹھنے کے انداز سے پتہ چلا کہ موصوف نے پہلی مرتبہ پینٹ پہنی اوپر سے چترالی ٹوپی بھی پہن کر آگیا تھا لیکن خاموش طبعیت کا تھا اس لئے آکر بیٹھ گیا اور میگزین کی پڑھائی شروع کردی۔

ایک ائیر ہوسٹس آئی اس نے مائیکروفون دیا کہ اگر گانے سننے ہیں تو اس کے ذریعے سنو میں نے مائیکروفون لگایا اور تھائی زبان کا ایک گانا لگایا گانے کے بول تو سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن جس طرح ہمارے ہاں موسیقی اداس ہوتی ہیں اسی طرح ایک باریک آواز گلوکارہ کی تھی اور پرسوز انداز میں موسیقی تھی مجھے ایسے لگا جیسے موسم غمگین ہے اور کوئی شخص برتن زمین پر اٹھا کر مارتا ہو اور جس طرح ان برتنوں کی آواز نکلتی ہے ایسی ہی گانا سن رہا ہوں ۔ کچھ ہی لمحوں میں جہاز روانہ ہوا میں نے ائیر ہوسٹسز پر نظر دوڑائی تو عجیب سے سپاٹ سے چہرے تھے ہنستی تھی تو صرف دانت نکل نظر آتے تھے اسی دوران ائیر ہوسٹس نے تھائی اور انگریزی زبان میں بتا رہی تھی کہ ابھی ہمارا جہاز اسلام آباد سے روانہ ہوگیا ہے اور لاہور اور دہلی سے ہوتا ہوا بنکاک تک

جائیگا اور ہمارا یہ سفر چھ گھنٹے تک کا ہے کچھ ہی لمحوں میں ایئر ہوسٹسز نے کھانے پینے کی اشیاء رکھنی شروع کردی ایئر ہوسٹسز مسافروں سے پوچھتی کہ مسلم کھانا میں نے بھی جواب دیا کہ ہاں تو مجھے ایک پلیٹ دیا جس میں چاول تھے میں دعا کر رہا تھا کہ ایسے نہ ہوں کہ یہ کھانے کیلئے سٹک دے ورنہ اسے پھر کون کھائیگا لیکن شکر ہے کہ کانٹا اور چھری ساتھ میں تھا اس لئے اللہ کا نام لیکر کھانا شروع کردیا۔

کچھ لمحوں بعد ایئر ہوسٹسز نے کھانے پینے کا سامان اٹھانا شروع کردیا تو مجھے ایسا لگا کہ یہ لڑکیاں تبدیل ہو گئی ہیں پھر غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں لیکن انہوں نے کپڑوں کے کچھ حصے تبدیل کردیئے ہیں اس لئے عجیب سے لگ رہی تھی دل میں خیال آیا کہ یہ تو ہمارے خواتین سے بھی زیادہ ہے جو شادیوں مہندیوں میں میں چار چار جوڑے تبدیل کرتی ہیں لیکن تھائی ایئر ہوسٹسز ان سے بھی زیادہ تیز نکلی۔ خیر پھر سوچا کہ ایشیائی ملک ہے سو ان کی خواتین بھی ایسی ہی ہونگی جس وقت ایئر ہوسٹس میرے سیٹ سے سامان اٹھانے لگی اس وقت جہاز کو دھچکہ لگا میں سمجھا کہ بڈھ بیر کے بس میں بیٹھا ہوں ایسے وقت میں ایئر ہوسٹس سے کچھ سامان مجھ پر گرا اور وہ بھی میرے سیٹ پر آن گری موصوفہ نے جلدی سے اپنے آپ کو اٹھالیا اور سامان اٹھانے کے بعد اتنی معافی مانگی کہ مجھے شرمندگی ہو گئی اور میرا دل کر رہا تھا کہ یہ آتے

جاتے میرے سیٹ پر اسی طرح گرتی رہی لیکن یہ آرزو پھر پوری نہیں ہوئی۔ جہاز تو محو سفر تھا لیکن کبھی کبھی باڑے کے بس جو کہ پشاور سے باڑہ تک چلتی ہیں اور اپنی تیز رفتاری اور مخصوص آوازوں کی وجہ سے پہچانی جاتی تھی اسی طرح آوازیں آنی شروع ہو جاتی اور میں یہ سوچنا لگتا کہ میں بنکاک جارہا ہوں یا پھر پشاور سے باڑہ۔ پتہ چلتا کہ موسم خراب ہے اور موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ جھٹکے لگتے ہیں میں نے بہت کوشش کی کہ نیند آجائے لیکن اسے نہ آنا تھا اور نہ آئی بیٹھ کر بھی دل بھر گیا کچھ لمحوں بعد ائیر ہوسٹس نے ایک فارم دیا کہ یہ بھر دیں کیونکہ یہ آپ سے ائیرپورٹ پر مانگیں گے جسے بھر دیا اور اتنے خیال سے بھر دیا کہ جیسے میں سی ایس ایس کا امتحان دے رہا ہوں
۔

آدھ گھنٹے بعد آواز آئی کہ ہم بنکاک ائیرپورٹ پہنچ رہے ہیں اس لئے اپنے بیلٹ باندھ لے جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا تو روشنیوں کی ایک لائن دیکھی بہت ساری گاڑیاں آجارہی تھی جہاز نے جھٹکا لیا اور پھر وہی دھکم پھیل شروع ہو گئی کہ حیران رہ گیا یہاں بھی عجیب بات یہ تھی کہ جو تھائی اور دوسرے غیر ملکی ہمارے جہاز میں تھے آرام سے بیٹھے تھے جبکہ ہمارے پاکستانی جہاز سے نکلنے کیلئے کوشاں تھے ہر کوئی بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ جہاز ابھی رکا بھی نہیں تھا میں نے اپنے دوست جو کہ پشاور سے اسلام آباد تک میرے ساتھ آیا تھا کو دیکھنا چاہا کہ اس سے مدد لے

لونگا لیکن وہ بھی نظر نہیں آیا اور میرے دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ میری عزت رکھنا کیونکہ ایڈریس کا بھی نہیں پتہ تھا اور دوسرا شہر بھی دوسرے ملک کا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بجلی سے چلنے والی سیڑھیاں مسلسل چلتی ہوئی دیکھی ہمارے ہاں پشاور میں بھی تھی لیکن وہ صرف دیکھنے کیلئے ہے کیونکہ بجلی ہوتی نہیں ایسے میں میں اپنے آپ کو ایسے محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کوئی مینڈک کنویں سے نکل کر سمندر میں آجاتا ہے اور اسے حیرانگی ہوتی ہے کہ میرے کنویں میں تو ایسا نہیں ہوتا بالکل ایسے احساسات میرے تھے صبح کے چھ بجے ہونیوالے تھے ہم سب مسافر امیگریشن کیلئے لائن میں کھڑے ہوگئے تھائی امیگریشن کے حکام مسافروں کو بھگتا رہے تھے لیکن انداز سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ عجیب سے خاموشی تھی اور سب لوگ خواہ وہ بوڑھے تھے کہ جوان بچے تھے کہ خواتین آرام سے ہاتھوں میں پاسپورٹ لئے کھڑے تھے اور اپنے نمبر آنے کا انتظار کر رہے تھے کسی کو یہ جلدی نہیں تھی کہ لائن سے نکل جائے۔

میں نے بھی اپنے دور طالب علمی کی یاد تازہ کر دی کہ جو لوگ امیگریشن آفیسر کے سامنے جاتے ہیں ان سے کیسے سوال کئے جاتے ہیں تا کہ وہ میں بھی سن لوں اور ان کی طرح جواب کا رٹا لگاؤں لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا جس وقت میری باری آئی امیگریشن آفیسر نے مجھ سے سوال کیا کہ تعلیم کیلئے آئے ہوں میں نے جواب

دیا کہ نہیں تو اس نے پوچھا کہ تمھارا تو ویزہ طالب علم کا ہے میں نے اپنا تعارف کروا دیا کہ بھائی میرے میں ٹریننگ کیلئے آیا ہوں پھر مجھ سے پوچھا گیا کہ کونسے ادارے کیساتھ ہوں کارڈ دیکھنے کے بعد اس نے مجھے جانے کا کہا اور کہا کہ گیٹ نمبر چار پر اپنا بیگ اٹھالو اگر تمھارے پاس کوئی سامان ہے جس وقت میں وہاں پر پہنچ گیا بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف چل پڑا۔

دل میں سوچ رہا تھا کہ اللہ خیر کرے پہلی مرتبہ ملک سے باہر نکلا ہوں ائیرپورٹ کے باہر کی طرف جانیوالے گیٹ کی طرف آیا تو دیکھا لوگوں نے بینرز پر نام لکھے ہوئے اٹھائے تھے میں بھی خوش ہوگیا کہ چلو جس نے میرا نام اٹھایا ہوگا اس کے پاس چلا جائو نگا لیکن اپنی ایسی قسمت کہاں ۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ میں نے تو باقاعدہ اطلاع دی تھی کہ میں دو دن پہلے آرہا ہوں اور متعلقہ آرگنائزر نے کہا تھا کہ ائیرپورٹ پر لینے کیلئے ہمارا بندہ آجائیگا لیکن یہاں تک کوئی نہیں آیا اب کیا ہوگا۔ تھائی لڑکیاں ائیرپورٹ پر کھڑی کوئی لپ سٹک ٹھیک کررہی تھی اور کوئی ناخن پر نیل پالش لگانے میں مصروف تھی سب کے چہرے ایک جیسے تھے ۔ میرے جیسا بندہ جس نے خواتین کو مشرقی لباس میں دیکھا ہو وہ ائیرپورٹ پر یا تو خاتون کو سوٹ میں دیکھے یا پھر جسے ہمارے چڈی کہا جاتا ہے اس میں دیکھے تو کیا حالت ہوتی ہے یہ بتانے کا نہیں ۔ وہ لڑکیاں بھی کسی ہوٹل کی سیلز ڈیپارٹمنٹ کی تھی جو لوگوں کو ریسیو کرتی

ان سے بات کرتی اور پھر فون کرکے مسافر کو گاڑی میں بٹھا دیتی تھی وہ میرے پاس بھی آئی سوال کیا کہ ہوٹل کمرہ چاہئیے لیکن میں نے انکار کیا اور سائیڈ پر بیٹھے کرسیوں پر بیٹھ گیا کہ شائد مجھے ریسیو کرنا والا بندہ لیٹ ہو بیس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا تو ائیرپورٹ پر آوارہ گردی شروع کردی لوگوں کی بڑی تعداد جن میں یورپین شامل تھے سیر کیلیئے آرہے تھے اور ہر ایک اپنی دنیا میں مگن تھا کسی کو یہ احساس نہیں کہ کس نے کونسے کپڑے پہنے ہیں کس سٹائل کے بال ہیں بس اپنے کام سے کام رکھنا -ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو سوچ رہا تھا کہ لوگوں کے کپڑوں اور سٹائل دیکھ رہا تھا خصوصا خواتین کی کہ اللہ معاف کرے اس سے تو نہ پہننا اچھا تھا لیکن بس چل چلائو والا کام تھا-میں توبہ توبہ بھی کر رہا تھا اور لڑکیوں کو کن انکھیوں سے بھی دیکھ رہا تھا- کچھ وقت گزرنے کے بعد جب اس جگہ آیا جہاں پر لوگوں نے نام اٹھا رکھے تھے تو کسی نے میرا نام کا کارڈ نہیں اٹھایا تھا اور میں اس دن کو کوس رہا تھا کہ کیوں دو دن جلدی آگیا-پھر خیال آیا کہ موبائل میں میرے پاس تو نمبر ہے اس پر ٹرائی کرتا ہوں انہی ہوٹل کے سیلز کے شعبے کی خواتین سے ملا اپنا مسئلہ بیان کیا انہوں نے پوچھا کہ کوئی نمبر دیا ہے تو ہمیں دے دیں نمبر ملنے کے بعد اس نے اپنے موبائل سے ملا لیا اور کہا کہ تمھارے مہمان آیا ہے اور ائیرپورٹ پر خوار ہو رہا ہے اس لئے آکر اس پاکستانی کو لے جائو-وہاں سے اسے کہا گیا کہ اس پاکستانی کو کہو انتظار کرے پندرہ

-منٹ میں پہنچ رہے ہیں
اس مسئلے کی وجہ سے ٹینشن کم ہو گئی تو کرسی پر بیٹھ پر لوگوں کو تاڑنا شروع کردیا کچھ عجیب سے لوگ تھے ہر کوئی بھاگ رہا تھا لیکن ان لوگوں کی یہ بھاگ دوڑ بھی ایک منظم انداز میں تھی کوئی یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ یہ مرد ہے یا لڑکی -ایسے میں ایک عورت آئی اور مجھ سے پوچھا کہ بھارت سے تعلق ہے تو میں نے جواب دیا کہ نہیں پاکستان تو پھر ہیلو ہائے ہو گئی پتہ چلا کہ موصوفہ اپنے سات سال کی بیٹی کے ہمراہ نیوزی لینڈ جارہی تھی اس کا شوہر آگے تھا خاتون نے بتایا کہ اس نے اپنی چھٹیاں دہلی میں گزار کے آرہی ہیں اور اپنے فیملی کیساتھ ملنے کا اپنا مزہ ہے -اس وقت ایک چھوٹا سا لڑکا آیا اور میرے ساتھ ہاتھ ملانے لگا اس نے اپنا تعارف کروایا کہ یونیورسٹی کا طالب علم ہو اور رضاکار ہوں اور تمھیں لینے کیلئے آیا ہوں اس نے معافی مانگی کہ برامت مانا تمھیں انتظار کرنا پڑا لیکن ٹریفک جام تھی اسی وجہ سے یہ مسئلہ پیش ہوا اور لیٹ آیا اس نے میرا بیگ اٹھایا میں نے بھارتی خاتون اور تھائی لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے رضاکار میزبان کیساتھ روانہ ہوا میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی میرے یہ تو بتاؤ کے ڈالر کہاں سے تبدیل کرنے ہیں وہ مجھے ایک بوتھ پر لے گیا اس وقت ایک ڈالر کے 33 بھات ملتے تھے یہاں آکر اپنے روپے کی بے وقعتی کا احساس ہوا ہمارے ہاں ڈالر اس وقت 86 روپے کا تھا اب

تو اور بھی بہت آگے جارہا تھا لیکن یہ بھی ایک ایشیائی ملک تھا اور ہم بھی ایشیاء میں ۔ہم کہاں جارہے ہیں ہماری معیشت کہاں جارہی ہے اور لوگ کہاں جارہے ہیں ۔ خیر ٹیکسی میں بیٹھے ان کی ٹیکسی بھی ہمارے نوابوں کے گاڑیوں سے اچھی تھی اس رضاکار نے اپنا نام تنگ بتایا تھا جس ادارے کیساتھ میں ٹریننگ کرنے آیا تھا وہ وہاں پر انٹرن شپ کررہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ چونکہ ابھی تو دو دن ٹریننگ میں رہتے ہیں اس لئے کوئی سستا سا ہوٹل مجھے بتادو جہاں پر میں رہائش کرسکوں ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ سستے کمرے کی قیمت 33 ڈالر تک ہے اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ اللہ خیر کرے لیکن تنگ بہت تیز تھا چھوٹے سے قد کے اس لڑکے نے بنکاک کے شہر کے بارے میں بتانا شروع کردیا لیکن اس کی جتنی انگریزی تھی اس کے مقابلے میں میں اپنے آپ کو انگریزی زبان کا پی ایچ ڈی سمجھ رہا تھا لیکن بین الاقوامی زبان اشاروں کی زبان میں بتایا کہ کوشش کروں کہ مجھے دس ڈالر تک کوئی کمرہ ملے اس نے گیسٹ ہاؤسز دیکھنے شروع کردیئے اور ایک گلی میں داخل ہوگیا اور گیسٹ ہاؤس میں جاکر بات کی اس نے مجھے بلایا اور مجھے کمرہ لیکر دیا 860 پاکستانی روپے میں مجھے کمرہ مل گیا یہ بھی ہماری ذہنیت ہے کہ جب ڈالر میں ادائیگی کرتے ہیں تو پہلے موبائل اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ پاکستانی روپے میں اس کی ویلیو کتنی ہے خیر کمرہ لے لیا ایڈوانس پیمنٹ کردی اور وہ رضاکار مجھے کہنے لگا کہ تم آرام کرو میں دفتر میں جاکر انفارم کرتا ہوں پھر نکلیں گے اور میں کمرے

میں داخل ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

بنکاک کا موسم اور سٹور سے خریداری

تھائی لینڈ کے شہر بنکاک کا موسم نارمل ہے جس طرح ہمارے ہاں اپریل میں موسم ہوتا ہے ویسا ہی موسم جنوری میں ان کے ہاں تھا جس وقت میں پاکستان سے جا رہا تھا اس وقت ایک صحافی دوست نے کہا تھا کہ وہاں پر موسم گرم ہے اپنے ساتھ فضول کپڑے مت لے جائو۔ یہاں سے جاتے ہوئے میں ایک سویٹر پہن کر گیا تھا جس وقت میں بنکاک ایئرپورٹ پر اتر گیا تو گرمی لگنی شروع ہو گئی اسی باعث سویٹر اتار دیا جو کمرہ مجھے موٹیل میں ملا تھا لکڑیوں سے بنا ہوا تھا جس وقت میں داخل ہوا مجھے یوں لگا جیسے لکڑیوں کے قبرستان میں داخل ہوگیا ہوں جو کمرہ مجھے ملا اس کے ساتھ شیئرنگ باتھ اور غسل خانہ تھا یعنی میرے سمیت کوئی اور مہمان بھی اسے استعمال کر سکتا تھا ہوٹل کا مینجر جو بنیادی طور پر امریکی تھا اور وہاں سے بھاگ کر تھائی لینڈ میں ملازمت کر رہا تھا نے کہا کہ اگر آپ کو علیحدہ باتھ روم چاہیے تو اضافی پیمنٹ کرنا پڑے گی تو میں نے دل میں سوچا کہ میں نے کونسا وہاں رات گزارنی ہے سو میں نے کہہ دیا کہ مجھے شیئرنگ باتھ روم قبول ہے۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ نہالو غسل خانہ میں چلا گیا

اتنا ٹھنڈا پانی تھا کہ حیران رہ گیا جس وقت میں پشاور سے روانہ ہو رہا تھا اس وقت میں گرم پانی سے نہا کر گیا تھا جبکہ یہاں موسم تبدیل تھا اسی وجہ سے ٹھنڈے پانی سے نہانا پڑا۔ کمرے سے نکل رہا تھا کہ ایک خاتون غسل خانے کے باہر انتظار کر رہی تھی اس نے مسکرا کر ہیلو کہا اور کہا کہ وہ بھی نہانا چاہتی ہے۔ میں بھی دل میں خوش ہوا کہ چلو شیئرنگ غسل خانہ کا فائدہ تو ہوا کہ کوئی لڑکی تو مل گئی میں نے اس سے تعلق بنانے کیلئے اسے شیمپو دینا چاہا لیکن اس نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ والے کمرے میں ہے میں بھی خوش ہوگیا کہ چلو لڑکی سے دوستی تو کر سکتے ہیں۔

کمرے میں آکر سوگیا اور چار گھنٹے تک سوتا رہا میں یہاں بھی ذہنی تناؤ کا شکار تھا کہ کہیں لوڈشیڈنگ نہ ہو لیکن اس بارے میں جب میں نے ہوٹل کے ویٹر سے پوچھا کہ لوڈشیڈنگ تو وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا کیونکہ موصوف کی انگریزی مجھ سے بھی گئی گزری تھی اور جب بین الاقوامی زبان اشاروں میں سمجھایا تو پندرہ گھنٹے کی کوششوں کے بعد سر انکار میں ہلاتا ہوا مجھے ایسے نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہ مجھ جیسا بدقسمت انسان اس سے کبھی دیکھا نہ ہو حالانکہ موصوف کو پتہ نہیں تھا کہ ہم راجہ رینٹل کے ملک سے ہو کر آئے ہیں۔

چار گھنٹے کی نیند کے بعد کمرے کی دروازے پر دستک سنائی دی میں نے دروازہ

کھولا تو وہ رضاکار جس کا نام تنگ تھا کھڑا تھا اس نے کہا کہ اگر آرام کرلیا ہے تو آجاؤ میں تمھیں بنکاک میں چکر لگواتا ہوں میں نے اسے کہا کہ کاونٹر پر بیٹھ جاؤ میں آتا ہوں منہ ہاتھ دھونے کے بعد نیچے آیا تو تنگ بیٹھا تھا میں نے اسے کہا کہ میری مدد کرو گھر فون کرنا ہے اور مجھے پہلے کسی فون بوتھ لے جاؤیا کہیں سے فون کی سہولت مل سکے تنگ مجھے ایک سٹور میں لے گیا جہاں پر ساری لڑکیاں سیلز کے شعبے سے وابستہ تھی اس نے تھائی زبان میں ان سے کچھ کہا - یہ سٹور ہمارے ہاں کے یوٹیلٹی سٹورز کی طرح تھا لڑکیوں نے مخصوص یونیفارم پہنے تھے اور یہاں پر ہر چیز مل رہی تھی مجھے بھوک لگ رہی تھی سو میں نے بسکٹ اور چاکلیٹ خرید لئے ساتھ میں اس سے گزارش کی کہ مجھے گھر فون کرنا ہے فون کارڈ دیدے مجھے لڑکی نے تیس بھات کا ایک کارڈ دیا اور کہا کہ سٹور کے دائیں سائیڈ پر فون بوتھ ہے وہاں سے فون کرو میں بھی کارڈ لیکر آگیااور اپنے موٹل کے باہر لگے بوتھ سے فون کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں ملا میں نے موٹل کے مینجر سے پوچھا کہ یہ تو کام نہیں کر رہااس نے مجھ سے کارڈ لیکر ٹرائی کیا لیکن نہیں ہوا پھر میرے ساتھ کھڑے تنگ کو کچھ کہا تنگ نے مجھے کہا کہ آجاؤ واپس سٹور جاکر کارڈ واپس کرتے ہیں میں دل میں پریشان اور حیران کہ اب اس لڑکی کو میں کیسے کہوں کہ یہ واپس لو ایک تو شرم آرہی تھی اور دوسرے ہمارے ہاں تو یہ سلسلہ ہے کہ اگر کوئی چیز واپس دکاندار کو دو تو دکاندار اول تو واپس نہیں لیتا لیکن اگر واپس لیتا ہے تو

اتنی باتیں سناتا ہے کہ انسان شرم محسوس کرتا ہے میں تنگ کے ساتھ واپس سٹور روانہ ہو گیا لیکن دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ ایک تو لڑکی اور اس نے سخت زبان میں بات کہہ دی تو کیسے لگے گا لیکن جب سٹور واپس گیا اور تنگ نے اس لڑکی کو تھائی زبان میں کچھ کہہ دیا تو اس لڑکی نے مسکرا کر مجھ سے واپس کارڈ لے لیا اور مجھے ایک رسید دی جس پر نمبر لکھے ہوئے تھے جیسے ہمارے ہاں ایزی لوڈ ہوتا ہے یہ نمبر ایک سو یونٹ کا تھا اس لڑکی نے تنگ سے بات کی وہ مجھ سے نمبر لیکر موٹل کے مینیجر کے پاس گیا اور اس نے اسے دیدیا اس نے اپنے موبائل میں لوڈ کر دیا اس نے انٹرنیٹ سے کوڈ لے لیا اور مجھ سے نمبر لیکر گھر ملا دیا گھر والوں سے بات کی۔ والدہ سے بات ہوئی مجھے خود بھی والدہ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی ماں کا رشتہ بھی بہت عجیب ہوتا ہے۔ اپنی والدہ جسے میں امی کہتا ہوں نے وہ دعائیں دی کہ بیان سے باہر ہے ساتھ میں امی نے نصیحت بھی شروع کر دی کہ خیال کرنا کھانا وقت پر کھانا اور فضول لوگوں سے بیٹھنے سے بہتر ہے کہ ہوٹل میں رہا کرو۔ میری امی کو یہ ڈر تھا کہ بنکاک میں کہیں کلبوں کے چکر میں نہ پھنس جائے میں نے انہیں کہا کہ نہیں میں انہی لوگوں کے ساتھ ہے جن کیساتھ میں ٹریننگ کیلئے آیا ہو فون کرنے کے بعد اطمینان ہوا اور فون بند کر دیا۔ ہوٹل کے مینیجر جس کا نام ٹومی لی تھا نے اپنا موبائل دیکھنے کے بعد مجھے کہا کہ سو بھات میں پینتیس بھات کی رقم میری رہتی ہے اس نے مجھے اس کے سکے دیئے اور میں نے تنگ کو کہا کہ آ جاؤ اب

بنکاک کی چکر لگاتے ہیں۔

تھائی لوگوں کی اصول پسندی اور میری پاکستانی عادتیں

بنکاک کے موٹل سے تنگ کیساتھ شہر کے بازاروں کا چکر لگانے نکلا اتنا صاف شہر میں نے نہیں دیکھا تھا سڑکوں پر اتنی نئی ماڈل کی گاڑیاں چل رہی تھی اور وہ بھی ٹیکسی ہیں لکہ میں حیران رہ گیا۔ جس وقت میں ایئرپورٹ سے نکل رہا تھا اور ٹیکسی میں بیٹھا تھا میں نے شہر کا ابتدائی جائزہ لیا تھا اور اندازہ ہوگیا کہ یہ فلائی اورز کا شہر ہے ایک فلائی اور پر ریل کی گاڑی چل رہی ہیں دوسری پر گاڑیاں چل رہی ہیں گاڑیوں کی ایک دنیا تھی اور مزے کی بات کہ سب نئی گاڑیاں تھی جسے چلانے والی بھی زیادہ تر لڑکیاں ہی تھی لیکن ایک بات جو میں نے نوٹ کی کہ کوئی پیچھے سے ہارن بجا بجا کر دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کر رہا لگتا جیسے سارے روبوٹ ہیں۔دل میں اپنے ملک کا خیال آیا یہاں پر تو اللہ معاف کرے گاڑیاں وہ ٹیکسی میں استعمال ہوتی ہیں کہ بیٹھنے کے بعد پشیمانی ہوتی ہے کہ یہ کس چیز میں بیٹھ گیا ہو ہمارے ہاں ٹیکسی ڈرائیور گاڑیوں کی صفائی بھی نہیں کرتے جبکہ تھائی لینڈ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر لگتا ہے کہ کسی دلہن کی گاڑی میں بیٹھ گیا ہوں۔یعنی اتنی صفائی ہوتی ہے کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔

بنکاک میں ایک بات جو میں نے نوٹ کی کہ زیادہ تر موٹرسائیکل چل رہی ہیں

لیکن ان کے ہاں کا ڈیزائن ہمارے ہاں چلنے والے موٹر سائیکل سے بالکل مختلف ہے پہیے تو دو ہی ہیں لیکن ڈیزائن کچھ عجیب سا ہے چلانے والوں میں لڑکیاں اور لڑکے دونوں شامل ہوتے ہیں لیکن ہمارے لوگوں کی طرح جہاز سمجھ کر نہیں اڑاتے سڑک کے آخری لائن میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں ہر موٹر سائیکل سوار نے ہیلمٹ پہنی ہوتی ہیں اور مزے کی بات کہ پیچھے بیٹھنے والے بھی ہیلمٹ پہن کر سفر کرتے ہیں یعنی خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ ہوجائے تو کسی کو نقصان نہ ہو-دل میں خیال بھی آیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے اتنی قانون سے محبت اور عملدرآمد بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن پھر اپنے اوپر افسوس ہوا کہ ہماری اسی سوچ کی وجہ سے تو ہم پیچھے جارہے ہیں تھائی لینڈ ایشیائی ملک ہے لیکن وہاں پر ٹریفک کے اصولوں پر لوگوں کی عملدرآمد دیکھ کر لگتا ہے کہ ہم بہت پیچھے ہیں-

ہمارے ہاں سڑکوں کے درمیان ڈیوائڈر کیلئے انہوں نے جالیاں نہیں لگائی کہ ہم لوگ بھاگ کر ان جالیوں پر چڑھ کر دوسری طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے سڑکوں کے مابین چھوٹے سے ڈیوائیڈر ہوتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کوئی بھاگ کر ان ڈیوائیڈر پر چڑھ کر سڑک کراس کرنے کی کوشش کرے سڑک کراس کرنے کیلئے مختلف جگہوں پر انڈر گراؤنڈ پل بنے ہوئے ہیں جہاں پر بجلی سے چلنے والی سیڑھیاں ہیں جس کے اندر سے شہری سڑک کراس کرتے ہیں -میں جس موٹل میں رہائش پذیر تھا اس کے سامنے انڈر گراؤنڈ میں ریلوے سٹیشن بھی تھا اور سڑک کراس

کرنے کیلیئے بھی استعمال ہوتا تھا میں جس وقت پہلی مرتبہ سڑک کراس کرنے اندر جانے لگا تو مجھ سے خوشبوئوں کی بہار جارہی تھی یعنی پانچ افراد جن میں تین خواتین تھی جبکہ دو مرد سیاح تھے وہ مجھ سے آگے جارہے تھے اور ان لوگوں نے سپرے کا وہ استعمال کیا تھا کہ میں ان کے پیچھے جارہا تھا اور اپنی سونگھنے کی حس استعمال کررہا تھا کہ کس نے کونسا پرفیوم استعمال کیا ہے ۔ لیکن وہ اپنی دنیا میں مگن تھے اور میری خواہش تھی کہ ان سے نام پوچھوں پرفیوم کے لیکن پھر خیال آیا کہ یہ کیا سوچیں گے لیکن پھر میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ جو سوچتے ہیں میرا کیا ہے کم از کم پرفیوم کا نام تو سیکھ لوں۔
میں اسی کشمکش میں تھا کہ سامنے سے سکول کی بچوں بچیوں کی ایک یلغار آگئی اور وہ بھی انڈر گراونڈ راستے میں جو ریلوے سٹیشن پر تھے اوران کو دیکھنے کے چکر میں مجھ سے وہ سیاح گم ہوگئے اور یوں دوبارہ اپنی ٹریک پر آگیا میں نے دیکھا کہ انڈر گرائونڈ راستے میں ایک پولیس اہلکار کھڑا ہے اگر کسی کے پاس بیگ ہے تو وہ اسے چیک کرتا ہے اور پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے آگے جانے کی اجازت دیتا ہے جبکہ جو عام لوگ جن کے ہاتھ میں بیگ نہ ہوں ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ اتنے اچھے پولیس اہلکار وہاں پر ہوتے ہیں کم از کم تمیز سے بات تو کرتے ہیں ۔
ہمارے ہاں تو جو کوئی پولیس کی وردی پہن لیتا ہے وہ زمین پر خدا بنتا ہے اگر کوئی عام شہری ان سے گزرے تو روک لیتے ہیں اور اگر بد قسمتی سے وہ غیر ملکی ہوں تو پھر ان کیلیئے تو وہ

مرغا ہوتا ہے اور مرغے سے بات کرنے اور انہیں پھنسانے کے ہمارے پولیس ماہر ہے
جبکہ ان کے مقابلے میں بنکاک میں پولیس یہ نہیں پوچھتی کہ کہاں سے آئے ہو کیوں۔
۔آئے ہوں پاسپورٹ ہے کہ نہیں کتنے پیسے لیکر پھر رہے ہو

بنکاک کے ٹریفک میں ایک بہت بڑی بات جو میں نے محسوس کی کہ جس وقت کوئی مسافر سڑک کراس کرنے کیلئے مخصوص جگہ پر پاؤں رکھتا ہے تو گاڑیاں خواہ کتنی ہی تیز اور زیادہ کیوں نہ ہو ایک دم رک جاتی ہیں اور اس وقت تک گاڑیاں رکی ہوتی ہیں جب تک مسافر سڑک کراس نہ کرے جبکہ ہمارے ہاں تو سسٹم ہی الٹا ہے سڑک گاڑیوں والے کیلئے بنی ہیں اور اگر کوئی ہماری طرح عام مسافر سڑک کراس کرتا ہے تو یہ اس کی ۔ اپنی رسک پر ہے کہ وہ کتنی جلدی کوشش کرے کیونکہ گاڑیاں تو کسی کیلئے نہیں رکتی

ہمارے ہاں فٹ پاتھوں پر دکانداری کا سلسلہ بنکاک میں بھی ہے لیکن مزہ تو یہ ہے کہ کہیں پر آگ گندگی کے ڈھیر نہیں دیکھیں گے ہمارے ہاں تو یہ ایک رواج ہے کہ فٹ پاتھ پر جس چیز کی دکان ہے اس دکان کے سامنے گندگی کے ڈھیر پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ہاں پلاسٹک شاپر میں کھانے پینے کی اشیاء ملتی ہیں لیکن پھر وہ شاپر ہر ایک نے ڈسٹ بن میں پھینک دینا ہے میرے لئے تو ابتداء میں بہت مشکل تھا کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ کوئی چیز کھا لو اور پھر شاپر ہاتھ

میں لئے پھر و کہ گندگی کو ڈالنے والا ڈسٹ بن کہیں ملے اور اس میں ہم وہ ڈال دے
سب سے حیران کن بات جو دیکھنے کو اچھی بھی لگی کہ ہر فٹ پاتھ پر سامان فروخت
کرنے والے نے ایک شاپر رکھا ہے اور لوگ اس میں گندگی ڈال دیتے ہیں ہمارے ہاں
نہیں کہ کاروبار اپنا کرو اور گندگی کمیٹی والوں کو چھوڑ دو کہ وہ ہمارے لئے کام کرتے
ہیں -

بنکاک کے فٹ پاتھوں پر کھانے پینے کی اشیاء کی فروخت سے لیکر فروٹ تک فروخت
ہوتا ہے اور گوشت کی دکانوں سے لیکر مختلف اقسام کے کھانے کی اشیاء پڑی ہوتی ہیں
ساتھ ساتھ میں بیٹھ کر دکاندار جو زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں اشیاء فروخت کرتے دکھائی
دیتی ہیں لیکن کبھی ہمارے ہاں والا حساب نہیں کہ آجاؤ یہاں سے کم قیمت پر ملے گا یا
پھر دوسرے کے سامان کو غلط کہہ کر دکانداری خراب کرنا وہاں یہ نہیں -

صحافت ` چوتھا ستون اور تجارت

صحافی ریاست کا چوتھا اہم ستون ہے اور اس کے بغیر ریاست چل نہیں سکتی یہ بھاشن گذشتہ بارہ سال سے میں صحافت کرتے ہوئے سن رہا ہوں لیکن آج کل اسکا تکرار کچھ زیادہ ہی کیا جارہا ہے کسی زمانے میں صرف اپوزیشن رہنمائوں سے اس طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں لیکن جب سے الیکٹرانک میڈیا نے شہریوں کو ان کے مسائل کسی حد تک دکھانے شروع کردیئے ہیں اور اب عام شہری کو ان کے حقوق بھی کس حد تک بتائے جارہے ہیں اس صورتحال نے حکمرانوں کو بھی میڈیا کی جانب متوجہ کردیا ہے اور اب حکمران طبقے کو صحافی معاشرے کا اہم ستون نظر آنے لگے ہیں جس کا اظہار اب وہ مختلف فورمز پر کرنے لگے ہیں اور جب اس طرح کی بات بھرے محفل میں حکمران کرنے لگے تو کوریج کیلئے آنیوالے صحافی اپنے آپ کو کچھ الگ ہی چیز سمجھنے لگتے ہیں اور ان میں اکثر کی گردنیں اکڑ جاتی ہیں۔ محفلوں میں سب سے آگے بیٹھ کر رپورٹنگ کرنے والے ان صحافیوں کی حقیقت کیا ہے اس کا اندازہ عام لوگوں کو تو نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ بہت سارے صحافیوں کی مالی حالت اتنی ہوتی ہے کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ تک ادا نہیں کرسکتے۔

نائن الیون کے واقعے نے جہاں پاکستان کو کئی مسائل سے دوچار کردیا وہاں پر

صحافی پر دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے لگے ہیں 2001 سے 2011 ء تک 23 کے قریب صحافی مختلف دھماکوں ، خودکش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں خیبر پختونخوا اور فاٹا کے علاقے میں اپنی جانب سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ۔ میں خود بحثیت صحافی دو مرتبہ ٹارگٹ فائرنگ کی زد میں آکر بچا ایک مرتبہ پشاور میں ایک کے بعد دوسرے ہونیوالے دھماکے میں اللہ تعالیٰ نے بچایا ایک مرتبہ خودکش حملے اور ایک مرتبہ ہنگو میں کوریج کے دوران دوسرے فرقے کے لوگوں نے پکڑ لیا لیکن اللہ تعالیٰ نے جان بچالی ان پانچ واقعات کے بعد بھی ہر روز ایک نیا تجربہ مجھے سیکھنے کو ملتا ہے ۔ کئی مرتبہ رپورٹنگ کے دوران ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ بھی سیکورٹی ایجنسیوں کی طرف سے جاری رہا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک کسی کے ڈرانے دھمکانے میں نہیں آیا یہ الگ بات ہے کہ میرے جیب میں پیسے نہیں ہوتے لیکن میرے پاس بحثیت صحافی ایک اکڑ ہے اور یہ اکڑ قلم کی وجہ سے ہے جو میں کوشش کرنے کے باوجود ختم نہیں کرسکا ہوں صحافیوں کے مختلف واقعات میں ہلاک ہونے کے واقعات میں اضافے کے ساتھ ساتھ انہیں ڈرانے دھمکانے اور تشدد کے واقعات میں اضافے کے باوجود صحافیوں کی اکڑ ختم نہیں ہوتی اور وہ اپنے صحافتی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں ۔ غیر سماجی ادارے جو اس سے قبل عام لوگوں خواتین اور بچوں کے حقوق اور ترقیاتی کاموں کیلئے ڈونرز سے فنڈز لیتے تھے اب انہوں نے اکڑ کے مارے ان صحافیوں کو ٹارگٹ

کرلیا ہے اور اب انہی کے نام پر سروے کرنے کے بعد پروپوزل بنائے جاتے ہیں اور پھر استعداد کار بہتر بنانے کے نام پر صحافیوں کی تربیت کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے یہ الگ بات کہ صحافیوں کی تربیت بہت کم ہورہی ہیں لیکن ان غیر سماجی اداروں کے فنڈز میں اضافہ ہورہا ہے اور کوئی ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں کیونکہ " ریاست کے اہم چوتھے ستون کو بھی کرپٹ کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں -اور اس عمل میں ہمارے چند صحافی بھی ان این جی اوز کے ساتھی بنے ہوئے ہیں -

گذشتہ روز اسلام آباد میں کام کرنے والی ایک این جی او کے نمائندے نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں نے سروے کرنا ہے آپ سے فون پر سوالات کرنے ہیں میں چونکہ اسے جانتا تھا اس لئے اس نے مختلف سوالات کئے یہ عمل تقریبا ایک گھنٹے تک جاری رہا اور فون کے ذریعے اس نے سروے فارم مجھ سے بھروا لیا جب اس کا کام ہوگیا تو میں نے پوچھ لیا کہ یہ سروے جو تم کررہے ہیں کس لیول کا ہے اور اس میں کتنے صحافیوں کے انٹرویوز لئے جائینگے اس نے جواب دیا کہ یہ پاکستان سطح پر ہے اور بیس صحافیوں سے سوالات کرنے ہیں جس میں چار مختلف صوبوں سے ہیں جبکہ چار اسلام آباد کے صحافیوں کے انٹرویوز کرنے ہیں اور وہ بھی فون پر - میں نے سوال کیا کہ کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے کہ فون پر تم لوگ سروے کررہے ہیں اور پھر اس پر تم پروپوزل بنا کر

بھیج دوگے تو متعلقہ شخص نے جواب دیا کہ مجھے پتہ ہے کہ سروے اس طرح نہیں ہوتے لیکن چونکہ این جی او کی چیف ایگزیکٹو نے مجھے آرڈر دیا ہے اس لئے میں یہ سروے کر رہا ہوں میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں ۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں اس طرح کے واقعات مسلسل رونما ہو رہے ہیں اور مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ادارے صحافیوں کی ٹریننگ / سیکورٹی کے نام پر کروڑوں روپے لیکر ڈکار چکے ہیں لیکن چونکہ ہمارے اپنے ہی کچھ صحافی ان کے ساتھ ملکر کام کر رہے ہیں اور یہ صحافی چونکہ اچھی جگہوں پر ہیں اس لئے ہمارے جیسے ٹٹ پونجئے قسم کے صحافی ان سے سوال پوچھنے کی ہمت نہیں کرتے کہ ٹریننگ کس مد میں کی گئی کتنا فنڈز صحافیوں کے نام پر لایا گیا اور کتنے صحافیوں کے استعداد کار کو بہتر کیا گیا اور کیا جن صحافیوں نے تربیت لی ان میں سفارشی لوگ کتنے تھے اور کونسے ان میں جینوئن صحافی تھے ۔دو ماہ قبل ایک امریکی ادارے کی جانب سے کمپیوٹر / ویب / سیکورٹی کے نام پر صحافیوں کیلئے ایک ٹریننگ کروائی گئی مجھے پتہ نہیں تھا لیکن میں ایک غلطی سے وہاں پر اس ٹریننگ میں چلا گیا وہاں پر جا کر پتہ چلا کہ جو لوگ اس میں ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں ان میں بیس افراد میں سے دس افراد کو کمپیوٹر کو آن آف کرنا بھی نہیں آتا تھا لیکن چونکہ یہ لوگ کچھ مخصوص صحافیوں کے دوست / تعلق دار تھے اسی بناء پر انہیں ٹریننگ میں موقع دیا گیا تھا اس میں غلطی نہ صرف این

جی او کی تھی بلکہ ہمارے اپنے صحافی برادری کی بھی تھی جنھوں نے اپنے پسند ناپسند کے لوگ وہاں بھجوائے تھے ۔ گذشتہ دنوں کورٹس کی رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کیلئے ایک ٹریننگ کا اہتمام کیا گیا اور اس میں ایسی صحافی بھی دیکھنے کو ملے جنھیں میں نے کبھی غلطی سے بھی کورٹس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن وہ بھی تربیت مکمل کرنے کا سرٹیفیکیٹ لے گئے ۔

سب سے مزے کی بات جو مختلف صحافیوں کی استعداد کار کو بڑھانے کیلئے تربیتی ورکشاپ / سیمینار میں دیکھنے کو مل رہی ہیں سیکورٹی کی ٹریننگ دینے والے بھی مخصوص لوگ ہیں تحقیقاتی رپورٹنگ کرنے والے بھی مخصوص لوگ ہیں اور آزادانہ غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کی بھاشن دینے والے بھی این جی اوز کے مخصوص لوگ ہیں جو صحافیوں کی ایک حد تک استعداد کار کو تو بڑھا رہے ہیں لیکن اپنی مالی حالت بھی انہی فنڈز کے ذریعے بہت حد تک بہتر بنا گئے ہیں اور بنا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ فائدہ اس صورتحال سے حکومت اٹھا رہی ہیں جن کے مختلف اداروں کے ملازمین صحافیوں کی تربیتی مہم میں تربیت لیتے ہیں حالانکہ نہ تو انہیں صحافت کا کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی انہیں صحافت سے کوئی دور کا تعلق ہے لیکن چونکہ این جی اوز سرکار کو خوش کرنا چاہتے ہیں ہیں اس لئے صحافیوں کے ناموں پر سرکاری لوگ تربیت لے رہیں اور صحافی خاموش ہیں کیونکہ چند لوگوں کو فائدہ ہے لیکن پوری صحافی برادری بدنام ہو رہی ہیں ۔

بنکاک کی سیر `چھڈی اور پہلا ناشتہ

بنکاک شہر کی رات کا اپنا ہی مزہ ہے چونکہ پہلے دن میں نے نزدیکی جگہوں کی سیر کی تھی اس لئے رات کو جلدی آ کر بازار میں کھانے پینے کے چکر میں مصروف عمل ہوگیا۔جس وقت میں تھائی لینڈ آ رہا تھا اس وقت یاروں دوستوں نے ڈرایا ہوا تھا کہ خیال کرنا کوئی غلط چیز مت کھانا کیونکہ وہاں پر کھانے میں بہت کچھ مل جاتا ہے سو رات کو ایک سٹور میں جا کر اپنے لئے چاکلیٹ والے بسٹ لئے تھے اور اسے رات کا کھانا سمجھ کر کھا لیا تھا۔ چاکلیٹ کی یہی ایک خوبی ہے جس وقت بھوک لگے اسے کھالیا جائے تو مٹھاس کی وجہ سے بھوک نہیں لگتی پھر آ کر گیسٹ ہاؤس میں سو گیا۔

صبح اٹھ کر نہانے کیلیۓ گیا تو شیمپو تو ساتھ لے گیا تھا لیکن غسل خانے میں جا کر خیال آیا کہ یہ تو میرا گھر نہیں یہاں پر تو صابن بھی نہیں اب کیا ہوگا۔ ذہن پر بہت زیادہ زور دیا لیکن کچھ طریقہ سمجھ نہیں آیا پھر میں نے دیسی طریقہ اپنایااور شیمپو کی جھاگ کو صابن کی جھاگ سمجھ کر استعمال کیا۔اور اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ " شیروں کے منہ کس نے صابن سے دھوئے ہیں " سو اپنے آپ کو شیر سمجھ کر ہم نے بھی صابن کو استعمال نہیں کیا۔ کسی زمانے میں

پشاور میں ہشتنگری کے لنڈے سے میں نے اپنے لئے چھڈی خریدی تھی جو کہ بعد میں شرم کے مارے پہن نہیں سکا۔ایک دفعہ پہن کر موٹر سائیکل پر نکل گیا تھا لیکن دوستوں نے میری وہ کلاس لی جس کے بعد وہ چھڈی گھر میں چھوڑ دی تھی ایک دفعہ رمضان کے آخری عشرے میں ہنگو کے علاقے میں خودکش حملہ ہوا تھا میں جینز میں چھڈی پہن کر دفتر گیا تھا دھماکے کی کوریج کیلئے مجھے جانا پڑا ہنگو میں کوریج کے بعد دوسرے چینلز کے لوگ تو روزہ ڈکار گئے لیکن مجھ اور میری ٹیم سے یہ نہیں ہوسکا سو میں نے اس چھڈی میں گرمی کا توڑ کرنے کیلئے وہاں نالے میں نہانا شروع کردیا میرے دوسرے ٹی وی چینل کے صحافی دوستوں نے اس چھڈی پر مجھے تنقید کا نشانہ بنایا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے روزہ میں ڈکار گیا ہوں اس کے بعد چھڈی میں گھر میں چھوڑ گیا۔ میں تھائی لینڈ جاتے ہوئے یہی چھڈی اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ وہاں پر کون ہوگا جو مجھے دیکھے گا اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو کون مجھے پہچانتا ہے سو نہانے کے دوران یہی چھڈی استعمال کی۔ ناشتے کیلئے بھی اسی چھڈی میں نیچے گیسٹ ہائوس کے ریسپشن پر آگیا وہاں پر چینی ریسپشنسٹ کومی لی نے ناشتے کا بندوبست کردیا میں نے جلدی میں اسے ناشتے میں کافی لانے کا کہہ دیا وہ ظالم بریڈ اور کافی لے آیا میں نے کافی کو چکھ لیا اتنی کڑوی کافی تھی مجھے لگا جیسے میں نے کھانسی کی دوائی کھالی ہو۔بریڈ جو کہ ناشتے کے ساتھ مجھے دیا گیا وہ شوگر کے مریضوں کیلئے تھا یعنی ذائقہ نہیں تھا مجھے اپنی آمی کی یاد آگئی وہ بھی شوگر کی

مریضہ ہے اور وہ کس طرح یہ بریڈ کھاتی تھی اور بغیر ذائقے کے بریڈ کھانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے ۔ناشتہ مشکل سے کرنے نے بعد انٹرنیٹ استعمال کیا اور گھر والوں دوستوں کو ای میل کیا دس بجے کے قریب گیسٹ ہاؤس سے نکلا ۔ گیسٹ ہاؤس کے مین روڈ پر ایشیا ٹائمز نامی اخبار کا دفتر دیکھا وہاں کا چکر لگایا تو پتہ چلا یہ چینی زبان میں شائع ہوتا ہے کسی کو انگریزی کی سمجھ نہیں آتی تھی وہاں پر ایک بوڑھا ہیلپر تھا اس نے بتایا کہ اس وقت دفتر میں کوئی نہیں ہوتا آپ شام کو چکر لگائیں اس نے مجھ سے پوچھا کہ مسلمان ہو میں نے اثبات میں جواب دیا اس نے ہاتھ ہلایا اور کہا کہ میں بھی مسلم ہوں پھر اس کیساتھ گپ شپ ہوئی اس سے سوال کیا کہ سڑک کراس کرنا ہے کیا کروں اس نے مجھے بتایا کہ انڈر گراؤنڈ آگے ہے وہاں سے سڑک کراس سکتے ہو اور پھر میں آگے چل پڑا ۔

انڈر گراؤنڈ ٹرمینل میں داخل ہوا تو ایسا لگا کہ دوسری دنیا میں آگیا ہوں بجلی سے چلنے والی سیڑھیوں اور صفائی نے حیران کر دیا ہمارے ہاں جو انڈر گراؤنڈ ہیں وہاں پر گندگی کے ڈھیر اور پانی کھڑا ہوتا ہے لیکن بنکاک میں انڈر گراؤنڈ تو جیسے خوشبوؤں کی دکانیں ہیں کیونکہ جو بھی لڑکی گزرتی اس نے اتنی خوشبو لگائی ہوتی کہ پورا انڈر گراؤنڈ ہی خوشبوؤں کی دکان بن گیا تھا آگے انڈر گراؤنڈ میں سٹیشن بھی تھا یہ میٹرو بس تھی جس میں لوگ اندر

جانے کیلئے پیسے ڈالتے انہیں ٹکٹ ملتا اور آگے جا کر ٹرین کا انتظار کرتے اس انڈر گراؤنڈ کے ذریعے سڑک کراس کیا تو ایک گلی میں خود کو پایا جہاں پر فٹ پاتھوں پر شرٹس ۔ بیلٹس سے لیکر خواتین کا سامان پڑا ہوا تھا میں بھی ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے وہاں آگے چلا گیا آگے چلا تو پتہ چلا کہ ہیئر ڈریسر کی دکان پر خواتین بال ٹھیک کر رہی تھی بہت افسوس ہوا کہ میرے بال نہیں تھے یعنی جس میں وقت میں یہاں سے جا رہا تھا تو میں نے مشین کے ذریعے بال انتہائی چھوٹے کروا لئے تھے جس پر افسوس ہو رہا تھا کہ چلو اگر بال ہوتے تو ان لڑکیوں سے بال کٹواتا پھر یہاں آکر اپنے دوستوں پر رعب جماتا کہ میرے بال لڑکیوں نے ٹھیک کئے ہیں ۔

اسی بازار میں کھانے پینے کی اشیاء ہتھ ریڑھیوں پر پڑی تھی گوشت کے عجیب عجیب سے ڈیزائن بنائے گئے تھے ایک ہتھ ریڑھی والی سے گوشت کے بارے میں پتہ کیا تو اس نے بتایا کہ یہ " سور" کا گوشت ہے جسے یہاں کے لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں میں جلدی سے اس گلی سے واپس آیا سڑک کراس کرنے کیلئے زیبرا کراسنگ پر پاؤں رکھا تو چلنے والی تمام گاڑیاں رک گئی پھر میں نے جلدی سے سڑک کراس کرلیا یہ ایک انوکھا تجربہ تھا یعنی جیسے ہی کسی مسافر نے زیبرا کراسنگ پر پاؤں رکھ تمام گاڑیاں رک گئی اور جب تک مسافر زیبرا کراسنگ پر ہوں خواہ کتنے ہی مسافر کیوں نہ ہوں اس وقت تک کوئی گاڑی نہیں جاتی جبکہ

ہمارے ہاں تو بہادر شخص وہ ہے جو اپنے آپ کو گاڑیوں کے ٹکر سے بچائے ورنہ کونسا زیبرا کراسنگ اور کہاں کے مسافروں کے حقوق ۔ہمارے ہاں تو صرف گاڑیوں والوں کے حقوق ہیں غریب اور پیدل لوگوں کے کوئی حقوق نہیں ۔
بنکاک کے لوگ بھی عجیب سے ہیں انہیں دیکھ کر اپنے وطن کی یاد آئی ہمیں تو سیکورٹی ناکوں نے تباہ حال کردیا ہے اول تو جہاں جہاں پر سیکورٹی ناکے ہیں وہاں پر عام آدمی کا داخلہ بند ہے اور اگر کوئی جانا چاہتا ہے تو سیکورٹی ناکوں پر کھڑے پولیس اہلکار اور اب سیکورٹی فورسز کے جیب گرم کئے بغیر جانا مشکل ہوتا ہے اور پھر ان کا رویہ بھی لوگوں کیساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے یہ سیکورٹی فورسز اور پولیس والے ہمیں تنخواہ دیتے ہیں حالانکہ یہی لوگ ہمارے ٹیکسوں سے پلتے ہیں اور ہماری ہی ٹیکسوں سے تنخواہیں لینے والے ہم پر غراتے ہیں اور ہم سے رشوت بھی لیتے ہیں ۔اگر کسی کو اس صورتحال کا اندازہ کرنا ہو تو پشاور صدر کے سی ایم ایچ ہسپتال یا پھر سٹیٹ لائف بلڈنگ پر کھڑے پولیس اور سیکورٹی فورسز کے اہلکاروں کی بدتمیزی سے اندازہ خود بھی کر سکتے ہیں۔چار کلومیٹر کا سفر ہم نے بنکاک کے مختلف سڑکوں پر کرلیا لیکن کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جارہے ہوں کاغذات مکمل ہیں کہ نہیں اپنے آپ پر اور اپنے ملک کے نظام پر بہت افسوس ہوا ۔

پیدل چلنے کی وجہ سے بہت بھوک لگی ایک گلی میں داخل ہوا تو وہاں پر مسلم فوڈز لکھا ہوا نظر آیا ایک عورت نے سکارف پہنا تھا میں نے اس سے مسلم فوڈز کا پوچھا اس نے کہا کہ ہاں ہمارے پاس چاول انڈہ مچھلی موجود ہیں ۔پہلی مرتبہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چاول انڈہ اور سلاد مکس کرکے کھا لیا یہ لوگ نمک بھی نہیں ڈالتے لیکن چونکہ بھوک بہت زیادہ تھی اس لئے ابتداء میں تو پتہ نہیں چلا پھر بعد میں خیال آیا اور اتنا نمک میں نے ڈالا کہ اسی نمک کے زور پر میں نے وہ کھانا کھا لیا ۔ویسے ان کے نمک استعمال نہ کرنے کی وجہ تو سمجھ نہیں آئی لیکن اتنا سمجھ گیا کہ بنکاک کے لوگ کیوں نمکین نہیں ہوتے ان کے چہروں سے لگتا ہے کہ ان کی خمیر میں نمک استعمال ہیں نہیں کی گئی اسی وجہ سے ہمیں اچھے بھی نہیں لگے -- ہاہا

گھر کی روٹی کی یاد آئی کیا مان ہوتے ہیں دیار غیر میں گھر والوں کی روٹی کی بہت زیادہ یاد آتی ہے وہاں پر فٹ پاتھ پر بیس بھات کا پپیتا لیا وہاں پر چونکہ پپیتا پیدا ہوتا ہے اس لئے اس کی قیمت کم ہے جبکہ آم وہاں پر نہیں ہوتے اس لئے آم خاص لوگ کھا سکتے ہیں خاتون سے آم کی قیمت کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک آم ایک سو بیس روپے کا ہے میں نے اسے جواب دیا کہ ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاں آم ہیں اور کئی قسموں کے ہیں ایک سو بیس روپے میں تو ایک کلو آم آتے ہیں ۔اس عورت نے خوش دلی سے جواب دیا کہ تم یہاں آم اپنے

ملک سے لاؤ یہاں کاروبار شروع کرو۔ ویسے اس کی تجویز تو اچھی تھی لیکن جب غور کیا تو پتہ چلا کہ ایک صحافی تجارت نہیں کر سکتا نہ تو ہمارے پاس پیسے ہیں اور نہ ہی تجارت کیلیے تیزی۔ ہم ٹھہرے ایک جمع ایک والے لوگ۔ سو اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے ہوٹل کی راہ لی۔

سچ کے علمبردار اور ہمارا آدھا سچ

سچ اور حقیقت جاننا عوام کا حق ہے اور کوئی بھی ادارہ یہ حق عوام سے نہیں چھین سکتا اظہار رائے کی آزادی ہر شخص کو حاصل ہے یہ ایک روایتی جملے ہیں جو ہر جگہ سننے کو مل رہے ہیں لیکن کیا اس سچ سے عوام باخبر ہیں کہ انہیں کتنا سچ بتایا اور دکھایا جارہا ہے یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ہمارے پاس سچ کی علمبرداری کرنے والے صحافی بھی بہت ہیں اور سچ کا جھنڈا اپنے ساتھ لگا کر دکانداری کرنے والے اخبارات بھی بہت ہیں جو اتنا ہی سچ عوام کو بتاتے / دکھاتے اور سناتے ہیں جتنے میں ان کا کام چلتا ہو یعنی جتنے میں ان کا مفاد ہو یا پھر جتنے سچ کا انہیں آرڈر دیا جاتا ہے احکامات جاری کرنے والے مختلف لوگ اور ادارے ہیں جن سے اشتہارات / تبادلوں اور کمیشنوں کا مفاد وابستہ ہوتا ہے جتنا بھی بڑا اخبار / ٹی وی چینل یا ریڈیو ہو اس کی سچائی کا اندازہ ان میں چھپنے / آن ایئر ہونیوالے اشتہارات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کتنا سچ بولتے / لکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں اخبارات ہی عوام کو معلومات کی فراہمی کا واحد ذریعہ ہوتے تھے اور اس کے ذریعے نہ صرف عوامی مسائل سامنے آتے بلکہ عوام کو غلطی سے کبھی کبھار یہ بھی پتہ چلتا کہ ان کے نمائندے نے کتنا مال کمالیا یا ان کی

کارکردگی کیا ہیں عوام کسی حد تک اس سے مطمئن تھے لیکن برا ہو مارکیٹنگ کا -اخبار کا مالک صحافی ہو یا تاجر مارکیٹنگ نے دونوں کی سوچ یکساں کردی اسے عوام کی کوئی فکر نہیں بلکہ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عوام کے کیا مسائل ہیں بلکہ اسے اس بات کا مسئلہ ہوتا ہے کہ اخبار کے پرنٹ اور بیک پیج پر کتنے اشتہارات آئے ہیں اور اس کے اخبار کی خالی جگہ کتنے میں فروخت ہوئی ملک اور قوم جائے بھاڑ میں -ان کے مسائل کس نے حل کئے ہیں اخبار کے مالک کو صرف اپنے مسائل سے دلچسپی ہوتی ہے کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ عوام کو سچ کا گلہ گھونٹ کر سچ بتایا جائے جس کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کے اخبارات میں پیج 2 پر عوامی مسائل کم ہو گئے بلکہ اب تو سفارشی خبریں لگنے لگی ہیں ہم نے ایسے مالکان بھی دیکھ لئے ہیں جو کہنے کو تو صحافی ہے لیکن ان کی سوچ بنیئے بھی بدتر ہیں اور زیادہ تر ایسے مالکان ہیں جس کا اندازہ ان کے گھروں اور ان کے بڑے بڑے املاک سے کیا جاسکتا ہے - گرمیاں لندن میں گزارنے والے یا پھر جون جولائی میں ملازمین کی تنخواہوں سے غیر ممالک کے دور کرنے والے مالکان کی صحافت سے دلچسپی اتنی ہی ہے کہ "ابا نے ان کیلئے روزگار کیلئے اخبار چھوڑا" جس کے ذریعے ان کی کمائی کا سلسلہ جاری ہے اور صرف چند اخبارات نہیں بلکہ 85 فیصد اخبارات اسی طرح کے ہیں جہاں پر سچ بھی ایک حد تک بولا جاتا ہے سرکار انہیں اپنے مد /مقاصد میں استعمال کرنے کیلئے کروڑوں کے اشتہارات دیتی ہیں اور یہ انہیں

اشتہارات کی رقم دیکھ کر اتنا ہی سچ بولتے ہیں اور سب سے بڑا سچ بھی یہی ہے کہ اس کاروباری عمل میں چند صحافی مالکان کے چمچے بن کر نہ صرف صحافیوں کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ ملک و قوم کا بیڑا بھی آدھا سچ بیان کرکے تباہ کیا جا رہا ہے۔

پرویز مشرف نے اپنے دور حکومت میں جتنے بھی کام کئے میں اس کے حوالے کچھ نہیں کہہ رہا لیکن ایک اچھا کام اس نے پرائیویٹ چینلز کو موقع دیکھ کر کیا اور یہی اس کا سب سے بڑا کریڈٹ بھی ہے پتہ نہیں اس میں پرویز مشرف کی کتنی مرضی شامل تھی لیکن یہ سچ اور حقیقت ہے کہ اس میڈیا نے اخبارات کا توڑ کر دیا جو کہ آدھا سچ اپنے مطلب کا بیان کر رہے تھے۔ مجھے پرویز مشرف کے " ٹیک اوور" کی رات بھی یاد ہے اس وقت میں ایک مقامی اخبار سے وابستہ تھا آدھی رات کو چند وردی والے آئے ان میں سینئر جو کہ کپتان تھا نے اخبار کے نیوز ایڈیٹر کی کرسی سنبھالی اور اخبار جو کہ چھپنے کیلئے جانے والا تھا کو روک لیا اور پھر بارہ بجے چھپنے والے اخبار رات کو تین بجے منظوری ملنے کے بعد چھپنے کیلئے دے دیا گیا اور پھر جیسے قلم کی مزدوری کرنے والوں کی چھٹی ہو گئی کہنے کو تو قلم کی دھار تلوار سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ہمیں اس رات اس سچ کا پتہ چل گیا کہ قلم چلانے والے کی اوقات اتنی ہی ہوتی ہے اور یہ ایک کڑوا سچ ہے خبر بات ٹی وی چینل کی ہو رہی تھی الیکٹرانک میڈیا نے آغاز میں

اچھا کام کیا مقابلے کی فضاء میں سچ بھی بولا گیا لیکن چونکہ ٹی وی چینل کے مالکان بھی تاجر ہیں سو انہوں نے اپنا وقت بیچنا شروع کردیا ۔ چند میراثی اینکر بن کر صحافت کرنے لگے اور حال یہ ہوا کہ اب ٹی وی چینل بھی اتنا ہی سچ بولتے ہیں جتنے میں ان کا اپنا مفاد ہو کبھی کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے بارے میں سچ آپ نے چینلز پر نہیں دیکھا ہوگا خواہ وہ شیمپو کے اشتہار ہو یا موبائل کمپنیوں کے عوام کیساتھ زیادتیاں جو ٹیکسوں کی آڑ میں لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور یہی رقم اشتہارات میں دیکر عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ چونکہ یہ اشتہارات / پیسے دینے والی کمپنیاں ہیں اور سیکنڈوں کے حساب سے ادائیگی کرتی ہے اور اب الیکٹرانک میڈیا نے بھی آدھا سچ بولنا شروع کردیا ۔

گذشتہ تقریبا چار سالوں سے ایف ایم ریڈیو چینلز کا دور دورہ ہوگیا ہے امریکی امداد سے زیادہ تر چلنے والے ریڈیو چینلز نے آج کل قبائل کو اپنا نشانہ بنایا ہوا ہے اورانہیں معلومات کی فراہمی /سچ اور انہیں اظہار رائے کا حق دینے کیلئے لگائے جارہے ہیں یہ ایک اچھا اقدام ہے کیونکہ جہاں ٹی وی /اخبارات کی رسائی نہیں وہاں پر ریڈیو کی لہروں کے ذریعے عوام کو سچ بتایا جارہا ہے لیکن یہ سچ بھی کتنا "کنٹرولڈ" سچ ہے اور ان لوگوں کو اظہار رائے کی کتنی آزادی ہے اس کا اندازہ شائد کسی کو نہیں ۔ ہمارے ایک وزیر جو کسی

زمانے میں اپنی پارٹی کے پریس ریلیزیں لیکر اخبارات کے دفتروں میں حاضریاں لگوایا کرتے تھے اب اب چونکہ ان کی اپنی حکومت ہے اللہ تعالی انہیں اور عزت دے ہم تو ان کیلئے دعاگو ہے کیونکہ اظہار رائے کی آزادی کیلئے وہ بیانات بہت دیتے ہیں لیکن یہ انہی کے دور حکومت میں ایک قبائلی صحافی نے جو کہ سرکار کی مدد سے چلنے والے ریڈیو میں ملازم تھا نے سچ بولا یہ سچ اتنا ہی تھا کہ قبائلی عوام نے حکومت کے خلاف بات کی جو کہ صحیح بات بھی تھی جو اس نے بحثیت صحافی نشر کردی بس پھر کیا تھا اس سچ نے اس غریب صحافی کی نوکری ختم کردی کیونکہ یہ ان کی پالیسی کے خلاف تھا کہ حکومت کی مدد سے چلنے والے ریڈیو چینل پر عوام کا سچ سامنے آگیا اور اب وہ صحافی اپنے سچ کی سزا بھگت رہا ہے - بہت دوڑ دھوپ کے بعد وہ غریب صحافی اپنے روزگار پر بحال ہوگیا لیکن یہ بحالی بھی عارضی ہے -اب تو ہماری سرکار ریڈیو چینلز لگانے کیلئے اقدامات اٹھا رہی ہیں لیکن اس پر کتنا سچ / حقیقت عوام کو سنائی جائیگی اس واقعہ سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے-

آہ ! میں جذبات کی رو میں آکر آدھے سے زیادہ سچ بول گیا ہوں چونکہ میں بھی صحافی ہوں اس لئے زیادہ سچ میرے لئے بھی خطرناک ہے سو خوش رہئیے "ہمارے عوام" - آپکو آدھا سچ ملتا رہے گا اور ہمارا روزگار بھی چلتا رہے گا

ہمارا معاشرہ `خواتین کو ہراساں کرنا اور قانونی بل کی حیثیت

پاکستانی معاشرے میں ملکی قوانین کا جس طرح ہم لوگ مذاق اڑاتے ہیں شائد ہی کسی باشعور اور تعلیم یافتہ معاشرے میں کسی نے اڑایا ہو قوانین خواہ وہ ملکی ہو یا اسلامی - کہنے کو تو ہمارے ہاں ہر ایک کو آزادی ہے ایسی آزادی جو آئین پاکستان نے ہر ایک کو دی ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ فائدہ ایلیٹ کلاس اٹھا رہا ہے - جو آئین اور قانون کے نام پر سب کچھ کر رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معاشرتی بے حسی بڑھنے کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ مسلسل بگاڑ کا شکار ہے اور اس بگاڑ میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے خواتین ہمارے معاشرے کا 52 فیصد آبادی پر مشتمل ہے انہیں معاشرتی ذمہ داریوں میں مواقع دینے کا حکم نہ صرف ہمارے مذہب اسلام نے دیا ہے بلکہ ہمارے پختون معاشرے میں بھی ان کے حقوق ہیں لیکن یہ حقوق انہیں کس بنیاد پر مل رہے ہیں اور خواتین آج کن مشکلات سے دوچار ہے اس کا اندازہ ان خواتین کی حالت سے کیا جاسکتا ہے جو باعزت روزگار کے لئے گھروں سے نکلتی ہیں اور انہیں نامساعد حالات کا شکار ہونا پڑتا ہے -

موجودہ حکومت جو اپنے آپ کو خواتین کو حقوق دینے کے حوالے سے چیمپئن گردانتی ہے نے خواتین کو ہراساں کئے جانے کے واقعات کی روک تھام کیلئے

قانون منظور کروایا جس کا مقصد عورتوں کو اپنا کام سرانجام دینے کے لیے محفوظ ماحول فراہم کرنا ہے جو خوف وہراس، بیہودگی اور تخویف سے پاک ہو تا کہ وہ وقار کے ساتھ کام کرنے سے متعلق اپنے قانونی حق کی تکمیل کریں۔ جس سے مقام کار اعلیٰ پیداواری حصول اور ایک بہتر معیار زندگی کو بھی قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ کام کرنے والی اکثر عورتوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی خوف وہراس ہے جو انہیں اور ان کے خاندان کو غربت و فلاس سے نکالنے کے لیے جو کام کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بل اس ملک کی ترقی کے لیے ہر سطح پر عورتوں کو پوری طرح شرکت کرنے کے راستے کھولتا ہے ۔لیکن اس بل کے آنے کے باوجود یہاں پر خواتین کی مشکلات کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا سکتا ہے۔

ایک ماہ قبل پشاور میں کام کرنے والی ایک بین الاقوامی امدادی ادارے میں کام کرنے والی خاتون ورکرز نے مقامی انگریزی اخبار میں اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک مرد ساتھی کی جنسی طور پر ہراساں کئے جانے کے واقعے کی شکایت کردی جس میں متعلقہ خاتون جن کا تعلق پشاور کے ایک اعلی خاندان سے ہے اور پڑھی لکھی خاتون ہے نے الزام لگایا کہ وہ ایک بین الاقوامی امدادی ادارے میں ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں تعینات تھی جہاں پر ان کے مرد باس اسے جنسی طور پر ہراساں کرتے تھے اور اس کے ٹیکسٹ میسج بھی اس نے اپنے موبائل میں محفوظ رکھ کر اپنے دفتر میں شکایت کی لیکن اس معاملے میں کچھ نہیں ہوا اور

وہ خاتون ابھی تک اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں اور ابھی تک اس معاملے میں کوئی اقدام نہیں اٹھایا گیا۔ یہ واقعہ ایک بہت بڑے بین الاقوامی امدادی ادارے میں کام کرنے والی خاتون کا ہے یہ ادارہ سوشل سیکٹر میں بہت کام کر رہا ہے اور مختلف منصوبوں پر خواتین کے حقوق کے حوالے سے علمبرداری کا دعویدار بھی ہے لیکن اندرون خانہ کیا ہو رہا ہے اس اندازہ آپ کو اس خاتون کی تحریر سے بھی لگ سکتا ہے جن کو ابھی تک کوئی انصاف نہیں مل سکا ہے جبکہ دوسری طرف اس شکایت پر اسے روزگار سے ختم کئے جانے کا بھی خطرہ ہے۔

بل میں اس بات کی بھی منظوری دی گئی ہے کہ خواتین کے انہی مسائل کو حل کرنے کیلئے صوبائی سطح پر محتسب کام کرے گا لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ صرف باتوں یا پھر اخبارات میں خبریں چھپنے کی حد تک ہے۔ خیبر پختونخوا حکومت نے خواتین کے انہی مسائل سے نمٹنے کیلئے صوبائی وومن کمیشن قائم کیا لیکن 12 افراد پر مشتمل خواتین کمیشن میں صرف سات ممبران اس وقت ممبر ہیں ابھی تک صوبائی وومن کمیشن اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکی۔ جبکہ ان میں اپنے پسند کے ممبران ڈالنے کیلئے حکومت کے ایک اعلی عہدیدار نے دو نام بھیج دیئے ہیں لیکن ابھی تک ان کی باقاعدہ تعیناتی عمل میں نہیں لائی گئی دووسری دو سال گزرنے کے باوجود وومن کمیشن کے قیام کو لیکن ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا ابھی تک کہ اضلاع کی سطح پر وومن کمیٹیاں قائم نہیں

ہوئی۔افسوسناک امر یہ ہے کہ جوادارے خواتین کے حقوق کی علمبرداری کرتے ہوئے نہیں تھکتی اس معاملے میں خاموش ہیں اور کوئی پیش رفت ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی دوسری طرف بین الاقوامی امدادی دارہ اپنے آپ کو پاکستانی قوانین سے بھی بالاتر سمجھ رہا ہے اسی وجہ سے اس کیس میں کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دے رہی۔اس واقعے کے بعد بین الاقوامی امدادی ادارے نے اپنے ملازمین پر سختیاں شروع کردی ہیں اور باقاعدہ ان کے فون ریکارڈ کئے جارہے ہیں اور ملازمین کی جاسوسی ان کا اپنا ادارہ کررہا ہے کہ کون ملازم اس حوالے سے میڈیا کو رپورٹیں دے رہا ہے۔ یہ صرف ایک واقعہ ہے جس کی نشاندہی ہوئی ہے لیکن اس کی روک تھام کیلئے کوئی اقدام نہیں اٹھایا جارہا۔ ایسے سینکڑوں واقعات ہورہے ہیں لیکن جب معاشرے میں بے حسی بڑھ جائے اور وہ بے حسی خصوصا خواتین کے حوالے سے ہو تو پھر کوئی پاگل ہی اپنے حق کیلئے آواز اٹھاتا ہے۔

سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ خواتین کے حقوق کیلئے آواز اٹھانے والے زیادہ تر این جی اوز میں ہراساں کئے جانے کے واقعات کی تحقیقات کیلئے کوئی کمیٹی قائم ہی نہیں جبکہ جو کمیٹیاں قائم ہیں وہ اس وقت حرکت میں نہیں اسی باعث خواتین کو ہراساں کئے جانے کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے جو ہم سب کیلئے لمحہ فکریہ ہے کیونکہ اگر آج ہراساں کئے جانیوالی کسی اور کی بہن / بیٹی

ہو سکتی ہے تو پھر یہ معاملہ ہمارے اپنے ذات پر بھی آ سکتا ہے۔ جس کیلئے ہمیں ابھی سے تیاری کرنا ہوگی۔

آپریشن `بے گھر لوگ اور انکی حالت زار

گھر سے بے گھر ہونا کا عذاب کتنا تکلیف دہ عمل ہے اس کا اندازہ بے گھر لوگوں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے اور یہ دکھ اس وقت بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب گھر ہونیوالے افراد کے چھوٹے بچے یا پھر ان کی جواں سال بہنیں / بیٹیاں بھی بے گھر ہونے کے عمل میں ایک شریف آدمی کیساتھ ہوں اور وہ بے سروسامانی کے عالم میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوں۔ہمارے معاشرے میں جہاں ہر ہر شریف آدمی کا جینا تو ویسے بھی محال ہے ایسے میں اگر کوئی شریف اور غریب آدمی بے گھر ہو جائے اور جولائی کے ان سخت گرمیوں میں خیموں میں قیام پذیر ہوں اور ان کیلئے بنیادی ضروریات نہ ہوں تو پھر وقت کیسے گزرتا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ڈھونڈنے کیلئے ہم سب کو بطور شہری اور جو لوگ اس کے ذمہ دار ہیں سوچنا ہوگا۔

تین سال قبل جب سیکورٹی فورسز نے باڑہ میں آپریشن شروع کردیا اور کرفیو کا نفاذ شروع کردیا تو ہزاروں کی تعداد میں بے سروسامان کی عالم میں لوگ اپنے گھربار چھوڑ گئے صاحب حیثیت لوگوں نے پشاور اور اس کے گرد و نواح کا رخ کرلیا جبکہ "باڑہ ہیں غریب و خوار لوگوں " نے جلوزئی کا رخ کرلیا۔ آپریشن کرنیوالے کون ہیں اور کیوں کررہے ہیں اس پر بحث نہیں کی جاسکتی لیکن آپریشن

کرنے والوں سے یہ پوچھا تو جا سکتا ہے کہ یہاں حالات یکدم خراب تو نہیں ہوئے بلکہ خرابی کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا اور اگر یہ سلسلہ پہلے سے جاری تھا تو ان کی انٹیلی جینس ایجنسیاں جن کی تنخواہیں ہم جیسے غریبوں کا گلہ گھونٹ کر ٹیکس لیکر ادا کی جاتی ہیں ان کی اس دوران کارکردگی کیا تھی اور انہوں نے کیا رپورٹیں سیکورٹی اداروں کو دی تھی اور اگر ان کی غلطی نہیں تھی تو کس کی غلطی تھی جس کی وجہ سے آج ہزاروں کی تعداد میں غریب خوار ہو رہے ہیں جن کی غلطی ہے انہیں کیا سزا دی گئی۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج تک "وردی والوں" سے کوئی پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا ہے۔ کیونکہ اس طرح کی باتیں "ملکی مفاد" میں آجاتی ہیں۔ جو ہم جیسے لوگ پوچھ نہیں سکتے۔

بات ہو رہی تھی آپریشن کے نتیجے میں بے گھر ہونیوالے افراد کی ` یہ بے گھر افراد کن حالات سے دوچار ہے کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ پہلے تو ان کی جلوزئی میں رجسٹریشن نہیں ہو رہی تھی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے ایسے لوگ میں نے بذات خود دیکھے ہیں جو دوسرے لوگوں کے خیموں میں رہائش پذیر ہیں کیونکہ ان کے علاقے میں آپریشن تو نہیں لیکن وہ لوگ اپنی عزت و ناموس کی خاطر علاقہ چھوڑ گئے ہیں لیکن پی ڈی ایم اے میں بیٹھے ہوئے زمینی خداؤں کو صرف " ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھنے "والوں کے آرڈر سمجھ آتے ہیں۔ پشاور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس نے رمضان سے قبل ان متاثرین کو تمام بنیادی سہولیات

کی فراہمی کے احکاماتی جاری کر دیئے تھے جس کی یقین دہانی ہوم سیکرٹری نے عدالت عالیہ میں کروادی تھی اور کہا تھا کہ پی ڈی ایم اے کو سیلاب کے خطرات کا سامنا ہے اس لئے فاٹا ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی یہ کام رمضان سے قبل کرلے گی ۔لیکن ہمیں پتہ نہیں کہ انہوں نے کونسا رمضان المبارک کا ذکر کیا تھا ابھی جو چل رہا ہے یا پھر آنیوالے رمضان المبارک کا کیونکہ ان کی حالت تو ویسے ہی ہے۔

ہزاروں کی تعداد میں اپنے ہی وطن میں بے گھر ہونیوالوں کی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خیموں میں مقیم متاثرین خیبر ایجنسی کو تین دن بعد ایک کلو/اور کبھی کبھار آدھ کلو.برف پانی ٹھنڈا کرنے کیلئے ملتا ہے سخت گرمی میں ان متاثرین کو باڑہ کے متاثرین کی اپنی ایک تنظیم روزانہ 75 بلاک.برف لیکر تقسیم کرتی ہے جو مختلف سیکٹروں کے لوگوں کو ملتا ہے.برف روزانہ آتا ہے لیکن چونکہ لوگ زیادہ ہے اس لئے تین دن بعد ہر ایک متاثر کا نمبر آتا ہے.برف کی تقسیم کا منظر اتنا دردناک ہے کہ کوئی صاحب دل شخص اسے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا دو سال سے لیکر پانچ سال تک معصوم بچے جن کے پاؤں میں چپل بھی نہیں ہوتے.برف کیلئے کیسے خوار ہوتے ہیں اس کا اندازہ گھروں میں ٹھنڈے ایئر کنڈیشنر اور ریفریجریٹر کا.برف استعمال کرنے والے لوگ نہیں کرسکتے ایسے ہی خواتین اور بوڑھے بھی.برف کیلئے خوار ہوتے ہیں-اگر یہ

معصوم بچے / خواتین / بوڑھے ہمارے نہیں ہو سکتے ۔کیا نیلی چھت والا ان لوگوں کو بے ۔ گھر کر سکتا ہے تو پھر ہم جیسوں اور " لینڈ لوڈ" والے کیا آسمان سے اترے ہوئے ہیں پی ڈی ایم اے /ایف ڈی ایم اے جو متاثرین کی امداد کے دعوے کرتی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے متاثرین کیلئے امداد تو درکنار انہیں رمضان کے مہینے میں کھجوریں دینا بھی گوارہ نہیں کیا جبکہ انہیں دی جانیوالی دال کے دو پیکٹ بھی آدھے کر لئے چینی اور چائے تک ان متاثرین کو نہیں دی جارہی ۔ ان حالات میں خیبر ایجنسی سے اپنوں کے ہاتھوں بے گھر ہونیوالے یہ متاثرین اگر یہ بات کرتے ہیں جو کہ سچ بھی ہیں کہ اگر قبائل ہونا جرم ہے تو انہیں اس جرم کی سزا روزانہ دینے کے بجائے انہیں یکدم دی جائے ۔ اور انہیں ختم کیا جائے تاکہ وہ روز روز کی ذلتوں سے بچ سکیں

ان بے گھر اور خانماں برباد لوگوں کیلئے وزیر اعلی نے کجھوریں دینے کا بھی اعلان کیا جو ابھی تک انہیں نہیں ملا اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ان کیلئے آنیوالا امداد کہا جارہا ہے ۔ گذشتہ دنوں سعودی عرب سے ہمارے لئے " خیرات "آگیا جو کہ اخبارات میں بھی آچکا ہے جو دینے والے ہیں وہ عاجزی کیساتھ کھڑے ہیں جبکہ جو خاتون وزیر " خیرات لے" رہی ہیں انہوں نے " سن

گلاسز" ایسے سٹائل سے پہنی ہیں جیسے وہ خیرات لے نہیں دے رہی ہوں - خیر کیا پتہ
موصوفہ اپنی شرم کو چھپا رہی ہوں ان "کالے چشموں" کی آڑ میں -خیر خیبر ایجنسی کے
جلوزئی میں مقیم متاثرین پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ ان کے نام پر آنیوالا کھجوریں کہاں گئی
کیونکہ چند مخصوص لوگوں میں تقسیم کرکے اور ان کی تصاویر لیکر ویب
-سائٹس/اخبارات میں دینے سے کام نہیں چلتا

اپنے گھروں میں آرام سے افطاری اور سحری کرنے والے ہم جیسے لوگ بھی اس
صورتحال کے ذمہ دار ہیں جو اپنے حکمرانوں سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں رکھتے کہ آخر
کاران کے اپنے " پیٹ" کب بھریں گے اور متاثرین کی نام پر آنیوالا خیرات کب تک یہ
لوگ اپنے گھروں میں لے جاتے رہیں گے ویسے آپ کی بات ہے کہ خیرات خور ہم
سے زیادہ ان محکموں میں بیٹھے ہیں جو اپنے گھروں میں پہلے راشن پہنچاتے ہیں اور
بعد میں اپنے محکموں کے اعلی حکام کو -انہیں اور حکمرانوں کو ہم جیسے غریب عوام سے
اس وقت محبت ہوتی ہے جب یہ لوگ ووٹ ڈالنے کیلئے آتے ہیں ویسے غریب عوام کی
- عام دنوں میں کوئی اوقات نہیں

ڈاکٹر ،کاروبار اور قصائیوں والے آپریشن

کسی زمانے میں ہمارے معاشرے میں ڈاکٹر ہونا بہت فخر کی بات ہوا کرتی تھی اور لوگ اپنے بچوں کو بچپن سے ڈاکٹر بنانے کے سپنے دکھایا کرتے تھے۔ خود مجھے یاد ہے جب میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو میرے مرحوم والد کی بڑی خواہش تھی کہ میرا بیٹا سائنس پڑھ کر ڈاکٹر بنے جب میرے نمبر کم آئے تو والد نے اس دن باقاعدہ چپل سے میری وہ " عزت افزائی " سے کی جو برسوں گزرنے کے بعد بھی آج تک مجھے یاد ہے -- بات کہاں سے کہاں تک نکل گئی ہمارے معاشرے میں ڈاکٹروں کی اب بھی بہت عزت ہے چونکہ اب تو ان کے پاس پیسہ بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن عزت وہ نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی کیونکہ اب دیگر شعبے بھی آگئے ہیں اسی باعث اب والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنوانے کے بجائے دیگر شعبوں کی طرف بھیجنے کی ترغیب دیتے ہیں جبکہ اب جس صورتحال سے ہم دوچار ہیں پاکستانی والدین اپنے بچوں کو باہر بھجوانے کے چکر میں ہیں کہ کم از کم امن و سکون کے ساتھ ان کے بچے تو رہ سکیں گے اور انہیں روزگار کے مواقع بھی مل سکیں گے۔جس طرح ہمارے دیگر شعبوں کے لوگ عوام کی خدمت کر رہے ہیں ایسے ہی ہمارے ڈاکٹر برادری نے بھی عوام کی خدمت کا بیڑہ اٹھا لیا ہے ہم اپنے صوبے میں ڈاکٹر مریضوں کا کیا حال کرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب آپ کسی سرکاری ہسپتال

میں علاج کیلئے جاتے ہیں جہاں پر مریض صاحب بہادر کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں اور اگر خوش قسمتی سے کوئی ڈاکٹر ہسپتال میں نظر آتا ہے تو ان کے پاس میڈیکل ریپس کی فوج ظفر موج دکھائی دیتی ہیں جو انہیں اپنے مختلف دوائیوں کے سمپل غریب غرباء پر آزمانے کیلئے اپنی کوششیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

گذشتہ رات ایک افطاری میں میڈیسن فروخت کرنے والی ایک ادارے کے ریجنل مینجر سے گفتگو ہوئی بقول ان کے ہمارے میڈیکل ریپس کے شعبے میں سب سے بھوکے ہسپتالوں میں کام کرنے والے ڈاکٹرز ہوتے ہیں جو ڈیمانڈ کرتے ہیں کہ ان کیلئے کلینک لیا جائے اور اگر کلینک ہے تو کلینک کی فرنشنگ فارما کمپنیوں سے کرائی جاتی ہے کلینک میں اے سی سے لیکر میز اور دیگر اشیاء تک میڈیسن کمپنیاں فراہم کرتی ہیں جس کے بدلے میں یہی ڈاکٹرز ہمیں یہ کہتے ہیں کہ آپ اس سے بے غم ہو جائیں کہ آپ کی میڈیسن کیسی ہے ہم آپ کی "سیلز" آسمان تک پہنچائیں گے لیکن ہمیں آپ "خوش رکھیں" بقول ان صاحب کے کاغذوں کے پیڈ سے لیکر بال پوائنٹ اور دیگر اشیاء تک یہ سب چیزیں لیتے ہیں۔ ان صاحب کے بقول اسسٹنٹ پروفیسر اور پروفیسر لیول کے ڈاکٹرز یہ ڈیمانڈ فارما کمپنیوں سے غیر ملکی دوروں کی ڈیمانڈ کرتے ہیں اور اب تک یہ دورے برطانیہ ` امریکہ اور مختلف یورپی ممالک تک پہنچ گئے ہیں ریجنل مینجر صاحب نے مجھے یہاں تک بتایا کہ پہلے ڈاکٹر فارما کمپنیوں سے صرف اپنے لئے ٹورز ارینج کرنے کا مطالبہ کرتے تھے جبکہ اب تک پوری فیملی وزٹ کا مطالبہ ہوتا ہے اور ہم ان کا مطالبہ

پورا کرتے ہیں اور یہ لوگ ہمارے مطالبات پورے کرتے ہیں اسی طرح ہمارا کاروبار چل رہا ہے اور میڈیسن کی سیلز میں اضافے کی وجہ سے میرے سیلز میں اضافہ ہو رہا ہے اور کمپنی مجھ سے خوش ہے اور میری تنخواہ میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

سرکار کے ہسپتال میں تو صرف سرکار کا علاج ہوتا ہے جہاں پر لاکھوں کے بل بھی ہمارے نمائندے اپنی بیماری کا علاج عوام کے منہ سے نکالے گئے زبردستی کے پیسوں سے کراتے ہیں یقین نہ ہوں تو کبھی غلطی سے پشاور کے مختلف سرکاری ہسپتالوں میں "ایلیٹ کلاس کیلئے" بنائے گئے بلاکوں میں جا کر دیکھ لیں غریب لوگ تو زندہ باد اور مردہ باد کیلئے پیدا ہوئے اس لئے اگر اپنے علاج کیلئے سرکاری ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں پر تعینات ڈاکٹرز اول تو انہیں لفٹ نہیں کراتے اور اگر لفٹ کرائے بھی تو انہیں سیدھے اپنے کلینک بھجواتے ہیں جہاں پر وہ ان غریبوں کا چمڑہ نکالنے کی اپنی پوری سعی کرتے ہیں کہنے کو تو یہ لوگ ڈاکٹر ہوتے ہیں لیکن یہ ہمارے معاشرے کے قصائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ان کے پرائیویٹ ہسپتال ہمارے جیسے لوگوں کے دم سے چلتے ہیں۔

گذشتہ دنوں میرے چھوٹے بیٹے بیمار ہوا پہلے تو مقامی طور پر ڈاکٹر کو دکھایا

بعد ازاں مجبوراً حالت خراب ہونے پر ڈیگری گارڈن کے ایک پرائیویٹ ہسپتال کا رخ کرلیا وہاں پر سفارش اور تعلق کی وجہ سے چھ سو روپے پر ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر نے میرے بیٹے کو چیک کیا اور بعد ازاں کہا کہ اسے ایک دن کیلئے داخل کرائو ۔ جس کمرے میں مجھے بھیجا گیا کہنے کو تو وہ پرائیویٹ تھا لیکن اس کے بیڈ کی بدبو سے برا حال تھا جب اسے تبدیل کرنے کو کہا کہ بچے ویسے بھی بیمار ہے اگر یہاں پر بچے کو لٹانا ہے تو پھر کم از کم کشن تو صاف کروا دو اس دوران ایک صفائی والی آ گئی موصوفہ کہنے کو تو صفائی والی تھی لیکن اس نے ناخن ایسے سٹائل سے بنائے ہوئے تھے کشن اور کور تبدیل کرنے کے بعد مجھے کہا کہ میں خالہ ہوں اور مجھے " خرچہ پانی "دے میں نے کہا کہ میری خالہ تو نہیں ویسے میرے پاس خرچے پانی کیلئے پیسے نہیں تو اس نے میرا یوں جائزہ لیا جیسا میرا اس سے رشتہ ہونے جا رہا ہو- خیر پھر بیٹے کے ہاتھ میں کینولہ لگانے کا کہا گیا اسے آپریشن تھیٹر ایک نرس جو کہ تھی نہیں لیکن اپنے آپ کو کہہ رہی تھی لے گئی اور کینولہ لگانے کے بعد دو سو روپے اس کی فیس کا مطالبہ کر دیا میں نے اس سے کہا کہ میں لینڈ لارڈ کا بیٹا نہیں ہوں اور ویسے بھی یہاں میں عیاشی کیلئے نہیں آیا اپنے بیٹے کا علاج کرنے کیلئے آیا ہوں پھر جب میں نے ڈاکٹر کو شکایت کر دی تو اس نے کہا کہ " خیر ہے کچھ گزارا آپ کریں " یعنی مجھے لوٹا جا رہا ہے اور ڈاکٹر مجھے کہہ رہا تھا کہ خیر ہے یہ تم لوٹ لے لیکن تم کوئی شکایت نہ کرو- پھر علاج کے بعد جب ڈاکٹر نے میڈیسن کی لمبی

فہرست دی اس فہرست کے مطابق بازار میں پتہ کیا تو تقریبا چار ہزار روپے کی ادویات تھی میں نے ہسپتال کے ایک جاننے والے ڈاکٹر کو دکھلائی تو اس نے کچھ "دوائیوں کو" سفارشی قرار دیکر اسے خریدنے سے منع کردیا اور کہا کہ اس کی ضرورت نہیں اور تقریبا پندرہ سو روپے کی ادویات غیر ضروری مجھے دی گئی تھی - یہ میں نے اپنے ساتھ پیش آنیوالا واقعہ بیان کردیا ہمارے ارد گرد یہ سب کچھ ہورہا ہے لیکن ہم لوگ شکایت نہیں کرتے اور ڈاکٹرز مختلف طریقوں سے ہماری آپریشن کررہے ہیں -

پشاور میں ڈبگری گارڈن واحد جگہ ہے جہاں پرائیویٹ ڈاکٹروں کے کلینک ہے اور یہاں پر روزانہ ڈاکٹرز لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں لیکن یہاں پلازوں میں مریضوں کی گاڑیوں کیلئے رکھنے کیلئے جگہ مختص ہے اور نہ یہاں پر آنیوالے مریضوں کو بنیادی سہولیات تک فراہم ہیں - سخت گرمی میں بزرگ خواتین بچے اور بوڑھے ان پلازوں میں کیسے خوار ہوتے ہیں یہ دیکھنے کا معاملہ ہے جبکہ لوگ صحت سے متعلق معاملات کو چیک کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کی اپنی "صحت "تو بہت بہتر ہیں کیونکہ "انہیں خرچہ پانی "ملتا ہے اس لئے وہ قصائیوں کی طرح لوگوں کو ذبح کرنے والے افراد کی چیکنگ نہیں کرتے اسی وجہ سے یہاں پر جعلی ڈاکٹرز بھی پیدا ہوگئے ہیں جو اپنے ہی طرح سے آپریشن میں مصروف عملے ہوتے ہیں- جبکہ جو نمائندے ہمارے صحت کے محکمے کے ذمہ دار ہیں وہ موصوف ہسپتالوں

میں " جیالوں " اور اپنے " رشتہ داروں " کی بھرتی میں مصروف عمل ہیں اسی باعث
انہیں نہ تو ڈاکٹروں کے ظلم نظر آتے ہیں اور نہ ہی غریب عوام کی ابتر صورتحال ۔
کیونکہ موصوف خود بھی عوامی حکومت میں " مزے " لینے میں مصروف عمل ہیں۔

- لوڈشیڈنگ ، حکمرانوں کا لارالپہ

پشتو زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے جس کے معنی ہیں کہ " بھرا پیٹ فارسی بولتا ہے " ہمیں اس کا اندازہ گذشتہ روز پشاور پریس کلب میں وفاقی وزیر ریلوے کے لوڈشیڈنگ کی صورتحال پر پریس کانفرنس کے دوران ہوا لوگ رمضان میں لوڈشیڈنگ کے باعث تباہ حال ہو گئے ہیں اور موصوف نے پریس کانفرنس میں یہ کہہ کر عوامی نمائندگی کا حق ادا کردیا کہ " اب میں باہر جارہا ہوں " عید کے بعد آئونگا اور احتجاج بھی کرونگا" موصوف کی وزارت کا سب کو پتہ ہے کہ پٹڑیاں تو موجود ہیں لیکن انجن نہیں اور یہی حال رہا تو انشاء اللہ پٹڑیاں بھی جلد غائب ہو جائینگی -وزیر ریلوے نے لوڈشیڈنگ کے حوالے سے کی جانیوالی پریس کانفرنس میں جو اعداد و شمار صحافیوں کو بتائے بقول ان کے ہمارے صوبے کی پیداوار 3136 میگاواٹ ہے لوڈشیڈنگ میں حصہ ملنے کے بعد ہمارا حصہ 2100 میگاواٹ بنتا ہے جبکہ ہمیں 1300 میگاواٹ دیا جارہا ہے- سب سے حیران کن بات انہوں نے یہ بتادی کہ وفاق ہماری بات نہیں سنتا اور ان کے اور بھی مسائل ہیں -انہوں نے اپنی حاضری لگوادی اور ان کے جانے کے ایک گھنٹے بعد پختون قوم کی علمبردار پارٹی کے صوبائی سربراہ نے صوبائی کابینہ کے ممبران کے ہمراہ پریس کانفرنس کر ڈالی انہوں نے لوڈشیڈنگ کے مسئلے پر 9 اگست کو اے پی سی بلانے کا اعلان کردیا اور

ساتھ ہی کہہ دیا کہ اگر استعفوں سے عوام کو ریلیف ملتا ہے تو ہم دیدینگے - دونوں نے لوڈشیڈنگ کے مارے عوام کے آنکھوں میں "سرمہ "تو لگا دیا-ہمیں ایک بات کی سمجھ نہیں آئی جو اعداد و شمار وزیر ریلوے نے صحافیوں کو بتائے جبکہ جو صوبائی رہنماء نے صحافیوں کیساتھ شیئر کئے ان میں تضاد تھا -

بحثیت صحافی میرا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے نہیں لیکن میں عوام کے اس کچلے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں جو صرف زندہ باد اور مردہ باد کے چکر میں خوار ہوتے رہتے ہیں تعلق چونکہ ہشتنگر کے انتہائی پسماندہ علاقے سے ہے اس لئے یہ سوال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو موجودہ دور میں ہر کوئی کرنا چاہتا ہے کہ کہاں گئے مفت بجلی کے وعدے اور بجلی کا بٹن صوبے میں لانے کا اعلان کرنے والے رہنماء -ویسے لوڈشیڈنگ کے مسئلے کیلئے صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا بھی اعلان کیا گیا جو کم از کم پشاور کے عوام کیساتھ رمضان میں ظلم ہوگا کیونکہ جس دن اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے اس دن پشاور کی ٹریفک کا کیا حال ہوتا ہے "ائیر کنڈیشنر "ہالوں میں بیٹھ کر تقریریں کرنے والے نمائندوں کو اس کا اندازہ نہیں - عوام حکمرانوں کے نشستا ` خوردا اور برخاستا کے اے پی سی سے کچھ لینا دینا نہیں چاہتے انہیں اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے وہ لوڈشیڈنگ کا بڑھتا ہوا "جن "ہے جس کے باعث نہ صرف کاروبار تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے بلکہ عوام کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہیں اور وہ اس عذاب

سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں۔اور تو اور اسمبلی کے اجلاس پر پر جتنا خرچہ آئیگا وہ حکمران تو ادا نہیں کرینگے وہ بھی اس" بھوکے ننگے " عوام سے نکالا جائیگا۔

ویسے یہ بات بہت سارے لوگوں کیلئے تلخ بھی ہوگی مجھے یاد ہے پختونوں کے علمبرداری کا دعوی کرنے والے حکمرانوں کے پہلے دور میں آٹا نہیں ملتا تھا اس وقت میرے کالج کا دور تھا اللہ تعالی والد مرحوم کو جنت نصیب کرے گھر کیلئے آٹا لانا کتنا عذاب ہوتا تھا پہلے لوگ "حکمرانوں کو " آٹاچور" کہتے تھے ایک دو دفعہ تو والد کسی دوست سے آٹا لائے بعد میں ہمیں کہہ دیا کہ اب " جوار کا آٹا" کھائو۔اور پھر ہمیں مجبورا جوار کا آٹا کھانا پڑتا خیر اللہ تعالی نے اس صوبے کے عوام پر رحم کردیا اسی صورتحال کا اب ہمیں سامنا ہے صوبے کے عوام اپنے ہی لیڈروں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ان کا گناہ کیا تھا کہ اب بجلی یونٹ تو انہیں مفت ملنے سے رہا لیکن پانی سے پیدا ہونیوالی بجلی ان پر تیل کی قیمت پر بیچی جارہی ہیں اور وہ بھی اٹھارہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کیساتھ۔بڑے لمبے چوڑے بل بھیج کرانکی زندگی اجیرن کی جارہی ہیں۔ موجودہ حالات میں " بجلی چور "کے نعرے لگائے جارہے ہیں ل معذرت کیساتھ کچھ لوگوں کو حکمرانی کرنے والوں لیڈروں میں کوئی۔برائی نظر نہیں آتی کیونکہ ان کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔

ہمارے کچھ لوگ اسے عوام کی اعمال کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن کیسے اعمال ہیں جس کا نشانہ اس صوبے کے غریب ` لاچار لوگ ہی بن رہے ہیں ٹھیک ہے کہ عوام نے غلطی سے اپنا سمجھ کر صوبے کے حکمرانوں کو ووٹ دیکر منتخب کروایا تھا لیکن اب وہ اپنی غلطی پر کیسے پشیمان ہیں اس کا اندازہ مجھے رنگ روڈ پر لوڈشیڈنگ کے خلاف مظاہرے کی کوریج کے دوران ہوا جب بچوں اور بوڑھوں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور وہ صوبے کے حکمران جماعتوں کے رہنمائوں کو جو کہ اب " قبروں میں " ہیں کی شان.بڑھا رہے تھے جب میں نے ایک.بزرگ شخصیت سے پوچھا کہ ووٹ انہوں‌نے کس کو دیا تھا تو جواب۔ میں انہوں نے جو مغلظات ان لیڈروں کے حوالے سے مجھے سنائی اس نے میرے روزے کو بھی مکروہ کردیا۔ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر رمضان المبارک میں اللہ تعالی شیطان کو بند کرتا ہے تو واپڈا کے اہلکاروں اور افسران کو کم از کم رمضان میں گرفتار کیا جاتا تو لوگوں کو لوڈشیڈنگ کا سامنا تو نہیں کرنا پڑتا - ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھےہوئے حکمران کو اس صوبے کے غریب عوام کی حالت زار کا کچھ اندازہ ہی نہیں کیونکہ جو لوگ ائیر کنڈیشن میں بیٹھے ہوں کروڑوں کی گاڑیوں میں بیٹھ کر اعلانات کرتے ہوں اور ان کے آگے پیچھے ہوٹرز بجتے ہیں انہیں اس صوبے کے پختونوں کی ابتر صورتحال کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی انہیں عوام کی کوئی فکر ہے اس لئے تو پسے ہوئے عوام سے کہا جارہا ہے کہ رمضان المبارک میں سڑتے

رہو عید کے بعد اگر صوبے کے عوام رمضان اور لوڈشیڈنگ سے بچ نکلے تو انہیں نیا "
- لاراالپہ " دیکر سلا دیا جائیگا
پختون قوم کی علمبرداری کا دعوی کرنے والی پارٹی کے صوبائی رہنماء نے ایک بات اپنے پریس کانفرنس میں اچھی کہہ ڈالی کہ اسلام آباد سے لوڈشیڈنگ کی جارہی ہیں جو اٹھارھویں ترمیم کی خلاف ورزی ہے اگر حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملے پر ڈٹ جائیں لیکن چونکہ انہیں پتہ ہے ان کی "اوقات" نہیں جس کی تصدیق وفاقی وزیر ریلوے نے بھی کی تھی کہ "وفاق ہماری بات نہیں سنتا" تو پھر وقت گزارنے کا فائدہ کوئی نہیں۔ ساڑھے چارسال تو گزر گئے ہیں خدارااب تو اس غریب عوام کیلئے کچھ تو کریں اگر حکمرانوں نے بھی غریب غرباء کی طرح پریس کانفرنس کرکے احتجاج کرنا ہے تو پھر ان کے حکمرانی کا فائدہ تو نہیں ۔اس لئے انہیں باہر نکل آنا چاہیے لیکن شائد ہمارے حکمران چھپڑی چھپڑی اور دو دو "یعنی عوام کو سرما لگانا چاہتے ہیں یا یہ سیاسی ہتھکنڈے
- آنے والے انتخابات میں عوام کے پاس دوبارہ جانے کیلئے جواز پیدا کرنا ہے

انصاف اور معاشرتی بے بسی

انسان کی بے بسی کا اظہار اس کی آنکھوں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے اپنے ارد گرد نظر دوڑایئے آپ کو سینکڑوں ایسے لوگ نظر آئینگے جن کی ہزاروں مشکلات ہیں لیکن وہ مجبوریوں کے باعث بے بس ہوتے ہیں وہ اپنی بے بسی کا اظہار نہیں بھی کرنا چاہتے لیکن ان کی آنکھیں بے بسی کی تصویر بنی ہوتی ہیں اور اپنی بے بسی کی داستانیں سناتی ہیں ۔ محفل میں آپ کے سامنے ایسے لوگ بھی آتے ہونگے جن کے قہقہوں کی آواز سب سے تیز ہوتی ہے لیکن ان کے یہ قہقہے اپنی بے بسی کو چھپانے کیلئے ہوتے ہیں ۔
بازاروں میں اللہ کے نام پر سوال کرنے والوں کی آنکھوں کو دیکھیں آپ کو اندازہ خودبخود ہو جائیگا کہ کوئی کتنا بے بس ہے اور کون سوال کرنے کی آڑ میں اپنا کاروبار کررہا ہے بے بسی کے یہ تاثرات صرف حساس دل رکھنے والوں کو ہی نظر آتے ہیں اور اس میں کوئی چاہے کتنا بھی ڈرامہ باز ہو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیونکہ آنکھیں ہی انسان کے اندر کی عکاسی کرتی ہیں ۔
بات کہاں سے کہاں نکل گئی گذشتہ روز اس خاتون سے ایک محفل میں ملاقات ہوئی

جسے ایک بین الاقوامی غیر سرکاری ادارے میں دوران ملازمت جنسی ہراساں کیا گیا اور مئی میں ہونیوالے واقعے کے اپنے ادارے میں شکایت درج کرنے کے باوجود ابھی تک انصاف نہیں مل رہا۔ خاتون کی آنکھیں اپنے ساتھ ہونیوالی واقعات پر بے بسی کا اظہار کررہی تھیں متعلقہ خاتون کیساتھ ہونیوالے واقعے نے اسے ذہنی طور پر منتشر کردیا ہے اسے روزگار کا بھی غم ہے کیونکہ اپنے خاندان کی اکلوتی کمانے والی خاتون ہے اور اس کے گھر کا خرچہ اس کے تنخواہ سے چل رہا ہے خاتون کی شکایت پر اسے ڈیرہ اسماعیل خان سے جلوزئی تبدیل کردیا گیا ہے اور آج تک اس کے اپنے ادارے میں اس کیساتھ ہمدردی کیلئے کوئی آواز تک نہیں اٹھ رہی حالانکہ وہاں پر خواتین کی بڑی تعداد موجود ہے لیکن یہ آواز بھی کون اور کیوں اٹھائے کیونکہ ہر ایک کو اپنی نوکری کی پڑی ہوئی ہے ہر کوئی اپنے مفادات کیلئے لڑ رہا ہے کسی کی عزت لوٹنے کی کوشش کرتا ہے یا لٹتا ہے تو لٹتے رہے کون دوسروں کے مسائل میں اپنے آپ کو پھنساتا ہے۔ جنسی طور پر ہراساں کئے جانیوالی متعلقہ خاتون اپنی بے بسی بیان نہیں کرسکتی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کس ذہنی اذیت کا شکار ہے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بنوں میں بھی پیش آیا جہاں ایک خاتون کو اپنے ہی سسر نے تین اور لوگوں کیساتھ ملکر زیادتی کا نشانہ بنایا۔ بڑی تگ و دو کے بعد چاروں گرفتار تو ہوگئے لیکن وہ خاتون آج پشاور کے ایک ہسپتال میں ذہنی مریضہ کی حیثیت سے پڑی ہوئی ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ یہ دو واقعات ہیں جو

باقاعدہ طور پر رپورٹ ہوئے ہیں ایسے سینکڑوں واقعات ہمارے ارد گرد ہو رہے ہیں لیکن ہم لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ویسے بھی میڈیا کے پاس اس بے مصرف موضوع پر پروگرام کرنے کا وقت تو ہے کہ وینا ملک کو استغفار کا حق کیوں نہیں دیا گیا لیکن خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر یہ این جی زدہ خواتین لنکرزچپ سادھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔

یہ دو خبریں جہاں ہمارے ہاں خواتین کیساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی نشاندہی کرتی ہیں وہیں یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کس طرف جارہا ہے ہم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتے اور سمجھتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات جانوروں سے بدتر ہوگئے ہیں ہمارے اعمال/افعال ہمیں کس حدتک لے جارہے ہیں۔ان واقعات سے اداروں کی کارکردگی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے معاملات خصوصاً خواتین کے حقوق کے نام پر دکانداری کرنے والے ان پر تشدد /زبردستی کی شادی جیسے موضوعات اور خواتین کے حقوق پر نام نہاد ڈرامہ کرنے والے غیر ملکی امدادی ادارے اس ملک کی خواتین کا کس طرح استحصال کررہے ہیں بیرون ممالک سے آنیوالے غیر ملکی ہمارے پاکستانیوں کو تھرڈ کلاس شہری سمجھتے ہیں۔ اے لیول اور اولیول پاس کرکے پاکستان میں بین الاقوامی اداروں کے اہم عہدوں پر تعینات گورے پاکستانیوں کو گدھوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔انتظامیہ اس معاملے میں خاموش ہیں کیونکہ مانیٹرنگ اور چیکنگ

کرنے والے اداروں کے ذمہ داروں کے رشتہ دار غیر ملکی اداروں میں اہم پوسٹوں پر براجمان ہیں اور اگر وہ کوئی ایکشن لیتے ہیں تو پھر ان کے لئے مسئلہ بنتا ہے کیونکہ سفارشی اور والدین کے عہدوں کی وجہ سے تعینات ہونیوالے لوگ جو لاکھوں روپے تنخواہیں لیتے ہیں ان کی بیروزگاری کا خطرہ ہے -اسی باعث ان لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں - مقامی ادارے کتنا بھی چیخے چلائے ان کے چیخنے چلانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ گوری چمڑے والے اب بھی پاکستانیوں کو اپنا زرخرید سمجھتے ہیں- اور انہوں نے ایلیٹ کلاس کو اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے سو یہ لوگ کچھ بھی کرے ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں-

خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے اور ان واقعات میں ملوث افراد کی روک تھام کیلئے صوبائی سطح پر خاتون محتسب کا ہونا ضروری ہے لیکن ہمارے سرکار کا یہ حال ہے کہ خیبر پختونخوا میں ابھی تک کسی کو تعینات نہیں کیا گیا -حالانکہ ہمارے صوبے میں جو خاتون اس شعبے کی ذمہ دار وزیر ہے ان کا تعلق بھی غیر سرکاری ادارے سے ہے لیکن شائد وہ وزارت ملنے کے بعد ہر چیز بھول گئی ہیں اور ساڑھے چار سال گزرنے کے بعد بھی ابھی تک ان کا دھیان نہیں گیا - خبر تو اڑائی گئی کہ ایک خاتون جو کہ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے بہت سرگرم ہے کو اس عہدے کیلئے لیا جارہا ہے اور ان کا نام بھی صوبائی وومن کمیشن نے تجویز

کیا لیکن چونکہ ان کا ڈومی سائل صوبے کا نہیں تھا اسی باعث ان پر اعتراضات اٹھائے گئے اور وہ اس دوڑ سے باہر ہو گئی تبھی وہ آج کل نجی محفلوں میں گلے شکوے بھی کرتی نظر تی ہیں کہ اس صوبے میں کام کرنے کے باوجود بھی اس کا یہی حال ہے خیر یہ تو ان کا اپنا معاملہ ہے لیکن جب کام ہی ستائش / مقصد کیلئے کیا جاے تو پھر ایسے ہی گلے شکوے کئے جاتے ہیں-

ایک اچھا اقدام جو کہ عدالت عالیہ کے ہیومن رائٹس سیل نے اٹھایا ہے کہ جنسی طور پر ہراساں کئے جانیوالی خاتون کی درخواست پر متعلقہ ادارے کو وضاحت کیلئے نوٹس جاری کر دیا ہے اور اس کیس کا نتیجہ سامنے آ جائیگا - لیکن کیا ہمارے معاشرے میں ہر کام عدالت نے کرنا ہے اس ملک کے ادارے / انتظامیہ کہاں ہیں وہ کس لئے غریب عوام کا خون چوس کر ان پر بوجھ بنے ہوئے ہیں اگر سارا کام عدالت نے کرنا ہے تو پھر خون چوسنے والے حکمرانوں سے ہمیں نجات کی ضرورت ہے اور اس معاملے میں ہمیں اپنی بے بسی ختم کرنا ہوگی -

ٹاؤن ملازمین کی ابتر صورتحال اور "چہیتوں" کی عیاشیاں

اگست کے مہینے کا دوسرا ہفتے ختم ہونے کو ہے لیکن ٹاؤن ون پشاور کے ملازمین اور پنشنرز تنخواہوں کیلئے چکر کاٹ رہے ہیں اور ابھی تک ان لوگوں کو جولائی کی تنخواہیں اور پنشن نہیں مل سکی ہیں ۔رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں اپنے ہی تنخواہوں کیلئے چکر کاٹنے والے ملازمین میں سب سے زیادہ نچلے طبقے کے مزدور شامل ہیں جنہیں ہمارے ہاں کلرک اور کلاس فور کہا جاتا ہے جن کا استحصال پہلے سے بھی ہورہا تھا اور اب بھی دھڑلے سے جاری ہے یہی حال پنشنرز کا بھی ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی سال اس ادارے میں صرف کئے تھے اور اپنے پنشن کیلئے دفاتر کے چکر کاٹنے پر مجبور ہیں ۔
اندازہ ہے کہ اپنے آپ کو پشاور کے "سپوت "قرار دینے والے وزیر عید پر ان ملازمین کو گزشتہ مہینے کے تنخواہ دیکر جان چھڑا لینگے اور اپنی "واہ واہ " بھی کروالیں گے لیکن کیا یہ مالی بحران کا مستقل شکار ٹاؤن ون کا حل ہے !
کچھ عرصہ قبل جب میں محکمہ " بل دی آت "کی رپورٹنگ کرتا تھا تو ٹاؤن ون کے دفاتر کے چکر لگانے پڑتے ان دفاتر کے چکروں سے یہ پتہ چلا کہ اس ادارے کا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے جس کی کرسی اس ادارے میں سب سے زیادہ مضبوط ہے

وہ انتاہی زیادہ کرپشن کر رہا ہے۔اس ادارے میں ایسے ایسے لوگ میں نے خود دیکھے ہیں جن کی بنیادی تعلیمی معیار تو کچھ نہیں لیکن ان کی سب سے بڑی صلاحیت " جی حضوری" ہے اور اس صلاحیت کے بدلے یہ عوام کے خون پسینے کی کمائی تنخواہ کی شکل میں لے رہے ہیں ایسے " ٹیوب ویل آپریٹر" بھی اس ادارے کی ملازمین میں شامل ہیں جو تنخواہ تو ٹاؤن ون سے لے رہے ہیں لیکن انہوں نے اپنی ملازمت پر کسی اور کو تعینات کیا ہے اور وہ " چمچہ گیری" میں مصروف ہیں اور اپنے محکمے کے " بڑوں" کیلئے کام کرتے ہیں کچھ ایسے لوگ بھی ان میں شامل ہیں جو تنخواہیں تو اس ادارے سے لے رہے ہیں لیکن وہ "افسران اور صاحبان" کے گھروں میں سبزیاں لانے کا کام کرتے ہیں ۔چونکہ انہیں" آشیرباد" حاصل ہے اس لئے ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں

ان میں نچلے سطح پر کام کرنے والے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو روزانہ لاکھوں روپے آمدنی پیدا کر رہے ہیں اگر کسی کو یقین نہیں تو شاہی باغ روڈ پر واقع سبزی منڈی میں صبح سویرے چکر لگا کر دیکھ لیں یہاں پر تعینات ٹاؤن ون کے اہلکار سبزی والے دکانداروں اور تھڑے پر کام کرنے والے افراد سے کتنی " پیداگیری" کرتے ہیں یہ ماڈرن انداز کا " بھتہ " کہاں پر استعمال ہوتا ہے کسی کو پتہ ہی نہیں یہ صرف ایک شاہی باغ بازار کی بات ہے جہاں پر سینکڑوں تھڑے اور دکاندار صبح چار بجے سے شام چھ بجے تک بیٹھے رہتے ہیں اس بازار سے

ہزاروں کی آمدنی ٹاؤن ون کے مخصوص اہلکار لیتے ہیں جبکہ یہاں پر نام نہاد "یونین" کے نمائندے بھی موجود ہیں جو ان غریبوں سے زبردستی پیسے وصول کرتے ہیں۔ گلبہار کی پرانی فروٹ منڈی ،گڑ منڈی اور ہشتنگری میں ریلوے پھاٹک پر قائم غیر قانونی تھڑے اور دکانیں جن کی تعداد سینکڑوں پر مشتمل ہیں ان سے وصولی الگ ہے فٹ پاتھ پر بیٹھے لوگوں سے بھی " بھتہ وصولی " کی جاتی ہیں یہ آمدنی کہاں پر جارہی ہیں اور کون اس کی سرپرستی کررہا ہے کیا اس محکمے کے ذمہ داروں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں یا انہیں بھی اس میں "حصہ "مل رہا ہے سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس عمل میں چھوٹے سطح کے ملازمین کو استعمال کیا جارہا ہے اس ادارے کے چہیتے افسران کیلئے لاکھوں کی نئی گاڑیاں ایسے وقت میں لے لی گئی ہیں جب ادارہ مالی بحران کا شکار ہے جبکہ چہیتوں کے زیر استعمال پرانی گاڑیاں ٹاؤن ون کے دفتر میں کھڑے کھڑے تباہ ہورہی ہیں اور آڈٹ والوں کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہیں کہ ادارے کی سربراہی کرنے والے کے پاس ایک گاڑی کے ہوتے ہوئے دوسری گاڑی لینے کی ضرورت کیا ہے لیکن چونکہ " بڑوں "کے چہیتوں میں شمار ہوتے ہیں اس لئے یہاں بھی صورتحال کنٹرول میں ہیں۔

یہی چہیتے افسران ملازمین کو " تقسیم کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہے جو لوگ ان افسران کی" جی حضوری "کرسکتے ہیں انہیں تنخواہیں بھی مل جاتی ہیں جبکہ

جن میں " لیکٹ " نہیں ان سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا ہے لیکن انہیں تنخواہیں بھی نہیں مل رہی اور وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کیلئے آواز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ اداروں میں جب سفارش اور من پسند افراد کو بھرتی کیا جاتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جب غیر ضروری لوگوں کو خوشنودی کی خاطر لیا جائے تو اس کا اثر اداروں میں ایسے ہی نکلتا ہے اب حال یہ ہے کہ پشاور شہر میں گندگی اٹھانے والی گاڑیاں کچرے کا ڈھیر بن چکی ہیں اسی باعث جا بجا شہر میں گندگی کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں اور اس سے اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے " بل دی آت " والے " بڑے " پشاور شہر کے عوام سے کتنی محبت رکھتے ہیں چونکہ ان "بڑوں" کے اپنے گھر پوش علاقوں میں ہیں جہاں پر روزانہ صفائی بھی ہوتی ہیں پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا جاتا ہے اس لئے انہیں عوام جن کے سر پر " بڑے " بن بیٹھے ہیں اپنی ہی طرح نظر آتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ اداروں کو مضبوط کرنے کے بجائے شخصیتوں کو مضبوط کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ادارے تباہ حال ہیں۔

ٹاؤن ون کے ملازمین اپنی بنیادی تنخواہوں کیلئے صبح و شام روتے پھرتے ہیں جبکہ " بڑوں " کے چمچے ٹھیکوں میں کمیشن لینے کے چکر میں لگے ہیں چہیتوں کیلئے ڈیڑھ لاکھ روپے ماہوار پر نئے دفتر لئے جارہے ہیں جس کی منظوری بھی دی گئی ہیں اور جلد ہی ٹاؤن ون پشاور کا دفتر پوش علاقے شامی روڈ پر نظر

آجائیگا اس صورتحال میں کوئی یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہیں کررہا کہ ڈیڑھ لاکھ روپے " بڑوں "کے " چہیتے "کیا اپنے جیب سے ادا کرینگے یا پھر آوارہ کتوں کی طرح زندگی گزارنے والے " غریب عوام" سے مختلف مدوں میں ٹیکس لگا کر نکالا جائیگا ایک طرف تنخواہیں اور پنشن دینے کیلئے پیسے نہیں اور دوسری طرف عوام کا پیہ عیاشیوں میں اڑایا جارہا ہے -

شہری روزانہ چیختے ہیں کہ شہر میں صفائی نہیں ہورہی گندگی اور بدبو کے باعث ٹاؤن ون کے مختلف علاقوں میں لوگوں کا جینا حرام ہے لیکن ان حالات میں جب " بڑوں " کے چہیتے شہریوں کے ٹیکسوں کے بل بوتے پر " عوامی خدمت "مصروف عمل ہوں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو - نہ " بل دی آت " کے "بڑے "اور نہ ٹیکس ادا کرنے والے عوام کہ آخر ہمارے ٹیکسوں پر یہ چہیتے کیوں عیاشی کررہے ہیں تو صورتحال مزید ابتر ہوجائیگی- ویسے بھی ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ استعمال ہونے والا فنڈز حکومت کا ہے اس لئے ہمیں خاموش رہنا چاہئیے حالانکہ یہ اس غریب عوام کا ٹیکس ہے جس پر " بڑے" اور ان کے " چہیتے "عیاشی کرتے ہیں لیکن ہم لوگوں میں اتنا شعور نہیں کہ اپنے ٹیکسوں پر " بڑوں "اور ان کے "چہیتوں "کا احتساب کرے -

شعبہ صحافت اور شوڑہ ماری

" شوڑا مار" دے یہ لفظ گذشتہ بارہ سالوں سے شعبہ صحافت میں ہونے کی وجہ سے سن رہا ہوں ابتداء میں تو شوڑے مار کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے بعد میں کچھ صحافی دوستوں نے سمجھا دیا کہ شوڑا مار " پیسے لینے کو " کو کہتے ہیں اور کون کون شوڑا ماری کر رہا ہے ۔وقت کیساتھ ساتھ میدان صحافت میں شوڑا ماروں کی تعداد میں بھی کسی حد تک اضافہ ہوا ہے اور ماڈرن دور میں طریقے بھی نئے آ گئے ہیں ۔اب تو سرکار بھی شوڑے ماری کو فروغ دے رہی ہیں اور کچھ وزراء
اپنے "صوابدیدی اختیارات " استعمال کرکے غریب عوام کا ٹیکس اس مد میں استعمال کررہے ہیں تاکہ ان کی واہ واہ ہو۔
کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک دور کے رشتہ دار پشاور پریس کلب میں ملنے کیلئے آئے کینٹین میں اس کیساتھ چائے پینے کیلئے بیٹھے تو اس نے بیٹھتے ہی طعنہ دیا کہ "یار تم بھی شوڑے مار ہوگئے ہو لیکن اتنے شوڑے مارے کہ پیسے لینے کے باوجود خبریں نہیں چلاتے "غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی میرے میں نے کب تم سے پیسے لئے ہیں میری تو تم سے خبروں کے حوالے سے رابطہ بھی نہیں ہوتا تو اس نے جواب میں ایک شخص کا نام بتا دیا کہ ایک

پروگرام میں یہ شخص آیا تھا اور اس نے پروگرام کی کوریج کے بعد مجھ سے خرچہ پانی مانگا جو میرے اس رشتہ دار نے اسے دیدیئے بعد میں کہا کہ یہ خبر مسرت اللہ کو بھی دے جانا تو اس شخص نے مزید پیسوں کا مطالبہ کیا کہ اسے پیسے بھی دینے ہیں اور اس کا خرچہ زیادہ ہے سو اس نے شوٹرا تو دیدیا لیکن دوسرے دن اخبار میں خبریں نہیں آئی اور اسے دکھ ہوا جو اس نے مجھے بتا دیا جس شخص کے بارے میں اس نے مجھے بتایا میں نے اسے پریس کلب میں بلوالیا کہ میں نے تم سے کب پیسے لئے ہیں جس پر متعلقہ شخص آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اس دوران گرما گرمی ہو گئی اور اس دوران اس شخص نے اعتراف کیا کہ اس نے شوٹرا ماری تو کی ہے لیکن بقول اس کے میں نے مسرت اللہ کا نام نہیں لیا خیر درمیان میں کچھ دوستوں کی آنے کی وجہ سے جھگڑا تو ختم ہوگیا لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ شوٹرا ماری کیلئے کیسے کیسے طریقے لوگ اپناتے ہیں۔

شعبہ صحافت سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اس معاملے میں اتنا ماہر ہو گئے ہیں کہ کھڑے کھڑے لوگوں کو بیچ دیتے ہیں اور ساتھ والے کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کس نے کس کو کتنے میں بیچ دیا ہے ایسے لوگ بھی میں نے میدان صحافت میں دیکھے ہیں جنہوں نے اپنے بلڈنگ قائم کردیئے ہیں حالانکہ اس شعبے میں آنے سے قبل ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا تاہم اب ایسے ماہر شوٹرا مار ہو گئے ہیں کہ ان کی روزانہ کی آمدنی دو ہزار سے پانچ ہزار روزانہ تک ہیں اور یہ سلسلہ

تاحال جاری ہے -صحافیوں کو پیسے دینے جسے ہمارے ہاں شوٹرا ماری کہتے ہیں کی عادت سیاستدانوں اور پولیس نے ڈال دی ہے جسے اب کچھ صحافی اپنا حصہ سمجھ کر وصول کرتے ہیں مختلف سیاسی پارٹیاں تو خبریں چلوانے کیلئے صحافی کو ادائیگیاں کرتی ہیں کچھ دن قبل ہمارے صوبائی حکومت نے بھی ایسے ہی ایک سلسلہ شروع کردیا یعنی "شوٹرا ماری" کو فروغ دینے کیلئے سرکار کی سرپرستی میں پروگرام ترتیب دیا گیا لیکن شکر ہے ہماری طرح کچھ "سرپھرے" صحافی میدان میں آگئے اور غریبوں کی کمائی جو کہ "صوابدیدی اختیارات" کی نذر ہورہی تھی کا سلسلہ روک دیا گیا-

کچھ عرصہ قبل پشاور یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے زیر انتظام ایک تربیتی سیشن میں حصہ لینے کا موقع ملا جہاں پر صحافیوں اور سیاستدانوں کو آمنے سامنے بٹھایا گیا اور ایک دوسرے کے دل کی بھڑاس سنانے کا موقع دیا گیا جس میں کچھ سیاسی لوگوں نے صحافیوں پر شوٹراماری کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ یہ خبریں پیسے لگا کر چلواتے ہیں اور اگر صحافت کا شعبہ صحیح انداز میں چلے تو یہ قوم لوگ کی رہنمائی کرسکتے ہیں-ہمیں تو سمت کا پتہ نہیں کیونکہ ہم لوگوں کی اپنی "سمت" ٹھیک نہیں قوم اور وہ بھی پاکستانی قوم کی سمت کیسے ٹھیک کرینگے - ہمارے شعبہ صحافت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قوم کی رہنمائی بھی کرتے ہیں حالانکہ یہاں پر شریف صحافی تنخواہ کیلئے کام کرتے ہیں انہیں

رہنمائی کا پتہ نہیں جبکہ کچھ مخصوص لوگ صحافت کی آڑ میں پیداگیری اور شوڑے ماری میں مصروف عمل ہیں خیر تربیتی سیشن میں جب میں نے سیاستدان سے کہا کہ آپ لوگ شوڑے ماری کو فروغ دے رہے ہیں تو ہمارے اپنے کچھ صحافی دوستوں کو میری یہ بات بری لگی میں نے اس بات کی وضاحت بھی کردی کہ کچھ لوگ جو ہمارے صفوں میں بیٹھ کر سیاستدانوں کی "پی آر اوشپ" کر رہے ہیں کچھ لوگ کو مذہبی جماعتیں اس چکر میں چیکس کی شکل میں ادائیگی کرتی ہیں اور کچھ صحافی ماہوار شوڑا ماری پر سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید بنا رہے ہیں اور ان لوگوں کی وجہ سے نئے آنیوالے اور اس شعبے میں " تنخواہ "کیلئے کام کرنے والے شریف صحافی نہ صرف بدنام ہو رہے ہیں کیونکہ سفید کو سیاہ اور سید کو سفید بنانے والوں کو شوڑا ماری کی مد میں اچھے پیسے ملتے ہیں جو دوسرے صحافیوں کیلئے تحریص وترغیب کا باعث بن رہی ہیں - صحافیوں پر شوڑا ماری کا الزام لگانے والے سیاستدان ہی اس مرض کو صحافیوں میں عام کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں.

صحافیوں کو پیسے دینے کا مرض پولیس میں بہت زیادہ ہے چونکہ یہ لوگ اپنے افسران بالا کو خوش کرنا چاہتے ہیں اس لئے خبروں میں کاروائی سی سی پی او کی ہدایت پر ڈی ایس پی کے حکم پر متعلقہ ایس ایچ او نے کارروائی کی جیسی خبریں چھپنے سے خوش ہو جاتے ہیں اس لئے یہ لوگ ایسے خبریں چلوانے کیلئے

صحافی کو شوٹرا ماری کی عادی کرواتے ہیں - تقریبا ایک ماہ قبل ایک تھانے میں پریس کانفرنس کی اطلاع آئی مجھے اس ڈیوٹی کیلئے کہا گیا پریس کانفرنس کیلئے وقت بارہ بجے کا تھا میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا ساتھ میں ایک اور ٹی وی چینل کا صحافی بھی موجود تھا تاہم ڈی ایس پی صاحب جو کہ پریس کانفرنس کرنے والے تھے آدھ گھنٹے تک نہیں آئے میں نے دوسرے ٹی وی چینل کے ساتھی کو کہا کہ نکل چلو یہ ہمیں لیٹ کروا رہے ہیں جب ہم دونوں نکلنے لگے تو متعلقہ ایس ایچ او نے ہمیں زبردستی روک لیا کہ بس صاحب آنے والے ہیں کچھ صحافی دوست اور بھی موجود ہیں پریس کانفرنس کے بعد موقع پر ہمیں لے جایا گیا اور کارروائی دکھائی گئی جب ہم نکل رہے تھے کچھ مخصوص صحافیوں کو ایس ایچ او پانچ پانچ سو روپے دینے لگا جب ہم گاڑی میں بیٹھنے لگے تو اس نے گاڑی میں پانچ سو روپے کا نوٹ پھینک دیا اور کہا کہ یہ تمھارا "خرچہ پانی" ہے میں نے اسے واپس کردیا کہ بھائی میری اوقات اتنی نہیں اور دوسری سب سے بڑی بات کہ میں "خرچے پانی" والا صحافی نہیں اس پر ایس ایچ او ناراض ہوگیا اور کہا کہ یہ دوستی میں دے رہا ہوں میں نے اسے جواب دیا کہ بھائی میرے دوستی کرنی ہے تو "خبروں" پر دوستی کرو کہ جیسے کچھ ہو تو مجھے پہلے بتادیا کرو اس سے نہ صرف مجھے بروقت خبریں ملیں گی بلکہ تمھاری کارکردگی بھی آئیگی میں نے پیسے نہیں لئے ایس ایچ او نے اس وقت بات تو مان لی لیکن اس کے بعد اس نے رابطہ کرنا ہی بند کردیا-اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ شوٹرا ماری والا نہیں اس

لئے اسے اپنے مخصوص لائن میں نہیں لایا جاسکتا اس لئے اس نے مجھے اپنے لسٹ سے ہی نکال دیا۔ خیر خبریں تو مجھے اب بھی مل رہی ہیں لیکن چونکہ میں شوٹرا مار نہیں اس لئے بروقت خبریں کبھی کبھار مس ہو جاتی ہیں۔

میں اپنے آپ کو اونچے سطح کا صحافی نہیں سمجھتا اور نہ میں ہوں میں بھی ایک عام سا آدمی ہوں جس کی خواہشات بہت ساری ہیں لیکن جب حلال سے اللہ تعالی دے رہا ہو تو " شوٹرا ماری " کی ضرورت ہی کیوں ہے۔ شوٹرا ماری کے معاملے میں صحافی تنظیموں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہیں کہ وہ ایسے " شوٹرا ماری " کرنے والے افراد کیلئے کوئی قانون / ضابطہ مقرر کرے تاکہ شوٹرا ماری کرنے والے صحافی کی حوصلہ شکنی ہو اسی طرح اخبارات کے مالکان / نیوز ایڈیٹرز بھی اس معاملے میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں تو تبھی اس کی روک تھام ہو سکتی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اگر حکمران جو کہ خود بھی غریب عوام کے ٹیکسوں پر " پل " رہے ہیں اپنے " صوابدیدی اختیارات " کا استعمال بند کردے تو ہمارے ہاں " شوٹرا ماری " بند ہو سکتی ہیں۔

! خدارا ! بے بس عوام پر رحم کیجئے

وہ جب تیرہ سال کی ہوئی تو اس کے بال جھڑنے کا سلسلہ جاری ہوا اور سکول و کالج میں دوران تعلیم لوگ اسے گنجی کہہ کر پکارتے تھے ۔کلاس فیلوز اس کا مذاق اڑاتے اور وہ روزانہ اپنے ساتھیوں سے جھگڑ کر واپس گھر آجاتی اور والدین سے رو رو کر یہ شکایت کرتی کہ " آخر میرے ساتھ ہی یہ کیوں ہو رہا ہے "اور میں گنجی کیوں ہو رہی ہوں۔ جس کا جواب کوئی نہیں دیتا کیونکہ اسے ایسے بیماری لگ گئی تھی جس کے باعث نہ صرف اس کے بال جھڑ گئے بلکہ اس کے بھنویں بھی ختم ہو گئیں اور وہ لوگوں میں بدصورتی کا "نمونہ " بن گئی ۔لیکن !

یہ قصہ برطانیہ کی ایک لڑکی " جوانا روسل " کا ہے جس نے اپنی ہمت سے ایسی داستان رقم کی کہ آج لوگ اس گنجی کی ہمت کو داد دے رہے ہیں - جوانا روسل ہی وہ لڑکی ہے جس نے اولمپک 2012 ء میں سائیکلنگ کے مقابلوں میں گولڈ میڈل حاصل کیا یہ وہی لڑکی ہے جو لوگوں کے رویوں سے بددل ہو گئی تھی لیکن جب اسے وکٹری سٹینڈ پر گولڈ میڈل دینے کیلئے بلایا جا رہا تھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ اپنے گنجے پن کو چھپانے کیلئے وگ بھی استعمال کر سکتی ہیں تاکہ اسے اپنی بدصورتی کا احساس نہ ہو اور نہ ہی کسی احساس کمتری کا شکار ہو کیونکہ اس کے

ساتھ کھڑی ہونیوالی دیگر سائیکلسٹ کے خوبصورت بال تھے اور انہوں نے چوٹیاں باندھی ہوئی تھیں لیکن اس بہادر لڑکی نے یہ کہہ کر وگ استعمال کرنے سے انکار کر دیا کہ "آج میں چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے میری اصل سے پہچانے اور حقیقت میں دیکھیں جیسی میں ہوں " یہ کہہ کر اس نے وکٹری سٹینڈ پر کھڑے ہو کر سائیکلنگ کے میدان میں گولڈ میڈل حاصل کیا-آج اس باہمت لڑکی کو نہ صرف برطانیہ بلکہ پوری دنیا میں سلام پیش کیا جارہا ہے اور اسے آئیڈیل قرار دیا جارہا ہے- بالوں کے نہ ہونے کی وجہ سے " گنجی " ہو کر تضحیک کا نشانہ بننے والی "جوانا روسل "آج دنیا بھر میں لڑکیوں اور خصوصا کھیل کے میدان میں ہمت اور بہادری کا "نمونہ " ہے -

ہمارے معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی کمی کا شکار ہے اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے -آپ کو بہت سارے لوگ "جوانا روسل "کی بیماری کا شکار نظر آئینگے اس کے ساتھ ہم لوگوں کا رویہ کیسا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح برطانوی سائیکلسٹ جوانا روسل کیساتھ اس کے سکول کے ساتھیوں کا تھا لیکن جوانا نے جب سیکنڈری سکول میں سائیکلنگ کے کھیل میں حصہ لیا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا- اسے لگنے والی بیماری ایک سو افراد میں سے ایک شخص کو ہوتی ہے اس کے ارد گرد لوگ اسے گنجی کہہ کر مذاق اڑاتے تھے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور کھیل کے میدان میں مستقبل مزاجی کیساتھ مصروف عمل رہی - اپنی اسی ہمت سے

اولمپک 2012 ء میں سائیکلنگ کے مقابلوں میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ایسے وقت میں جب ساری دنیا اس کو ٹی وی سکرین پر دیکھ رہی تھی اس نے اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیا اس گنجی نے گولڈ میڈل حاصل کرکے سب کو دکھادیا کہ امید کیساتھ ہمت ہو تو بہت کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔

ہم وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے زخموں پر نمک ڈالنا جانتے ہیں یا پھر اسے مزید چیر لگانے کی ہماری سوچ ہے تاکہ دوسروں کو تکلیف ہو ہمارے اس رویئے نے ہمارے ارد گرد کتنے ہی باصلاحیت لوگوں کو تباہ و برباد کردیا ہے ہم میں انفرادی طور پر دوسروں کو برداشت کرنے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کی کمی ہے اور اسی رویئے کے باعث ہم لوگوں کو اپنے سے آگے بڑھتا ہوا دیکھ نہیں پاتے۔ اور یہی انفرادی عمل اب ہمارے اجتماعی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ میرے اتنے لمبے تمہید کا مقصد ایک سیاسی پارٹی کی جانب سے لاہور میں کینسر ہسپتال پر اچھالی جانیوالی کیچڑ کے بارے میں بات کرنا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ایسے مریض ہیں جو برطانوی سائیکلسٹ کی طرح ہمت کرکے اپنے آپ کو آگے لاتے ہیں کتنے ایسے ہیں جو اپنی کسی موذی بیماری کا علاج کرنے کیلئے ہسپتال کا رخ کرتے ہیں اور ایسے کتنے مریض ہیں جو ایسے ہی بیانات کی وجہ سے نہ صرف دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں بلکہ ہزاروں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی زکواۃ عطیات کا پیسہ بیماروں کے علاج پر خرچ ہوتا ہے لیکن انہوں نے ان بیانات کے بعد عطیات اور زکواۃ

متعلقہ ہسپتال کو نہیں دیئے جس کا اثر ان غریب لوگوں پر پڑے گا جو اسی ہسپتال میں کینسر جیسے موذی مرض کا علاج کرنے کیلئے آتے ہیں -

میرا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں- اپنی چھتیس سال کی زندگی میں کوئی ایسی سیاسی پارٹی نہیں دیکھی جو اس ملک کے غریب اور بے بس عوام کیساتھ مخلص ہوں یہاں پر آنیوالا ہر ایک خواہ وہ شیر پر بیٹھ کر سیاست کر رہا ہے یا پھر روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر عوام کو تیر مار رہا ہے اکیسویں صدی میں بھی عوام کو"لالٹین "کی روشنی دے رہا ہے یا پھر کوئی انقلاب لا رہا ہے -ان باتوں سے غریب اور بے کس عوام کو کوئی فائدہ نہیں کیونکہ دال آٹے چینی کے چکر کے بعد مہنگائی اور بجلی نے انکی کمر توڑ دی ہے بلکہ انہیں مختلف بیماریوں کا شکار کردیا ہے ان بیماریوں میں ایک بیماری کینسر کی بھی ہے جس کے علاج کیلئے اگر کسی شخصیت نے ہسپتال قائم کردیا ہے اجہاں پر غریب لوگ بھی علاج کیلئے جا سکتے ہیں - اگر اس ہسپتال کو سیاست کی نذر کیا جائے تو یہ ان غریب عوام کیساتھ زیادتی ہے جو حکمرانوں کو اس وقت یاد آتے ہے جب انہیں "ووٹ "کی ضرورت ہو -

خدارا! وطن عزیز کو 65 سال گزر گئے ہیں آج عوام کو کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی دلچسپی نہیں نہ رہی چند لوگ اگر پارٹیوں کے زندہ باد ` مردہ باد کے

نعرے لگا رہے ہیں انہیں اس کی "پیمنٹ" ملتی ہیں عوام اپنے مسائل کا حل چاہتی ہیں انہیں روزگار کی ضرورت ہے انہیں بیماریوں کے خلاف لڑنا ہے اور ان مسائل کے حل کیلئے تمام سیاسی پارٹیوں کو اپنے اختلافات ختم کرنے ہونگے سیاسی رہنماؤں کے اپنے مقاصد اور ایجنڈے ہیں لیکن خدا کیلئے اگر کوئی بھی شخصیت اس غریب عوام کیلئے کوئی بھلائی کا منصوبہ چلا رہا ہے تو اسے سپورٹ کریں انہیں برداشت کرے اگر کسی میں اس طرح کی بھلائی کی ہمت نہیں تو دوسروں کی ہمت دلائیں انکے ساتھ تعاون کرے تاکہ غریب عوام کی حالت بہتر ہو۔

لاپتہ افراد اور عید

خدا ان لوگوں کو تباہ و برباد کرے جنہوں نے میرے آٹھویں کلاس کے معصوم طالب علم بیٹے کو مجھ سے دور کیا اور بغیر کسی وجہ کے ڈیڑھ سال سے میں اپنے بیٹے کیلئے خوار ہو رہی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ میرے بیٹے کا جرم کیا ہے - ہاں ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں اور ہماری کوئی سنتا نہیں لیکن اللہ تعالی تو سننے والی اور دیکھنے والی ذات ہے - یہ گلہ شکوہ مچنی کے علاقے انگور کلے سے ڈیڑھ سال قبل لاپتہ ہونیوالے نعیم کی والدہ کا ہے جو گذشتہ دنوں پشاور ہائیکورٹ میں لاپتہ افراد کی کیس کی سماعت کیلئے آئی ہوئی تھی اس کے ہمراہ ایک چھوٹی سی معصوم بچی بھی تھی جو اپنے بھائی کی تصویر اٹھائے ہائیکورٹ میں کھڑی تھی - نعیم کی والدہ کے بقول اس کا بیٹا سکول سے واپس آ رہا تھا کہ اڈے کے قریب پولیس نے اس کو گاڑی سے اتارا اور سیکورٹی فورسز کے آدمیوں نے میرے چھوٹے بیٹے کو گاڑی میں ڈالا اور وہاں سے لے گئے اور ابھی تک میرا بیٹا لاپتہ ہے یہ داستان غم سناتے ہوئے دکھوں کی ماری ماں رو پڑی - اور اس نے نعیم کو لاپتہ کرنے والے افراد کو بد دعائیں دینا شروع کر دیں جو ہمارے ہاں مجبور اور بے کس لوگ ہی دیا کرتے ہیں -

ایسی ہی دکھ بھری داستانیں لاپتہ ہونیوالے افراد کے رشتہ داروں کی ہیں جو ان کے غم اور دکھ شیئر کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے لاپتہ ہونیوالے افراد کے رشتہ دار جن میں معصوم بچے ، بوڑھی خواتین ، بہنیں شامل ہوتی ہیں ان کے چہروں پر ایسے دکھ ہوتے ہیں جو کسی حساس شخص کو نظر آتے ہیں ان لاپتہ افراد میں ایسے معصوم فرشتے بھی میں نے خود دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے لاپتہ ہونیوالے والدین کو نہیں دیکھا صرف ان کی تصاویر اٹھائی ہیں اور اپنی ماں یا دادی کے ساتھ لاپتہ افراد کے کیس کی سماعت کے موقع پر نظر آتی ہیں کہ شائد ان کے پیاروں کو اٹھانے والے کچھ احساس کریں اور انہیں چھوڑ دیا جائے ۔ان بدنصیب لوگوں کی داستانیں سن کر ایسا لگتا ہے جیسے سولہویں صدی میں افریقہ کے کسی غار میں رہتے ہوں اور سفید فام جیسا سلوک ان کیساتھ کیا کرتے تھے ۔ ویسا ہی سلوک ان لوگوں کیساتھ کیا جا رہا ہو

ہمارے کچھ عوامی نمائندے سابق صدر پرویز مشرف کو اس حال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جنہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انسانوں کا معاوضہ لینا شروع کیا۔ لیکن ان لاپتہ ہونیوالے افراد میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پیارے اس عوامی جمہوری دور میں لاپتہ ہوئے ہیں اور ان کو غائب کرنے والوں میں ہمارے تحفظ کیلئے ہم سے ٹیکس لیکر ڈیوٹی انجام دینے والی پولیس فورس اور دیگر لوگ شامل ہیں آخر ہم لوگ دوسروں کے دکھ درد کا احساس کیوں نہیں کرتے کیا ایک بیلٹ

پہن کر ہر کوئی قانون/انسانیت کی دائرے سے نکل جاتا ہے۔ہمارے معاشرے میں جھوٹی قسمیں کھاکر منکر ہو جانا ایک وطیرہ بن گیا ہے یہ بات بھی گذشتہ دنوں خیبر ایجنسی کے ایک طالب علم نے بتائی اور اس نے باقاعدہ ایک پولیس افسر کا نام لیکر کہا کہ اس نے مدرسے میں زیر تعلیم میرے بھائی کو بشہ تل باڑہ سے دیگر دو دوستوں کے ہمراہ بغیر کسی وجہ سے گاڑی میں ڈال دیا اس کے ساتھی کو چالیس ہزار روپے دیکر چھوڑ دیا گیا جبکہ میں اپنے بھائی سے ملنے اور اس کیلئے روٹی بھی اسی پولیس افسر کی موجودگی میں لے گیا تھا بعد میں وہ پولیس افسر مجھ سے دس لاکھ روپے کا مطالبہ کرنے لگا کہ اتنی رقم دو تو تمھارے بھائی کو چھوڑ دونگا اور تب سے میرا بھائی لاپتہ ہے۔ شکر ہے کہ عدالت عالیہ نے اس سلسلے میں نوٹس لیا ہے اس وقت پشاور ہائیکورٹ میں 171 افراد کی گمشدگی کی کیسوں کی سماعت ہورہی ہیں یہ عدالت عالیہ کا احسن اقدام ہے اس اقدام پر پر چیف جسٹس پشاور ہائیکورٹ کیلئے لوگوں کی دلوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔لیکن کیا ہمارے اس معاشرے میں عدالتیں ہی لوگوں کو ٹھیک کرینگی اور یہ سلسلہ کب تک رہیگا!

میں اس ماں ` بہن ` بیٹی اور بیوی کیلئے بھی خون کے آنسو رو رہا ہوں جن کا گھر سے عبدالصمد نو ماہ قبل یہ کہ کر روانہ ہوا کہ صدر میں ٹائر تبدیل کرنے جارہا ہوں اور پھر وہ پشاور صدر سے لاپتہ ہوا والدین نے عدالت عالیہ میں

گمشدگی کی رٹ جمع کرادی اور دو ماہ بعد اس کی بوری بند لاش مل گئی ۔ کس نے مارا اور کیوں مارا یہ اس جمہوری عوامی حکومت میں جس کے نمائندے اپنے آپ کو سپریم قرار دینے کے چکروں میں مصروف عمل ہیں اور حکومتی سربراہ اپنے میٹرک پاس بیٹے کو اس " بے غیرت " قوم کے پیسوں پر دنیا بھر یں سیر کروارہے اور اسے ان کمین کمینوں پر حکمرانی کے اداب سکھا رہا ہے سے کوئی پوچھ سکتا ہے یا کوئی پوچھنے والا ہے کہ آخر ان جیسے سینکڑوں لوگ جن کا تعلق کسی بھی نسل /مذہب سے ہے کیوں لاپتہ ہوا اور کیوں یہ لوگ اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے کیونکہ جس آئین کے بل بوتے پر اپنے آپ کو یہ لوگ سپریم قرار دینے کے چکر میں ہیں اسی آئین کے ان کی ذمے شہریوں کو تحفظ دینے کی ذمہ داری بھی لگائی ہے ۔ سپریم قرار دلوانے والے یہ لوگ تو اپنے خاندان والوں کیساتھ بیٹھ کر عیاشیوں میں مصروف ہے لیکن اس شخص جس کی لاش نو ماہ بعد ملے اور اس کے رشتہ داروں کو یہ پتہ نہ ہو کہ آخر اسے کس جرم میں بوری میں بند کرکے ڈال دیا گیا کیا ۔ سپریم قرار دینے والے ان لوگوں سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ اس عیدالفطر پر وہ معصوم بچے / بہنیں / والدین اپنی عید کیسے مناپائیں گے اس کا جواب کوئی دے سکتا ہے ۔یا وہ لوگ جن کے رشتہ دار لاپتہ ہیں اور انہیں نہیں پتہ کہ کس جرم میں ان کے پیارے لاپتہ ہے اور کیا ان کے پیارے زندہ بھی ہیں کہ نہیں ۔

میں ایک عام شہری کی حیثیت سے پاکستان کے 65 سال سے کوئی سروکار نہیں اور نہ
اس سے کوئی سروکار ہے کہ اس ملک کے پاس ایٹم بم ہے نہ ہی اس سے کوئی مقصد ہے
کہ اس ملک کوئی کتنا طاقتور یا پیسے والا ہے اس کا مذہب کیا ہے مجھے بحیثیت ایک ماں /
بہن / بیوی جن کے رشتہ دار لاپتہ ہو چکے ہوں اس سے کوئی غرض نہیں نہ ہی مجھے کوئی
فرق پڑتا ہے۔ لیکن میرا آپ لوگوں سے یہ سوال ہے کہ اس عید پر میں اپنے پیارے
بھائی / شوہر / والد کی گمشدگی کے حوالے سے کیا جواز دوں کیونکہ سب کے پیارے عید
پر اپنے گھر واپس آ جاتے ہیں عید کی خوشیوں میں رشتہ داروں دوستوں کیساتھ مشغول
ہو جاتے ہیں لیکن ہمارا پیارا جو لاپتہ ہوا ابھی تک لاپتہ ہے اس کی گمشدگی کا دکھ میں
بحیثیت / ماں / بہن / بیوی / والد کیسے برداشت کروں۔ ہاں ہم جیسے بے کس لوگ تو
برداشت کرلیں گے لیکن ہر کوئی یہ جان لے کہ اگر آج میرا کوئی پیارے مجھ سے لاپتہ
ہوا ہے تو کل آپ لوگوں کا پیارا بھی لاپتہ ہو سکتا ہے اس وقت کیلئے سوچیئے !۔

تھائی لڑکے کو لڑکی سمجھنا

تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں لڑکوں کی شان نرالی ہے یہاں پر ایسے لڑکے میں نے دیکھے جن کے بال ہمارے ہاں کے لڑکیوں سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں اور انہوں نے کانوں میں ائیر رنگ ڈالے ہوتے ہیں میں خود بھی ایک لڑکے کو لڑکی سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

لڑکے کو لڑکی سمجھنے کی غلطی میں نے گیسٹ ہاؤس میں کی ۔میں گیسٹ ہاؤس میں سویا ہوا تھا کہ صبح سویرے گانے سے میری آنکھ کھل گئی میں گانے کی آواز سننے کیلئے دیوار کیساتھ کان لگائے چونکہ دیوار لکڑی کی تھی تو آواز آرہی تھی باریک سی آواز میں لڑکی گانا گارہی تھی ۔ صبح سویرے لڑکی کی آواز میں گانا اور آواز بھی پیاری تھی ۔میں جلدی سے سلیپر پہن کر کمرے سے باہر آگیا کہ چلو دیکھ تو لو کہ کیسی " لڑکی " ہے ۔طبعیت میں تو ہماری بھی شوخ ہے اور ویسے بھی بیرون ملک ہے اپنے ملک میں تو بیگم کے ڈر سے کسی کو دیکھ نہیں سکتے اب یہاں تو کوئی بھی نہیں ۔ سو میں کمرے سے باہر نکل آگیا باہر نکل کر دیکھا تو وہ صفائی میں مصروف تھی بالوں کی پونی بنائی ہوئی تھی جینز اور شرٹ میں وہ فرش کی صفائی میں لگی ہوئی تھی میری طرف اس کی پشت تھی ۔

میں نے اس کو دیکھ کر دل میں سوچا کہ دیکھو کتنی پیاری آواز والی لڑکی ہے اور اس کی محنت دیکھو صفائی بھی کتنی خوبصورتی سے کررہی ہے میرے دل میں " مردانہ ہمدردی "کے جذبات بھی ابھرے اس لئے میں جلدی سے اسے سامنے سے دیکھنے کیلئے آگے گیا دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر خوبصورت ہوئی تو اس سے کسی بہانے سے بات کرونگا -آگے جا کر شکل دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ 'موصوفہ "نہیں بلکہ " موصوف " ہے اس کو دیکھنے کے بعد میرے سارے مردانہ ہمدردی کے جذبات بھی ختم ہوگئے اور اپنے اوپر ہنسی بھی آرہی تھی کہ یہاں بھی لمبے بالوں کی بیماری ہے -

ہم لوگ تو اپنے پاکستان میں لڑکوں کو روتے ہیں یہاں بنکاک کے لڑکے تو پاکستانی لڑکیوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کیونکہ ان کے کانوں میں دو مختلف اقسام اور رنگوں کے ائیر رنگ بھی ہوتے ہیں- یہاں آکر پتہ چلا کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں لڑکیاں لڑکوں کی طرح چھوٹے بال کاٹتی ہیں ہر لڑکی نے کانوں میں مائیکروفون ڈالا ہوتا ہے اور گانے سنتی ہیں یہاں پر موبائل فون بہت زیادہ سستے ہیں جو موبائل فون ہمارے ہاں پاکستان میں تین ہزار روپے کا ملتا ہے وہ بنکاک میں چودہ سو روپے میں فروخت ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہمارے موبائل فون پر اردو اور عربی زبان میں حروف تہجی لکھے ہوتے ہیں جبکہ تھائی لینڈ میں فروخت ہونیوالے موبائل فون میں تھائی زبان کے حروف تہجی ہوتے ہیں -

جس طرح ہمارے ہاں موبائل فون میں ایف ایم چینل سنے جاتے ہیں اسی طرح ان کے ہاں بھی ہوتا ہے تاہم وہاں پر اتنے ایف ایم چینل موبائل فون کے ذریعے سنے جاتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے کہ میں کیا سنوں اور کیا نہ سنوں ۔اور جب میرا طرح کا کوئی سیاح ہو تو پھر تو بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ الفاظ کی سمجھ تو نہیں آتی لیکن موسیقی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ خیر بات لڑکیوں کی ہو رہی تھی تھائی لڑکیاں گانے سننے کی ۔ بہت شوقین ہوتی ہیں اسی وجہ سے ہر وقت ان کے کانوں میں ہیڈ فون لگے ہوتے ہیں میں بنکاک کے ایک بازار میں گھوم کر ونڈو شاپنگ کر رہا تھا اور مجھے کچھ معلومات کی ضرورت تھی پاس گزرنے والی ایک لڑکی کو آواز دی لیکن وہ لفٹ ہی نہیں کروا رہی تھی آخرکار مجبور ہو کر لڑکی کو اشارہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا اور کانوں سے ہیڈ فون اتار کر میری بات سنی اور مجھے معلومات دی اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تھائی لڑکیاں گانے سننے کی کتنی شوقین ہوتی ہیں۔

صحافی اور ان کی اوقات

ساری دنیا کی مشکلات میڈیا پر لانے والے صحافی کہنے کو تو بڑے بہادر ہوتے ہیں اور اپنی باتوں اور خبروں میں سورماد کھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کی اوقات اتنی ہی ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنے حق کیلئے آواز تک نہیں اٹھا سکتے نہ ہی اپنی مشکلات کسی کو بیان کر سکتے ہیں ۔ہمارے معاشرے میں لوگ صحافیوں کو بہت اونچی چیز سمجھتے ہیں ہر چیز کی خبر رکھنے والے لوگ اور ہر غلط چیز کو سامنے لانے والے بہادر لوگ ۔لیکن لوگوں کی نظروں میں اعلی وارفع یہ صحافی کتنے کمزور ہیں اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی تنخواہ تک نہیں لے سکتے اور نہ ہی اس بارے میں کوئی آواز اٹھا سکتے ہیں۔

مالکان پرنٹ کے ہوں یا الیکٹرانک میڈیا کے ان کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے اور یہ سارے ہم جیسوں کو لیبر سمجھتے ہیں اور مزدوروں کی طرح ہی سلوک کرتے ہیں ان کی بڑی بڑی بلڈنگ اور اخبارات ہم جیسے مزدوروں کے خون پسینے سے کھڑی اور بنی ہیں یہ الگ بات کہ ہم لیبر ہوتے ہوئے بھی نہ تو مزدوروں کی طرح مراعات حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہمیں یونین سازی کا حق حاصل ہے ہاں اپنے دل کو خوش کرنے کیلئے ہم اپنے آپ کو صحافی کہہ کر اپنی انا کو دم دلاسہ دے دیتے ہیں۔

اس ملک میں کتنے ایسے اخبارات ہیں جن میں کام کرنے والے صحافیوں کو چھ چھ ماہ سے تنخواہیں نہیں مل رہی لوگوں کے مسائل کو شہ سرخیوں میں دینے والے صحافی کے اپنے گھر والوں پر کیا گزرتی ہے کبھی کسی نے سوچا ہے -مزے کی بات تو یہ ہے کہ تنخواہیں نہ دینے والوں میں ایسے اخبارات بھی شامل ہیں جن کے مالکان ٹی وی چینلز پر بیٹھ کر بڑی بڑی بڑھکیں مارتے ہیں اور اپنے آپ کو ولی کا درجہ دیتے ہیں-حکومت کو جمہوریت سمیت پتہ نہیں کس کس چیز کی سبق دیتے ہیں اور انہیں دیکھ کر ٹی وی دیکھنے والے ناظرین انہیں ولی اللہ سمجھ بیٹھتے ہیں -

کچھ روز قبل لاہور کی ایک خاتون صحافی نے دو ماہ سے تنخواہ نہ ملنے پر ہاسٹل کی چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی وجہ تنخواہ کا بروقت نہ ملنا تھا اس خاتون پر پورے گھر کی ذمہ داری تھی اور اخبار کا مالک اسے تنخواہ نہیں دے رہا تھا جس کے باعث ہاسٹل میں بھی اسے مسائل کا سامنا تھا اس کی خودکشی کے باعث بڑی بڑی باتیں ہوئی لیکن کسی نے اس اخبار کے مالک سے کچھ پوچھا نہ ہی ہمارے کسی صحافیوں کی تنظیم نے نہ ہی حکومتی ادارے نہ اور نہ ہی کسی عدالت نے اس اخبار کے مالک سے یہ پوچھا کہ آخر کار کیا وجہ ہے کہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا -س کی مرنے کے بعد ایک سیاسی پارٹی کے رہنما کی طرف سے ایک لاکھ روپے کا چیک متعلقہ خاتون صحافی کے گھر والوں کو بھیج دیا گیا

۔ لیکن کیا یہ مسئلے کا حل ہے

ہمارے ہاں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ایسے ادارے ہیں جو پانچ ہزار سے آٹھ ہزار روپے تک تنخواہیں اپنے قلم کے مزدوروں کو دیتے ہیں اور وہ بھی قسطوں میں۔ ہم جیسے لوگوں سے تو گدھوں کی طرح قلم کی مزدوری لی جاتی ہیں اور ان کے مالکان گردن اکڑا کر کہتے ہیں کہ ہم صحافت کے ذریعے قوم کی خدمت کر رہے ہیں حالانکہ یہ جیسی خدمت اپنے مزدوروں) صحافیوں (سے کروا رہے ہیں اگر ان کے اصلی چہرے ۔منظر عام پر آجائے تو لوگوں کو پتہ چلے کہ کیسے کیسے ڈرامے باز یہاں پر بیٹھے ہوئے ہیں ہمارے ایک ساتھی ایک مقامی اخبار جو حقیقت میں بیگار کیمپ ہے یں سے وابستہ ہے بیگار کیمپ اس حوالے سے کہ قلم کے مزدوروں سے جتنا کام لیا جاتا ہے اتنے کا آدھا حصہ بھی ان صحافیوں کو تنخواہوں کی مد میں دیا نہیں جاتا ۔بقول ہمارے ساتھی کہ میں اپنے کام سے تنگ نہیں لیکن دفتر یں لگنے والے آفس آرڈر سے تنگ ہوں کیونکہ جب بھی مالکان کے گھر میں ختم قرآن شریف یا خیرات ہوتا ہے تو دفتر سے مزدوروں کو بلایا جاتا ہے کیونکہ مساجد سے مولوی لانے میں خرچہ پڑتا ہے جبکہ دفتر میں کام کرنے والے مزدور مفت میں مزدوری بھی کر جاتے ہیں اور ختم قرآن شریف بھی انہی لوگوں سے کروائی جاتی ہیں تاکہ انہیں

اللہ تعالی بخش دے - یہ مالکان اپنے مزدوروں کے ذریعے اپنے آپ کو بخشواتے ہیں - بقول ہمارے دوست کے مالکان کے گھر میں ختم قرآن شریف اور خیرات میں حصہ لینے کیلئے مجبورا تو چلا جاتا ہوں لیکن اس دن لیکن اس دن اپنے گھر میں فیملی کیساتھ جھگڑا ضرور ہوتا ہے -بقول میرے اس دوست کے کہنے کو تو میں صحافی ہوں لیکن میری اتنی ہی اوقات ہے کہ میں اپنے مالک کو "نہ" کہہ سکتا کیونکہ اگر انکار کرونگا تو پھر مالک اور اس کے "چمچے" میرے لئے دفتر میں اتنے مسائل پیدا کرتے ہیں کہ میرا اس شعبے سے دل بھر جاتا ہے -اس ادارے میں ہمارے ایک دوست جو آج کل وکیل ہے نے کسی زمانے میں کام کیا تھا اس نے اپنے غصے کا اظہار کچھ ایسے کیا تھا کہ جب اخبار کے مالک کے رشتہ دار وفات پا گئے تو دفتر میں آرڈر لگ گیا کہ جنازہ ہے اور سب نے شرکت کرنی ہے تو میرا وہ دوست جو اس وقت ادارے میں کام کر رہا تھا کہ اتنا غصے میں آگیا تھا کہ اس نے جنازے میں بے وضو شرکت کرکے اپنی غصے کا اظہار کیا تھا - خیر بات کہاں سے کہاں تک آگئی - ان باتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مالکان قلم کے مزدوروں کو کیا سمجھتے ہیں اور ان کا اپنے ملازمین کیساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے -

کوئی صحافی نہ تو انفرادی طور پر اس حوالے سے آواز اٹھا سکتا ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر- کچھ عرصہ قبل ایک تنخواہیں ادا نہ کرنے پر میں نے اس ادارے کے ایڈیٹر کو ای میل کے ذریعے آگاہ کردیا کیونکہ اس کا ایڈیٹر ٹی وی پر بیٹھ

کراتی بڑی باتیں اب بھی کرتا ہے کہ لگتا ہے کہ پورا پاکستان یہی چلا رہا ہے میرے ای میل کا اثر تو کچھ نہیں ہوا الٹا اس ادارے کا ایک شخص میری ممبرشپ ختم کرانے کیلئے دوڑ دھوپ کرنے لگا کہ اس نے "سچی بات" کہہ کر مجھے ننگا کردیا ہے خیر اس وقت کی انتظامیہ نے معاملے میں دلچسپی نہیں لی لیکن اس معاملے سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہاں پر سچ بولنا" بھی جرم ہے اور کسی کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کی ضرورت ہی نہیں -"

اب یہاں پر ویج ایوارڈ کی باتیں تو بہت ہورہی ہیں اور فیصلہ بھی عدالت دے چکی ہیں لیکن اس پر عملدرآمد کون کروائے - صحافی تنظیموں نے اخبارات کے اشتہارات تنخواہوں کی ادائیگی سے مشروط کرنے کیلئے بھی بہت زور لگایا لیکن یہ معاملہ بھی جہاں سے چلا تھا وہیں پر ہی ہے اور اب تو ہمیں سرکار کی وعدوں پر اعتبار ہی نہیں رہا -

موبائل دہشت گردی اور انوکھے بالوں والے وزیر کی انوکھی منطق

ہمارے داخلے کے وزیر بھی نرالی شخصیت کے مالک ہیں جس طرح ان کے بالوں کا رنگ عجیب ہے اسی طرح ان کی سوچ اور زبان بھی انوکھی ہے اپنی انوکھی سوچ اور وفاداری کی وجہ سے اسلامی عوامی اور ساتھ میں جمہوری پاکستان کے حکمران طبقے کے بہت نزدیک ہیں گذشتہ دنوں انہوں نے پری پیڈ موبائل فون بند کرنے کا اعلان کرکے نہ صرف قوم کو چونکا دیا بلکہ موبائل فون کمپنیوں کو بھی جھٹکا دیا موصوف کے اعلان کے بعد عید پر مختلف صوبوں میں موبائل فون سروس بند کردی گئی اور وجہ یہ بیان کردی کہ دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ عید گزرنے کے بعد اکلوتے بیٹے کو قوم کے خرچے پر سیر کروانے والے "سربراہ" نے داخلے کے وزیر کو شاباش دیدی کہ انہوں نے عید پر بڑے اچھے اقدامات کئے اور حالات پرسکون رہے۔ قوم نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ دہشت گردی نہیں ہوئی !

ویسے منطق بھی عید پر موبائل فون سروسز بند کرنے کی عجیب ہی ہے کہ دہشت گرد موبائل فون کے ذریعے دہشت گردی کرتے ہیں کیا یہ کہہ کر کہ "چھری" سے لوگوں کو ذبح کیا جاتا ہے اس لئے چھری تیار کرنا جرم ہے حالانکہ اسی چھری سے تو ٹماٹر پیاز بھی کاٹے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں مولوی وی سی آر کو

ہر برائی کی گڑھ سمجھتے تھے اور ان کے بقول اس سے فحاشی پھیلتی ہے حالانکہ وی سی آر کا استعمال میڈیکل کے شعبے کیلئے میں کتنا مفید ہے کیونکہ اس کے ذریعے آپریشن اور سرجری نئے لوگوں کو سکھائی جاتی - اسی کے ساتھ سمجھنے والی بات کیا اس مملکت پاکستان میں خیبر پختونخوا کے لوگوں کی کوئی اوقات ہے کیا یہ لوگ انسان نہیں اور اگر ہے تو یہ بتایا جائے کہ دہشت گردی کی کتنی وارداتیں یہاں پر موبائل فون کے ذریعے کی گئیں ان وارداتوں کی روک تھام کیلئے ہمارے انوکھے داخلے کے وزیر نے کیا اقدامات اٹھائے تھے کیا صرف پنجاب اور سندھ میں انسان بستے ہیں جن کیلئے حفاظتی اقدامات کئے جاتے ہیں- کیا یہ تعصب نہیں !

داخلے کے وزیر نے بیان بھی بہت بڑا دیا کہ اگر عید پر موبائل فون سروس بند نہ کی جاتی تو کئی بم پھٹنے کے خدشات تھے اور انہوں نے کامیاب حکمت عملی کرکے عوام کو تحفظ فراہم کر دیا لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بم کہاں کہاں پر نصب تھے جس سے دہشت گردی کا خطرہ تھا اور ان کی وزارت نے کونسے دہشت گرد کو گرفتار کیا جنہوں نے عید پر موبائل فون کے ذریعے دہشت گردی کی منصوبہ بندی کی تھی نہ تو موبائل فون سامنے لائے گئے اور نہ ہی دہشت گرد بتائے گئے لیکن ہاں اب عجیب رنگ کے بالوں والے داخلے کے وزیر نے نیا بیان داغ دیا کہ پری پیڈ سمز بند نہیں کی جارہی ہیں بلکہ غلط ناموں سے لی جانیوالی موبائل

۔فون سموں کو بند کیا جائیگا

واقفان حال توپری پیڈ سم بند کرانے کے اصل معاملے کو کچھ اور قرار دے رہے ہیں ان کے مطابق وفاقی حکومت نے 2012 کی رقم ادا کرنی تھی تاہم وہ رقم ابھی تک ادا نہیں کی جاسکی جس کی وجہ سے وفاقی حکومت کو وارننگ دی گئی تھی کیونکہ اس رقم کی یقین دہانی وفاقی حکومت نے کی تھی اور ادائیگی جنوری 2012 میں کرنی تھی تاہم ادائیگی کی وارننگ ملنے کے بعد کمال کا ذہن رکھنے والے داخلے کے وزیر نے موبائل فون کمپنیوں سے رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جسے سب کمپنیوں نے متفقہ فیصلہ کے تحت مسترد کردیا جس پر کمپنیوں کو عید کے موقع پر بارہ گھنٹے سروس بند رہنے کی صورت میں اربوں روپے کے نقصان کی دھمکی دی گئی تاہم اس کے باوجود تمام کمپنیوں نے رقم کی ادائیگی سے انکار کردیا اس انکار کے بعد اہم شہروں میں دہشت گردی کے نام پر چاند رات کو تمام موبائل کمپنیوں کی سروس بند کردی گئی اور عید کی صبح دس بجے تک بند رکھنے اور موبائل کمپنیوں کو جھٹکا دینے کے بعد موبائل فون کمپنیوں سے پھر رابطہ کیا گیا تاہم انکے انکار کے بعد تمام کمپنیوں کو پری پیڈ سروس بند کرنے کی دھمکی دی گئی اور یہی دھمکی کام کر گئی اور موبائل فون کمپنیوں کے مالکان پشتو مثل کے مصداق "لکیر پر سر" رکھ گئے اور رقم کی ادائیگی کرنے کیلئے کمپنیوں کے مالکان نے مشورے شروع کردیئے جس کے بعد ہمارے داخلے کے وزیر کی

زبان بھی تبدیل ہو گئی اور پری پیڈ سمز کے بیان سے پھرنے کے بعد اب انہوں نے جعلی ناموں سے سمز کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

ہمیں حکمرانوں کے اتنے بڑے کھیل کی سمجھ نہیں آتی اور نہ ہی ہم سمجھنا چاہتے ہیں لیکن ایک بات جو اس ملک کا ہر شہری سمجھنا چاہتا ہے کہ اگر موبائل فون کمپنیوں کو یہی سبق عوام کو سہولیات کی فراہمی پر دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا کیونکہ ان کی " لاجواب سروس" اور رات بھر لگے رہو کے پیکجز نے ہماری نوجوان نسل کا تو بیڑہ غرق کر دیا ہے اور تو اور ایک سو روپے کے "ایزی لوڈ" جسے ہمارے ہاں " بابا کا ایزی لوڈ" " بھی کہتے ہیں میں اٹھارہ روپے ٹیکس کاٹنے کے علاوہ موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرنے پر بھی ٹیکس عائد ہے اور ہم جیسے " فقیر" تو روتے ہیں کہ کل تو 100 روپے کا ایزی لوڈ کیا تھا اب پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا کیونکہ موبائل فون کمپنیاں تو صارفین کو ایسے لوٹتی ہیں جس طرح ہمارے ایئر پورٹ پر تعینات مختلف اداروں کے اہلکار بیرون ملک سے واپس آنیوالے " مسافروں " کو لوٹتے ہیں۔ لیکن جس طرح ان کا کوئی پوچھنے والا نہیں اسی طرح موبائل کمپنیوں سے بھی کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی اخبار / ٹی وی چینل یا ریڈیو آواز اٹھاتے ہیں کیونکہ ان کے اشتہارات کے دم سے ان کا کاروبار چل رہا ہے۔

آہ بات کہاں سے کہاں تک نکل گئی پاکستانی موبائل فون کے ذریعے ایس ایم ایس کے استعمال میں بھی بہت تیز ہیں اسی وجہ سے موبائل کمپنیوں نے ان کیلئے خصوصی پیکجز جن میں رات بھر لگے رہو اور سب کچھ کہہ دو شامل ہیں جیسے پیکجز متعارف کروائے ہیں مسائل میں گھری اس قوم کا نوجوان طبقہ بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال ہے، مگر وسائل کی کمی کے باعث اس کی صلاحیتیں سنجیدہ کاموں کی بجائے اس طرح کی غیر تعمیری سرگرمیوں کی جانب لانے کا سہرا بھی موبائل کمپنیوں کو ہی جاتا ہے موجودہ حکومت کے وجود میں آنے کے بعد 2009 کے آغاز میں بے پناہ لوڈشیڈنگ، دہشتگردی، مہنگائی اور امن وامان کی خراب صورتحال سے تنگ آئے اس نوجوان خون نے حکمرانوں کے کیخلاف ہتک آمیز پیغامات موبائل فون کے ذریعے ایک دوسرے کو بھیجنے شروع کردیئے۔ جس نے اہل اقتدار کے ہوش اڑا دیئے تھے اور ہمارے انوکھے داخلے کے وزیر نے قانون بنا دیا کہ کہ آئندہ اس طرح کا پیغام بھیجنے والے کو 7 سال تک قید کی سزا دی جائے گی۔ تاہم اب نوجوان ایس ایم ایس پیغام کے آخر میں " سمجھ گئے میں کس کا ذکر کررہا ہوں " کے انوکھے طریقے سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں سو ہمارا اپنے خوبصورت " بالوں والے داخلے کے وزیر سے گزارش ہے کہ "انوکھی " قوم پر رحم" کرے اور "انوکھے " اقدامات سے ہمیں مزید "انوکھا" نہ کریں.

سیاسی بیان بازی اور سیلاب کی تباہ کاری

سرکاری اداروں کے سربراہوں نے سیاسی "فنکاروں" کی طرح بیان بازی شروع کردی ہے اور اب ہر جگہ پر سیاست شروع ہو گئی ہے جس کی بنیادی وجہ سرکاری اداروں میں سیاسی مداخلت اور سیاسی بھرتیاں ہیں جس کا خمیازہ عام لوگوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے - سرکاری اداروں کی طرف سے بیان بازی کا اندازہ گذشتہ روز سیلاب سے متاثرہ علاقے بڈھنی میں کوریج کے دوران ہوا - جہاں پر بارہ گھنٹے گزرنے کے باوجود سیلاب سے متاثرہ افراد کو نکالنے اور انکی امداد کیلئے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے گئے- حالانکہ گذشتہ کئی ماہ سے پی ڈی ایم اے اور پشاور کی ضلعی انتظامیہ سیلاب سے بچاؤ کیلئے بڑے بڑے دعوے کرتی رہی ان کے مطابق وہ ایک گھنٹے میں متعلقہ ادارے رسپانس دے سکتے ہیں لیکن حقیقت کا اندازہ گذشتہ روز ہونیوالی ایک گھنٹے کی بارش کے بعد ہوا جب سیلابی ریلے نے پشاور کے نواحی علاقوں سردار احمد جان کالونی سمیت چھ مختلف علاقوں میں تباہی مچادی راتوں رات آنیوالے سیلابی ریلے نے ایک ہزار کے قریب مکینوں کو راتوں رات گھروں سے نکلنے پر مجبور کردیا اور افسوسناک بات یہ ہے کہ جو لوگ دعوے کرتے رہے ان کے دعوے سیاسی "فنکاروں" کی طرح بیان بازی نظر آئی کیونکہ یہ لوگ کہیں پر بھی نظر نہیں آئے اور " کی کمین "اپنی مدد آپ کے تحت گھروں سے محفوظ مقامات کی طرف

منتقل ہوتے رہے۔

صوبے کے غریب عوام کے پیسوں پر پلنے والے ضلعی انتظامیہ کے افسران نے رات کے ایک بجے آنیوالے سیلابی ریلے کو دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی بلدیات کے " آقاؤں " کے گھروں میں "حاضری" لگانے والے افسران جن کا کام "کوارڈینیشن" ہے ان کی کوارڈینیشن کا پتہ سیلاب کے روز پتہ چل گیا کہ یہ لوگ صرف "جی حضوری" کیلئے کوارڈینیشن پر لگے ہوئے ہیں۔ ٹیکسوں پر پلنے والے اداروں کے افسران واہلکاروں کی کارکردگی کی سیلاب کے روز عالم یہ تھا کہ چارسدہ اور پشاور کے مابین رابطہ آٹھ گھنٹے تک معطل رہا لیکن نہ تو یہ نظر آئے اور نہ ہی ریسیکو کیلئے بننے والے بڑے ادارے کے اہلکار کہیں پر دیکھنے میں آئے حالانکہ ان کیلئے بڑی بڑی بلڈنگ تو اس صوبے کے غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی سے لینے والے "بھتہ ٹیکس " سے بن رہی ہیں بھتہ ٹیکس اس لئے کہ عوام کے مفاد کیلئے تو کچھ نہیں کیا جارہا البتہ وی وی آئی پی کیلئے سرکاری گاڑیاں اور ان کے پٹرول کے خرچے اسی ٹیکس سے ادا کئے جاتے ہیں۔ریسیکو کیلئے بننے والے گیارہ بائیس کے بارے میں کہا جاتا رہا کہ یہ بہت تیز ہونگے لیکن ان کی تیزی کا بھی اسی سیلاب میں پتہ چل گیا چونکہ اب تو آرڈیننس کے ذریعے ان کی سرکاری نوکریاں لگ گئی ہیں اس لئے انہوں نے بھی بے حسی شروع کردی اور چارسدہ اور پشاور کے مابین بڈھنی روڈ پر ہزاروں بچے ` خواتین اور

-بوڑھے پانی سے نکلنے کیلئے خوار ہوتے دکھائی دیتے رہے

اور تو اور اس حلقے کے "ایم پی اے" بارہ گھنٹے گزرنے کے بعد سرکاری گاڑی میں بمعہ پروٹوکول صرف میڈیا کو دکھانے کیلئے موقع پر آئے اور ساتھ ہی رونا شروع کردیا کہ میری کوئی نہیں سنتا اور حکومت میرے حلقے پر توجہ دے" حالانکہ انہیں یہ حلقہ بھی " رشوت" کے طور پر عوام کو " لالٹین" کے دور میں بھیجنے والی حکومت نے دیا ہے " موصوف نے میڈیا کے سامنے بڑے بڑے دعوے بھی کئے حالانکہ ان کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ یوسف آباد روڈ پر جو ان کے گھر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے پر ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی اخراجات آنیکی تختی تو موصوف نے لگادی لیکن چھ ماہ سے اس پر بھی کام نہیں ہورہا اور شائد سیاسی رشوت کے طور پر لینے والے ایم پی اے سیٹ کے مالک ممبر آخری دنوں میں "کھیل ختم اور پیسہ ہضم "والا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ جن کا کام ہی اس طرح کی - صورتحال کو کنٹرول کرنا ہے ان کے پاس سیلابی پانی کو نکالنے کیلئے شاول/ مشینری تک نہیں تھی اور تیرہ گھنٹے گزرنے کے بعد یہ مشینری وہاں پر لائی گئی حالانکہ اس ادارے میں بڑے بڑے " پیٹو " موجود ہیں جو دوسرے ممالک سے آنیوالا " خیرات "پر ہی پل رہے ہیں تاہم سیلاب والی جگہ پر ان کی کارکردگی زیرو رہی لیکن چونکہ سیلاب سے متاثر ہونیوالے زیادہ تر لوگ ڈنڈے کھانے والے اور زندہ

باد مردہ باد کے نعرے لگانے والے عام لوگ ہی تھے اس لئے ان کی پالیسی بھی "لگے رہو منا بھائی" رہی اور نہ توانھوں نے کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی "عوامی" نمائندے کہلانے والے "اسمبلیوں" کے ممبران نے کوئی نوٹس لیا۔

سیلاب سے متاثر ہونیوالے علاقوں میں سرکاری افسران کی بدمعاشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے گھروں میں صفائی کیلئے ٹاؤن ون کے اہلکار صفائی کیلئے پہنچ گئے تھے جبکہ سیلاب سے تباہ حال ہونیوالے "کمی کمین" جن کا کام ٹیکس ادا کرکے انہی سرکاری ملازمین کیلئے تنخواہیں اور مراعات دینا ہے انہی کمی کمینوں کے معصوم بچے اپنے گھروں سے گندگی نکالنے میں سارادن مصروف عمل رہے بے غیرتی کی انتہا یہ ہے کہ جب ٹاؤن ون کے ایک سپروائزر کو جو کہ وہاں پر موجود تھا کو بتایا گیا کہ صرف سرکاری افسران کے گھروں کی صفائی کی جارہی ہیں تو موصوف "ڈھیٹ" بن گئے اور انکار کر گئے حالانکہ ہم خود بھی وہاں پر موجود تھے جہاں پر ٹاؤن ون کے ایک افسر کے گھر میں پانچ اہلکار صفائی میں مصروف تھے جبکہ ہماری طرح "تھڑے ماروں" کے بچے اپنے گھروں کی صفائی کرتے دکھائی دیئے۔

گذشتہ پانچ سال سے بڈھنی پل میں آنیوالا سیلاب مسلسل اس علاقے کے لوگوں کو متاثر کررہا ہے اس کی صفائی کے نام پر کروڑوں کے فنڈز "افسران شاہی" غائب

کر گئے ہیں لیکن نالے کی صفائی گذشتہ کئی سالوں سے تک نہیں کی گئی ہر سال آنیوالا سیلابی ریلا دو سے تین فٹ مٹی بھی لیکر آتا ہے جس کی صفائی کی ذمہ داری ایریگیشن حکام کی ہے لیکن شائد صفائی کرنا ان کی شان کے خلاف ہے کچھ غلطی ہمارے لوگوں کی بھی ہے جو پشتو مثل کے مصداق "سہ جرندہ خرابہ اور سہ دانے لوندے" کچھ سرکار کے ادارے تباہ حال ہے اور کچھ ہم لوگوں میں شعور کی کمی ہے جو کہ گھروں کا گند نالوں میں گرا دیتے ہیں جو نالوں کو بند کرنے کا باعث بنتی ہیں اور پھر یہی گند سیلابی پانی کو روکتی ہیں اور اس کے باعث تباہی مچ جاتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی تجاوزات بھی ہے جس کا آغاز تو "ملا ملٹری الائنس" میں ہوا تھا اور اب تو چودہ فٹ تک اس نالے کی زمین پر "ڈنڈا اور بیلٹ رکھنے والے" ایک بڑے افسر نے پمپ تعمیر کیا ہے اس افسر کے ڈنڈے کے ڈر سے نہ تو ایریگیشن والے صفائی کرتے ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کس کھاتے میں تم نے سرکاری زمین پر سی این جی پمپ بنا دیا ہے۔ ان حالات میں ہم یہی التجا اپنے "عوامی نمائندوں" سے کر سکتے ہیں کہ خدارا تم لوگ تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن عوامی خدمات کیلئے بنائے جانیوالے سرکاری اداروں کو کام کرنے دو اور انہیں سیاسی بیان بازیوں کے بجائے کام کرنے دو تاکہ کچھ تو عوام کا بھلا ہو

-

لوگوں کے ٹیکسوں پر پلنے والے حکمران اور ان کے بچے

عوامی اسلامی اور ساتھ ہی جمہوری کا اعزاز رکھنے والے پاکستان کے حکمرانوں کی ناز برداریاں تو اس ملک میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے والے عوام اٹھا رہے ہیں چودہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کے باوجود اضافی بل دینے والے بے حس عوام اپنے بچوں کیلئے کچھ نہیں کر سکتے لیکن حکمرانوں کی بچوں کی ناز برداریاں اٹھا رہے ہیں تبھی تو اس ملک کو عوامی کہا جاتا ہے کہ حکمران عوام کے سروں پر عیاشیوں میں مصروف ہے اور اپنے بچوں کو بھی ان عیاشیوں میں اپنے ساتھ مشغول رکھ رہے ہیں جس کا اندازہ مختلف سیاسی پارٹیوں جو خود بھی جمہوریت کی دعویدار ہے اور جمہوریت کی راگ الاپتے ہیں لیکن اپنے پارٹیوں میں ان کی کوئی جمہوریت نہیں اور اپنے بچوں کو چیئرمین اور صدارتی عہدوں پر رکھتے ہیں لیکن کارکنوں کیلئے اونچے عہدوں پر کچھ نہیں۔ مملکت پاکستان کی سربراہی کا اعزاز رکھنے والے سربراہ اپنے بیٹے کو آج کل بیرون ملک ہر جگہ پر لے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور اسے سرکار کے کھاتے میں ابھی سے ٹریننگ دی جارہی ہیں کہ مستقبل کیلئے انہیں پارٹی سربراہ کو تیار کرنا ہے اور چیئرمین کو سکھایا جارہا ہے کہ تم ابھی سے ان کمی کمینوں کو کنٹرول کرنے کے طریقے انہی کے ٹیکسوں پر پل کر اور عیاشیاں کرکے سیکھو۔ جمہوریت کا ڈھول گلے میں ڈال کر عوام کو نچانے والے

تمام سیاستدان بشمول فرینڈلی اپوزیشن جن کے زیادہ تر اراکین " نوزائیدہ بالوں "کے مالک ہیں اس عمل پر خاموش ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس حوالے سے بات کی گئی تو پھر کل ہماری باری پر بھی ایسا ہی ہوسکے گا اس لئے چپ چاپ نعروں کی سیاست کی جارہی ہیں۔

ہماری مذہبی جماعتیں بھی یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں رکھتی اور نہ ہی اس ملک کے سیکورٹی ادارے کے کس کھاتے میں / کس قانون کے تحت بائیس سالہ نوجوان امور مملکت میں سربراہ مملکت کے ساتھ بیرون ملک دوروں پر جارہا ہے اور وہ نوجوان جس کے بارے میں برطانوی اخبار نے باقاعدہ اپنے اشاعت میں لکھا تھا کہ اس کی آکسفورڈ میں دوستیاں ایسی خواتین سے ہیں جو ہم جنس پرست ہیں۔ یہ مضمون آج بھی انٹرنیٹ پر آن لائن گوگل پر دیکھا جاسکتا ہے کہ جس میں بتایا گیا ہے کہ اس ملک پر حکمرانی کرنے والے خاندان کا ہونہار سپوت جو آج کل میدان سیاست میں آنے کیلئے پر تول رہا ہے اور اسے تیار کیا جارہا ہے کی تین سال قبل آکسفورڈ میں جولیا ہرٹلے اور کیرینی کوکے نامی خواتین کیساتھ دوستی ہیں اور یہ دونوں لڑکیاں اپنے آپ کو وہاں کی سوسائٹی میں ایک دوسرے کو منگیتر کہہ کر متعارف کرواتی ہیں ۔ برسلز سے تعلق رکھنے والی جولیا آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہم جنس پرست سوسائٹی کی ممبر ہے اور ان دونوں لڑکیوں کی تصاویر بھی ہم اگلے انتخابات میں مسلط ہونیوالے قومی نمائندہ اور نسل در نسل

چلنے والے حکمرانوں کے موجودہ سپوت سے ہے۔ یہ تمام معلومات اور تصاویر کسی پاکستانی اخبار نے نہیں بلکہ برطانیہ سے چھپنے والے اخبار نے دیئے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو اس ملک کے عوام کے ٹیکسوں پر عیاشی کیلئے تیار کیا جارہا ہے جسے بعد میں وقت آنے پر عوامی نمائندہ کہا جائیگا کیا ہم لوگ بالکل ہی بے حس ہیں یا ہمارے اندر "غیرت" نامی کی کوئی چیز موجود ہے۔

نسل در نسل چلنے والے حکمرانوں کے اس سپوت نے گذشتہ دنوں اپنے دو غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ حیدرآباد کے راستے ٹنڈو محمد خان کا دورہ کیا جہاں انہوں نے باوانی اور انصاری شوگر ملوں کا دورہ کیا جس کے بعد وہ حیدرآباد سے گزرتے ہوئے نوابشاہ کیلئے روانہ ہوگئے اس موقع پر ان کے ہمراہ ایس ایس پی حیدرآباد پیر فرید جان سرہندی ایس ایس پی ٹنڈو محمد خان ایس ایس پی رخسار کھاوڑ بھی تھے ذرائع کے مطابق ایس ایس پی حیدرآباد کی سپوت کی آمد کے موقع پر وی وی آئی پی سیکورٹی پروٹوکول کی فراہمی کی ہدایت کی گئی تھی لیکن ان ہدایات کے باوجود راستوں پر پولیس تعینات نہیں کئے گئے جس پر ایس ایس پی حیدرآباد نے خصوصی ہنگامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے چھ ڈی ایس پیز سات تھانیداروں کے علاوہ چار ٹریفک افسران کو فوری طور پر معطل کرکے پولیس لائن رپورٹ کرنے کی ہدایت کی ہے اب ان حالات میں سمجھ نہیں آتی کہ قانون کہاں پر ہے اور کس کیلئے ہے جب غریب آدمی کا مسئلہ ہوتا ہے تو پھر پولیس اہلکار

ریاست کے ملازم ہوتے ہیں اور ڈنڈے برسانے کیلئے ہر جگہ پہنچتے ہیں لیکن اسلام "کے نام پر بننے والے ایلیٹ کلاس کے پاکستان یں لکیا ہر کسی نے آنکھیں بند" کر رکھی ہیں اور اسے یہ نظر نہیں آ رہا کہ یہ سب "کیا ہو رہا ہے" اور اس کا انجام کیا ہوگا

-

کہنے کو تو بہت کچھ ہیں لیکن ایک بات جوایک حالیہ سروے سے پتہ چلا ہے جس میں کہ حکمرانوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے ہونہار اکلوتے سپوت کا گراف لوگوں کی نظروں میں بہت نیچے ہیں لاہور کے ایک اخبار میں کئے گئے سروے کے مطابق سندھ سے تعلق رکھنے والے پارٹی جن کی سربراہ خاتون ہے اور اس کا شوہر بھی اسی کے بہن کے دور حکومت میں فائرنگ کے نتیجے میں ہلاک ہوا تھا کی بیٹی کیلئے اس وقت عام لوگ زیادہ ہمدردیاں رکھتے ہیں دوسرے نمبر پر مخصوص لہجے میں بات کرنے والے صاحب کے خاندان کے سپوت کا نمبر ہے اس خاندان کیلئے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نیا عہدہ نکالا گیا جبکہ اس کے بعد نوزائیدہ بالوں والے لیڈر کی بیٹی ہے جس کے بارے میں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ سیاسی میدان میں ان کے آگے آنے کے امکانات زیادہ ہیں جبکہ موجودہ حکمرانوں کے سپوت اس سروے میں صرف چھ فیصد ووٹوں سے پانچویں نمبر پر آئے ہیں جن کے بارے میں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ میدان سیاست میں کچھ نہ کچھ کر سکیں گے ہماری کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں لیکن ہم اپنے عوام سے یہ

پوچھنا چاہتے ہیں کہ حکمرانوں اور ان کے بیٹوں کے لئے "لڈیاں ڈالنے والے" بے حس عوام اپنے بچوں کیلئے کب کچھ کرنا چاہیں گے اور کیا ان کے پاس اپنے بچوں کیلئے سوچ بھی ہے کہ نہیں۔

پشاور کے شہری اپنے شہر میں مسافر

اپنے شہر میں مسافر ہونا کیسا لگتا ہے اس کا جواب تو خیبر پختونخوا کے لوگ خصوصا پشاور کے شہری ہی دے سکتے ہیں کیونکہ اس دیس کے باسیوں کیساتھ جو سلوک اس وقت سیکورٹی فورسز کر رہی ہیں اس سے انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری "اوقات" کیا ہے اور ہم جیسے " بلڈی سویلین" کا اس صوبے میں کوئی پوچھنے والا نہیں - عام لوگوں کیساتھ سیکورٹی فورسز کا روا رکھنے جانیوالا سلوک اس وقت صرف قبائلی علاقوں میں ہی نہیں بلکہ پشاور کے مختلف شاہراہوں پر تعینات فوج کے اہلکار جیسا کر رہے ہیں وہ پاک فوج جیسے قومی ادارے سے تعلق رکھنے والے اہلکاروں کے شایان شان ہی نہیں -اب تو ان کے سلوک کی وجہ سے پشاور کے لوگ جس القاب سے انہیں پکارتے ہیں انہیں یہاں لکھنے سے جہاں" قومی مفاد" پر ضرب پڑتی ہے وہیں پر میرا نام بھی " لاپتہ افراد "کی فہرست میں شامل ہونے کا خطرہ ہے -

ایک ہفتہ قبل خیبر روڈ پر محکمہ صحت میں کوریج کے سلسلے میں دفتر کی گاڑی میں گیا ہوا تھا کوریج کے بعد گاڑی میں بیٹھ گیا اور کیمرہ مین کا انتظار کرنے لگا چونکہ اس وقت وہ ایک اور ادارے کے کیمرہ مین کو اس میٹنگ کی فلم دے رہا تھا اسی وجہ سے وہ پانچ منٹ لیٹ ہو گیا میں انتظار کر رہا تھا کہ سڑک

کے دوسرے طرف سیکورٹی فورس کے ایک اہلکار نے اشارہ کیا اور کہا کہ "فورا یہاں سے نکل جائو" میں نے اشارہ کرکے بتا دیا کہ جناب پانچ منٹ میں کیمرہ مین آرہا ہے اور میں نکل رہا ہوں اس کی غصے اور غلط لہجے کی وجہ سے میں نے کیمرہ مین کو آواز دی کہ جلدی ختم کرو میں پیچھے کیمرہ مین کو دیکھ رہا تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی بھگا دی میں نے پوچھا کہ ایسا تم نے کیوں کیا تو اس نے بتادیا کہ متعلقہ سپاہی نے جو کہ دیوار پر ڈیوٹی پر تھا نے تمھارے جواب کے فوری بعد گن ہماری طرف کردی اور کارتوس کو آگے کردیا یعنی اس نے صرف ٹرائیگر دبانا تھا کہ میں نے ڈر کی وجہ سے بھگا دی میں نے اس سپاہی کو دیکھ لیا جو اس وقت گن نیچے کرکے اس سے گولی نکال رہا تھا۔میں خوف کا شکار بھی ہوگیا لیکن اس دن اپنے قومی ادارے جس کیلئے میرے دل میں جتنی محبت تھی اس سپاہی کے ایک ہی حرکت نے ختم کردی مجھے اس فورس سے ڈر لگنے لگا اور جس چیز سے ڈر لگنے لگے اس سے محبت نہیں کی جاتی اس سے نفرت شروع ہو جاتی ہیں اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں اس سے پہلے بہت سارے واقعات ہوئے ہیں۔چونکہ ہم اس ملک کے وہ باسی ہیں جن کی "اوقات" نہیں ہوتی اور پھر سویلین بھی ہیں تو ان کیلئے ہماری اوقات شائد مچھر مارنے کے برابر ہے۔

گذشتہ دو ہفتوں سے پشاور کے خیبر روڈ پر عام لوگوں کیساتھ جو رویہ رکھا جارہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں صرف سیاستدان ہی نہیں بلکہ ان

کے " چاچے " بھی موجود ہیں جن کے ڈنڈے کے آگے کسی کی نہیں چلتی ۔ "یس سر اور نو سر" کی گردان کرنے والے ان لوگوں نے پشاور کے خیبر روڈ کو ٹریفک کیلئے مکمل طور پر بند کردیا ہے اور صرف "کار والے "حضرات ہی اس روڈ سے گزر سکتے ہیں میری طرح ہزاروں افراد جو روزگار کے سلسلے میں اسی روڈ کے ذریعے حیات آباداور یونیورسٹی ٹاؤن سمیت شامی روڈ کو جانا چاہتے ہیں ان کیلئے یہ راستہ شجر ممنوعہ ہے ۔ بڑی بڑی دیواروں ` سیکورٹی کیمروں اور بلٹ پروفوں میں ڈیوٹی انجام دینے والے موت "سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں اور زندگی پیاری لگتی ہے لیکن اپنی زندگی کیلئے" دوسروں کی زندگی کو حرام کرنا کونسے آئین اور کونسے اسلام میں ہے کیا اس کا جواب کسی کے پاس ہے ۔

ٹھیک ہے کہ ہمارا خطہ دہشت گردی کا شکار ہے اور دہشت گرد معصوم لوگوں کو مار رہے ہیں لیکن دہشت گردی کی اس جنگ نے ہمیں کس حال میں پہنچا دیا ہے شائد اوپر بیٹھنے والے حکمران اور ان کے پٹی بندوں کو یہ نظر نہیں آرہا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ نے عام لوگوں کی زندگی اتنی اجیرن کردی ہے کہ اب وہ ہر چیز سے نفرت کررہا ہے ۔ اللہ جنت نصیب کرے) ویسے مشکل ہے (ضیاء الحق جن کے بارے میں ہمارے ایک مشہور کامیڈین کا لطیفہ ہے کہ جب اسے قبر میں رکھ دیا گیا اور اس سے سوال و جواب کا سیشن ہوا تو غلطی ہوئی تو فرشتوں نے اسے مار دیا تو جواب میں قبر میں پڑے صاحب نے کہا کہ مجھے مارتے رہو

مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس قبر میں تو بہت سارے لوگوں کے گوشت کے ٹکڑے پڑے ہیں - خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے لیکن یہ اعزاز بھی انہیں کو جاتا ہے کہ سیکورٹی فورس کو تباہ کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے انہوں نے سویلین اداروں میں انہیں ضم کر دیا اور پھر ملک سے بھاگ کر "سیاست کرنے والے" ایک سابق جرنیل بھی اسی فہرست میں شامل ہیں جنہوں نے اس قومی ادارے کا وقار تباہ کردیا اور ایسا وقت آگیا کہ اس ادارے سے وابستہ لوگ یونیفارم تک نہیں پہنتے تھے ان کے جانے کے بعد موجودہ صاحب نے حالات بہت حد تک کنٹرول کر دیئے اور لوگوں کا اعتماد کسی حد تک بحال ہونے لگا کیونکہ پروفیشنل ہونے کی وجہ سے قومی ادارے میں ڈسپلن آگیا - اور یہی اس ملک کا واحد ادارہ ہے جس میں اس وقت بھی ڈسپلن ہے اور قوم کی حفاظت کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ سڑکوں پر پولیس کیساتھ ڈیوٹی کرنے والے سیکورٹی فورس کے اہلکاروں کا رویہ عام لوگوں کیساتھ انتہائی توہین آمیز ہے اور اس حوالے سے پولیس جو اپنی بدزبانی کی وجہ سے مشہور تھی انہیں بھی یہ اہلکار شائد پیچھے چھوڑ دے -

ہمارے پشتو زبان میں ایک مثل مشہور ہے جس کے معنی تو اردو میں یوں ہیں کہ " غریب تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے لیکن کمینہ کس نے بنا دیا" یہ مثل اب سیکورٹی کیلئے تعینات اہلکاروں کیلئے بدقسمتی سے کہی جا سکتی ہے کہ ٹھیک ہے

کہ ڈیوٹی ہے لیکن اگر اس ڈیوٹی کو خوش اسلوبی سے انجام دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے اگر سیکورٹی کی صورتحال خراب ہے تو خدارا! جو لوگ بند قلعوں اور بلٹ پروفوں میں پھرتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ شہر کے کسی دوسرے علاقے میں اپنی رہائش / دفاتر قائم کرے تاکہ اس ملک کے " بلڈی سویلین " کو کچھ تو سکون ہو۔ یہ گزارش ان لوگوں سے بھی ہے جنھوں نے سیکورٹی کے نام پر تاریخی قلعہ کے آگے بڑی دیواریں قائم کردی ہیں اور ٹریفک کا برا حال ہے اگر اس تاریخی قلعے کو سیاحوں کیلئے کھول دیا جائے تو یقینا لاکھوں کی آمدنی بھی ہوگی اور شہری بھی آرام سے اس شہر میں رہ سکیں گے۔

شہری انتظامیہ `پیداگیری اور بے بس عوام

شہری انتظامیہ کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد شہر اور نواحی علاقوں میں قصائیوں / سبزی فروشوں نے نے پھر اپنی چھری تیز کردی اور اب تو الٹی چھری سے کام لیا جارہا ہے اور شہر میں گوشت کی فی کلو قیمت 300 روپے تک پہنچ گئی ہیں حالانکہ صارف کمیٹی نے گوشت کی فی کلو قیمت 200 روپے مقرر کردی تھی اسی طرح سبزی کی قیمتیں لوکل منڈی میں سبزی ہونے کے باوجود بڑھ رہی ہیں نرخنامے تو موجود ہیں لیکن اس پر عملدرآمد کرانے کیلئے کوئی تیار نہیں اسی وجہ سے اب تو قصائیوں / سبزی فروشوں نے نرخنامے بھی لگانے چھوڑ دیئے ہیں،اور اپنی مرضی کے ریٹ مقرر کردیئے ہیں یہ صورتحال شہری انتظامیہ کے اہلکاروں کیلئے بہتر ہے کیونکہ ایک طرف انہیں گھر کیلئے گوشت / سبزی "مفت" مل جاتی ہے تو دوسری طرف انہیں " پیداگیری" کرنے کا بھی موقع ملتا ہے ۔یہ شکایت گذشتہ کئی دنوں سے شہری کررہے ہیں لیکن ان کی کوئی سننے والا نہیں ۔ عدالت عالیہ پشاور نے رمضان میں مرغی گوشت اور جانور افغانستان سمگل کرنے پرپابندی عائد کرکے تاریخی فیصلہ کیا تھا جس کے نتیجے میں رمضان میں گوشت کی قیمتوں میں کسی حد تک استحکام آیا ساتھ ہی مرغیوں کی گوشت کی قیمت میں بھی کمی آئی جس کا فائدہ عام لوگوں کو پہنچا اور شہریوں نے چیف جسٹس کو دعائیں دی کہ کسی کو عوام کا خیال تو ہے۔

چیف جسٹس کا کا یہ فیصلہ پرمٹ کی آڑ میں سمگلنگ کرنے والے منافع خوروں کیلئے پریشان کن ہے ۔کچھ نے تو ڈرامہ کرکے قبائلی علاقوں کا نام لیکر چیخنا شروع کردیا کہ وہاں پر گوشت کی کمی ہے لیکن شکر ہے کہ صورتحال کنٹرول میں رہی۔

کچھ دن قبل میں نے اپنے محلے میں واقع قصائی سے جب میں گوشت لینے گیاتو دکاندار نے مجھے کہاکہ فی کلو گوشت ڈھائی سو روپے ہے ہم جیسے لوگ تو پہلے قیمت پوچھتے ہیں اور بعد میں خریداری کرتے ہیں میرے لئے گوشت کاٹنے کے دوران ایک شخص گاڑی میں سے اتر کر قصائی کے دکان پر آیا اور بڑے رعب سے پوچھاکہ " اوئے کلو گوشت کس طرح بیچ رہے ہوء اور قصائی جس کے ہاتھ میں چھری بھی تھی بڑا ادب سے بولا کہ جناب دو سو بیس روپے ہیں آپ کو مل جائیگا - میں حیران اور پریشان ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے خیر پیسے دینے کے بعد سبزی لی اور گھر چلا گیا اور تقریبا آدھ گھنٹے بعد اسی قصائی کی دکان پر گیا کہ یہ کیا ماجرا ہے مجھے ڈھائی سو روپے میں فی کلو گوشت دیا اور گاڑی والے کو دو سو بیس روپے میں یہ کیا معاملہ ہے- جواب میں قصائی نے کہاکہ جناب یہ شہری انتظامیہ کے لوگ ہیں جو ہم سے گوشت لیکر جاتے ہیں اور ان کی پسند کا گوشت ہم انہی کے مقرر کردہ رقم پر دیتے ہیں - یعنی جو نرخ عوام کیلئے مقرر کئے گئے وہ شہری انتظامیہ نے اپنے اہلکاروں کیلئے کئے ہیں ہم جیسے عوام کیلئے نہیں

اس صورتحال میں شہری انتظامیہ کو ایک تو صارف کمیٹی کے مقرر کردہ قیمتوں پر - گوشت مل جاتا ہے دوسری طرف انہوں نے "پیداگیری" بھی ہوجاتی ہیں اپنی " پیداگیری "کیلئے انہوں نے نیا انداز شروع کردیا ہے - شہری انتظامیہ کا ایک ریٹائرڈ اہلکار آج کل مختلف علاقوں میں گراں فروشی کے نام چھاپے مار کر لوگوں کو گرفتار کرکے متعلقہ تھانوں میں لے جاتا ہے جہاں پر ان سے پولیس کی موجودگی میں ڈیلنگ کی جاتی ہیں - مزے کی بات یہ ہے کہ گراں فروشوں خصوصا قصائیوں /سبزی فروشوں سے پانچ سے دس ہزار روپے " جرمانے کے مد میں وصول کئے جاتے ہیں لیکن کوئی رسید" نہیں دی جاتی یعنی جرمانوں کی آڑ میں پیدا کیا جانیوالا " مال حرام " شہری انتظامیہ کے " حرام خوروں " کے پیٹوں میں جارہا ہے -چونکہ گراں فروشوں کو " جیل نہیں جانا پڑتا "اور وہ رقم دیکر نکل آتے ہیں اسی وجہ سے واپس آنے کے بعد " انکی دادگیری" - اپنے علاقوں میں شروع ہوجاتی ہیں

دو دن قبل پاک افغان دوستی بس سروس میں تین ہزار کلوگرام گوشت سمگل کرنے کی کوشش کی گئی جسے محکمہ فوڈ اور پولیس نے ناکام بنادیا ہمارے ایک جاننے والے دوست نے بتایا کہ یہ سلسلہ کافی عرصے سے جاری ہے کیونکہ "وردی "والے سرکار "ایک ہزار کا نوٹ ءلینے کے بعد آنکھیں بند کرلیتے ہیں لیکن چونکہ عدالت عالیہ نے سخت احکامات جاری کئے اس لئے اب "وردی والوں" " کو اپنی پڑی

ہوئی ہے اسی وجہ سے یہ لوگ اب کارروائیاں کررہ ہیں -ہمارے ہاں لوگ گوشت ڈھائی سو روپے کلو میں خرید نہیں سکتے جبکہ افغانستان میں یہی گوشت چار سو سے پانچ سو روپے کلو میں فروخت ہورہا ہے اس وجہ سے یہاں کے تاجر گوشت ` جانور پرمٹ کی آڑ میں افغانستان سمگل کررہے ہیں کیونکہ اس میں ان کا منافع ہے -مقامی لوگ تو اب لگتا ہے کہ "مار اور ہوا" کھا کر زندگی گزاریں گے کیونکہ "دال بھی مہنگی ہے "اور سبزی " بھی افغانستان بھیجنے کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے روزانہ کئی ٹرک طورخم بارڈر پر " افغانستان بھیجے جاتے ہیں پنجاب سے آنیوالی سبزی بھی مقامی مارکیٹ کے بجائے افغانستان بھیجی جاری ہیں- افغانستان گوشت/سبزی سمگل کرنے کے حوالے سے مقامی تاجروں کا کہنا ہے کہ ایک طرف یہاں قیمتیں کم ہیں اور عام لوگوں کی قوت خرید بھی کم ہو کر رہ گئی ہیں دوسری طرف شہری انتظامیہ ہفتے میں ایک مرتبہ چھاپہ مار " پیداگیری " کیلئے آجاتے ہیں،ایسے میں زیادہ تر تاجر مقامی مارکیٹ میں سبزی / گوشت لانے کے بجائے اسے افغانستان لے جانا پسند کرتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو ان کا منافع تین گنا ہوتا ہے دوسری طرف انہیں شہری انتظامیہ کی ٹینشن بھی نہیں ہوتی-ان تاجروں کے مطابق عیدالضحی کی آمد آمد ہے اسی وجہ سے مال مویشیوں کی قیمتوں میں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے اسی کے ساتھ ساتھ پٹرول کی قیمتیں بھی مسلسل بڑھ رہی ہیں اور پنجاب سے گاڑیوں پر مال مویشیوں/' سبزیاں لانے پر اخراجات بڑھ رہے ہیں جس کا اثر مقامی مارکیٹ پر پڑ رہا ہے-

ہم افغانستان سے تجارت کے مخالف نہیں لیکن موجودہ حالات میں جب مقامی لوگوں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہیں ایسے میں مقامی مارکیٹ کی ضرورت کی اشیاء افغانستان بھیجنا یہاں کے عوام کیساتھ زیادتی ہے ۔افسوسناک بات یہ ہے کہ گوشت / سبزی سمیت دیگر اشیاء افغانستان بھیجنے کے معاملے میں بہت سارے " اعلی " اختیاراتی لوگ شامل ہیں جو اس کاروبار سے وابستہ ہیں ۔ جنہیں عوام سے کوئی غرض نہیں انہیں صرف "پیسہ کمانے" سے غرض ہے۔ویسے آپس کی بات ہے کہ جو لوگ اس وقت حکمرانی کے مزے لے رہے ہیں شرم کے معاملے میں "میراثیوں" سے بھی گئے گزرے ہیں ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا ان میں " لالٹین "کے دور میں بھیجنے والے حکمرانوں سمیت " تیر "کے ذریعے انقلاب لانے والے بھی شامل ہیں جو اس وقت صرف "مال کماؤ" مہم میں شریک ہیں ۔

شان مصطفیٰ اور اظہار رائے کی آزادی

عجیب دستور زمانہ ہے جب کسی عورت پر حملہ کیا جاتا ہے تو اسے جنسی تعصب اور امتیازی سلوک کا نام دیا جاتا ہے جب ہم جنس پرستوں پر حملہ کیا جاتا ہے تو لوگوں میں صبر کا مادہ ختم ہونے کا کہا جاتا ہے جب کسی یورپی ملک پر حملہ ہوتا ہے تو دہشت گردی ہوتی ہے لیکن یہی حملہ جب کسی مسلمان ملک پر ہوتا ہے تو اسے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی قرار دیا جاتا ہے اور جب شان مصطفیٰ محمد صلی اللہ علی وآلہ وسلم کی شان میں کوئی بکواس کرتا ہے تو اسے "آزادی اظہار رائے" کا نام دیا جاتا ہے اگر یہ اظہار رائے کی آزادی ہے تو لعنت ہے ایسے اظہار رائے کی آزادی پر جس میں ہمارے نبی آخر الزمان کی شان میں گستاخی کرنے والے کو تحفظ ملے۔ یہودی نژاد امریکی کی فلم ریلیز ہونے کے بعد جس صورتحال کا ہمیں سامنا ہے اور جس طرح کے اسلامی ملکوں میں ہنگامے ہورہے ہیں اس سے مغربی ممالک پریشان ہے۔ مغرب سے تعلق رکھنے والے صحافی بھی اس حوالے سے لوگوں کی رائے جاننا چاہتے ہیں گذشتہ روز فرانس کی ایک نیوز ایجنسی کی طرف سے ای میل ملا کہ کیا میں اس احتجاج میں شریک ہونا پسند کرونگا اور میرا اس فلم کے بارے میں کیا خیال ہے میں نے اسے جوابی ای میل کی کہ ابھی تک میں نے فلم نہیں دیکھی اس حوالے میں کچھ نہیں کہہ سکتا پھر اس نے مجھ سے کچھ سیاسی لیڈروں

کے فون نمبر مانگے جن سے اس سلسلے میں رابطہ کیا جاسکتا ہے بحیثیت صحافی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ آخر کیا اس فلم میں ہے جس سے وقت کے فرعون امریکہ کے سفیر بھی مارے گئے اور اب یورپی یونین بھی مسلمانوں سے صبر اور پرامن رہنے کی تلقین کر رہی ہے۔

انٹرنیٹ پر سرچ کرکے فلم دیکھنے کی کوشش کی لیکن ویب سائٹس بلاک ہونے کی وجہ سے اس فلم تک رسائی نہیں ہوئی تاہم ایک امریکی خبر رساں ادارے کی ایک رپورٹ دیکھی جس میں اس فلم کے کچھ حصے دکھائے گئے ان حصوں کو دیکھنے کے بعد میرا کیا خیال ہوا اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ نبی آخر الزمان کی شان میں جتنی گستاخی اس فلم میں کی گئی ہے اس کا اندازہ لوگوں کو نہیں کیونکہ جو کچھ اس فلم میں دکھایا گیا وہ ناقابل برداشت ہے۔ بحیثیت ایک کمزور ایمان والے مسلمان اور محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے امتی کے میرا اس بات پر ایمان ہے کہ ان کی شان ان چیزوں سے مبرا ہے کیونکہ وہ نبیوں کے سردار ہے۔ اور جس فلم ساز نے یہ حرکت کی ہے اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اس کا کیا حشر کرونگا یہ میں اور میرا خدا جانتا ہے۔ کچھ لوگوں کیلئے یہ انتہا پسندی ہوگی لوگ اسے کیا سمجھیں اور کیا کہیں مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ کچھ لوگ جن کا روز آخرت اللہ اور اس کی نبی پر ایمان اور یقین نہیں ان کیلئے یہ باتیں انتہا پسندی ہوگی۔

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ امریکہ میں "دلالی" کرکے سفارت حاصل کرنے والے ایک سابق پاکستانی سفارتکار جو کچھ عرصہ قبل ایبٹ آباد آپریشن کے حوالے سے بھی بدنام ہوئے تھے اور بعد ازاں امریکہ بھاگ گئے تھے وہاں پر آج کل " خوشامد " کرکے اپنی پوزیشن دوبارہ بہتر کررہے ہیں انہوں نے رد عمل میں اپنا ایک مضمون شائع کیا ہے جسے وائس آف امریکہ نے بھی آن لائن دیا ہے جس میں نام سے لگنے والے سابق پاکستانی سفیر نے نے لکھا ہے کہ" اس قسم کے بے حقیقت وڈیوز کہیں بھی کسی کو فرق نہیں پڑتا جب تک اسلامی انتہا پسند اپنی انتہا پسندی کو فروغ دینے کیلئے خود اس کی تشہیر نہ کریں۔حالات حاضرہ کے حوالے سے امریکی ادارے میں پروفیسرز کے عہدے پر تعینات نام نہاد مسلمان کے مطابق " اصل مسئلہ اہانت کا نہیں بلکہ مسلم ممالک میں سڑکوں پر جس تشدد کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ تین صدیوں سے مسلمان ملکوں کی مسلسل اس تنزلی پر مایوسی کا اظہار ہے جس کے متوازی مغرب کے عسکری اور اقتصادی طاقت نئی نئی بلندیوں کو پہنچی ان کے بقول متنازعہ فلم پر مظاہرے اسلامی انتہا پسندوں کیلئے بہانہ ہے۔ میرا ایک سوال ان جیسے مسلمانوں کی دلالی کرنے والوں سے ہے کہ کیا وہ اپنی ماں باپ کے بارے میں غلط اور بیہودہ گفتگو پسند کرتے ہیں یقینا ان کا جواب نفی میں ہوگا تو کیا اس نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شان میں گستاخی جس

کی وجہ سے دنیا قائم ہوئی جو اللہ کا محبوب ہے اور رحمت العالمین ہے۔ ہم اسی محبوب کے امتی ہے جس پر ہم جیسے گناہ گاروں کو فخر ہے کہ ان کے توسط سے ہماری بخشش ہوگی کیا ہم اپنے پیغمبر کی شان میں گستاخی برداشت کرینگے یقینا نہیں۔ دنیا اسے انتہا پسندی کہے ہمارے لئے بحیثیت مسلمان اسی زندگی سے خاک میں دفن ہونا بہتر ہے کہ ہمارے نبی کی شان میں کوئی غلط بات بھی کہے اور ہم خاموش رہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے۔۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ حکومت نے فوری طور پر متعدد ویب سائٹس کو بلاک کردیا ہے جس پر یہ فلم لوڈ کی گئی ہیں تاہم کچھ حصے ابھی تک انٹرنیٹ پر آن لائن موجود ہے جسے فوری طور پر بلاک کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بھارت اور افغانستان جیسے ممالک میں ان سائٹس پر پابندی عائد کردی گئی ہیں۔ اس فلم کے حوالے اب تک پاکستان کے مذہبی و سیاسی جماعتوں نے جس رد عمل کا اظہار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے لیکن اس احتجاج میں حکومت کو بھی کھل کر ساتھ دینا چاہیے۔

میرے لئے باعث اطمینان و قلب یہ ہے کہ الحمد اللہ ہم لوگوں میں غیرت ایمانی کا کچھ ذرہ تو موجود ہے جس کی بنیاد پر ہم لوگ احتجاج کر رہے ہیں لیکن کیا ہم اپنے احتجاج کو آرگنائز کر سکتے ہیں اور توڑ پھوڑ کے اس احتجاج کو ہم پرامن کر سکتے ہیں کیونکہ اپنے ہی املاک پر حملہ کرنا ` توڑ پھوڑ کرنا بھی بے وقوفی ہے۔ ہمارے پاس وسائل ہونگے تو ہم احتجاج کرسکیں گے اگر ہم اپنے وسائل کو

خود تباہ کرے تو پھر کیسے احتجاج کرینگے اس کی مثال ایسی ہے جیسے بھوکے پیٹ نماز نہیں ہوتی کیونکہ نمازی نمار کے دوران بھوک ختم کرنے کیلیۓ سوچتا ہے ویسی ہی صورتحال ہماری بھی ہے اگر ہم خود اپنے اداروں کو تباہ کرے تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جایگا اور ہم کیسے احتجاج کرسکیں گے کیا اس ملک میں امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں کام نہیں کررہی کیا ہم ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ نہیں کرسکتے -مارکیٹ میں سینکڑوں ایسی چیزیں موجود ہیں جس کا بائیکاٹ کرکے ہم اپنا احتجاج ریکارڈ کرسکتے ہیں اس عمل نہ صرف وقت کے فرعون "امریکہ" کو نقصان ہوگا بلکہ وہاں پر بیٹھے "کالے" کو اس فرق کا پتہ بھی چل جایگا کہ "اظہار رائے کی آزادی"کیا چیز ہے -

پولیو اور سادہ مزاج چیف جسٹس

بچوں میں متعدی امراض سے بچاؤ کیلئے صوبائی حکومت نے ویکسی نیشن آرڈیننس 1958 اور مغربی پاکستان وبائی امراض کی روک تھام کے ایکٹ کو ضم کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ فیصلہ پولیو اور دیگر متعدی امراض میں والدین کے تعاون نہ کرنے پر کیا گیا۔
قانون کے تحت اب والدین کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو متعدی امراض سے بچاؤ کیلئے ویکسی نیشن کروائیں - انکار پر والدین کو جرمانہ اور سزا ہوگی جبکہ محکمہ صحت کے اہلکاروں کے خلاف کوتاہی پر کارروائی کی سفارش کی جائیگی ۔حکومت کی طرف سے حالیہ دنوں میں پولیو مہم میں انکاری والدین کو شامل کرنے کیلئے متعدد اقدامات اٹھائے جارہے ہیں اور یہ اقدام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔
گذشتہ کچھ عرصے سے صوبے میں پولیو کے کیسز میں اضافہ ہورہا ہے جس کی روک تھام کیلئے محکمہ صحت اور ڈونرز ادارے "اخباری بیانات" کی حد تک.بڑے مستعد نظر آتے ہیں - پولیو مہم کے آغاز میں میڈیا سے بھی اپیل کی جاتی ہے کہ قومی مہم میں .بڑھ چڑھ کر حصہ لیں لیکن حقیقت میں ایئر کنڈیشنڈ دفتروں /لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر لاکھوں روپے کی تنخواہیں لینے والے کچھ بھی نہیں کررہے۔ کیونکہ انہیں ڈر اس بات کا ہے کہ اگر اس غریب ملک سے پولیو کی بیماری ختم

ہو گئی تو سالوں سے ایک ہی عہدوں پر " براجمان" صاحبان کی نوکریاں ختم ہو جائینگی اور ڈونرز کے "خیرات" پر پلنے والے پھر کہاں سے لاکھوں روپے تنخواہوں کی مد میں لے سکیں گے کیونکہ پراجیکٹ بند ہونگے تو لینڈ کروزر گاڑیاں بھی ختم اور ان کی مراعات بھی ختم۔ سو اپنے مزوں کیلئے یہ ملک کے مستقبل اور معصوم بچوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔

پولیو مہم کے آغاز میں بڑی بڑی باتیں کرنے والے "ای پی آئی" کے اہلکاروں کی کارکردگی کا یہ حال ہے کہ پشاور کے محال تیرائی یونین کونسل میں دس سے بارہ ستمبر کو کئے گئے مہم میں یوسف آباد کے علاقے میں سینکڑوں بچے پولیو کی حالیہ مہم میں پولیو ویکسینشن سے محروم رہ گئے والدین اس انتظار میں تھے کہ تین دنوں میں ویکسی نیشن کرنے والے آجائینگے لیکن یہ مہم ختم ہوگئی اور اس علاقے کے بچے پولیو کے مہم سے محروم رہے۔ ہمارے اپنے محلے میں تقریبا بیس کے قریب بچے جن میں میرا اپنا دو سال کا بیٹا بھی شامل ہے پولیو کے قطروں سے ابھی تک محروم ہے۔ جب اس حوالے سے ای پی آئی کے عرصہ دراز سے تعینات کوارڈینیٹر سے بات کی تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے ان کی ہدایت پر ایک صاحب نے سرکاری فون پر پہلے تو مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کی کہ آپ نے پولیو کے حوالے سے شکایت کی ہے جب میں نے اسے اپنا تعارف کروایا تو پھر موصوف کا لہجہ تبدیل ہوگیا اور مجھ سے میرا پتہ مانگ لیا کہ ہم آپ کے بیٹے کو "پولیو

ویکسینیشن "کیلئے سپیشل طور پر آتے ہیں میں نے جوابا کہ جناب میرا بیٹا آسمان سے نہیں اترا اس علاقے میں سینکڑوں بچے پولیو کے مہم سے محروم ہے اور سب کو اپنے بچے پیارے ہوتے ہیں تو جواب میں اسی صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کے علاقے میں پیر تک ٹیمیں پہنچ جائینگی کیونکہ سڑک کے اس طرف ایک سپروائزر کا علاقہ ہے اور سڑک کے دوسری طرف کسی اور سپروائزر کا علاقہ ہے اس لئے یہاں پر پولیو مہم پیر سے شروع ہوگی۔ میں بھی چپ کرگیا کہ چلو پیر تک سہی لیکن پیر کے بعد دو دن گزرنے کے باوجود بھی میرے بچے سمیت اس علاقے میں سینکڑوں بچے پولیو کی ویکسینیشن سے محروم ہے اور والدین اس انتظار میں ہے کہ کوئی غلطی سے ان کے علاقے میں آجائے اور پولیو کی ویکسینیشن ہو۔ ویسے ہمارا علاقہ نہ تو قبائلی ہے اور نہ ہی وزیرستان یا متنی ادہزئی کا علاقہ جہاں پر پولیو کے قطرے پلانے والی ٹیموں کو "طالبان " مہمان نوازی کیلئے بٹھاتے ہیں ہمارا علاقہ پشاور شہر کا ایک پسماندہ ایریا ہے جس میں زیادہ تر مزدور پیشہ افراد آباد ہیں جن کی اوقات اور آواز کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے "ای پی آئی " کے کرتا دھرتائوں کیلئے ہمارے علاقے میں "پولیو زدہ" بچوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

پشاور کے سادہ مزاج چیف جسٹس نے تقریبا دو ماہ قبل پولیو مہم کو کامیاب بنانے کیلئے یہ حکم صادر کیا تھا کہ ہائیکورٹ میں رٹ کے اندراج کیلئے

متعلقہ شخص کو اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کا سرٹیفیکیٹ بھی فراہم کرنا ہوگا اس فیصلے پر مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کو خوشی ہوئی تھی کہ چلو ہم اپنے آنیوالے نسلوں کو اس خطرناک بیماری سے بچا سکیں گے لیکن موجودہ صورتحال میں محکمے کی غفلت جسے غفلت بھی نہیں کہا جاسکتا البتہ اسے ہٹ دھرمی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اتنی شکایات کے باوجود بھی کوئی پولیو ویکسی نیشن کیلئے نہیں آرہا۔اس صورتحال میں ہم جیسے لوگوں کیلئے جو اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کے خواہشمند ہیں لیکن محکمہ والے پروا نہیں کررہے اس میں ہمارے لئے چیف جسٹس کیا کرینگے ! ہمارے ہاں بھی ایک عجیب سا دستور ہے یورپی ممالک میں لوگ قانون توڑنے سے ڈرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں لوگ قانون کی پروا نہیں کرتے لیکن قانون کی عملداری یقینی بنانے والے "ڈنڈے" سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ میں بحیثیت صحافی اپنے بچے کو پولیو کے قطرے پلانے کیلئے رابطے کررہا ہوں لیکن کوئی سنتا نہیں ایسے میں عام لوگ جن کو اس بیماری سے آگاہی نہیں اگر وہ بھی اس صورتحال سے دوچار ہوں تو پھر لوگ بھی یہی کہیں گے کہ "بھاڑ میں جائے پولیو کی ویکسی نیشن" خیرات پر پلنے والے "سرکاری اہلکاروں" کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ صحت کے حوالے سے کام کرنے والے بین الاقوامی امدادی ادارے نے فیلڈ میں کام کرنے والے " ای پی آئی "ورکروں کو فنڈز نہ

دینے پر تحفظات کا اظہار کیا ہے جس کے بارے میں مقامی اخبار میں خبر بھی شائع ہوئی۔ جس پر صوبائی سربراہ نے جوابا کہ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں "کمیشن مافیا" کی وجہ سے تنخواہیں لیٹ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف پولیو مہم کو کامیاب بنانے کیلئے اور "فنڈز" کو "صحیح طور" پر استعمال کرنے کیلئے محکمے نے "مولویوں" کو بھی ٹارگٹ دیا ہے کہ وہ اپنے خطبوں میں لوگوں میں اس بیماری سے متعلق آگاہی پیدا کرے اس حوالے سے بھی میڈیا کے سامنے بڑے بڑے دعوے کئے جاتے ہیں۔ موجودہ صورتحال میں ہمارے اپنے مولوی صاحبان" سے گزارش ہے کہ وہ اپنے خطبوں میں "خیراتی مال پر پلنے والے سرکاری اہلکاروں" کو بھی شرم دلائیں کہ خدارا تم لوگ بھی ڈیوٹی کرو صرف اخباری بیانات دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔کاش ان " بے شرموں" کو یہ سمجھ آجائے اور وہ ملک کے مستقبل اور معصوم بچوں کے صحت سے کھیلنے سے گریز کرے

مجھے حکومت کے نت نئے قوانین کی سمجھ نہیں آرہی ایک طرف والدین کو شکنجے میں جکڑنے کیلئے قوانین تو بن رہے ہیں دوسری طرف "حرام خوری" کرنے والے اہلکاروں سے بھی کوئی یہ پوچھے کہ "بھائی میرے تم کس مرض کی دوا ہو" تم پر کون سا قانون لاگو ہوگا جس کی وجہ سے تم ڈیوٹی پر حاضر ہو۔حکومت اگر والدین کو شکنجے میں لانے کیساتھ ساتھ محکمے کے اہلکاروں کو بھی سزا دینے کا سلسلہ شروع کرے تو بہتر ہوگا کیونکہ نئے قانون میں تو صرف کوتاہی برتنے

والوں کے خلاف کاروائی کی سفارش کی جائیگی۔ سفارش کیلیے کمیٹی بیٹھے گی اور جہاں پر
کمیٹی بن جاتی ہیں وہاں پر "کام کی مٹی" بن جاتی ہیں۔

پولیس کی بربریت اور پاکیزگی

21 ستمبر کو ہونیوالے واقعات میں جہاں اور بہت سارے معصوم لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ان میں ہمارے ایک ساتھی محمد عامر زیب بھی پولیس کی مبینہ فائرنگ کا نشانہ بن کرجاں بحق ہوگئے۔اللہ تعالی ان کو اور ان جیسے کئی افراد جو فائرنگ کے نتیجے میں جاں بحق ہوگئے تھے جوار رحمت میں جگہ دے ۔واقعہ تو گزر گیا ہے اب اس دن کے واقعات پر سیاست شروع ہوگئی ہے اور "کرسی اور لینڈ کروزور" میں عوام کی خدمت کرنے والے حکمران اسے اب اپنی سیاست کیلئے استعمال کررہے ہیں ۔ ریڈزون میں بیلٹ والی سرکار کے ساتھ اندر چھپے حکمران اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ انہیں دوسروں کے دکھ کا احساس ہی نہیں کیونکہ ان کے اپنے بچے یا تو مغربی مہالک میں زیر تعلیم ہیں یا پھر ان کیساتھ قلعوں میں بیٹھ کر زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں ۔ اس دن کے احتجاج پر "سیاسی میدان" چمکانے والے حیران ہیں کہ کیسے پشاور جیسے شہر میں لوگ نکل آئے اور بغیر کسی تعصب کسی مذہبی تفریق کے ایک ساتھ چلے اور احتجاج کیا ۔اور پھر یہ لوگ کیسے تشدد کی طرف آئے اور لوٹ مار کی۔ابھی تک اس کی تحقیقات کیلئے کوئی کمیٹی قائم نہیں کی گئی نہ ہی سرکاری طورپر اور نہ ہی پرائیویٹ طورپر اس سلسلے میں کوئی اقدام اٹھایا گیا۔ کسی نے جی ٹی روڈ پر واقع ایک سینما کے چوکیدار کی طرف سے کی جانیوالی

فائرنگ کا نوٹس ہی نہیں لیا جس کی وجہ سے تین افراد زخمی ہو گئے اس واقعے کے بعد مظاہرین جو صوبائی اسمبلی کی طرف جا رہے تھے پر تشدد ہو گئے اور انہوں نے سینما گھر کو آگ لگا دیا اور یہی سے تشدد کا آغاز ہوا جس کے بعد پولیس بھی ایک مخصوص سینما جو گرما گرم " فلموں کے حوالے سے بہت مشہور ہے اور اس میں سیاسی میدان میں " کمی کمینوں " کی خدمت کے دعوے کرنے والے ایک بڑے خاندان کے شیئرز ہیں کو بچانے کیلئے پولیس نے مظاہرین پر براہ راست فائرنگ شروع کر دی جس سے متعدد افراد زخمی ہو گئے جن میں ایک نجی ٹی وی چینل کا ڈرائیور بھی شامل تھا جو بعد میں ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا - کوریج کیلئے آنیوالے صحافیوں نے مظاہرین پر پولیس کی براہ راست فائرنگ کی فلم بھی بنائی ہے اور مجھ سمیت کئی صحافیوں نے براہ راست فائرنگ کا عمل بھی دیکھا -

ایک لاکھ روپے میں بھرتی ہونیوالے پولیس کانسٹیبل کس بے حسی سے عوام پر فائرنگ کر رہے تھے کیا ان سے کوئی پوچھنے والا ہے - لالٹین کے دور میں بھیجنے والی " سرکار " یا انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانے والے " عدلیہ " غریب عوام کی خاطر یہ پوچھ سکتی ہے کہ کن لوگوں نے مظاہرین پر فائرنگ کا حکم دیا تھا اور اگر حکم جاری ہوا تو پھر براہ راست فائرنگ کا حکم کس نے دیا - اور تو اور مظاہرین کے سروں میں فائرنگ کے احکامات کس نے سیکورٹی فورسز کو دیئے ہیں - کیا یہ لوگ دہشت گرد تھے - لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں لائے جانیوالے لوگ میں

نے خود دیکھے جنہیں براہ راست گولی سر میں ماری گئ تھی - مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ حالات جمعہ کے نماز کے بعد خراب تر ہو گئے تھے لیکن کیا ان کو کنٹرول کرنے کیلئے فائرنگ ہی واحد راستہ تھا اور اگر فائرنگ ہی واحد راستہ تھا تو لوگوں کے سروں میں یا سینوں پر فائرنگ کرکے انہیں قتل کرنے کے احکامات کس نے دیئے -انہی عوام کے ٹیکسوں سے تنخواہیں لینے والے "پولیس " کیا اس مقصد کیلئے بھرتی کی جاتی ہیں کہ وہ اپنے ہی لوگوں کو فائرنگ کرکے قتل کرے گی- چیمبر آف کامرس کے توڑ پھوڑ کے دوران میں نے پشاور کے ایک مخصوص خاندان سے نفرت کا اندازہ بلڈنگ پر پھینکنے والے پتھروں سے لگایا جہاں وہ گالیاں دے رہے تھے یہی صورتحال پولیس کو دیکھ کر مظاہرین کی تھی -جو چیمبر آف کامرس میں محصور ڈی ایس پی `ایس ایچ او کے سامنے پیپسی پی کر پولیس کو گالیاں دے رہے تھے - ایس ایچ او اور ڈی ایس پی کو کس نے حکم دیا تھا کہ مظاہرے کے دوران گرفتاریاں کرلو تاکہ لوگ اور مشتعل ہو -لیکن محرر سے اے ایس آئی اور پھر ایس ایچ او `ڈی ایس پی تک ترقی پانے والے " خان" کہلانے والوں میں عقل کی کمی ہوتی ہے اور یہ ہر چیز کو ڈنڈے کے زور پر ٹھیک کرنا ہی جانتے ہیں -ان لوگوں میں اتنی عقل نہیں ہوتی کہ کس طرح مجمع کو کنٹرول کرنا ہے کس سے کیا بات کرنی ہے چونکہ شہر میں تھانوں کے اندر "خان" کہلانے والوں کو "اوپن ہینڈ" دیدیا گیا تھا اس لئے انہوں نے بھی اپنے اس طاقت کو خوب استعمال کیا -

اکیس اکتوبر کی شام جب پولیس کی فائرنگ سے ایک بوڑھا شخص شدید زخمی حالت میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال لایا گیا تھا سی سی پی او پشاور امتیاز الطاف اور طاہر ایوب اپنے ڈی ایس پی کو دیکھنے کیلئے پولیس کی بھاری نفری میں ہسپتال پہنچے تو اس بوڑھے کے بیٹے نے ان افسران کو دیکھ کر شکایت کردی کہ پولیس نے گھر کے سامنے بیٹھے اس کے والد کو فائرنگ کا نشانہ بنایا جس پر بجائے اسے تسلی دینے یا کوئی بات کرنے کے بیلٹ کی بدمعاشی کرنے والے افسران نے کانسٹیبل کو ہدایت کردی کہ اس کو پانی پلادو اور کانسٹیبل اس شخص کے بیٹے کو جو شکایت کررہا تھا تھانہ خان رازق شہید میں گرفتار کرکے لے گئے-یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک شخص کا والد ڈیپارٹمنٹ کی فائرنگ کا نشانہ بنے اور پھر اسکے بیٹے کو بجائے تسلی و تشفی دینے کے اسے گرفتار کیا جائے-اپنے آپ کو ہر چیز سے بری الذمہ قرار دینے والے پولیس افسران سب کچھ شرپسندوں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں کیونکہ اب تو جن لوگوں کے پیارے مرے ہیں کیا وہ اپنے " پیاروں "کا " خون" معاف کرینگے اگر قانون نے انہیں انصاف فراہم نہیں کیا تو پھر یہ لوگ بھی اسی " پختون "معاشرے کا حصہ ہیں کیا کوئی شخص اس معاشرے میں اپنا "خون "معاف کرتا ہے-

پولیس اہلکار اور افسران کس طرح اپنے آپ کو " صاف "کرتے ہیں اس کا اندازہ

کرنے کیلئے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے پرانے محلے میں ایک صاحب جن کی ہاتھوں کی انگلیوں میں فرق ہے اور معذور بھی ہے نے ساٹھ ہزار رپے دیکر کانسٹیبل کی نوکری حاصل کی بعد ازاں اپنا تبادلہ ٹریفک کروا دیا اور شہر کے مخصوص چوک میں روزانہ کھڑے ہو کر دس سے پچاس روپے لیا کرتا تھا بعد میں یہی روپے میرے ایک دکاندار دوست کے پاس شام کو دیکر اس سے سو سو روپے کے نوٹ لیتا۔اسی رقم سے ان صاحب نے شادی کرلی پھر بعد میں ترقی ہو گئی اور آج کل " لمبی داڑھی رکھ " کر لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ دو دن کی زندگی ہے " حلال رزق کما لیا کرو" کچھ عرصہ قبل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اس نے میرے فرنچ داڑھے کو دیکھ کر مجھ پر طنز کیا اور اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "اوئے شرم کرو یہ کیا کر رہے ہو" میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن میں نے جواباً کہا کہ " بلی سو چوہے کھا کر حج کو چلی ہے" تو موصوف کا رنگ اڑ گیا اور پھر اپنے ساتھیوں کو کہنے لگا کہ یہ "اخبار والے" منہ میں آگ لئے پھرتے ہیں اور پھر چلا گیا اس وقت میں کچہری میں تھا اور لوگوں نے مجھے کہا کہ تم نے اتنے " لمبی داڑھی والی" کو غلط بات کی تو میں نے جواب دیا کہ اس کو میں جانتا ہوں کہ پہلے 'کتنا پاجی" تھا اور اب کتنا" پاکیزہ" ہوگیا ہے خیر میرے دوستوں نے جو اس وقت میرے ساتھ تھے نے مجھ پر لعن طعن کی اور وہ "رشوت "دیکر بھرتی ہونے والا پاکیزہ" ہوگیا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پولیس والے کتنے جلدی رنگ " بدلتے ہیں اور کتنا جلدی اپنے آپ کو لوگوں کے

نظروں میں پاکیزہ بناڈالتے ہیں۔

"بم ڈسپوزل یونٹ اور پچاس روپے "خطرہ الاؤنس

اگر آپ کو یہ پتہ ہو کہ آپ کی زندگی کی قیمت صرف پچاس روپے ہے تو کیا آپ اسے داؤ پر لگانا پسند کرینگے۔ نہیں کوئی بھی ہوش مند شخص کیا پاگل بھی صرف پچاس روپے میں اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگائے گا لیکن بم ڈسپوزل یونٹ کا انچارج انسپکٹر حکم خان اپنے ساتھیوں سمیت پولیس کے وہ لوگ ہیں جن کی خدمات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ صحافیوں کیساتھ ساتھ بم ڈسپوزل یونٹ کے اہلکاروں کی بھی عجیب سی زندگی ہے جہاں پر بم دھماکہ ہوتا ہے وہاں سے لوگ دور بھاگتے ہیں جبکہ ہماری طرح بم ڈسپوزل یونٹ کے اہلکار اسی جگہ بھاگتے ہیں تاکہ خدانخواستہ کوئی دوسرا دھماکہ نہ ہو یا پھر تحقیقات کیلئے انہیں بلایا جاتا ہے۔ انسپکٹر حکم خان گذشتہ روز فرنٹیئر روڈ پر بم کو ناکارہ بناتے ہوئے شہید ہوگیا شرپسندوں نے باڑہ شیخان میں فرنٹیئر روڈ پر دو بم نصب کر رکھے تھے ۔ حکم خان نے ایک بم ناکارہ بنا دیا تھا لیکن دوسرا بم اس کی موت کا پروانہ بن گیا ۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے انچارج حکم خان نے 1986 میں معمولی عہدے سے پولیس فورس میں شمولیت اختیار کی تھی ۔ بم ناکارہ بنانے میں مہارت حاصل کرنا حکم خان کا شوق تھا جس کی وجہ سے اسے بم ڈسپوزل اسکواڈ کا انچارج بنا دیا گیا۔ حکم خان موت سے کھیلتے ہوئے سات سو سے زیادہ بم ناکارہ بنا

چکا تھا۔ خیبر پختونخوا کے بم ڈسپوزل اسکواڈ میں چودہ ماہرین تھے جن میں سے ایک ملاکنڈ میں بم ناکارہ بناتے ہوئے شہید ہو گیا تھا جبکہ اسکواڈ کے انچارج حکم خان کی شہادت کے بعد اب اہلکاروں کی تعداد صرف بارہ رہ گئی ۔ گذشتہ چار سالوں سے بم دھماکوں کی کوریج کرتے ہوئے بم ڈسپوزل یونٹ کے حکم خان سمیت بم ڈسپوزل یونٹ کے اہلکاروں سے ایک قلبی تعلق سا بن گیا ہے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں شریف لوگوں کا واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کے ممبران ہر وقت سر ہتھیلی پر رکھ کر پھرتے ہیں اور ان میں بیلٹ والوں کی طرح نخرہ اور بدمعاشی نہیں ہوتی۔

بم ڈسپوزل یونٹ واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کے انچارج حکم خان سمیت دیگر ساتھیوں کے ہاتھوں کی انگلیاں بم دھماکوں میں اڑی ہوئی ہے ۔ 2009 ء میں جب پہلی مرتبہ ایک دھماکے کی کوریج کے دوران میں نے حکم خان کو تحقیقات کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کی انگلیاں نہیں تو میں حیران رہ گیا کہ یہ کیسا ادارہ ہے کہ معذور یہاں پر کام کر رہے ہیں لیکن جب پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس سکواڈ میں کام کرنے والے زیادہ تر اہلکار بموں کو ناکارہ بناتے ہوئے اپنے جسمانی اعضاء کھو بیٹھے ہیں اور یہ ان کی ہمت ہے کہ انگلیاں کٹ جانے کے باوجود جانفشانی اور محنت سے کام کرتے ہیں دھماکے کی اطلاع ملتے ہی موقع پر پہنچ کر تحقیقاتی عمل میں سب سے آگے ہوتے ہیں حالانکہ جس طرح عام لوگ کو

دکھ اور درد ہوتا ہے یہ لوگ بھی ہماری طرح ہوتے ہیں انہیں بھی دکھ درد ہوتا ہے اور ان کے بھی رشتہ دار خاندان کے لوگ ہوتے ہیں لیکن اپنے کام سے لگن اور قوم کی خاطر یہ لوگ ہر وقت اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ڈیوٹی کرتے ہیں۔ انسپکٹر حکم خان کی شہادت نے جہاں بہت سارے لوگوں کو اداس کر دیا ہے وہیں پر ہماری صحافی برادری کے لوگ جو اس کیساتھ تعلق رکھتے تھے کو بھی غمزدہ کر دیا جب بھی کہیں پر کوئی دھماکہ ہوتا تو ہم لوگ حکم خان سے رابطہ کرتے اور تفصیلات پوچھتے۔ حکم خان کو مرحوم لکھتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کیونکہ اس کی خوش اخلاقی اور ہنس مکھ چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کبھی اس نے بدتہذیبی کیساتھ جواب نہیں دیا نہ ہی معلومات دینے سے کبھی انکار کیا اپنے ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ کوئی اور بھی ملتا تو انتہائی خوش اخلاقی سے ملتا۔ کئی مرتبہ حکم خان سے بموں کے حوالے سے معلومات لیتے تو ہر قسم کے بموں کو ناکارہ بنانے کے ماہر حکم خان انتہائی عاجزی سے بات کرتے اور کبھی بھی اکیلے جواب نہیں دیتے بلکہ اپنے دیگر ساتھیوں کو شامل کرکے مشورہ کرکے بات کرتے حالانکہ ان سے کئی جونیئر بھی تھے لیکن اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرنا میں نے انسپکٹر حکم خان سے سیکھا۔

تقریبا ایک سال قبل اسی سکواڈ کے اہلکاروں کو دھمکیاں ملی تھی جس کے بعد اہلکاروں نے اپنے فون نمبر تبدیل کر دیئے تھے جس کے بعد انسپکٹر حکم خان سے

رابطہ کچھ وقت کیلئے نہیں رہا لیکن ٹائون ون کے دفتر کے سامنے صبح سویرے ہونے والے دھماکے کے کوریج کے دوران ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے گلہ کر دیا کہ فون نمبر تبدیل کیا ہے تو ہمیں تو بتا دیا کریں تو انسپکٹر حکم خان مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ " ناراض مت ہو فون نمبر ابھی لو لیکن کچھ سیکورٹی کا مسئلہ تھا اسی وجہ سے فون نمبر تبدیل کیا ہے اور تمھیں تکلیف ہوئی اس کیلئے معذرت خواہ ہوں" یقین کرے اس کے جواب نے مجھے شرمندہ کر دیا کہ اتنے بڑے عہدے کا مالک کتنے سادہ شخصیت کا مالک ہے ۔ ہم لوگ دفاتر میں ٹائمنگ کی ڈیوٹی کرتے ہیں یعنی آٹھ یا بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی ہے لیکن میں نے حکم خان سمیت بم ڈسپوزل یونٹ کے اہلکاروں کو بیس گھنٹے ڈیوٹی کرتے ہوئے دیکھا ہے کئی مرتبہ حکم خان ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد دھماکے کی اطلاع پر موقع پر پہنچا اور تحقیقات کی۔ سفید ٹوپی اور سفید کپڑوں میں عجیب سی شان بے نیازی سے ڈیوٹی انجام دینے والے حکم خان وی آئی پی کی ڈیوٹی کے دوران بھی ہمیشہ ہر کسی سے جھک کر ملا حالانکہ میں نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب کہیں پر وی آئی پی کی آمد ہو تو بہت سارے لوگ آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے لیکن یہ خوبی بھی انسپکٹر حکم خان کی تھی کہ وہ ہمیشہ ہر کسی خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا ہر ایک کو عزت دیتا۔

لوگوں کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے والے بم ڈسپوزل یونٹ کے

اہلکاروں کو ماہانہ صرف پچاس روپے "خطرہ الائونس" کے ملتے ہیں کئی مرتبہ اس بارے میں مختلف ساتھیوں سے بات کی جب بھی حکم خان سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ مرحوم کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کی کئی باتیں یاد آرہی ہیں لیکن انسپکٹر حکم خان کیلئے لکھے جانیوالے ان چند فقروں میں اپنے حکمرانوں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں نہیں پتہ کہ حکم خان جیسے نڈر لوگوں کو ماہانہ پچاس روپے خطرہ الائونس ملتا ہے حالانکہ انہی وی آئی پی کی ڈیوٹی کیلئے یہ لوگ جلسہ گاہوں میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔حکم خان تو شہید ہوگیا اب اس کیلئے حکمران کچھ نہ کچھ اعلان تو کرینگے ۔ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جو زندہ لوگوں کی زندہ درگور کرنے کے عادی ہے اور جب لوگ مر جاتے ہیں تو پھر ان کی یاد میں پروگرام بہت کرتے ہیں اور انکی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔کیا قوم کیلئے اپنی زندگیاں خطرے میں ڈالنے والے حکم خان جیسے دیگر اہلکاروں کی خطرہ الائونس بڑھ نہیں سکتی۔دیگر صوبوں میں ہزاروں روپے ان لوگوں کو خطرہ الائونس کی مد میں دیئے جاتے ہیں کاش " لالٹین "کے دور میں بھیجنے والے حکمران قوم کیلئے زندگیاں قربان کرنے والوں کیلئے کچھ کرسکے۔

موبائل کل اور ہماری منافقت

واہ کیا زبردست ڈانس کر رہی ہے یار مزہ آ رہا ہے۔ یہ وہ کمنٹس ہیں جو گذشتہ دنوں میرے اپنے دفتر کے ساتھی موبائل فون کے ذریعے لی جانیوالی ڈانس کی ریکارڈنگ دیکھتے ہوئے میرے ساتھی کر رہے تھے ۔اس ڈانس کو دیکھنے والے ہر عمر کے لوگ شامل تھے اور بڑے مزے لیکر کسی نامعلوم شخص کی شادی میں ان کے گھریلو خواتین کے ڈانس کو دیکھ رہے تھے جو شائد اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی مرد یا خاتون نے موبائل فون کے ذریعے بنائی تھی اور بعد میں یہی ویڈیو موبائل فون کے میموری کارڈ میں رہ گئی اور کسی " بے غیرت "نے وہ ویڈیو ریلیز کر دی اور اس پر گانوں کی ڈبنگ کروادی۔ گھر میں شادی کے موقع پر خوشی کے عالم میں ڈانس کرنے والی خواتین کو اپنے گھر میں موبائل کیمرے کے ذریعے بننے والی کلپ / مووی میں دیکھ کر مجھے دکھ ہوا اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "یار یہ کیا بکواس دیکھ رہے ہو" جواب میں میرے دوستوں نے کہا کہ ہم کیا کرے اب مارکیٹ میں یہی لوکل چیزیں دستیاب ہے ۔ کچھ ساتھیوں نے مجھے پاگل کہا اور کچھ کہنے لگا کہ " چھوڑو یار اس کا دماغ خراب ہے" اپنی انجوائے کرو۔ یہی کمنٹس سن کر میں نے بھی اپنی کان لپیٹ لئے اور سوچنے لگا کہ کیا ہم اپنے آپ کو پختون اور مسلمان کہلوانے کے قابل ہیں ۔ میرے اتنے لمبے تمہید کا مقصد اپنے آپ کو شریف النفس ظاہر نہیں

کرنا۔ میں بھی ایک عام اور گناہ گار انسان ہوں اپنے آپ کو پختون اور کمزور ترین مسلمان سمجھتے ہوئے میں یہ سوال اپنے آپ سے کر رہا ہوں کہ کیا میں اپنی خاندان کے کسی خاتون کو دوسرے لوگوں کے سامنے نچاتے ہوئے برداشت کر سکوں گا۔ نہیں کبھی نہیں بلکہ اس سے میری لئے موت اچھی ہے کیونکہ یہ انتہائی درجے کی بے غیرتی اور بے شرمی ہے لیکن کیا ہم اور آپ دوسرے لوگوں کے خاندان کی خواتین کو اسی ماڈرن اور پختون معاشرے میں ڈانس نہیں کروا رہے اور اس سے مزے بھی لیتے ہیں ۔یہی وہ عمل ہے جو اس وقت ہمارے ارد گرد ہر جگہ ہو رہا ہے لیکن ہم نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ موبائل فون اس وقت ہر ایک شخص کی ضرورت ہے لیکن ہم نے اس ضرورت کو اپنے سر پر سوار کرتے ہوئے اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کر رہے ہیں ۔

ہم پختون دیگر صوبوں کے لوگوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہت زیادہ مسلمان اور راسخ العقیدہ کہلواتے ہیں نماز روزے کی پابندی کرتے ہوئے اس پر فخر بھی کرتے ہیں اگر ہمارے خاندان کی کسی خاتون کے حوالے سے غلط بات سننے کو ملے تو ہم قتل سے بھی دریغ نہیں کرتے اور نسل در نسل دشمنیاں پالتے ہیں لیکن اسی معاشرے میں رہتے ہوئے دوسرے لوگوں کی خواتین ہمارے لئے اتنی احترام کی لائق نہیں جتنی ہمارے اپنے خاندان کی ہوتی ہیں یہ ایک تلخ حقیقت ہے جسے ہم سننا بھی پسند نہیں کرتے ۔اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ کیا تم رنگین مزاج ہو

تو میں جلدی سے کہوں گا کہ نہیں نہیں میں تو بہت " پہنچا ہوا بزرگ " ہوں اور میرے دامن " پر نماز ہوتی ہیں یہ رد عمل صرف میرا نہیں بلکہ ہمارے اس معاشرے میں " 80 فیصد لوگ ایسا ہی کرتے ہیں حالانکہ ان کا باطن اپنے ظاہر کے بالکل مترادف ہوتا ہے -آپ کسی بھی شخص کا موبائل فون لیکر اس کو دیکھ لیں اس میں لازما کوئی نہ کوئی ایسا کلپ / مووی ہوگی جس میں کسی کے گھر میں ہونیوالے خوشی کی تقریب میں ہونیوالے پروگرام کے ڈانس یا اپنے خاندان کے لوگوں کی تصاویر موجود ہونگی کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی خاندان کی خواتین کی فلمیں موبائل فون کے ذریعے بنوائیں اور پھر غیر ذمہ داری کرتے ہوئے اس موبائل فون کو ہر کسی کو دیں یا پھر بغیر میموری کارڈ کے چیک کئے اسے فروخت کریں-یہی میموری کارڈ اور تصاویر بازار میں کاروبار کرنے والے کچھ " بازاری " لوگ پشتو/انگلش گانوں کی ڈبنگ کیساتھ عام مارکیٹ میں فروخت کررہے ہیں -کچھ انتہائی بے شرم لوگ انہی ویڈیوز کو " یوٹیوب " پر ڈالتے ہیں تاکہ اپنے معاشرے کیساتھ ساتھ دنیا بھر میں یہ پیغام لوگوں کو مل سکیں کہ یہ ہمارا اصل چہرہ اور اوقات ہیں -شہر کے مختلف علاقوں میں خصوصا یونیورسٹی ٹائون اور صدر کے مخصوص لوگ جو کہ مارکیٹ میں موبائل فون کے کاروبار سے وابستہ ہیں عام لوگوں کے موبائل فون پر ریکوری سافٹ ویئر چلا کر اس میں ریکارڈ ہونیوالا تمام ڈیٹا واپس لیکر آجاتے ہیں اور پھر اسی ڈیٹا کو بازار میں فروخت کیا جارہا ہے اس ڈیٹا میں لوگوں کے گھروں میں خواتین کی ڈانس سے

لیکر گھریلو خواتین کی تصاویر بھی شامل ہوتی ہیں جو ہم جیسے لوگ موبائل پی لئے بڑی خوشی سے دیکھتے ہیں۔ اگر کسی کو یقین نہیں آتا تو یو ٹیوب پر جا کر دیکھ لیں ایسے ایسے نایاب کلپ / فلم دیکھنے کو مل جائیں گی کہ آپ حیران ہونگے کہ کیا یہ ہمارا ہی معاشرہ ہے اور اس کو آن لائن سائٹس پر دینے والے ہمارے اپنے ہی لوگ ہیں۔اور تو اور گرلز کالجز میں ہونیوالی تقاریب سمیت گیسٹ ہاؤسز میں ہونیوالی سرگرمیوں کی ویڈیوز بھی آسانی سے مل سکتی ہیں۔

موبائل کے استعمال میں ایشیاء میں تیسرا بڑا ملک ہونے کا اعزاز پاکستان کو حاصل ہے اور یہ اعزاز بھی شائد ہمیں حاصل ہے کہ ہم "نام نہاد" مسلمان اخلاق سے گری ہوئی ویڈیوز بھی سب سے زیادہ لوڈ کرتے ہیں مجھے سفید چمڑی والوں کی ویڈیوز کی پروا نہیں کیونکہ شائد ان کے معاشرے میں بے حیائی اور بے شرمی قابل فخر بات ہوگی لیکن ہم بحیثیت انسان / بحیثیت پاکستانی اور بحیثیت مسلمان اس طرح کے عمل کرکے دنیا والوں کو کیا دکھانا چاہتے ہیں۔اپنے آپ کو امت محمدی کہلوا کر ان کی تعلیمات پر عمل نہ کرکے ہم مذاق اڑاتے ہیں کیا اس صورت میں ہماری گلو خلاصی ہوگی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم دوسروں کے گھروں میں ہونیوالی تقریبات کی موویز / کلپ موبائل فون پر دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں لیکن یہی عمل جب ہمارے اپنے کسی پیارے کے ساتھ ہو تو ہم انتہا تک جاتے ہیں کیا یہ ہمارے منافقت کی انتہاء نہیں۔

کیا موجودہ حالات میں ہم اپنے موبائل فون کو صرف ضرورت کیلئے استعمال تک محدود نہیں کر سکتے اگر بحالت مجبوری ہم لوگوں کو اپنے موبائل فون فروخت کرنا پڑے تو کیا ہم اپنے موبائل فون کی میموری کارڈ جلا نہیں سکتے اسی کے ساتھ ساتھ کیا ہمارے معاشرے میں قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانے کیلئے "ڈنڈا اور بیلٹ" والی سرکار کچھ نہیں کر سکتی-یہ مکروہ کاروبار اس وقت مختلف تھانوں کے حدود میں ہو رہا ہے لیکن سب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کیونکہ کچھ کو " منتھلیاں" ملتی ہیں اور کچھ کے بقول کون " اپنے لئے" درد سر ڈھونڈے یعنی جیسا ہو رہا ہے چلنے دو- بقول ایک صاحب کے اگر کوئی خاتون موبائل فون کے سامنے ڈانس کرتی ہیں تو کیا وہ نہیں سمجھتی کہ یہ غلط بھی استعمال ہو سکتا ہے -حالانکہ ویڈیو بنانے والے کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ آج شادی / خوشی کے موقع پر بننے والی موبائل فون کی ذریعے ویڈیو شائد ہی غلط استعمال ہو اور یہی غلط فہمی اس کو لے ڈوبتی ہیں- میرا سوال آپ سب سے ہیں کہ کیا ہم دوسروں کے گھر کی خواتین کو ڈانس کرتے ہوئے دیکھتے ہوئے خوش ہوتے ہیں لیکن اگر یہ عمل ہمارے اپنے خاندان میں کسی کیساتھ ہو تو ہمارا ردعمل کیا ہوگا-یہ وہ سوال ہے جو شائد ہم سب لوگوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے.

خواتین بے حرمتی اور مسلح گروہ

چالیس مسلح افراد کا گروپ ریگی للمہ کے علاقے میں سرشام ہی سرکاری گاڑیوں میں گھوم رہا ہے اور کوئی اس کا نوٹس نہیں لے رہا یہ وہ ایس ایم ایس پیغام ہے جو میرے صحافی دوست نے گذشتہ دنوں مجھے فارورڈ کیا تھا چونکہ ریگی للمہ کا علاقہ قبائلی علاقے خیبر ایجنسی سے متصل ہے اسی وجہ سے میں نے بھی اتنی دلچسپی نہیں لی لیکن گذشتہ دنوں میرے ایک اور صحافی دوست جو کہ مقامی چینل سے وابستہ ہے نے ہائیکورٹ میں ملاقات کے دوران بتایا کہ اس کی خالہ جو کہ پشتہ خرہ کے علاقے میں رہائش پذیر ہے نے بتایا ہے کہ ان کے علاقے میں مسلح افراد گھروں میں داخل ہو کر نہ صرف گھروں کو لوٹتے ہیں بلکہ خواتین کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں اسی دن عدالت عالیہ کے چیف جسٹس دوست محمد خان نے جمعرات کو پولیس افسروں کو عدالت طلب کیا۔ اور ان سے اس حوالے سے پوچھا لیکن عدالت میں موجود زیادہ تر ڈی ایس پیز اور ایس ایچ اوز نے لاعلمی کا اظہار کیا چیف جسٹس کا کہنا تھا کہ اس حوالے سے ہیومن رائٹس سیل پشاور ہائیکورٹ کو متعدد شکایات بھی ملی ہیں عدالت عالیہ میں وکیل نے بھی سیکورٹی کی صورتحال پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس گروہ کی وجہ سے راتوں کو پہرہ دینے پر مجبور ہیں جس پر چیف جسٹس نے پولیس اہلکاروں کو خبردار کیا گیا کہ ایسا واقعہ پھر پیش آیا

تو ایس ایچ او ذمہ دار ہوگا۔

پشاور میں چالیس مسلح افراد کی لوٹ مار اور خواتین کی بیحرمتی کے واقعات نے خوف وہراس طاری کر دیا ہے۔ بم دھماکوں کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ خواتین کی بے حرمتی کرنے والے ڈاکوئوں کے گروہ نے نیندیں اڑا دی ہیں جس کی وجہ سے شہری اپنی حفاظت کرنے پر مجبور ہیں ۔سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ پولیس نے عدالت عالیہ میں اس طرح کے کسی بھی قسم کے گروہ کی موجودگی سے انکار کیا لیکن اس کی خبر پورے پشاور کو ہے لیکن پولیس کو نہیں جو اسی عوام کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور انہی کے ٹیکسوں سے پل رہی ہیں ۔میٹرک میں ہمارے ایک اسلامیات کے استاد تھے ایک دفعہ انہوں نے ہمیں اس کی مثال ایسی دی تھی کہ اگر آپ کسی گھر کے سربراہ ہیں اور آپ کو اپنے گھر میں ہونیوالے واقعات کا پتہ نہیں تو یہ یا نااہلی ہے یا پھر تم نے اس سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جس کی وجوہات بھی انہوں نے دی کہ آنکھیں اس لئے بند کی جاتی ہے کہ انسان یا تو کسی کے ڈر کی وجہ سے خاموش رہتا ہے یا پھر اسے کسی قسم کا لالچ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان آنکھیں بند کرلیتا ہے۔کیا عوام پولیس کے ان " بہادروں " کو اپنے خون پسینے کی کمائی صرف اس لئے دے رہی ہیں کہ گروہ کی موجودگی کے اطلاع کے باوجود یہ کچھ نہیں کر رہی ۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو سارے نااہل ہیں یا پھر "منتھلیوں" کی وجہ سے خاموش ہیں یا پھر ڈرے ہوئے

ہیں۔یہ وہ تین وجوہات ہیں جس کا جواب ہماری پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی دے سکتی ہیں
پولیس عدالت عالیہ کے احکامات کا مذاق کس طرح اڑا رہی ہیں اس کا اندازہ اس بات
سے کیا جاسکتا ہے کہ جمعرات کی دوپہر بارہ بجے چیف جسٹس نے یہ احکامات جاری کئے
جس پر پولیس نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن اسی رات تین بجے کے قریب پانچ گاڑیوں
میں چالیس چوروں کا یہ ٹولہ جنھوں نے بلٹ پروف پہن رکھے تھے اور پشتو اور فارسی
زبان میں آپس میں بات کر رہے تھے حیات آباد کے علاقے فیز تھری میں دیکھے گئے
ہیں ان مسلح افراد کے پاس آٹومیٹک گن بھی ہوتی ہیں اور گھروں میں گھسنے کیلئے یہ لوگ
بندروں کو استعمال کرواتے ہیں بقول ایک عینی شاہد پانچ گاڑیوں میں آنیوالے افراد کے
پاس دو بندر تھے جو انتہائی تربیت یافتہ لگ رہے تھے اور اس سے لگ رہا تھا کہ یہ لوگ
بندروں کو گھروں کے دروازے کھولنے کیلئے استعمال کرتے ہیں ۔گاڑیوں میں مسلح
پھرنے والے ان افراد کے جسامت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غیر ملکی ہیں کالے کپڑے پہنے
ہوئے یہ لوگ غیر ضروری طور پر کسی سے بات نہیں کرتے ۔عینی شاہد کے مطابق پانچ
گاڑیوں میں تقریبا چالیس افراد شامل ہیں جن میں سے تین گاڑیوں میں چوکیداری
کرتے ہیں جبکہ دو اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہوتے ہیں۔حیرت انگیز طور پر ان
لوگوں نے دو ڈبل کیبن گاڑیوں پر سرخ رنگ کی لائٹ لگائی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے
عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیکورٹی ایجنسی یا پولیس کے اہلکار ہیں

حیات آباد میں جمعرات کی رات ایک بجے دکھائی جانیوالی اس گروہ کی آمد سے قبل۔ مقامی پولیس بھی اس علاقے میں تھی اور انہوں نے شہریوں کو یہ کہہ کر گھروں کے اندر بھیج دیا تھا کہ اپنی سیکورٹی کا خیال کرو کیونکہ چوریوں کا خطرہ ہے اور ایک دن پہلے بھی گھروں میں گھسنے کے واقعات ہو چکے ہیں مقامی پولیس کے ان ہدایات کے بعد عام لوگ تو گھروں میں گھس گئے اور پھر مسلح گروہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ریگی للمہ پشتہ خرہ نوے کلے اور وارسک روڈ سمیت پشاور کے مختلف علاقوں میں دیکھا گیا تھا اسی رات حیات آباد کے فیز تھری کے علاقے میں دیکھا گیا لیکن کسی نے اس کا نوٹس تک نہیں لیا۔حالانکہ جس جگہ پر یہ لوگ دیکھے گئے اس سے تقریبا ایک کلومیٹر کے اندر پولیس کا چیک پوسٹ ہے۔یہ مسلح گروہ اپنی گاڑیوں میں موبائل جیمرز لگا کر پھرتے ہیں جس کے باعث لوگ اگر موبائل استعمال کرکے کسی کو اطلاع بھی دینا چاہے تو اطلاع نہیں دے پاتے ۔ پہلے اس گروہ نے شہر کے ارد گرد کے علاقوں میں خوف وہراس پھیلا دیا لیکن اب پوش علاقوں میں بھی دیکھا جا رہا ہے جبکہ ان علاقوں میں بھی دیکھا گیا ہے جہاں پر افغان مہاجرین رہائش پذیر ہوں ۔

عدالت عالیہ کے چیف جسٹس دوست محمد خان نے اس کیس پیں صوبائی حکومت سے بھی رپورٹ طلب کی ہے اور لوگوں کو اپنی شکایات پشاور ہائیکورٹ کے ہیومن رائٹس سیل کیساتھ جمع کروانے کی بھی ہدایت کی ہے انہوں نے کیس کی سماعت کے دوران

یہ ریمارکس دیئے کہ عدالت عالیہ شہریوں کا تحفظ کریگی اور شہریوں کو اس طرح نہیں چھوڑا جاسکتا جو عدالت عالیہ کا قابل تحسین اقدام ہے اور شائد " بیلٹ والی سرکار" کو کچھ شرم "اور "غیرت" آجائے کیونکہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس میں تو " لوگ مالی نقصان تو برداشت کرلیتے ہیں لیکن خواتین کی بے عزتی اور بے حرمتی کے واقعات کسی کیلئے بھی قابل قبول نہیں اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یقینا صورتحال انتہائی ابتر ہوسکتی ہیں کیونکہ اگر شہریوں کو تحفظ نہیں تو پھر وہ ٹیکس کس چیز کا دیتے ہیں یہ ٹیکس تو انہیں تحفظ فراہم کرنے کیلئے ہے اور اگر تحفظ نہیں تو یہ ٹیکس نہیں حکومت کی "بھتہ خوری" ہے اور بھتہ خوری کی اجازت کوئی بھی شخص نہیں سکتا-کیا ہمارے "حکمران" طبقے کو اس کا اندازہ ہے-

ملالہ کے نام خط

ملالہ تم خوش قسمت ہو کہ تمھارے لئے پاکستان کی آزاد میڈیا زور و شور سے مہم چلا رہا ہے تمھیں دختر پاکستان کا لقب دینے کا مطالبہ ہو رہا ہے تمھارے لئے ستارہ شجاعت کا بھی اعلان کیا گیا ملالہ ہر جگہ تمھاری جرات کو سلام کیا جا رہا ہے -ملالہ ! تمھیں دیکھنے کیلئے چیف آف آرمی سٹاف بھی آ رہا ہے اور تمھاری وجہ سے این جی اوز کی دکانداری بھی چل گئی ہیں اور اب ان کی خواتین کی تصاویر اخبار میں تواتر سے چھپ رہی ہیں کاغذی شیر لالٹین کے دور میں پھینکنے والے اور پونڈ اور ڈالر لیکر سیاست کرنے والے رہنماء اور وزراء آئے دن بیانات دے رہے ہیں تم اتنی بین الاقوامی شخصیت بن گئی ہو کہ میڈونا نے تمھاری لئے گانا گایا انجلینا جولی نے تمھارے لئے آن لائن خط لکھا - مجھے بہت خوشی ہوئی کہ سوات سے تعلق رکھنے والی ایک عام سی لڑکی کو اتنا اعزاز ملا ہے لیکن !

ملالہ ! میرا تم سے یہ سوال ہے کہ کیا بی بی سی پر لکھنے والی ڈائری تم خود لکھا کرتی تھی حالانکہ تم اس وقت چوتھی جماعت کی طالبہ تھی مجھے نہیں پتہ کہ گل مکئی کے نام سے ڈائری لکھنے والا کون صحافی تھا اور کیوں ملک چھوڑ کر چلا گیا ہے اگر یہ تم لکھتی تھی تو تم نے باجوڑ ` خیبر ایجنسی مہمند ایجنسی

وزیرستان سمیت تمام قبائلی علاقوں سے بے گھر ہونیوالوں کیلئے کیوں نہیں لکھا اور مجھ جیسے بچوں کیلئے کیوں نہیں لکھا جنھیں نہیں پتہ کہ انہیں کس جرم میں زندہ درگور کردیا گیا اور ان کے خاندان کو کس جرم کی سزا میں ماردیا گیا۔ غلطی ہو گئی میں اپنا تعارف کرانا بھول گئی۔

مجھے جس نام سے پکارو مجھے کوئی غرض نہیں کیونکہ اب میرا بچپنا دس سال کی عمر میں ختم ہوگیا مجھے اپنے علاقہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہاں میں اتنا کہہ دیتی ہوں کہ میرا تعلق قبائل سے ہے۔ میں جب پیدا ہوئی تھی تو میرے)داجی (والد جو کہ غریب دکاندار تھے نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا میں اپنی تین بھائیوں کے بعد چوتھی پیدا ہونیوالی اکلوتی بہن تھی اسی بناء پر میرے تینوں بھائی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے میں اپنی بے بے)امی (کی جان تھی میں لفظ بول تو نہیں سکتی تھی لیکن رب کائنات نے مجھے آنکھیں تو دی تھی میں جب اپنے گھر کو دیکھتی تو خوش ہوتی تھی کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں جب میں پانچ سال کی عمر کو پہنچ گئی تو میرے والد نے لڑکوں کے سکول میں داخل کروادیا حالانکہ ہمارے خاندان والے والد کے اس اقدام کے خلاف تھے کہ ہمارے خاندان میں کسی لڑکی نے سکول نہیں پڑھا۔ میرے والد کو بتایا گیا کہ لڑکیوں کیلئے صرف قرآن پاک کی تعلیم ہے لیکن میرے) داجی (والد نے سب کے رائے مسترد کردی اور مجھے سکول میں داخل کروادیا وہ دن مجھے یاد ہے جب میں نے اپنا نام

لکھنا یکھ لیا تھا اس دن میرے داجی اور بے بے نے مجھے نئے کپڑے لیکر دیئے تھے اور میرے بھائی بھی بہت خوش تھے لیکن پھر منظر تبدیل ہوگیا اور!
ہمارے علاقے میں دکانداروں کو خطوط ملنا شروع ہوگئے کہ اتنے پیسے بھیج دو ورنہ سزا کیلئے تیار رہو۔ مجھے یاد ہے جب میں سکول سے واپس آئی تھی تو میرے داجی جو کہ دوپہر کے کھانے کیلئے گھر آئے تھے بے بے کو علاقہ چھوڑنے کا کہہ رہے تھے ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے داجی کو بھی خط ملا ہے اور وہ کہہ رہے تھے کہ موجودہ حالات میں ہمیں پشاور جانا ہوگا تاکہ ہمارے بچے امن وسکون سے رہ سکیں۔ جبکہ میری بے بے انہیں کہہ رہی تھی کہ صبر کرلو حالات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن حالات ٹھیک تو نہیں ہوئے البتہ میرے داجی جو مشکل سے گھر کا گزارہ چلا رہے تھے ان کی دکان میں نامعلوم لوگوں نے بم رکھ دیا اور یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ میرے دو بھائی اس دن دکان پر میرے داجی کیساتھ تھے دھماکہ تو ہوگیا لیکن اس دھماکے نہ ہماری زندگیوں میں دھماکہ کردیا اس وقت میں آٹھ سال کی تھی جب ہمارے گھر میں میرے دو بڑے بھائیوں جن کی عمریں 12 اور 14 سال کی تھی کے جسم کے کٹے پھٹے حصے "ڈیڈ باڈی" کے نام پر لائی گئی جبکہ میرے داجی کی صرف پھٹی پرانی چپلیاں ہمارے گھر آئی تھی اس دن میرے بے بے کی آنکھوں میں جتنے آنسو میں نے دیکھے تھے اتنے آنسو ملالہ تم نے نہیں دیکھے ہونگے تین لاشوں کے سامنے میری بے بے کا کیا حال ہوا شائد

ہی تمھیں اندازہ ہو لیکن اس واقعے نے ہمارے بے بے کو ڈرا دیا اایک ہفتے کے بعد جب ہمارے سب اپنوں نے آنکھیں بدل دی اور ہم نے اپنا علاقہ چھوڑ دیا اور ہم خیموں میں پناہ گزین ہو گئے!

ہمارے علاقہ چھوڑنے کے بعد لوگوں کے گھروں کو چھوڑنے کا سلسلہ ہو گیا ہمارے علاقے کے لوگوں نے پناہ گزینی شروع کردی میری بے بے کو داجی کی موت نے ڈرا دیا تھا وہ ہمیں ہر وقت خیمے میں رکھتی تھی ہمارے علاقے سے آنیوالے لوگ ہر وقت ڈرے ڈرے رہتے تھے اپنے علاقے میں دھماکوں سے ڈرتے تھے لیکن اب یہاں خیموں میں یہ ڈر تھا کہ ہمیں پولیس والے سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں ہمیں کسی سے تعلق کی بناء پر ہمیں گرفتار نہ کرے کیونکہ بہت سارے میرے ہم جولیوں کے والد اور بھائی قبائلی علاقوں میں کسی سے تعلق کی بناء پر گرفتار ہو گئے اور پھر لاپتہ ہو گئے میرے ساتھی اپنوں کو یاد کرکے رویا کرتے تھے ہاں میرے ایک ساتھی کے بھائی کی لاش ملی تھی جسے "بوری میں بند" کرکے ڈال دیا گیا تھا مجھے نہیں پتہ کہ اس کو مارنے والے کون تھے لیکن اس واقعے کے بعد ہمارے خیموں میں اور بھی ڈر پیدا ہو گیا!

ملالہ! میری باتیں تمھیں شائد بری بھی لگی کیونکہ میں اپنی پوری کہانی سنا رہی ہوں مجھ سے دو سال بڑا بھائی انہی خیموں میں راشن لینے گیا تھا کہ کہیں

گم ہوگیااس کی اچانک گمشدگی نے میرے بے بے کو پاگل کردیا ہمارا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا اور پناہ گزین خیموں کے انچارج میری بے بے کو گالیاں دے رہے تھے کہ تم کیسی عورت ہو کہ اپنے بیٹے کا پتہ نہیں - حالانکہ میری بے بے کو میرے داجی نے بھی کبھی گالیاں نہیں دی تھی لیکن میری بے بے سے غلطی ہو گئی اور میری بے بے نے پہلی مرتبہ میرے بھائی کو لائن میں کھڑا کردیا تھا کہ باہر لائن میں کھڑے ہو کر خیرات میں ملنے والا راشن لے آئو -وہ راشن تو نہیں لایا لیکن میری بے بے کو پاگل کرگیا کوئی کہتا تھا کہ میرے بھائی کو بیگار کیمپ والے لے گئے ہم دھماکوں سے تباہ حال ہو کر یہاں پہنچے تھے کہ یہاں پر امن ہے لیکن یہ کیسا امن ہے ملالہ کہ میرا بھائی کھو گیا اور میری بے بے پاگل ہو گئی -بے بے تو پاگل ہو گئی لیکن مجھے زندہ در گور کر گئی مجھے خیمے سے ایک شخص جو وہاں خیموں میں لوگوں کو امداد دے رہا تھا اور اخبار والے اور خیموں کے انچارج انہیں "سر" کہہ رہے تھے نے مجھے وہاں دیکھ کر گلے لگایا اور مجھے چوما کہ تم میری بیٹی ہوان کی مجھے گود میں لینے والی تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی اور مجھے سر" جو وہاں پر بیٹی کہہ کرلائے تھے نے اپنے گھر میں بچوں کے کھیلنے کیلئے نوکرانی رکھ" دیا اور اب جبکہ میری عمر دس سال ہے میں تین اور چار سال کے بچوں کو اسی "سر" کے گھر میں ان کیساتھ کھیلتی ہوں !ان کے بچے سکول جاتے ہیں لیکن میں ان کی غیر موجودگی میں گھر کی برتنوں کی صفائی کرتی رہتی ہوں اور پتہ نہیں یہ سلسلہ کب

تک جاری رہیگا یہ تو اللہ ہی جانتا ہے -ملالہ ! میرا صرف یہ سوال ہے کہ میرا کیا جرم ہے - کیا میں بچی نہیں ہوں کیا میرا اسکول جانے کو دل نہیں کرتا

ملالہ ! تم اتنی خوش قسمت ہوں کہ برطانیہ میں علاج کیلیے پہنچ گئی ہوں لیکن یہاں میں "سر" کے گھر میں کام کرتے ہوئے بیمار ہو جاتی ہوں تو مجھے گھر کی ماسی " تھپڑ مارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تم بڑی "ملالہ " بنی پھرتی ہوں اور اس کے تھپڑوں کے ڈر" کی وجہ سے میں اپنی بیماری کا بھی کسی کو نہیں کہتی -ملالہ ! میں اپنے اس خط میں آزاد "میڈیا سے بھی سوال کرنا چاہتی ہوں کہ کیا میں کسی کی "ملالہ " نہیں مجھ پر جو" گزری کیا یہ کسی " صحافی " کو نظر نہیں آتا یا میرے علاقے میں جس سکول کو مورچہ "بنایا گیا ہے اس کو مورچہ بنانے والے کیا بچوں کے حقوق سے آگاہ نہیں -ملالہ " میں تمھاری توسط سے کسی حد تک جذباتی اور بے حس قوم سے بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایک ہفتے پہلے تو تم لوگ گستاخ رسول کے پیچھے احتجاج کر رہے تھے لیکن آج انہیں پیغمبر کی شان میں ہونیوالی گستاخی یاد نہیں -ملالہ ! تمھارے ساتھ تو دو اور لڑکیاں بھی زخمی ہوگئیں لیکن کیا اس کا کسی نے پوچھا میں اسی خط کے ذریعے ارباب اختیار سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس کی آڑ میں آپریشن کہاں پر ہوگا اور کتنے مجھ جیسے بدقسمت اور زندہ درگور ہونگے مجھے طالبان سے کوئی لینا دینا نہیں نہ ہی مجھے سیکورٹی فورسز سے کوئی مقصد ہے مجھے صرف یہ جواب دو کہ میرے " بچپنے کا

دشمن کون ہے" کون میرے لئے آواز اٹھائے گا۔

طالبان کیلئے سرکاری پیکج اور بڈھے

ہماری بڑی خواہش ہے کہ سرکار کی نوکری ہو آرام سے ڈیوٹی کرے اور مہینے کے اختتام پر تنخواہ ہمیں بروقت مل جائے لیکن یہ ایسا خواب ہے جو ہم جیسے لوگ روز دیکھتے ہیں لیکن اس کی تعبیر مشکل ہے لیکن اپنے رحمان ملک کے ایک بیان نے نہ صرف مجھے بلکہ میرے ساتھی کو بھی حیران و پریشان کردیا وزیر داخلہ نے طالبان کیلئے جس پیکج کا اعلان کردیا اس سے اندازہ ہوگیا کہ طالبان کو " ظالمان "کہنے والے اپنے مقصد کیلئے کس حد تک جا سکتے ہیں -نہ ہم طالبان کے مخالف ہیں اور نہ ہی ہماری اوقات سیکورٹی فورسز کیخلاف بات کرنے کی ہے کیونکہ ان کے زیر استعمال " لمبے بوٹ" اور " گن "دیکھ کر بڑے بڑے " تیس مارخان" کلمہ شہادت تک بھول جاتے ہیں۔ سو ہم بھی یہاں اپنی بات کرتے ہیں۔

یار میرا دل کررہاہے کہ میں طالبان میں جا کر شامل ہو جاؤں اور ان کیساتھ کام کروں ان کیلئے ویسے بھی پیکج آیا ہے یہ جملہ میرے ایک صحافی دوست نے مجھے کہا۔ صبح سویرے اس کی بات سن کر میں حیران ہوگیا کہ آخر میرے اس شریف اور معصوم ساتھی کو کیا ہوگیا کہ یہ طالبان کیساتھ شامل ہونے کو کہہ رہاہے حالانکہ وہ میری طرح "درمیانہ ہے" یعنی نہ تو اس کا کوئی تعلق کسی خفیہ

ایجنسی سے ہے اور نہ ہی کسی طالبان لیڈر سے اس کا کوئی تعلق ہے اسی بناء پر میری طرح وہ بھی ہر جگہ خوار ہورہا ہے کیونکہ جن صحافیوں کے تعلق ایجنسیوں والوں سے اچھے ہوں ان کے حالات بہت حد تک ٹھیک ہوتے ہیں اور جن کے طالبان کیساتھ تعلقات ہوں وہ بھی کبھی کبھار کوئی بریکنگ نیوز انہیں دے جاتے ہیں جسے وہ دیگر باہر کی نیوز ایجنسیوں سے کوئی نہ کوئی خرچہ نکال ہی آتے ہیں۔جبکہ میری طرح ڈرنے والے ہر جگہ ڈر ڈر کر زندگی گزارتے ہیں۔ خیر بات ہورہی ہے اپنے ساتھی دوست جس سے میں نے پوچھ ہی لیا کہ بھائی یہ کونسا پیکج آیا ہے جس کی وجہ سے تم طالبان میں شامل ہورہے ہو۔جواب میں میرے ساتھی کا کہنا تھا کہ ہمارے عجیب و غریب بالوں کے رنگ والے وزیر داخلہ نے عجیب و غریب بیان دیا ہے کہ "طالبان کا ساتھ دینے والے ان کا ساتھ چھوڑ کر اسلحہ رکھ کر آجائیں تو پھر ہم انہیں سرکاری نوکریاں دیدیں گے" اس کی بات سن کر خود میرے منہ میں پانی بھر آیا کیونکہ پرائیویٹ نوکری کرتے کرتے اب تو ہمت جواب دینے لگی ہے لیکن ہمارے وزیر داخلہ نے ایسی خطرناک شرط رکھی ہے کہ طالبان کے ساتھی ہونا لازمی ہے اب ہماری اتنی اوقات کہاں کہ اپنے آپ کو طالبان کا ساتھی کہہ کر سرکاری نوکری کیلئے اپنے آپ کو پیش کریں ویسے ہمیں تو ڈر اس بات کا ہے کہ اگر ہم نے غلطی سے کہہ بھی دیا کہ ہم طالبان کیساتھ ہیں تو بیلٹ والی سرکار جن کا نام ہم ڈر کی وجہ سے پورا نہیں لیتے اتنا چھتر ماریں گے کہ یقینا مجھے اپنی مری ہوئی دادی یاد آجائیں گی جس کا مجھے

- یقین ہے

ویسے مجھے رحمان ملک کی بات کا بھی یقین نہیں کیونکہ موصوف اتنی تیزی سے بیان بدلتے ہیں کہ اتنی تیزی سے الیکٹرانک میڈیا کے صحافی " تیز تر خبر " کے چکر میں جگہیں بھی تبدیل نہیں کرتے کیونکہ الیکٹرانک میڈیا کے صحافی بہت تیزی کیساتھ ہر جگہ پہنچنے کے دعوئوں میں خبر کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں اور پھر ٹی وی سکرین پر نظر آتا ہے کہ " ہم نے یہ خبر سب سے پہلے ہم نے عوام کو دی اور عوام کو ذہنی تنائو دینے میں ہم پہلے نمبر پر رہے -ذہنی تنائو انسان کو کہاں سے کہاں پہنچاتا ہے ہم بات کر رہے تھے رحمان ملک کی طالبان کے ساتھیوں کو نوکریوں کی -پاکستان کے لاجواب وزیر داخلہ طالبان کے ساتھیوں کو سرکاری نوکریاں دینے کا لالچ تو دے رہے ہیں لیکن اس ملک میں جو نوجوان طبقہ جو پہلے سے ہی بیروزگار ہیں انہیں ایڈجسٹ کرنے کوئی اقدام نہیں اٹھایا جارہا معاشی بدحالی کا شکار لوگوں میں ہمارا زیادہ تر نوجوان طبقہ شامل ہیں اور یہ پہلے سے بیروزگار ہیں اور طالبان کیساتھ نہیں لیکن جس طرح حکومت نے انہیں نظر انداز کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ ہماری نوجوان نسل جلد ہی طالبان کے صفوں میں شامل ہو گی اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہر جگہ پر نوجوانوں کا راستہ روکا گیا ہے سیاستدان کے میدان سے لیکر بیورو کریسی صحافت سمیت ہر شعبے میں "بڈھے " چھائے ہوئے ہیں جو قوم کی خدمت کا بیڑہ اپنے اٹھائے ہوئے

-ہیں حالانکہ ان کی عمر اللہ اللہ کرنے یا پھر "" قبر میں جا کر لیٹنے "کی ہے
ہمارے پشتو میں ایک مثل مشہور ہے جس کے معنی کچھ یوں ہیں کہ " انسان اگر ساٹھ کا ہو جائے تو اسے گولی مار دینی چاہئیے" پشتو میں اس کے تلفظ اور ادائیگی کا اپنا ہی مزہ ہے سرکاری نوکریاں تو عام لوگوں کو ملنے سے رہی عام لوگوں کیلئے گریڈ چودہ سے اوپر کی-نوکری تو خواب ہے اب تو حال ہو گیا ہے کہ لوگ نائب قاصد اور کلرک کی نوکری کیلئے لاکھوں روپے دیتے ہیں کہ چلو سرکار کے کھاتے میں شامل ہو جائینگے - ہمارے ایک رشتہ دار نے پشاور کے ایک بڑے ہسپتال میں نائب قاصد کی بھرتی کیلئے ایک لاکھ روپے دینے کی حامی بھری تھی جس کی ڈیمانڈ اس سے انسانیت کی خدمت کرنے والے ایک بہت بڑے سیاستدان جو اس وقت عوام کی صحت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں کے " پی آر او " کے " پی آر او "نے کی تھی اور رشتہ دار نے اسے ایک لاکھ روپے دیئے ہی تھی لیکن درمیان ہیں میں نے آ کر اس کا کام خراب کر دیا کہ بھائی میرے قسمت میں جو تمھیں ملنا ہے وہ تو ویسے بھی مل کر رہے گا لیکن اپنا رزق کیوں حرام کرنے پر تلے ہوئے ہوں-جس کی وجہ سے میرا رشتہ دار سرکاری نوکری سے رہ گیا رحمان ملک تو طالبان کے ساتھیوں کو لالچ دیکر لے آئیں گے لیکن انہیں کس ڈیپارٹمنٹ میں بھرتی کرینگے کیونکہ وفاق کے زیادہ تر اداروں میں تو لاکھوں روپے رشوت کا مطالبہ کیا جاتا اور لوگ تو بدانتظامی ناانصافی اور کرپشن کی وجہ سے بھاگے ہوئے

ہیں۔دوسرے ہمارے رحمان ملک تو انہیں ویسے بھی "ظالمان" کے نام سے پکارتے ہیں اگر ان کے ساتھی اگر کسی سول اداروں میں آ گئے تو پھر کیا ہوگا۔اگر یہ واقعی ظالمان ہے تو پھر انہیں آفر ہی کیوں کی جارہی ہے کبھی تو انہیں ختم کرنے کے دعوے کئے جاتے ہیں ۔ اور کبھی آفر دیکر انہیں اپنی طرف راغب کرنا سمجھ سے بالاتر گیم ہے

ہمارے ایک صاحب جن کا آغاز " اب پ " سے ہوتا ہے کچھ ستم ظریف اسے " آصف بلال اور پیپلز پارٹی" کہتے ہیں۔ان کی پارٹی "روٹی کپڑے اور مکان" کے نام پر آئی تھی اور گذشتہ ساڑھے چار سالوں میں عام لوگوں سے تو کپڑا اتر گیا روٹی کے لالے پڑے ہیں اور مکانات کیا بنگلے ان لوگوں نے بنالئے ہیں جو " جئے " کے نعرے نوجوانوں سے لگوا کر انہیں روزگار کیلئے سبز باغ دکھاتے ہیں ۔ہم یہاں پر اپنے وزیر داخلہ سے اپیل کرتے ہیں کہ جو نوجوان ہمارے خوار ہو رہے ہیں پہلے ان کی بیروزگاری کو ختم کرنے کیلئے کوئی اقدامات اٹھائیں گذشتہ پانچ سالوں سے ہم تو یہ سنتے آرہے ہیں کہ دھماکہ ہوگیا دہشت گردی ہو گئی نوجوان دھماکوں میں ہلاک ہوگیا نوجوان روزگار کی خاطر ملک چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں لیکن کبھی یہ اعداد و شمار بھی بتائے جائیں کہ حکومتی اداروں نے بغیر رشوت لئے اور میرٹ پر نوجوانوں کو مختلف صوبوں میں روزگار دیں شائد یہی میرے جیسے " ڈرنے والے " صحافی کیلئے ایک بڑی خبر ہو اور پھر ہمارا رحمان

ملک کی بات سن کر منہ میں پانی نہ آئے۔ کہ کاش ہم بھی طالبان کے ساتھی ہوتے تو
ہمیں بھی سرکاری نوکری مل جاتی۔

ملالہ اور این جی اوز کی دکانداری

ملالہ کے واقعے کے بعد این جی اوز بھی ہوش میں آ گئی ہے چونکہ معاملہ ڈونرز کو خوش کرنے کا ہے اس لئے اب خواتین کے این جی اوز بھی ملالہ کے نام پر دکانداری لگانے کی کوششوں میں مصروف ہے کہ چلو اسی کے نام پر "خیرات" مل جائیگا اور ہم "خیرات خور" قوم کے نام پر اپنے لئے کچھ نہ کچھ نکال لیں گے۔ ملالہ پر ہونیوالے واقعے کے بعد پشاور میں خواتین این جی اوز کے ایک گروپ جس میں اقوام متحدہ کی خواتین کیلئے کام کرنے والے ادارے کے مرد بھی حاضری لگوانے آئے تھے وہ بھی ملالہ کے معاملے پر میڈیا کو تاثر رہے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا۔ موصوف ملالہ کیلئے آواز تو اٹھا رہے تھے لیکن اپنا چہرہ میڈیا سے چھپایا ہوا تھا کہ کہیں "طالبان" انہیں اٹھا کر مہمان نہ بنوالیں۔ ویسے بھی ان جیسے بہت سارے لوگوں کو تنخواہ ڈالرز میں لینا اچھا لگتا ہے لیکن زمینی حقائق ان جیسے بہت سارے این جی اوز کے "خیرات" پر پلنے والوں کو پتہ نہیں ہوتا کیونکہ لمبی گاڑیوں اور ایئر کنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھ کر رپورٹ / پروپوزل بھیج کر فنڈ لینا فیلڈ میں جا کر حقیقت معلوم کرنے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن ان کو سمجھائے کون۔ خیر معاملہ ملالہ کے معاملے پر سچ لکھ کر ہمیں "ملال" ہو رہا ہے کیونکہ "ملالہ کے نام خط" پر پڑھے لکھے لوگوں نے سوشل

سائٹ پر جو گالیاں مجھے دی ہیں ان کیلئے میں "دعائے خیر "ہی کر سکتا ہوں ۔گذشتہ دنوں پشاور پریس کلب میں بچوں کے حقوق کیلئے کام کرنے والے ادارے نے صحافیوں کیلئے تربیتی سیشن کا اہتمام کیا جس میں صحافیوں کو بتایا گیا کہ بچوں پر اور ان کیلئے لکھتے ہوئے ہمیں کن کن چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا اور اس کا دائرہ کار کہاں تک ہے ۔تربیتی سیشن میں تقریبا سبھی اس بات پر متفق تھے کہ ملالہ بھی ایک بچی ہے اور بچی کو کبھی بھی سزا نہیں دی جاتی اس بات پر تمام صحافی متفق تھے اسے کس نے سزا دی اور کیوں فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا اور کیا وہ واقعی فائرنگ کا نشانہ بنی بھی تھی یا نہیں یا پھر جن پر الزام لگایا جاتا ہے کیا واقعی وہ لوگ اس واقعے میں ملوث ہے کہ نہیں یہ وہ سوال ہے جو مجھ جیسے کئی صحافی اس تربیتی سیشن میں کر رہے تھے لیکن اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

بطور صحافی میرے اور میرے کئی دوستوں کیلئے یہ بات حیران کن ہے کہ ملالہ پر حملے کے بعد فوری طور پر یکساں قسم کی بننے والی فلم کیسے " سب ٹی وی چینلز "کو مل گئی ہر کو excelusive قرار دے رہا تھا اس فلم کو فراہم کرنے والا کون تھا اور اسے اپنے لئے کون اتنے منظم طریقے سے فلم سب ٹی وی چینلز کو پہنچا گیا۔کیونکہ گذشتہ چار سال ٹی وی چینل کیساتھ رہ کر اتنا اندازہ تو ہوگیا کہ ہر ایک ٹی وی چینل اپنی انفرادیت بتانے کیلئے مختلف قسم کی

لائیو کوریج دیتا ہے لیکن اس واقعے میں فلم سب کو یکساں مل گئی ۔ سوات میں آنے سے قبل ملٹری کے زیر انتظام چلنے والے ادارے کی جانب سے ملالہ کی یکساں قسم کی تصاویر جاری کی گئی جس میں زخم ایک طرف دکھائی دے رہا ہے اور پشاور سی ایم ایچ میں پہنچنے کے بعد زخم کا رخ ہی تبدیل ہوگیا جبکہ یہی زخم برطانوی ملٹری ہسپتال پہنچنے کے بعد غائب ہوگیا یہ سوالات بڑے کنفیوژن پیدا کرنے والے ہیں اور اس کا جواب ابھی تک کوئی بھی نہیں دے سکا ہے ۔اپنی چھتیس سالہ کی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے ملالہ کے حوالے سے یہ سنا کہ اس کے سر کی ہڈی تبدیل کردی جائیگی یہ بات مجھے مزید کنفیوز کر گئی کہ اسے سر کے کون سے حصے کی ہڈی لگائی جائیگی اور کیا ایسی کوئی فیکٹری بنی ہوئی ہے جہاں پر انسان کے سر کی ہڈی تیار کی جاتی ہو ۔کیا اس کیلئے کوئی اپنے سر کی ہڈی عطیہ کرسکتا ہے اگر نہیں تو کیا اسے کسی جانور کے سر کی ہڈی لگائی جائیگی ۔شائد ایسا کوئی انتظام ہو جس کی وجہ سے ملالہ کے سر کی ہڈی لگ جائے ہمیں تو خوشی ہوگی کہ چلو اتنے انسان قابل ہوگئے کہ انسان کی ہڈی بھی بنا لی لیکن ! مجھے اپنے "لالٹین کے دور میں بھیجنے والی سرکار" کے صوبائی ترجمان کی پریس کانفرنس بھی یاد آرہی ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا "کہ اس کے سر کی "ہڈی گولی کی وجہ سے چور چور ہوگئی ہے " لیکن برطانوی ملٹری ہسپتال میں یہ چور چور ہڈی جس پر پشاور میں پٹی بھی نظر آرہی تھی وہاں پر غائب ہوگئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے "ڈاکٹر "للو پنجو قسم کے ڈاکٹر " ہیں ان سے "

قابل تو برطانیہ کے ڈاکٹرز ہیں جنہوں نے ایک ہفتے اندر زخم بھی بھر دیا۔ سب سے عجیب بلکہ ہمارے اپنے " رحمان ملک "کی بالوں کی طرح " غریب " بھی کہ اب تک جتنے بھی لوگوں کا سر کا آپریشن ہوا انہیں گنجا کر دیا جاتا ہے لیکن ملالہ کے معاملے میں ابھی تک ایسا کچھ نہیں کیا گیا اور نہ ہی ہمیں کچھ بتایا گیا کہ معصوم "ملالہ " آپریشن کیلئے کتنی حد تک " گنجی " کر دی گئی۔

ملالہ جب تک پشاور کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں رہی دو دن تک میں اس کے خبر لینے کیلئے کینٹ میں خوار ہوتا رہا جیسا کہ ہمارے صحافیوں کیساتھ " بیلٹ والی سرکار "کا معاملہ ہوتا ہے یعنی جب ضرورت ہوتی ہے تو پھر انہیں ہیلی کاپٹروں میں بھر بھر کر "چاند ماری" دکھانے تو لے جاتے ہیں لیکن جب معاملہ چھپانے کا ہو تو پھر ہم جیسے صحافی ان کیلئے " ٹٹ پو نجئے " بن جاتے ہیں اور ہماری "درگت" عوام سے بھی گئی گزری ہوتی ہے جس وقت ملالہ کو سی ایم ایچ پشاور سے لے جایا جارہا تھا اس سے تقریبا بیس منٹ پہلے ملٹری کے ڈاکٹر نے میڈیا کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ ٹھیک ہے ملٹری کے ڈاکٹر کیساتھ ڈاکٹر فیونا نے بھی میڈیا سے بات کرنی تھی لیکن آخری وقت میں یہ بتایا گیا کہ فیونا نے بات کرنے سے انکار کیا کیونکہ انہیں سیکورٹی خدشات کا سامنا ہے لیکن پھر جب ہماری بات دوبارہ ہو گئی تو بتایا گیا کہ "برطانوی ڈاکٹر فیونا "تو آئی ہی نہیں حالانکہ یہی لوگ ڈاکٹر فیونا کی آمد کی تصدیق

کر رہے تھے ڈاکٹر فیونا کی میڈیا سے بات چیت سے انکار بھی کئی بات کو مشکوک کر گیا لیکن بھیڑ چال میں کون سنتا ہے۔سب سے عجیب بات کہ اپنے "رحمان ملک "نے پشاور یں میڈیا سے بات چیت میں کہا کہ ہمیں مجرموں کا پتہ ہے لیکن اپنے "لالٹین والی سرکار" نے انعام رکھ دیا کہ ہمیں بتا دو ہم انعام دیں گے ۔ہمیں نہیں پتہ کہ ان میں جھوٹا اور سچا کون ہے ویسے دونوں کا تعلق ایسی پارٹیوں سے ہے جو گذشتہ پانچ سال سے عوام سے جھوٹ ہی بول رہے ہیں ۔

ملالہ کے نام پر اب تو ڈالرز آئینگے اور ہماری بہادر قوم اور ان کے رہنماء اور بہت سارے "اسی خیرات" میں ڈبکی لگالیں گے لیکن میں این جی اوز سے یہ سوال کرنا چاہ رہا ہوں کہ ہمیں ملالہ کے نام پر سبق پڑھانے والے " خود "اس بچے کے نام پر کتنے فنڈز لیں گے اور ہمیں اخلاقی اقدار سکھانے والے بڑے بڑے این جی اوز والے کیا برطانوی نشریاتی ادارے سے یہ سوال کرنا چاہیں گے کہ کیونکہ انہوں نے "کوڈ آف کنڈکٹ" کی خلاف ورزی کی ایک بچی کو " طالبان" کے خلاف استعمال کیا کیوں اس بچی کی زبان سے ایسے الفاظ نکلوائے گئے جس کی وجہ سے اس بچی کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیااور کیا معصوم بچی انے میچور الفاظ سکھ سکتی ہیں جتنا ایک صحافی لکھتا ہے اور اس بچی کیساتھ ایک گھنٹے کی انٹرویو میں کچھ حصوں کو ڈائری کی شکل میں دیکر برطانوی ادارے نے چھاپا ۔ کیا اس سے اندازہ نہیں ہوتا کہ اتنے بڑے ادارے "پروپیگنڈے" کی آڑ میں ہمارے ساتھ اور

! ہمارے مستقبل کیساتھ کیا کر رہے ہیں۔کیا اس کا جواب کوئی دے سکتا ہے

ہماری فلمیں تفریح یا لغویات

پختون چرس پیتا ہے نسوار کھاتا ہے اور چھوٹی بات پر دشمنیاں کرتا ہے یہ وہ باتیں ہیں جو ہر جگہ پر ہمارے صوبے سے تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں کہی اور سنی جاتی ہیں لیکن کیا نسوار صرف پختون کھاتے ہیں چرسی صرف پٹھان ہوتے ہیں اور دشمنیوں میں صرف پٹھان لوگ ہی آگے ہیں کیا پٹھان اور اس صوبے سے تعلق رکھنے والے مہمان نوازی کے حوالے سے مشہور نہیں کیا ہمارے معاشرے میں اچھی روایات نہیں اس صوبے سے تعلق رکھنے کی بناء پر کیا ہم لوگ اپنے معاشرے کا اچھا رخ فلموں میں پیش نہیں کر سکتے یہ وہ سوالات ہیں جو ہمارے ارد گرد ہر کوئی کر رہا ہے لیکن اس کا جواب کوئی نہیں دے رہا۔ گذشتہ روز بازار سے گزرتے ہوئے میرا خیال ایک سائن بورڈ کی طرف گیا جس پر ایک پشتو فلم کی تشہیری تصاویر لگائی گئی تھی پشتو کی وہ فلم منشیات کے حوالے سے تھی جس میں ایک ہیرو سوٹا لگاتا ہوا دکھائی دیا گیا تھا۔ سائن بورڈ شہر کے ایک بڑے بازار میں مارکیٹ کے اوپر لگایا گیا جس طرح اس فلم میں پختون معاشرے کا مذاق اڑایا گیا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ خود ہی اپنے کلچر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شہر کے مختلف دیواروں پر پشتو فلموں کے جس طرح کی تصاویر لگائی گئ کیا اس کو دیکھتے ہوئے عام لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس طرح کا لباس اسلحہ کی

بھرمار اور تشدد ان فلم کے پوسٹرز میں دکھایا جاتا ہے کیا وہ دیکھنے والوں پر اثر نہیں کرے گا کیا سڑک کنارے لگنے والے ان فلمی پوسٹرز کو صرف مرد ہی دیکھتے ہیں کیا ہم لوگوں کی مائیں بہنیں بیٹیاں اور ہمارے معصوم بچے ان بازاروں سے نہیں گزرتے یہ وہ سوالات ہے جو فلمسازی کے نام پر اپنے حرام مال کو حلال کرنے والوں کو سوچنا چاہیے اور اسی کے ساتھ ان سینما مالکان کو بھی جو تفریح کی آڑ میں ہمارے مستقبل کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

تفریح ہر ایک کا حق ہے اور کسی کو تفریح سے نہیں روکا جاسکتا لیکن تفریح کے نام پر بکواس اور فحش اور تشدد سے بھرپور فلموں کی نمائش کہاں پر جائز ہے کیا ہمیں بطور مسلمان یہ زیب دیتا ہے کیا یہ ہمارے اخلاقیات میں شامل ہیں یا بحیثیت انسان ہمیں اس کی اجازت ہے کہ نوجوان نسل کو صرف چند پیسوں کی خاطر لغویات میں مبتلا کریں۔ کسی زمانے میں پشتو کی ایک مشہور ایکٹرس کے بارے میں لوگ بات کرتے تھے کہ اس سے پشتو فلموں میں فحاشی کو فروغ دیا اور وہ پختون نہیں تھی اسی باعث اس نے پٹھانوں کو بدنام کردیا لیکن اب تو ہماری انڈسٹری میں پختون کلچر سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل ہیں کبھی انہوں نے اس تبدیلی کیلئے کوشش کی اور اگر نہیں کی تو کیا تفریح کے نام پر ان لغویات کو صرف سینما گھروں کے اندر تک محدود نہیں رکھا جاسکتا فلموں کے

پروموشن کے نام پر ہونیوالی پوسٹر سازی کی گندگی کو گلی محلوں میں لانے کی ضرورت ہی

- کیا ہے

آج سے تقریبا دس سال قبل شوبز رپورٹنگ کرتے ہوئے شوبز کی ایسی ہستیوں سے ملاقات ہوئی تھی جنہیں دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں - میٹرک پاک ہدایت کار ہے اور آٹھویں پاس ہیرو اور بھی ایسے لاجواب نمونے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے اپنے آپ کو ہیرو کے رول میں لانے کے خواہشمند ان " بابا" لوگوں کے بڑھے ہوئے پیٹ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ آخر ان میں کیا ایسی خوبی ہے جس کی بناء پر انہیں ہیرو لیا جاتا ہے ان جیسے لوگوں کی سوچ تو الگ ان کیساتھ بیٹھ کر انہیں عام زندگی میں برداشت کرنا بھی بڑا دل گردے کا کام ہے چونکہ دور پیسے کا چل رہا ہے اس لئے ایسے ایسے نادر نمونے فلموں میں دکھائی دیتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے موجودہ دور میں اگر وکسی کے پاس پیسہ ہے تو اس سرمایہ کو لگا کر کوئی بھی ہیرو بن سکتا ہے بھلے سے کوئی فلم دیکھے نہ دیکھے لیکن سرمایہ کاری کی وجہ سے کوئی بھی اپنے آپ کو ہیرو کہلوا سکتا ہے - اگر پیسہ بھی حرام کا ہو جسے کالا دھن بھی کہتے ہیں اور اس پیسے کو سفید کرنا یعنی حلال کرنا مقصود ہے تو شوبز کی دنیا سے بہتر کوئی جگہ نہیں - عیاشی آپ اس شعبے میں کر سکتے ہیں -ایک نام کا اداکار جو اغواء ہونے کے بعد ملک چھوڑ کر چلا گیا یہ

اس کی کہی ہوئی بات ہے جو وہ کھلے عام کہا کرتا تھا "کہ شوبز کے شعبے میں رہتے ہوئے ایک ہفتے میں اگر میری کسی نئی لڑکی سے دوستی نہ ہو تو مجھے چین نہیں آتا" اس سے اندازہ کیا جاسکتاہے کہ اس شعبے یں کیا ہوتا ہے اور ان کو بنانے والے اور ان میں کام کرنے والے اس معاشرے کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔

ہمارے صوبے میں اب تو کلچر کے فروغ کیلئے این جی اوز بھی میدان میں آ گئی ہیں جو فنکاروں کے نام پر پیسہ وصولی کرنا جانتے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ ایسے لوگوں کو جو یہاں سے اپنے اعمال کی وجہ سے بھاگ کر بیرون ملک چلے گئے تھے انہیں دوبارہ یہاں پر فحاشی کا کاروبار شروع کیا جاسکے تاکہ ان کی روزی روٹی اور عیاشی کا سلسلہ چل نکلے ۔عوام کو لالٹین کے دور میں بھیجنے والی سرکار بھی کچھ نہیں کررہی کیونکہ لالٹین کی روشنی میں انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا ۔اب تو فلموں میں فحاشی کیساتھ ساتھ سی ڈی ڈراموں میں بھی لغویات کا سلسلہ شروع کردیا گیا ہے سب سے عجیب اور حیران کن بات یہ ہے کہ سی ڈینر بنانے والے خود سنسر بورڈ کے حق میں ہیں اور اس کیلئے مخصوص رقم بھی دینا چاہتے ہیں جو کہ سنسر بورڈ کے مد میں استعمال ہوگی لیکن لالٹین والی سرکار کو فرصت نہیں۔ پختونوں کی ترجمانی کا دعوی کرنے والوں کو یہ سب کچھ نظر ہی نہیں آتا فلموں کے بارے میں چلو یہ حجت پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کا سنسر۔

کرنے والے شاید ہماری روایات سے بے خبر ہے لیکن کیا سی ڈینز کی آڑ میں جو فحاشی تشدد اور سگریٹ نوشی کو فروغ دیا جارہا ہے اس کے آگے پل باندھنے کا کردار کون ادا کرے گا۔ کیونکہ سی ڈینز تو اس صوبے میں بن رہی ہیں اور ان کو بنانے والے بھی اس معاشرے کا حصہ ہیں اگر لالٹین والی سرکار سوئی ہے تو کیا ہم اس معاملے میں کچھ کر نہیں سکتے یہ ایسا سوال ہے جو اس معاشرے میں رہنے والے ہر شہری کو اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین اور بچوں کا بڑھتا استحصال

عید کے دوسرے روز جب میں اپنے وکیل دوست کے ساتھ بازار کی طرف آ رہا تھا کہ گندگی کے ایک ڈھیر جس میں پورے علاقے کی گندگی پڑی ہوئی تھی اور عید کے روز شہریوں نے اوجھڑی بھی اسی گندگی میں ڈال دی اسی گندگی کے ڈھیر پر پچاس سال کی ایک خاتون کو دیکھا جس کے ہاتھ میں چھری تھی اور اس گندگی کے ڈھیر میں پڑی اوجھڑی نکال رہی تھی اس کے ساتھ ایک نو سال کا معصوم بچہ بھی موجود تھا جو اپنی والدہ/دادی یا نانی کی مدد کر رہا تھا انہیں دیکھ کر مجھے اپنی امی یاد آ گئی کہ اگر ایسی میری والدہ ہوتی تو کیا ہوتا اور اسی سوچ نے میرے اندر کے دکھ کو زیادہ کر دیا وہ خاتون اوجھڑی نکالتے ہوئے شرم کے مارے نیچے دیکھ رہی تھی کہ اگر اسے کوئی دیکھ لے تو اسے شرمندگی محسوس نہ ہو لیکن اسے دیکھ کر مجھے جو شرمندگی ہوئی وہ میری برداشت سے باہر تھی ۔ اگر یہ اوجھڑی کوئی مرد نکال رہا ہوتا تو اس وقت بھی مجھے برا لگتا لیکن اتنا برا نہیں جب میں نے ایک خاتون کو غربت کی وجہ سے اوجھڑی نکالتے ہوئے دیکھا میں نے اپنے وکیل دوست کو کہا کہ یہاں سے جلدی نکل جاؤ کیونکہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ ہم اپنی خواتین کا کس طرح استحصال کرتے ہیں یہ اس کی ایک مثال ہے۔ خاتون ہونا ایک ایسے معاشرے میں جہاں پر ہر جگہ استحصال ہوتا ہو بہت مشکل کام ہے ہم لوگ

مونچھوں کو تاؤ دیکر اپنے آپ کو پختون اور پھر مسلمان کہلوانے کا فخریہ اعلان تو کرتے ہیں لیکن ہم نے اپنی خواتین کو وہ حقوق دیئے ہیں جو انہیں ہمارے اس معاشرے میں حاصل ہے یا وہ حقوق جو انہیں اسلام نے دیئے ہیں۔ کہنے کو تو ہم علی اعلان کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہیں اور بیٹیاں / بہنیں سب کی سانجھیں ہوتی ہیں لیکن انہیں جو دکھ ہم اپنے دیتے ہیں وہ انہیں کوئی اور نہیں دیتا۔

اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو آپ کو اس معاشرے میں رہتے ہوئے انوکھے ڈرامے ملیں گے ۔بازار میں جھگڑا مرد کرتے ہیں لیکن گالیاں لوگوں کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کو پڑتی ہیں دشمنیاں مردوں کی ہوتی ہیں لیکن گھروں پر فائرنگ/اور حملے مرد ہی کرتے ہیں ہیں تو خواتین اور معصوم بچے ہی نشانہ بن رہے ہیں اگر کسی کو یقین نہیں آتا تو کسی بھی سرکاری ہسپتال میں جاکر ریکارڈ چیک کریں آپ کو اندازہ ہوجائیگا کہ کتنے لوگ ایک دن میں ہسپتال میں لائے جاتے ہیں،اور ان میں خواتین اور بچوں کی تعداد کتنی ہوتی ہیں ۔ان جھگڑوں کے بعد بہنیں اور بیٹیاں اغواء کی جاتی ہیں ۔سب سے انوکھے فیصلے جو ہمارے ہاں ہی ہوتے ہیں کہ فائرنگ اور جھگڑوں کے واقعے مرد ہی بیٹھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ بیٹی یا بہن کو "سورہ" میں دیا جائے تاکہ مردوں کے مسئلے حل ہوسکیں۔یعنی کرنے والے کوئی اور ہوتے ہیں اور اس کا خمیازہ کسی اور نے بھرنا

ہوتا ہے --ہم پانچ وقت کی نماز پڑھنے والے پیدائشی مسلمان ہیں پیدائش کے وقت کانوں میں ہمارے اذان سنائی گئی جس کے بعد ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم مسلمان اور ہم ہی جنت کے ٹھیکیدار ہیں لیکن جو ذمہ داریاں ہم پر عائد کی گئی انہیں پورا کرنے کیلئے ہمارے پاس وقت نہیں۔کیا خواتین کو جائیداد میں حق دینا ہمیں اسلام نے نہیں بتایا کیا معصوم بچوں پر رحم کرنے کا حکم ہمیں اللہ تعالی نے نہیں دیا لیکن ہم وہ بے حس مسلمان ہیں جہاں پر ہمارے مفاد کو ضرب پڑتا ہو وہیں پر ہمیں اسلام کے احکامات بھی نظر نہیں آتے لیکن جب ہمارا اپنا مفاد ہو تو ہم بہت پختون ولی اور مسلمانی کے نام پر کرتے ہیں ۔

خواتین اور بچوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کا عمل ہر جگہ زیادہ ہو رہا ہے بازاروں یں آپ کو درجنوں ایسی خواتین اور بچے نظر آتے ہیں جو سڑک کنارے بیٹھے ہوتے ہیں اور لوگوں سے خیرات مانگتے ہیں کیا ان کے مرد کمانے والے نہیں یا ان میں غیرت نام کی کوئی چیز نہیں کیا یہ خواتین اور بچوں کا استحصال نہیں۔

خاتون بننا اور لوگوں کے رویوں کو برداشت کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ برطانوی اخبار ڈیلی میل میں چھپنے والی ایک خبر سے کیا جا سکتا ہے جس میں ایک برطانوی بچہ جو پیدائش کے وقت لڑکا تھا نے اپنی جنس 17 سال کی عمر میں تبدیل کر دی اور اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ برطانیہ میں سب سے کم عمر میں جنس

تبدیل کرنے والی لڑکی بن گئی ہے رایا کوپر نامی لڑکی کو صرف ایک سال میں اندازہ ہوگیا کہ مرد سے خاتون بننے کا عمل کتنا تکلیف دہ ہے اور یہ اسی کے انطاط ہے کہ میں خوش رہنا چاہتی ہوں اس لئے اب میں دوبارہ مرد بننے کی خواہشمند ہوں "مرد بننے کے عمل سے گزرنے کے بعد مس کوپر.برطانوی آرمی یا ائیر فورس جوائن کرنا چاہتی/ چاہتا ہے یہ مغرب کی عورت کا قصہ ہے جہاں پر ہمارے کچھ لوگوں کے بقول ان کے حقوق ملے ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں مردوں کی ایجارہ داری کیا مشرق اور کیا مغرب میں ہر جگہ پر ہے ۔ہم بحیثیت شہری اپنے رویئوں میں تبدیلی لانے کیلئے کیا کر رہے ہیں کیا ہمارے علمائ/سیاستدان ۔/میڈیا اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے یہ سوچنے کی بات ہے ۔

ممبر صوبائی اسمبلی سید عاقل شاہ پر جعلی ڈگری کیس

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج پشاور کے عوامی نیشنل پارٹی سے تعلق رکھنے والے ممبر صوبائی اسمبلی سید عاقل شاہ پر جعلی ڈگری کیس میں فرد جرم عائد کردی۔

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شبیر خان کی عدالت میں صوبائی وزیر کھیل سید عاقل شاہ کی جعلی ڈگری کیس کی سماعت ہوئی عدالت میں سید عاقل شاہ کی طرف سے عبدالطیف آفریدی ایڈووکیٹ عدالت میں پیش ہوئے انہوں نے سید عاقل شاہ کی طرف سے حلف نامہ جمع کروادیا جس میں انہوں نے موقف اپنایا کہ انہوں نے امریکن انٹرنیشنل کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری لی ہے اور ان کے خلاف کیس بھی سینئر سول جج لاہور کی عدالت میں زیر سماعت ہے جس کی بناء پر پشاور میں کیس کی سماعت روک دی جائے الیکشن کمیشن خیبر پختونخواہ سے سید غفران اللہ شاہ ایڈووکیٹ پیش ہوئے جنہوں نے عدالت عالیہ میں سید عاقل شاہ کے خلاف کیس میں عدالت کو کاغذات پیش کئے الیکشن کمیشن کے مطابق نامزدگی کے وقت سید عاقل شاہ نے پنجاب یونیورسٹی کی بی اے کی ڈگری پیش کی تھی جو بعد ازاں جعلی ثابت ہوئی اور سید عاقل شاہ نے نیو پورٹ انسٹی ٹیوٹ آف کمیونیکشن کراچی کی بی اے کی ڈگری پیش کی جسے ایچ ای سی نے جعلی قرار دیا اور اب انہوں نے امریکن

انٹر نیشنل کالج لاہور کی بی بی اے کی ڈگری بھجوادی ہے تاہم یہ کالج بھی ایچ ای سی کیساتھ رجسٹرڈ نہیں جس پر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شبیر خان نے سید عاقل شاہ پر فرد جرم عائد کردیا سید عاقل شاہ کے وکیل عبدالطیف آفریدی نے عدالت کو بتایا کہ صوبائی وزیر کھیل پانچ نومبر سے تیرہ نومبر تک برطانیہ جارہے ہیں اس لئے کیس کی سماعت 15 نومبر تک ملتوی کردی گئی۔

اے این پی سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزیر کھیل سید عاقل شاہ کو جرم ثابت ہونے پر چھ سے سات سال کی قید کی سزا ہوسکتی ہے الیکشن کمیشن کی طرف سے بھجوائے جانیوالے جعلی ڈگری کیس میں سید عاقل شاہ پر فرد جرم عائد کئے جانے کے بعد کیس کی سماعت 15 نومبر تک ملتوی کردی گئی تاہم قانونی ماہرین کے مطابق ان پر 2/94 پیپلز کے سیکشن 94/82 سمیت پی پی سی کے سیکشن 471/200/199 D/ایکٹ اور 3/78 کے تحت جعل سازی کا مقدمہ چلایا جاسکتا ہے جس میں سزا چھ سے سات سال قید اور عمر بھر کیلئے نااہلی شامل ہیں۔

سید عاقل شاہ کی کیس کی سماعت کے موقع پر سیکورٹی کے سخت انتظامات کئے گئے تھے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج شیبر خان کی عدالت میں صوبائی وزیر کھیل سید عاقل شاہ کی پیشی کے موقع پر سیکورٹی کے سخت انتظامات کئے گئے تھے جبکہ ان کو سپورٹ کرنے کیلئے افغان سنز کے مالک سمیت پی ڈی اے کے ڈائریکٹر جنرل قاضی

لیئق سمیت اے این پی سے تعلق رکھنے والے سابق نائب ناظمین بھی عدالت میں موجود تھے۔

کرپٹ حکمران اور "دو ٹکے" کے عوام

وہ ملک کا اعلی عہدے کا حامل ہوتے ہوئے بھی کچے مکان میں قیام پذیر ہے وہ اپنے پرانی گاڑی فوکسی ویگن کو اپنا قیمتی متاع قرار دیتا ہے حالانکہ یہ گاڑی آج کل پاکستان میں بھی نایاب ہو چکی ہیں صدر ہوتے ہوئے بھی نہ تو اس کا کوئی ذاتی اکاؤنٹ ہے اور نہ ہی اس نے کسی کا قرضہ دینا ہے جس وقت وہ بطور صدر فارغ ہوتا ہے تو اپنی کتیا مانویلا کیساتھ وقت گزارتا ہے بطور صدر اسے جو تنخواہ ملتی ہے اس میں وہ 90 فیصد خیرات کرتا ہے شائد آپ سوچ رہے ہونگے کہ میں اپنے ملک کے کسی بڑی شخصیت کا ذکر کر رہا ہوں - جی نہیں ! میں ذکر کر رہا ہوں یوراگوئے کے صدر خوزے موجیکا کا جس نے صدارتی عہدہ 2010 میں سنبھالا تھا جو صدر ہوتے ہوئے بھی بالکل انوکھے انداز میں زندگی گزار رہا ہے ان کے بارے میں ایک بین الاقوامی آن لائن اخبار کی رپورٹ کے مطابق صدر کو ماہانہ 12500 ڈالر مشاہرہ ملتا ہے لیکن موجیکا ان میں سے 1250 ڈالر لیکر باقی تمام خیراتی کاموں میں صرف کر دیتے ہیں اسی بناء پر اسے فقیر مگر سب سے زیادہ سخی صدر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے مارچ 2010 میں منصب صدارت سنبھالنے والے مسٹر موجیکا کے بقول صدارتی مدت پوری ہونے کے بعد میں باقی زندگی اہلیہ کیساتھ پر سکون طور پر فارم ہاؤس میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں - ان کے بارے میں ٹرانسپرنسی

انٹرنیشنل نے اپنی حالیہ رپورٹ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موجیکاکے دور حکومت میں کرپشن بیں بہت زیادہ کمی ہوئی ہے اور عام لوگوں کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی ہیں جنوبی امریکہ میں واقع یہ ملک خطے میں سب سے کم کرپشن والے ممالک کی فہرست میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ یوراگوئے کے صدر کا عوام کے نام پیغام ہے کہ مثالی رہنما بننے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اچھے کام کا آغاز خود کریں تاکہ دوسروں کو پیروی کرنا آسان ہو۔

ان کے مقابلے میں ہم اپنے ایک ہی "محترم" کو لیتے ہیں جو اب "شہیدوں" کا والی وارث ہے۔ اس ملک میں اور کچھ ہو نہ ہو "شہید" زیادہ ہی ہیں۔ ہمارے اوپر مسلط صرف ایک شخصیت کے کراچی ٹنڈوآلہ یار حیدرآباد نواب شاہ حیدرآباد ٹنڈو محمد خان کلفٹن صدر کراچی سمیت 34 مختلف مقامات پر زرعی زمینیں رہائشی پلاٹس ٹریڈ ٹاور ہیں جن کی قیمت اربوں میں بنتی ہیں ٹھٹھہ سانگھڑ بدین نواب شاہ حیدرآباد میں چھ شوگر ملوں میں ان کے شیئرز ہیں فلوریڈا،برٹش ورجن آئس لینڈ میں چوبیس مختلف کمپنیاں کام کر رہی ہیں جو سب کے سب ہمارے صدر صاحب کی ہیں۔برطانیہ میں نو مختلف مقامات پر جن میں کوئن گیٹ ٹیرس لندن سمیت ہمپشائر روڈ کوچی ہل اور راک ووڈ سٹیٹ میں 355 ایکڑ زمین بھی شامل ہیں جو کھربوں روپے مالیت کی ہے اسی طرح بیلجیم میں دو مختلف جگہوں پر چار دکانیں دو اپارٹمنٹ جو کہ برسلز میں واقع ہے اور اس کی مالیت بھی پاکستانی

روپوں میں کروڑوں روپے بنتی ہیں امریکہ میں ٹیکساس پام بیچ فلوریڈا میں پراپرٹی کیساتھ ساتھ فرانس کے علاقہ کینیز میں بھی زمین ہے جس کے منتظم شمی قریشی نامی شخص ہے اس طرح دبئ سوئٹزرلینڈ لندن جنیوا پیرس میں 27 مختلف بینکوں میں اکاؤنٹس ہیں جن ہیں اربوں روپے پڑے ہیں یہ تمام تفصیلات آن لائن مختلف ویب سائٹس پر دستیاب ہیں جس میں روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر آنیوالے حکمران کے اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ یہ صرف ایک شخصیت کے ہیں اسی " غریب پرور" پارٹی کے تمام افراد ایسے ہی ہیں اور ان کے اثاثے اسی طرح ہیں۔

کیا ہم لوگ چوری کرتے ہیں قبضہ مافیا سے آپ کا تعلق ہے اگر نہیں تو پھر ہم لوگ کیوں چوری کرنے والے رشوت خور اور قبضہ مافیا کو سپورٹ کرتے ہیں یقینا یہ سوال آپ لوگوں کو عجیب لگیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اوپر چوری کرنے والے حکمران بیٹھے ہیں جو کرپشن بھی کرتے ہیں اور راتوں کو شہر میں " ٹکے ٹکے "کے لوگوں سے لی جانیوالی ٹیکس کا پٹرول / سی این جی بھر کر سرکاری گاڑیوں میں انہی "ٹکے ٹکے کے لوگوں کی زمینوں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر راتوں رات وہاں اپنی قبضہ مافیا بھجوا کر" زمینیں قبضہ کرتے ہیں ایسے حکمران جنہیں صرف اپنا گھر بھرنا زمینیں لینا اور بینکوں میں اکاؤنٹس کھول کر جمع کرنا ہی آتا ہے یقین نہیں آتا تو اسلامی جمہوریہ عوامی حکومت پاکستان کی

تاریخ کا جائزہ لیں ایک سے ایک بڑا چور کبھی اسلام کے نام پر آیا کبھی قوم پرستی کی آڑ میں ملک کا بیڑہ غرق کرگیا کوئی انقلاب لانے کی دعویداری کرکے ملک کو تباہ حال کرگیا اور کوئی ملک کو آدھا ڈبونے کے بعد بھی شہید کہلانے لگا اور کوئی انہی " ٹکے ٹکے " کے لوگوں کیلئے بیرون ملک سے قرضوں اور خریداروں میں کمیشن کھا کر ڈکار گیا لیکن پھر بھی یہ لیڈر صاف ستھرے ہیں اور " دو ٹکے " کے لوگ زندہ باد اور مردہ باد کرتے دکھائی دیتے ہیں لاٹھی چارج بھی یہی لوگ کھاتے ہیں جیلوں میں بھی یہی لوگ خوار ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ۔کیا ہمارے عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں یا پھر ان لوگوں کیساتھ ملے ہوئے ہیں ۔

گذشتہ روز ایک بین الاقوامی ادارے نے سروے رپورٹ جاری کی ہے جس میں بتایا گیا کہ پاکستان میں غربت کی شرح مزید نیچے گر گئی ہیں اور غربت کی سطح سے زندگی گزارنے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے غربت کے حوالے سے کئے جانیوالے سروے نے اس بات پر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ عوام کے ووٹوں سے آنے کے دعویدار ہمارے حکمران اس ملک کے غریب عوام کے کتنے ہمدرد ہیں ہمارے ہاں کرپشن کتنی ہے اس کا اندازہ ایک وفاقی ادارے میں بھرتیوں کیلئے خواہشمند افراد سے لاکھوں روپے کی وصولی ہے ۔ اسلام اور عوامی خدمت کا نعرہ بلند کرنے والے ہمارے حکمران نے متعلقہ وفاقی ادارے میں بھرتیوں کیلئے اپنی بہن

کو ٹاسک دیا ہے جنھوں نے باقاعدہ ممبران قومی اسمبلی کو تین سے دس سیٹیں دے رکھی ہیں جن پر چار لاکھ سے اٹھارہ لاکھ روپے وصول کئے جارہے ہیں میرے ایک جاننے والے کسی کو فون پر بتا رہے تھے کہ اس نے اٹھارہ لاکھ روپے میں نو لاکھ روپے دیدیئے ہیں اور بقایا نو لاکھ روپے کنفرمیشن لیٹر ملنے کے بعد دیئے جائیں گے مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی کہ آخر یہ اٹھارہ لاکھ روپے اس عہدے کیلئے دینے کے بعد اسے کس طرح پورا کرے گا یہ وہ سوال ہے جو مجھے پریشان کررہا ہے کیونکہ اٹھارہ لاکھ دینے کے بعد تو متعلقہ شخص اگر ماہانہ بھی لاکھ روپے پیدا کرے تو وہ ڈیڑھ سال تک تو اپنی رقم پیدا کرنے کیلئے کام کرے گا یہ سلسلہ صرف ایک وفاقی ادارے میں نہیں بلکہ اپنے لالٹین والی سرکار جن کے لالٹین کی روشنی بھی آخری لمحوں کی مہمان ہے وہ بھی اسی طرح ہی عوام کی خدمت کررہی ہے یہ صورتحال کرپشن کے حوالے سے ہے رہی بات غربت کی تو جس طرح حکمران اپنی عیاشیاں کررہے ہیں اور لوٹ مار انھوں نے گیس بجلی اور مختلف مدوں میں شروع کردی ہیں اور عام آدمی جن مسائل سے دوچار ہورہا ہے اور اس کو پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ پہلے تو لوگ راتوں کو گھروں میں داخل ہو کر ڈکیتیاں اور چوری کرتے تھے لیکن اب جس طرح کی صورتحال کا انہیں سامنا ہے عام لوگ اب دن دیہاڑے لوٹ مار شروع کرینگے یا پھر اپنی بدحالی کو ختم کرنے کیلئے انقلاب کیلئے اٹھیں گے

لالٹین والی سرکار کی خود ساختہ "اتفاق رائے" اور لوٹا

خدا کی زمین پر اپنے اختیار کا دعوی کرنے والی " لالٹین والی سرکار" نے کالا باغ ڈیم کو متنازعہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ قومی اتفاق کیلئے اس معاملے کو اچھالنے کی ضرورت نہیں اور اگر ایسا کیا گیا تو لالٹین کی روشنی میں لالٹین والی سرکار احتجاج بھی کریگی۔ صوبے سے تعلق کی بناء پر ہم کالا باغ ڈیم کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن سیلاب کی تباہ کاریاں ہم نے نوشہرہ میں دیکھی ہیں اس لئے ہماری بھی لالٹین والی سرکار سے اتفاق ہے کہ اس ایشو کو نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہے کیونکہ تین صوبے اس کو مسترد کر چکے ہیں اس لئے اس منصوبے کے بجائے ایسے منصوبے شروع کئے جائیں جس پر نہ صرف قومی اتفاق رائے ہو بلکہ عوام کو بھی سہولت ہو تاکہ وہ "لالٹین کی روشنی " سے نکل کر بجلی کی سہولت سے مستفید ہوں۔انتخابی فضاء بننے کے بعد" لالٹین والی سرکار" کو صوبے کے عوام کو اگلے پانچ سال کیلئے دوبارہ بے وقوف بنانے کا خیال آ ہی گیا اس لئے سرگرمیاں بھی شروع کردی گئی اور اب عوام سے کہا جارہا ہے کہ ہم کھلے میدان میں سرگرمیاں کررہے ہیں حالانکہ نوشہرہ میں ہونیوالی "کھلے میدان" کی سیاسی سرگرمی سے اندازہ ہوگیا کہ امن کا نعرہ بلند کرنے والے عوام سے کتنی دوری پر رہنا چاہتے ہیں اس کا اندازہ ڈاگ اسماعیل خیل میں ہونیوالے جلسے سے بخوبی کیا

جاسکتا ہے جس میں صرف پشاور سے تین سو کے قریب پولیس اہلکار سیکورٹی کیلئے تعینات کردیئے گئے جبکہ مردان اور نوشہرہ سے لائے جانیوالی پولیس سپیشل برانچ کے اہلکار اور چار لگائے گئے واک تھرو گیٹ اس کے علاوہ ہیں - عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والی پولیس سپیشل برانچ اور بیوروکریٹس کا اس جلسے میں حال یہ تھا کہ ووٹ دینے والے غریبوں کو کتوں " سے بدتر نظر سے دیکھ رہے تھے- کسی کو یقین نہیں آتا تو جا کر جلوزئی ڈاگ " اسماعیل خان اور ملحقہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں سے اس دن کی کارروائی کا پوچھ لیں جنہیں اپنے ہی علاقے میں جانے کی اجازت نہیں دے جارہی تھی کیونکہ امن کے دعویداروں کو سیکورٹی خدشات تھے اور انہوں نے سکینر خاردار تاریں اور جنگلے سمیت عام لوگوں کو اپنے گھروں سے بھی دور گاڑیاں رکھنے پر مجبور کردیا اور بیمار بھی اسی دن خوار ہوتے رہے -فائدہ ایک شخصیت کا تھا جو ایک پارٹی سے دوسری پارٹی -میں جارہا تھا

عوام کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنے والی " لالٹین والی سرکار " کو صوبے کے عوام کا اتنا احساس ہے کہ صبح سویرے سے انہوں نے پبی سٹیشن جلوزئی اور مختلف علاقوں یں غریبوں کی دکانیں بند کردی جو دوپہر چار بجے تک بند ہی رہی پبی سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک صحافی کے بقول اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالٹین والی سرکار کو غریبوں کا کتنا خیال ہے اس دن مزدوری غریب مزدوری نہ

کرے یہ لالٹین والی سرکار کو قبول ہے ان غریب مزدور دکانداروں کے گھروں میں چولہا نہ جلے یہ بھی لالٹین والی سرکار کو قبول ہے کیونکہ یہ بے وقوف لوگ تو ویسے بھی روکھی سوکھی کھا کر زندہ رہتے ہیں اور پھر بھی زندہ باد مردہ باد کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن دھماکہ بازار میں نہ ہو جس کا نشانہ یہ غریب غرباء لوگ بن جائیں کیونکہ آنیوالا دور تو ویسے بھی انتخابات کا ہے اس لئے "ووٹوں "تک انہیں زندہ رکھنا ہے بعد میں پھر دیکھا جائے گا-شائد میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہوگیا ہوں چونکہ خود بھی " ٹٹ پونجیا" ہوں اس لئے یہ باتیں کچھ زیادہ ہی لگتی ہیں - قومی اتفاق رائے کا تلقین کرنے والی "لالٹین کی روشنی دینے والی سرکار" کالا باغ ڈیم پر قومی اتفاق رائے کا مطالبہ کرتی ہیں لیکن دوسروں کو اتفاق رائے کا سبق دینے والے" پشتو "میں اپنا الگ قومی ترانہ بجاتے ہوئے قومی اتفاق رائے کو بھول جاتے ہیں -جب اسلامی عوامی اور ساتھ میں جمہوری پاکستان کا اپنا قومی ترانہ ہے تو پھر "الگ سے دکان" سجانے کی ضرورت ہی کیا ہے اور تو اور یہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھ لیا کہ ہمارے لوگ نئ قومی ترانہ کیساتھ ڈانس کرتے ہیں یہ باقاعدہ ریکارڈ پر موجود ہے کہ ڈاگ اسماعیل خیل میں ہونیوالی لالٹین والی سرکار کے جلسے میں کچھ من چلے "نت نئ " قومی ترانے کیساتھ بجائے جانیوالے ڈھول پر اپنے رہنمائوں کے سامنے ڈانس کرتے رہے بعد میں کچھ بڑوں نے اشارہ کیا جس کی وجہ سے منچلے آرام سے بیٹھ گئے ورنہ ڈھول کی تھاپ اور وہاں پر بجائے جانیوالے کچھ گانے سن کر ایسا

محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں پر لوگ "ڈانس کے شوقین " تھے انہیں " لالٹین والی سرکار" سے کوئی غرض نہیں تھا جس کی طرف ایک مقامی شخص نے بھی دوران پروگرام اشارہ بھی کیا تھا ایک بھاری بھر کم شخصیت نے تو جوش میں آکر سو سو روپے کی نوٹ ڈانس کرنے والوں پر نچھاور کردیئے اور ڈانس کرنے والے اپنا ڈانس بھول کر سو سو روپے کیلئے ایک دوسرے کو دھکے دیتے رہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'یہ بھوکی ننگی عوام" لالٹین والی سرکار کے دور میں بھی سو روپے کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

نوجوانوں کو گانوں میں "چوڑیاں "پہننے کا طعنہ دینے والی "لالٹین والی سرکار "کیلئے اطلاع عرض ہے کہ کہ یہاں کے نوجوانوں نے چوڑیاں نہیں پہنی جس کا اندازہ گذشتہ پانچ سالوں سے صوبے ہیں دہشت گردی اور خراب حالات کے باوجود میدان میں ڈٹے رہنا ہے لالٹین والی سرکار بھی ڈٹی ہوئی ہے لیکن "ہیلی کاپٹر اور آٹھ سے دس گاڑیوں کی کانوائے" میں پھرنے والے لوگوں کو گدھا گاڑی اور زمین پر پھرنے والوں کی حالات کا اندازہ ہی نہیں - سڑکیں اور سکول تو بن رہے ہیں لیکن اگر عوام بھوکے ہوں انہیں روزگار کے مواقع نہیں مل رہے ہو تو پھر یہ لوگ کیسے سڑکوں پر نکلیں گے اور کیسے اپنے بچوں کو سکولوں میں بھیجیں گے اس لئے "ہیلی کاپٹر "میں عوام کی خدمت کرنے والی سرکار کو "ہوش کے ناخن" لینے چاہئیے - ویسے ذاتی طور پر مجھے ان ڈیڑھ سو چھوٹے چھوٹے درختوں

کا خیال آتا ہے جسے بے رحمی سے کاٹا گیا اور بھی "لالٹین والی سرکار" کے سرکاری جلسے کیلئے ہمارے ہاں تو ویسے بھی درختوں کی کمی ہے اور صرف کسی کو خوش کرنے کیلئے اگر ڈیڑھ سو درخت کاٹے جائیں تو اس کا ماحول پر کتنا برا اثر پڑے گا اس کا اندازہ کسی کو نہیں ماحول کے حوالے سے یاد آیا کہ گذشتہ ایک ہفتے سے بیگم ہدایت کر رہی تھی کہ "۔ لوٹے کے پیندے" میں سوراخ ہوگیا ہے اس لئے گھر کیلئے نیا" لوٹا لیکر آ جائو" کیونکہ لوٹے" کے بغیر تو کام نہیں چلتا اور ہمارے لئے " لوٹے "کی اہمیت ویسے بھی زیادہ ہے " کیونکہ یہ باتھ روم میں اس کی ضرورت بہت زیادہ پڑتی ہے اور ہم بھی گھریلو ماحول بہتر کرنا چاہتے ہیں اس لئے" لوٹا" زندہ باد میرا مطلب ہے لوٹا لینے کیلئے ہم بازار جارہے ہیں-

"لالٹین والی سرکار کے ترجمان کے نام خط"

چار دن کی مزدوری اتنی بڑی بات تو نہیں لیکن ان چار دنوں کی مزدوری کیلئے میں گذشتہ ساڑھے چار سال سے خوار ہو رہا ہوں اور آج تو حد ہو گئی مجھے "کھلے میدان" میں کئے جانیوالے عوامی جلسے میں بھی " عوامی لیڈر " سے ملنے نہیں دیا گیا شائد آپ لوگوں کو بات بھی بری لگے کہ میں براہ راست شروع ہوگیا ہوں لیکن کیا کروں آج تو برداشت سے بھی باہر ہوگیا۔ میں وہ بد قسمت شخص ہوں جس کے خاندان والے تو ہیں لیکن اس کا کوئی پوچھنے والا نہیں گذشتہ سال آنیوالے سیلاب نے میرے گھر کو تباہ کردیا اور آج کل اپنے بھائی کیساتھ رہائش پذیر ہوں ۔ معاف کرنا بوڑھا ہوگیا ہوں اس لئے میری باتوں میں ربط نہیں اس لئے آپ کو سمجھ نہ آئے میں آپ کو اپنی پوری کہانی سناتا ہوں شائد آپ کو سمجھ آجائے !

تقریبا پانچ سال قبل جس وقت پاکستان میں انتخابات ہو رہے تھے اور جمہوریت کیلئے راہ ہموار کی جارہی تھی میں بھی جمہوری دور کا مزہ چکھنے کیلئے اپنی کوششیں کرنے لگا میں نے اپنے خاندان میں لوگوں کو کہا کہ " لالٹین والی سرکار" کو ووٹ دو تاکہ یہ ہمیں بجلی مفت فراہم کرسکے اور ہم غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ سے بچ سکیں لیکن لوڈشیڈنگ کی بات تو چھوڑی اب تو ہم لالٹین کی

روشنی میں زندگی گزار رہے ہیں میں سیاسی باتیں نہیں کرونگا لیکن میں نے اپنے علاقے کے ایم پی اے کو جو آج کل لالٹین والی سرکار کے ترجمان بھی ہیں کیلئے تین ووٹ پیدا کرکے دیئے تھے چونکہ میں مزدور ہوں اس لئے اپنے جیسے مزدوروں کو کہا کہ ہم پختون ہیں اور ہمیں پختونوں کو ووٹ دینا چاہیئے اللہ کا کرنا اور کچھ میری محنت کہ ہمارے علاقے کے ایم پی اے جیت گئے میں نے اسی جیت کی خوشی میں چار دن تک پبی بازار میں آپ کے حجرے میں لوگوں کی خدمت کی ویسے تو میں مزدور ہوں روزانہ کام کرتا ہوں تو پانچ سو روپے تک مل جاتے ہیں میں نے آپ کے حجرے میں آنیوالے مہمانوں کو پانی پلایا تھا اور چائے بھی لوگوں کے آگے پیش کی تھی حالانکہ میرے مزدور دوست مجھے کہہ رہے تھے کہ اپنی مزدوری کرو کیونکہ یہ ممبران اسمبلی منتخب ہونے کے بعد کسی کے نہیں ہوتے لیکن میں ان کی بات نہیں مانی اور چار دن تک مہمان نوازی کیلئے آپ کے حجرے میں کام کرتا رہا مجھے یہ غرور تھا کہ میں نے اپنی اوقات سے بڑھ کر آپ کیلئے نعرے بھی لگائے اور آپ کو تین ووٹ بھی لیکر دیئے اور اب تک آپ کے حجرے میں لوگوں کی خدمت بھی کی تو مجھے چار دن کی مزدوری بھی مل جائیگی اور ساتھ ہی ہمارے اس وقت کے "غریب پرور" ایم پی اے انعام بھی کچھ دے دینگے لیکن چار دن گزرنے کے بعد تو آپ نے پشاور کا رخ کرلیا اور آپ " لالٹین والی سرکار" کے ترجمان " بھی بن گئے" -

محترم! شکر ہے کہ میں شادی شدہ نہیں ورنہ تو میری بیوی مجھے طعنے دیکر مار دیتی لیکن اپنے مزدور دوست مجھے اب طعنے دیتے ہیں کہ یہ مزدور کی اوقات ہیں ۔کہنے کو تو آپ بھی مسلمان ہیں اور میں بھی الحمد اللہ مسلمان ہوں لیکن کیا مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل ادائیگی کا حکم اللہ تعالی نے نہیں دیا۔ لیکن مجھے تو چار دن کی مزدوری نہیں ملی البتہ اس مزدوری کیلئے خوار ہوتے ہوئے میرا مزید پسینہ نکل گیا لیکن مزدوری نہیں ملی ۔ اپنے علاقے میں کچھ لوگوں نے مجھے کہا کہ سیکرٹریٹ جائو شائد وہاں پر تمھیں تمھاری پیسے مل جائے اور میں کئی مرتبہ آپ کے دفتر بھی آیا آپ کے دفتر میں آنا بھی بڑا عذاب ہے لوگوں سے تلاشی لینے کے بعد چھوڑا جاتا ہے لیکن شکر ہے کہ یہاں پر میری سفید داڑھی کا لوگوں نے خیال کیا اور مجھے دفتر میں جانے کی اجازت مل گئی وہ بھی شناختی کارڈ دکھانے کے بعد میں نے سیکورٹی والوں کو یہ کہا کہ میں ان کا ملازم ہوں لالٹین والی سرکار" کے صوبائی ترجمان میں نے آپ کے دفتر آنے کیلئے لوگوں سے " ۔ پیسے بھی قرض لئے تھے اور بھی اس امید پر کہ وہاں پر مجھے پیسے مل جائینگے تو پیسے واپس کرونگا لیکن میری مزدوری کے پیسے تو نہیں ملے البتہ وہاں پر جو دھکے مجھے ملے ۔اس کا خیال آتے ہی مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوجاتی ہیں کیونکہ آپ کا سیکرٹری آپ سے فون پر بات کرتے ہوئے کئی مرتبہ میں نے دیکھا لیکن مجھے وہ کہتا رہا کہ "لالٹین والی سرکار" کے ترجمان شہر سے باہر ہیں اور کبھی کبھی تو مانسہرہ اور کبھی بیرون ملک جانے

کی نوید سناتے رہے اور میں خوار ہوتا رہا۔ محترم آپ کو شائد یہ بھی برا لگے لیکن کیا کروں آپ اپنی تقریروں میں پختونوں کی مہمان نوازی کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ آپ کے دفتر میں اپنی مزدوری کیلئے کئی مرتبہ آنے کے باوجود مجھے تو کسی نے چائے تو بڑی بات ہے کہ کسی نے پانی پلانے کا بھی نہیں پوچھا اور نہ ہی سوچا ` شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ میں "دو ٹکے " کا مزدور ہوں۔آہ! میاں صاحب آپ کی مہربانی تو میں بھول گیا تھا جو چار دن میں نے آپ کے حجرے میں لوگوں کو پانی اور چائے پلاتے ہوئے مزدوری کی تھی مجھے ان چار دنوں میں صرف پچاس روپے کا نوٹ دیا تھا جو میری عمر کی طرح ہی ضعیف العمر تھا اور کوئی اس کو لینے کیلئے تیار نہیں تھا یہ تو شکر ہے کہ میں نے اس پر اپنے علاقے میں نسوار فروخت کرنے والے دکاندار کو دیا جو اس سے احسان کرتے ہوئے مجھے اس کی جگہ دس دس کے نوٹ دیئے یہ واحد احسان ہے جو ۔ آپ نے کیا تھا اور میں بھی برملا بتا رہا ہوں اتنا تو آپ کا بھی حق ہے

محترم! میں نے دو ہفتے قبل سنا تھا کہ آپ لوگ ڈاگ اسماعیل خیل آرہے ہیں اس لئے میں نے پندرہ روپے دکاندار سے پھر قرض لئے اور میں اس امید پر کہ اپنے چار دن کی مزدوری آپ سے لے سکوں گا میں پبی بازار سے ہوتے ہوئے ڈاگ اسماعیل خیل پہنچا ہوں یہاں پر پولیس نے تلاشی کے نام پر میرے ساتھ جو کیا اس کیلئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے کپڑے اتارے جارہے

ہوں خیر مجھے یہ بھی قبول تھا لیکن جلسہ گاہ میں داخل ہونے کے بعد میرے کپڑوں اور حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے پیچھے بٹھا دیا گیا کہ آرام سے بیٹھے رہو لیکن میاں صاحب ! جس وقت آپ "غیرت حقوق کی بات کر رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ میں آپ کو اپنی مزدوری یاد دلاؤں اس لئے میں سٹیج کی طرف آگیا لیکن مجھے سرخ کپڑوں والوں نے روک دیا اور میری درخواست وہاں پر تعینات سپیشل برانچ کے اہلکار نے لے لی اور ساتھ میں بے عزت بھی کیا میں خوش ہوگیا کہ میرا خط آپ کو ملے گا اور پھر آپ مجھے بلا کر میری پانچ سال پرانی والی چار دن کی مزدوری مجھے دے دینگے لیکن میاں صاحب ! تقریر آپ نے بہت خوبصورت کرلی لوگوں نے تالیاں بھی خوب بجائیں اور آپ میرے چار دن کی مزدوری دیئے بغیر ہیلی کاپٹر میں اڑ کر "پختونوں "کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنے کیلئے نکل پڑے اور یوں اب اس اخبار والے کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں کہ شائد یہ فریاد آپ تک پہنچادیں ویسے مجھے اس کا بھی یقین نہیں کیونکہ یہ لوگ تو صرف "گاڑیوں اور پیسوں " والوں کی ہی سنتے ہیں -

خیر اندیش حکیم خان ولد الطاف ساکن امان کوٹ نوشہرہ

درمیانے" صحافیوں کو دھمکیاں"

صحافت کرنا وہ بھی ایک ایسے دور میں جب ہر جگہ جھوٹ بولا جاتا ہو اور اس جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کیلئے لوگوں کا قتل تک جائز ہو تو صحافت بہت مشکل کام بن جاتا ہے جو لوگ جانبداری سے کام کرتے ہیں ان کیلئے کچھ نہ کچھ فائدہ ہے کیوں کہ کہیں سے انہیں مالی طور پر فائدہ اور مراعات تو ملتی ہے لیکن جو صحافی غیر جانبدار رہ کر رپورٹنگ کرتے ہیں انہیں خطرات کا سامنا ہے ۔اسی صورتحال کا ہمیں بھی سامنا ہے اور خیبر پختونخواہ و قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے صحافی انہی مشکلات سے دوچار ہے موت کا ایک دن معین ہے تاہم اس ایک دن کا خوف صحافیوں کو جینے نہیں دیتا ۔اسی ڈر کے باعث بہت سارے صحافی جنہیں " کہیں اور سے بھی بہت "کچھ ملتا ہے صوبہ خیبر پختونخواہ سے اپنا بوریا بستر باندھ کر نقل مکانی کر چکے ہیں جبکہ میری طرح سینکڑوں صحافی جن کی اوقات "درمیانے "کی ہے مجبورا یہاں پر پڑے ہیں میں اپنے ساتھیوں کو "درمیانہ "اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ " ڈنڈے اور بیلٹ والے سرکار" کے ترجمان ہیں اور نہ ہی ان کا تعلق طالبان کے کسی گروپ سے ہے یہ لوگ غیر جانبدار رہ کر حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں لیکن یہاں کہیں پر " بیلٹ والی سرکار"کا ڈنڈا سامنے آجاتا ہے تو کہیں سے " خط " موصول ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ مورچوں ایوانوں میں رہائش پذیر لوگوں کیساتھ

ساتھ اب تو 'پہاڑوں میں رہنے والوں سے " مراسلے آتے ہیں اور تینوں اطراف سے صحافیوں کو اوقات بتائی جاتی ہے " حالانکہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں کام کرنے والے " صحافی جس بدترین صورتحال سے دوچار ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں -

موجودہ حالات میں ہمارے صوبے کے صحافی جسطرح کام کررہے ہیں ان پر انکی جرات کو خراج تحسین پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ انہیں " موت کا خوف "دیکر "راہ راست "پر لانے کی کوشش کی جائے اور یہ کام تینوں اطراف سے ہورہا ہے کوئی اشارہ کرکے بتادیتا ہے کہ " اپنی اوقات "میں رہو اور کوئی دھمکی دیکر بتادیتا ہے کہ "انسان کے بچے "بن جائو ورنہ دوسری صورت میں نتائج بھگتنے کیلئے تیار رہو- میری یہ باتیں کچھ لوگوں کو بری لگیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ صحافی بھی عام چھابڑی فروشوں مزدوروں کی طرح "مزدور" ہی ہے یہ الگ بات کہ ظاہری طور پر یہاں کے صحافی ایسے نظر آتے ہیں جیسے کہ ان کا تعلق ایلیٹ کلاس سے ہے یا پھر یہ لوگ فیصلہ سازی کی قوت رکھتے ہیں حالانکہ میری طرح سینکڑوں صحافی جو اس وقت مختلف اخبارات ٹی وی چینلز اور ریڈیو کیساتھ وابستہ ہیں "پل "کا کردار ادا کررہے ہیں اور مختلف واقعات کی رپورٹنگ کرکے عام لوگوں تک پہنچا رہے ہیں ان کی حقیقت میں اوقات "مزدور " سے بھی بدتر ہے -جبکہ میری طرح "روزی روٹی "کمانے کے چکر میں صحافت کرنے والے "للو پنجو "قسم کے صحافی نہ

توحکومتی فہرست میں اچھے صحافیوں میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں "پہاڑوں میں رہنے والے" پسند کرتے ہیں -نہ ہی ہم لوگ فیصلہ سازی کی قوت رکھتے ہیں -ہر روز مرنے سے ایک دن کا مرنا آسان ہے خواہ یہ موت کسی بھی صورت میں آئے -ویسے بھی "کرسیوں پر آگے بیٹھ کر" اپنے آپ کو "وی آئی پی" سمجھنے سے " للو پنجو" قسم کے صحافیوں کی اوقات نہیں بدل جاتی اگر یقین نہیں آتا توپانچ تاریخ کے بعد "محنت مزدوری" کرکے صحافت کرنے والے صحافیوں کے جیب / پرس دیکھ لیں آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ بجلی گیس پانی گھر اور رکشوں کے کرایوں سمیت سکول کے بچوں کی فیسوں نے ان صحافیوں کو عام لوگوں کی طرح مارا ہوا ہے دیکھنے میں یہ لوگ "دو ٹکے "کے عوام کی طرح زندہ دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں "زندگی" کی رمق نہیں ہوتی-یہ بھی اس صورت میں جب انہیں تنخواہیں بروقت ملتی ہوں -

کبھی عام زندگی میں آپ نے کسی صحافی کو دیکھا ہے کہ اس کے گھر والے / بچے کہیں پارک میں بیٹھے ہوں یا پھر کہیں آؤٹنگ پر گئے ہوں سوائے چند " لوگوں "کے یہ سارے "دو ٹکے "کے عوام سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں- سرکار کے کھاتے میں آگے پیچھے پھرنے والے کچھ لوگ شوقیہ اور نمائشی صحافت کر رہے ہیں یہ مخصوص لوگ اپنے مقاصد کیلئے پوری صحافی برادری کو بدنام کر رہے ہیں کیونکہ مراعات پلاٹس پراجیکٹس اور غیر ملکی سیر و تفریح یہی مخصوص لوگ کرتے

ہیں جو سب کو تو نظر آتی ہیں لیکن ان بدقسمت صحافیوں کا کوئی پرسان حال نہیں جو اخبار/ ٹی وی چینل/ریڈیو پر کام کررہے ہیں لیکن تنخواہ کے معاملے میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان لوگوں نے متعلقہ اداروں کیساتھ قسطیں ڈال رکھی ہوں کیونکہ انہیں تنخواہیں بھی سہ ماہی اور شش ماہی بنیاد پر ملتی ہیں -یا پھر ان صحافیوں کو جنہیں کسی بھی وقت "لات مار کر" نوکری سے نکال دیا جاتا ہے اور پھر انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا-درمیانے درجے کے صحافی نہ تو کسی " این جی او" سے وابستہ ہے نہ ہی کسی گروپ سے ان کا تعلق ہے اس لئے یہاں بھی مار کھا رہے ہیں کیونکہ آج کل تو این جی اوز بھی صحافیوں کو بہت کچھ سکھا رہی ہیں اسی بنیاد پر کچھ لوگ تو" غیر ملکیوں "کے سامنے اپنے آپ کو "ہراساں" ظاہر کرکے نہ صرف مظلوم ظاہر کررہے ہیں بلکہ غیر ملکی امداد کیلئے راستہ بھی صاف کررہے ہیں یہی مخصوص گروپ بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک ہیں اور "ٹٹ پونجئے" صحافیوں کا قسمت بھی فیصلہ بھی یہی کرتے ہیں اور "ہراساں" کرنے میں بھی یہی لوگ ماہر ہیں-

ہمیں نہیں پتہ درمیانے درجے کے صحافیوں کو کیوں جان سے مارنے کی "دھمکیاں "مل رہی ہیں کیونکہ نہ تو یہ لوگ "ہراساں" کرنے والوں میں سے ہے اور نہ ہی انہیں "پینے کا شوق ہے نہ یہ لوگ نام نہاد آزادی کے حق میں ہے جس کیلئے بڑی بڑی ورکشاپیں " اور" ٹن پارٹیاں " بھی منعقد کرائی جاتی ہیں ہاں اگر یہ

جرم ہے تو پھر خیبر پختونخواہ میں صحافت سے وابستہ 90 فیصد صحافی مجرم ہے جو نہ تو کسی گروپ کا حصہ ہے نہ پشتو زبان کے مصداق کسی کے " تالی سٹ " ہیں ہاں اگر سچ بولنا جرم ہے تو یہ جرم ہر ایک صحافی کر رہا ہے جو کسی کو اگر برا لگتا ہے تو لگتا رہے - ویسے بھی ہم صحافی بڑے بد قسمت لوگ ہیں کیونکہ ان کے " ٹارگٹ " ہونے کے بعد بھی انکی موت کی وجوہات کا پتہ نہیں چلتا - کیونکہ ان کی موت کے بعد تو تحقیقات کیلئے کمیٹیاں بنتی ہیں اور جہاں پر کمیٹی بن جائے وہاں پر " کام کی مٹی " بن جاتی ہے -- ہر ایک کے کام آنے والے صحافیوں کو اگر کوئی اپنا دشمن سمجھتا ہے تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ لوگ بھی " انہی کی طرح مظلوم " ہے سوائے چند مخصوص لوگوں کے موجودہ حالات میں خیبر پختونخواہ کے صحافی تو کچھ اور نہیں کر سکتے لیکن ڈنڈے اور بیلٹ والی سرکار سمیت ایوانوں اور پہاڑوں پر رہنے والے سے گزارش ہیں کہ " ہم جینے دو " کی پالیسی پر عمل پیرا ہے ہم کسی کے ساتھی نہیں اگر کوئی " فنڈز اور پراجیکٹ " لینے کیلئے ڈرامہ کرتا ہے یا پھر " ڈالروں کی آڑ میں کچھ " اور مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو " بڑے " لوگوں کا کھیل ہے ہم تو ویسے بھی " مرے کو مارے شامدار " کے مصداق ہیں . ہاں اگر پھر بھی " صحافی " نشانے پر ہیں تو " بسم اللہ " مرنا تو ایک دن سب نے ہے ہم اپنا حساب اس رب العزت کی دربار میں لیں گے جو سب کے دلوں کا حال جانتا ہے -

- کرے کوئی اور بھرے کوئی اور

کرے کوئی اور بھرے کوئی اور اس کا پشتو زبان میں میں اپنا ہی مزہ ہے لیکن میں یہاں پر اپنی زمانہ طالب علمی کی بات کر رہا ہوں جہاں پر دوران تعلیم اس محاورے کی تشریح کرنی تھی وہ تشریح تو اس وقت ہم نے کر لی تھی لیکن گذشتہ دنوں اس کی تشریح کی صحیح سمجھ آئی ہوا کچھ یوں کہ میرے ایک صحافی دوست نے مجھ سے ڈیجیٹل کیمرہ مانگا جو میں نے اسے دیا اس وقت اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس نے کچھ تصاویر لینی ہیں ۔شام کو جب اس نے مجھے کیمرہ واپس کر دیا اور میں نے اس میں تصاویر دیکھی جس میں معصوم بچوں کی تصاویر موجود تھی جو عید پر ملنے والے کپڑوں پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ ان معصوم بچوں کی تصاویر ہیں جو اس وقت ناکردہ گناہوں کی جرم میں جیل کے اندر سڑ رہے ہیں ان تصاویر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم کتنے بے حس لوگ ہیں کسی اور کی سزا ہم کس طرح ان معصوم بچوں کو دے رہے ہی ان تصاویر نے اس محاورے کی تشریح کر دی پشتو زبان میں اس کی اپنی ایک مثل ہے جو یہاں پر لکھی نہیں جا سکتی کیونکہ پھر " فحاشی کا الزام " لگنے کا ڈر ہے ۔اس کیمرے میں ان معصوم بچوں کی تصاویر تھی جو اس وقت سنٹرل جیل پشاور میں بغیر کسی جرم کے زندگی گزار رہے ہیں ان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ان معصوم بچوں کی مائیں مختلف جرائم میں جیل کے اندر مقید

ہیں کچھ ان میں ملزم ہیں اور کچھ مجرم بن بیٹھی ہیں اور ان کے ساتھ ان کے معصوم بچے بھی "مفت" میں سزائیں کاٹ کر جیل کے سلاخوں کے پیچھے ہیں ان خواتین پر اپنے شوہروں کے قتل کے الزامات سمیت منشیات فروشی سمگلنگ اور کار لفٹنگ کے الزامات ہیں ان معصوم بچوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم اپنے بچوں کیلئے کتنا دکھ درد رکھتے ہیں لیکن دوسروں کے بچوں کیلئے ہمیں کوئی پرواہ ہی نہیں ٹھیک ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے اور ہمارے ہاں تو قانون ویسے بھی اندھا ہے "غریب کیلئے الگ قانون اور امیر کیلئے الگ قانون" بنائے جاتے ہیں لیکن قانون کو اتنا اندھا بھی نہیں ہونا چاہئیے کہ کسی اور کی سزا کوئی اور بھگتے اور وہ بھی معصوم بچے یہ وہ معصوم بچے ہیں جنہیں نہیں پتہ کہ جرم کیا ہوتا ہے اور ان کا اپنا جرم کیا ہے جو کھیلنا تو جانتے ہیں لیکن انہیں کھیلنے کا میدان تک میسر نہیں۔

نہ تو جیل میں مقید ان معصوم اور ہمارے آنیوالے مستقبل کو کوئی جیل میں کھیلنے دیتا ہے کبھی کبھار ان بد نصیب بچوں کو غلیظ ترین نظریں اور گالیاں سننے کو ملتی ہیں جن کا تصور بھی ہم اور آپ لوگ نہیں کر سکتے یہ وہ بدقسمت بچے ہیں جن کے اپنے رشتہ دار بھی انہیں بھول جاتے ہیں جیل کی سلاخوں کے اندر رہنے والے یہ معصوم بچے اپنے ماؤں کیساتھ نا کردہ گناہوں کی سزائیں کاٹ رہے ہیں ہمارے معاشرے میں جہاں پر ویسے بھی بچوں کو کوئی نہیں پوچھتا

ایسے میں اگر یہ معصوم بچے جیل کے اندر تو پھر ان پر مخصوص چھاپ بھی لگ جاتی ہیں کہ یہ جرائم پیشہ کے بچے ہیں۔جس طرح ہمارے جیلوں کا حال ہے ایسے میں فرشتوں کی مانند ان بچوں کو اگر جیلوں میں زندگی گزارنے کا موقع ملے تو یہ کیا سیکھ کر آئیں گے اور اس کے اثرات ہمارے ان بچوں کے مستقبل پر کیا ہونگے کیا اس کا اندازہ کسی کو ہے۔ تصاویر میں ان بچوں کو دیکھ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان معصوم بچوں نے کبھی خوشیاں بھی دیکھی ہونگی۔بقول صحافی دوست نے جب میں نے ایک بچے سے سوال کیا کہ تم یہاں پر کیوں ہو تو اس بچے نے فورا جواب دیا کہ میری ماں نے تین سو دو کی ہے اور اس جرم میں وہ بھی اندر ہے اور میں اپنی ماں کیساتھ ہوں یہ اس معصوم بچے کے ادا کردہ الفاظ ہے ٹھیک ہے کہ ان جیسے بچوں کی ماؤں نے حالات /واقعات/ کے پیش نظر کوئی جرم اگر کیا بھی ہو تو ان کیسز میں یہ بچے کیوں مفت میں اندر ہیں اور کیوں ان بچوں کے ذہن اور زندگیاں تباہ کی جارہی ہیں۔

ان معصوم بچوں کیلئے مختلف این جی اوز بھی کام کررہی ہیں لیکن ان کی تعلیم اور ذہنی نشوونما کیلئے کوئی پروگرام کسی کے پاس نہیں ہمارے صحافی دوست کے بقول اس وقت سنٹرل جیل پشاور میں سولہ ایسے بچے ہیں جو اپنے ماؤں کیساتھ جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند ہیں یہ صرف ایک سنٹرل جیل پشاور کا حال ہے صوبے کی دیگر جیلوں میں مقید ماؤں کے ساتھ قید بچوں کی تعداد کتنی ہے ان

کی عمریں کتنی ہیں اس کا اندازہ اور ڈیٹا کسی کے پاس نہیں نہ انہیں تعلیم دینے / فنی ہنر / ذہنی تربیت کیلئے کوئی منصوبہ / ادارہ کام کر رہا ہے۔ اور تو اور ان معصوم بچوں کو ہم جیسے لوگ بھی اپنی خوشیوں میں یاد نہیں رکھتے۔ عیدالفطر / عیدالضحیٰ جیسے مواقع پر بھی یہ بچے کسی کو یاد نہیں آتے کوئی ان کیلئے جوتے لیکر نہیں دیتا نہ ہی انہیں کوئی نئے کپڑے لیکر دیتا ہے۔ میں تو اس خاتون صحافی کی جرات کو حیران ہوں جس نے امسال عیدالضحیٰ پر قربانی کرنے کے بجائے ان معصوم بچوں کا سوچا اور ان کیلئے کپڑے خرید کر دیئے حالانکہ یہ کام حکومت کا ہے کسی انفرادی شخصیت کا نہیں ہے کوئی ان بچوں کو خوشیوں میں یاد رکھنے والا! اس وقت سنٹرل جیل پشاور میں مقید بچوں میں آٹھ ماہ کا سب سے کم عمر بچہ ہے جبکہ نو سال کا سب سے بڑا بچہ ہے اس طرح کے بچے ہمارے اپنے گھروں میں ہیں ہم ان کیلئے کیا سوچتے ہیں کیا یہ اس قوم کے بچے نہیں۔

موجودہ حالات میں ہم تو یہاں صرف عدلیہ سے ہی توقع کرتے ہیں کہ ان معصوم بچوں کیلئے کوئی اقدام اٹھائے جتنے "سوموٹو" دیگر معاملات میں اٹھاتے ہیں اگر ان معصوم بچوں کیلئے "سوموٹو" لیا جائے تو یہ نہ صرف ان معصوم بچوں اور آنیوالے مستقبل کیساتھ بہتر ہوگا بلکہ ان خواتین کیساتھ بھی بہتر ہوگا جو کئی سالوں سے جیلوں میں قید ہیں مگر ان کی کیسز کی باری نہیں آرہی اگر ان کے کیسز ترجیحی بنیادوں پر عدالتوں میں پیش کئے جائیں تو یقینا بہت سارے

خواتین اور بچے جیل سے باہر نکل آئیں گے اور یہ سلسلہ صرف پشاور سنٹرل جیل تک نہیں بلکہ صوبے کے دیگر جیلوں میں قید خواتین کیلئے ہونا چاہیئے جبکہ جن خواتین پر کوئی جرم ثابت ہو اور ان کے بچے بھی ان کے ساتھ ہوں تو ان کیلئے کوئی عارضی پناہ گاہ بنائی جائے جہاں پر انہیں معاشرے کا فعال شخص بنانے کیلئے نہ صرف انہیں تعلیمی /فنی سہولیات دی جائے بلکہ انہیں جیل کے سلاخوں سے بھی دور رکھا جائے اور بعد میں یہ بچے نہ صرف اپنے ماؤں کا سہارا بنے بلکہ ملکی ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کرے۔سب سے آخری اور اہم بات کہ جو خواتین اس وقت جیلوں میں حاملہ ہیں کم از کم انہیں توصحت کی بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں اور انہیں ماہانہ بنیادوں پر چیک کرنے کا انتظام خاتون لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے کیا جائے۔

رہائشی علاقوں میں کمرشل بلڈنگز اور غیر قانونی ہاسٹلز

اظہار آزادی کا راگ الاپنے والے ٹی وی چینل/اخبارات اور ان سے وابستہ صحافی کہاں سوئے ہوئے ہیں انہیں رہائشی علاقوں میں بننے والی کمرشل اداروں کا پتہ ہی نہیں یا انہیں بھی سرکاری افسران کی طرح " حرام " کا کچھ نہ کچھ مل رہا ہے جس کی وجہ سے یہ بھی خاموش بیٹھے ہیں یہ ایک لمبے خط کا ایک حصہ ہے جو میں شیئر کررہا ہوں یہ ایک طالبہ نے لکھا ہے جس میں اس نے اپنے ساتھ ہونیوالے واقعات کی نشاندہی کی ہے۔ خط میں طالبہ نے فقیر آباد کے رہائشی علاقے میں قائم ہونیوالے غیر قانونی ہاسٹل کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے ۔بقول اس طالبہ کے وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ افغان کالونی سے ہوتے ہوئے اسی راستے پر اپنے کالج جاتی ہیں جہاں پر ہاسٹل قائم ہیں صبح اور دوپہر کے اوقات میں ان ہاسٹلز میں رہائش پذیر لڑکے ان طالبات کو چھیڑتے ہیں اور ان پر آوازیں کستے ہیں۔خط میں طالبہ نے لکھا ہے کہ ہمیں اپنے خاندان والے تعلیم کیلئے سپورٹ کررہے ہیں لیکن راستے میں واقع ان ہاسٹل کے لڑکے انکی زندگی حرام کئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو کر خط لکھ رہی ہیں۔ اس وقت ٹاؤن ون کے مختلف علاقوں بشمول فقیر آباد دلہ زاک روڈ سمیت ٹاؤن ٹو کنٹونمنٹ بورڈ کے گنجان علاقے گلبرگ و سپر مارکیٹ اور ٹاؤن تھری کے علاقوں یونیورسٹی ٹاؤن میں رہائشی علاقوں میں غیر قانونی طور پر

کمرشل بلڈنگ اور خصوصا ہاسٹلز کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہے مختلف کالجز کی انتظامیہ نے یا تو اپنے طلباء کے قیام کیلئے ان ہاسٹلز کو تعمیر کیا ہے یا پھر انہوں نے رہائشی علاقوں میں لوگوں کے گھروں کو کرائے پر لیکر ہاسٹل میں تبدیل کر دیا ہے رہائشی علاقوں میں ہونے کی وجہ سے ان ہاسٹل کے بجلی گیس کے بل کمرشل کے بجائے گھریلو صارفین کی مد میں وصول کئے جارہے ہیں لیکن ان ہاسٹلوں کی وجہ سے رہائشی علاقوں کے لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ کالجز میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے یہ طلباء رات گئے تک ان ہاسٹلوں میں غل غپاڑہ مچاتے ہیں ٹیپ ریکارڈ بجاتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے نزدیکی رہائش رکھنے والے افراد کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے صبح اور دوپہر کے اوقات میں ان ہاسٹلوں میں رہائش پذیر برائے نام طلباء نہ صرف طالبات کے پیچھے آوازیں کستے ہیں بلکہ انہیں تنگ کرتے ہیں اسی وجہ مختلف مقامات پر جھگڑے بھی ہوئے ہیں -زیادہ تر طالبات ڈر کی وجہ سے اپنے گھروالوں کو اس بارے میں بات نہیں کرتی کہ خدانخواستہ انہیں کوئی مسئلہ نہ بنے یا پھر ان کے گھر والے انہیں کالجز سکول بھیجنے سے انکار ہی نہ کردیں کیونکہ اگر اس طرح ان کے والدین بھائیوں کو پتہ چلے گا تو پھر ان کیلئے مسئلہ بنے گا- اسی طرح کا ایک خط ٹاﺅن کے رہائشی لوگوں نے بھی بھیجا ہے جس میں ان لوگوں نے لکھا ہے کہ "ہم سینئر وزیر کی عملداری میں رہتے ہوئے اس کے ڈر اور خوف کی وجہ سے بے بس ڈرپوک اور حق کے بے غیرت لوگ بن چکے ہیں

اور اپنی شرافت / بزدلی کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتے ان شہریوں کا کہنا ہے کہ یہ کونسا قانون ہے کہ رہائشی علاقوں میں کثیر المنزلہ کمرشل عمارتیں کالجز تعمیر کئے جائیں جس سے نہ صرف چلنے والے لوگوں کو مشکلات کا سامنا ہو بلکہ نزدیکی رہائش پذیر لوگوں کے گھروں کی بے پردگی بھی ہو لیکن انہیں پوچھنے والا کوئی نہ ہو۔ کیونکہ ان کو بنانے والوں کی "اپروچ" اوپر تک ہے۔

ان دونوں خطوط سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری "لال ٹین والی سرکار" نے کیسی آنکھیں بند کر رکھی ہیں "ملالہ" کے ڈرامے پر "ملال" کرنے والے حکمران تعلیم کے فروغ کیلئے دعوے تو بہت کر رہے ہیں اور طالبات کو روکنے کو اسلام دشمنی اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھتے اور گردانتے ہیں لیکن جن طالبات کو روزانہ اسی صورتحال کا سامنا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے کیا ان طالبات کو تنگ کرنے والے بھی "طالبان" ہے۔ رہائشی علاقوں میں کمرشل بلڈنگ کی تعمیر کی اجازت کس نے دی اس کا ذمہ دار کون ہے یہ وہ سوال ہے جو اس شہری کے رہائشی کر رہے ہیں۔ مختلف رہائشی علاقوں میں کمرشل بلڈنگز کی تعمیر کا سلسلہ بلدیاتی نظام کے دور میں شروع ہوا جس میں بہت سارے ناظمین نے اپنا حصہ " بھی بقدر" جثہ" وصول کیا اس میں " لال ٹین والی سرکار" کے ناظمین" سمیت "اللہ رسول کے نام پر دکانداری کرنے والے اور کتاب" کو "قرآن" کہلوانے بھی شامل ہیں جن میں کچھ کا تعلق تو قبضہ مافیا سے بھی ہے ان ناظمین کی آنکھیں بند

اور "اپنا حصہ وصول" کرنے کی وجہ سے آج یہ صورتحال ہے کہ یونیورسٹی ٹاؤن کے علاقے سے بھی لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہیں علاقہ چھوڑ کر جانیوالے افراد کے بقول انہیں اپنی عزت عزیز ہے اگر کسی لوفر لفنگے نے ان کی ماں بہن بیٹی پر آواز کس دی یا کچھ کہہ دیا تو پھر جھگڑے / مسائل پیدا ہونگے اور انہی مسائل سے بچنے کیلئے سالوں سے مقیم شہری یہ پوش علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف نکل رہے ہیں نقل مکانی کرنے والے لوگوں کے منہ سے موجودہ " لال ٹین والی سرکار کے کچھ سینئر لوگوں " کیلئے ہم نے جو پشتو میں روایتی گالیاں سنی وہ لکھی نہیں جاسکتی ورنہ دل تو کر رہا ہے کہ ان متاثرہ افراد کے دلوں کا حال اور " سرکار " کی شان میں نکلنے والی مغلظات لکھ دو شائد کسی کو "غیرت " آ ہی جائے۔لیکن ڈر اس بات کا ہے کہ " عوامی حکمرانی "کے دعویداروں کی غیرت مجھ جیسے " ٹٹ پونجئے " کو مشکل میں ڈال سکتی ہے۔سب سے حیران کن امر یہ ہے کہ کمرشل علاقوں میں بننے والی ان بلڈنگز/ہاسٹلز میں مختلف قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے سرمایہ کاری کی ہے انہوں نے باقاعدہ اپنے کاروبار کو محفوظ رکھنے کیلئے روزانہ کی بنیاد پر بھونکنے والے "غنڈے" بھی پال رکھے ہیں جوان ہاسٹل /بلڈنگ کے حوالے سے بات کرنے والوں کو "آنکھیں بھی دکھاتے ہیں "چونکہ مختلف تھانوں کی حدود میں ہونے کی وجہ سے " ڈنڈے والی سرکار" کو ماہوار "بھتہ " ملتا ہے اس لئے ان لوگوں نے بھی آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ ان کے علاقوں میں قائم ان غیر قانونی ہاسٹلز/ بلڈنگز میں غیر

قانونی اسلحہ کتنا پڑا ہے یہاں پر طلباء کے نام پر رہائش رکھنے والے لوگ "کہاں" سے آئے ہیں اور کس قسم کی سرگرمیوں میں یہ ملوث ہیں ان ہاسٹلز/بلڈنگز کے آگے پڑی بوتلیں "کس قسم کی ہیں۔انہیں "ماہواری "مل رہی ہے عوام بے چارے جائے بھاڑ" میں ان کا کام تو ویسے بھی روتے ہی رہنا ہے اور اگر کسی نوجوان کو زیادہ ہی گرم خون آگیا تو پھر ان کے علاج کیلئے ان کے پاس ویسے بھی "ڈنڈا" تو موجود ہے۔ گذشتہ ایک سال کی ان علاقوں میں جہاں پر رہائشی ہاسٹلز/بلڈنگز ہیں ہونیوالے چوریوں فائرنگ رہزنیوں کے واقعات کو شمار کیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان بلڈنگز/ہاسٹلز کے قیام میں کس کو "فائدہ "ہے -ماہانہ بھتہ لینے والے ضلعی انتظامیہ کے چھوٹے اور بڑے حرام خوروں "سمیت ان معاملات پر آنکھیں بند کرنے والے یہ بات شائد بھول گئے" ہیں کہ "دنیا گول ہے "جو عمل آج کسی اور کیساتھ ہورہا ہے کل ان کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے اس وقت یہ لوگ کیا کرینگے لیکن وہ بقول ایک صحافی دوست کے "میراثیوں "پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا -

"بول و براز اور "اشرف المخلوقات

بول و براز کی گندگی میں لتھڑے پانی کو کوئی استعمال کرتا ہےیقینا نہیں بلکہ اس کو سوچ کر جس طرح مجھے کراہیت آ رہی ہیں اس طرح آپ کو بھی یقینا میری یہ بات بری لگی ہو گی لیکن یہ واقعی ہم کر رہے ہیں کسی کو یقین نہیں آتا تو شہر کے مختلف علاقوں میں پینے کے پانی کے زنگ آلودہ پائپ کو دیکھ لیں بہت ساری جگہوں پر گٹروں سے نکلنے والا گند نالیوں میں شامل ہو کر پینے کے صاف پانی کے پائپوں میں غلاظت شامل کر رہا ہے اور ہم گھروں ںیں پائپوں کے ذریعے آنیوالے اسی پانی کو پیتے ہیں۔
میں روزانہ کئی علاقوں سے ہوتے ہوئے گندے نالیوں میں پینے کے صاف پانی کے زنگ آلود پائپ دیکھتا ہوں جس میں سب کچھ مکس ہو رہا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہمیں اور ہماری آنیوالی نسلوں کو بھی مختلف بیماریوں میں مبتلا کرنے کا باعث بن رہا ہے لیکن اس کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں۔کہتے ہیں کہ انسان پر ماحول بہت اثر کرتا ہے اور یہی ماحول اسے اچھا،برا بھی بناتا ہے ماحول ہی لوگوں کے عادات و اطوار میں تبدیلی لانے کا سبب بھی بنتا ہے۔
گذشتہ رات کیبل ٹی وی چینل پر چلنے والی جانوروں کے حوالے سے ایک ڈاکومنٹری دیکھ رہا تھا جس میں جنگل کا بادشاہ شیر شکار کھا رہا تھا سب سے عجیب بات

جو میں نے محسوس کی اور بعد میں اپنے ساتھیوں کیساتھ اسے شیئر بھی کی کہ جنگل کے شیر بھی ہمارے " بے دم والے شیر " کی طرح مال مفت کس طرح کھاتے ہیں۔ بچپن میں یہ سنا تھا کہ جنگل کا بادشاہ شیر اپنا شکار کیا ہوا جانور کھاتا ہے اور کسی دوسرے کا چھوڑا ہوا شکار نہیں کھاتا لیکن اس ڈاکومنٹری میں دکھایا گیا کہ شیروں پر فلم بنانے والے افراد نے ایک گائے کو مارا اور اسے جنگل میں رکھ دیا جس کے بعد شیر غراتے ہوئے آئے اور وہ کسی اور کا شکار کیا ہوا جانور کھا گئے ۔مجھے تو حیرت ہوئی لیکن دوستوں نے مجھے بتایا اور اس بات پر قائل بھی کیا کہ ہ شائد جس طرح ہمارے اشرف المخلوقات "اپنی اوقات سے نیچے "گر گئے ہیں " اسی طرح جنگل کے شیر بھی "مفت میں آئے گوشت " کی پرواہ نہیں کرتے کہ کون شکار کرے تیار ملتا ہے تو یہی بہتر ہے ۔ یقینا یہی حال ہم سب لوگوں کا بھی ہے جو اپنے آپ کو "اشرف المخلوقات " بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن ہمارے کام "جانوروں " سے بھی بدتر ہیں ہمارے ارد گرد کے ماحول نے ہم سے وہ حس ہی چھین لی جس میں ہم کم از کم کسی غلط بات کو غلط کہہ سکیں۔اس موقع پر وہ پشتو کی ایک مثل یاد آرہی ہے جو پشتو میں تو بہت لغو لگتی ہے لیکن اس کا اردو میں مہذبانہ ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے کہ "غریب تو تمھیں اللہ نے پیدا کیا کمینہ تمھیں نے کس بنادیا" یہ ترجمہ میں نے "اخلاقیات "کے دائرے میں رہنے کیلئے کچھ بہتر بنایا ورنہ اس کا پشتو میں براہ راست کچھ اور ہی مطلب نکلتا ہے ۔ویسے بھی آج کل کچھ مہربان مجھے اخلاقیات "کا سبق پڑھانے کی"

کوششوں میں مصروف ہیں کہ "اپنے آپ "میں رہو "دو ٹکے "کے صحافی ہو تمھارا تو پتہ بھی نہیں چلے گا جنہیں میں نے ہنس کر جواب دیا کہ "میرے پاس ہے کیا جو مجھ سے رہ جائیگا" خیر میں کہیں اور نکل گیا -

اسی شہر کے مختلف علاقوں سے کابل ریور کینال گزر رہا ہے اور یہ ہم جیسے "اشرف المخلوقات "کا کمال ہے کہ جو نہر ابتدا میں شہریوں کو صاف پانی کی فراہمی اور ماحول کی بہتری کیلئے رکھی گئی تھی آج اس میں گندگی و غلاظت کی انتہا ہے ہم جیسے ہی لوگوں نے اپنے گھروں سے نکلنے والے باتھ رومز کے گٹروں کا رخ اس نہر کی طرف کردیا ہے اسی نہر کے دونوں اطراف میں جانوروں کے باڑے موجود ہیں جہاں پر کام کرنے والے مزدور صبح و شام جانوروں کا بول و براز اسی نہر میں ڈال کر اپنے گھروں /باڑوں کا گند تو صاف کررہے ہیں لیکن دوسری طرف پورے معاشرے میں گندگی پھیلا رہے ہیں- ہر کوئی دوسرے کو دیکھ کر یہی کام کررہا ہے کہ چھوڑ دویار میں نہیں کرونگا تو کیا ہو جائیگا سب لوگ ایسا ہی کررہے ہیں اور یہی عمل مجھ سمیت ہر کوئی کررہا ہے اس میں غریب امیر تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ کا کوئی فرق نہیں ہر کوئی اپنے اوقات کے مطابق گندگی پھیلا رہا ہے - شہر میں گندے پانی کے نکاسی کیلئے استعمال ہونیوالی نالیوں میں صاف پینے کے پائپ ہیں جو اتنے پرانے ہیں جتنے ہمارے ہاں "سیاستدان "لیکن جس طرح ہمارے سیاستدان " کام چلا رہے ہیں گندے نالیوں سے آنیولا پانی بھی"

ہمیں اس طرح ہی مل رہا ہے اور ہم کام چلا رہے ہیں ۔گندے پائپوں کا پانی ہم استعمال تو کر رہے ہیں لیکن انہیں تبدیل کرنے کیلئے جس طرح ہم پر مسلط " حکم رانوں " کو فرصت نہیں کیونکہ وہ تو " منرل واٹر " بھی گھروں میں پیتے ہیں انہیں " دو ٹکے " کی لوگوں کیا کیا پروا اسی طرح ہم بھی اپنے آپ میں نہیں ایک طرف ہم گندہ پانی استعمال کر رہے ہیں اور دوسری طرف یہی گندہ پانی شہر یں ماحولیاتی آلودگی پھیلا رہا ہے گندہ پانی شہر کے مضافاتی علاقوں میں سبزیوں /پھلوں کے باغات کو پانی دینے کیلئے بھی استعمال ہو رہا ہے شہر میں آنیوالے سبزیوں پھلوں کی لیبارٹری ٹیسٹنگ کا کوئی انتظام نہیں کہ "بول و براز" کے کونسے کیمیکل ہم اپنے گھروں میں "سبزیوں" کی شکل میں حلق میں انڈیل رہے ہیں۔

آلودہ پانی کو صاف کرنے اور اسے قابل استعمال بنانے کیلئے 1992 میں پشاور میں ایک بہت بڑے منصوبے پر کام شروع کیا گیا تھا جس پر اس وقت 95 لاکھ روپے سے زائد کی لاگت آئی تھی جس یں شہر کے مختلف علاقوں میں آلودہ پانی کو صاف کرنے کیلئے پلانٹ لگائے جانے تھے لیکن یہ منصوبہ آج تک مکمل نہ ہو سکا اس وقت سے لیکر آج تک " بے دم کی شیر "سمیت " شہیدوں کے پارٹی " اور اسلام کے نام پر " ٹھیکیداری " کرنے والے بھی آئے ساتھ میں "کچھ دور تو بیلٹ والی سرکار کا بھی رہا لیکن جس طرح پشاور شہر کے ساتھ صوبے کے دیگر اضلاع سے تعلق رکھنے والے وزراء اعلی نے "سوتیلی ماں "کا سلوک کیا اسی طرح یہ لوگ بھی " چل

چلاؤ" کی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور یہ منصوبہ ابھی تک قابل عمل نہ ہو سکااس منصوبے کے باقیات حیات آباد چارسدہ روڈ کوہاٹ روڈ اور چمکنی کے علاقے میں ابھی بھی بڑے بڑے تالابوں کی شکل میں اب بھی موجود ہیں لیکن اس کیلئے مخصوص فنڈز بھی فرشتے" کھا گئے اور ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا نہ شہریوں کو صاف پانی میسر آیا نہ ہمارے" کھیتوں کو صاف پانی مل سکا۔ نہ ہی ہمیں آلودہ ماحول سے نجات ملی۔

اب تو سننے میں آ رہا ہے کہ شہر میں گندے پانی کی ری سائکلنگ اور پرانے اور زنگ آلود پائپ جو کہ شہریوں کو "وٹامن" بھرا پانی فراہم کر رہے ہیں کو تبدیل کرنے کیلئے آٹھ ارب روپے مختص کئے گئے ہیں جس کے تحت شہر میں تین بڑے ٹریٹمنٹ پلانٹ بنائے جائینگے جس میں پانی کو ری سائیکل کیا جائیگا اس کیلئے رقم بھی امریکی ادارہ یو ایس ایڈ فراہم کریگا تاہم ابھی تک یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ "خیراتی "رقم ہے یا پھر "ٹٹ پونجئے قوم کو "قرض "کے مد میں رقم دی جائیگی خیر جیسا بھی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ اس منصوبے سے شہریوں کو گندے پانی سے نجات مل جائیگی تاہم اگر اس منصوبے پر اگر صحیح انداز میں عمل کرایا گیا ورنہ جس طرح اب مخصوص لوگوں کے حلقوں کو اس پروگرام میں شامل کرکے "لالٹین والی سرکار" کے لئے اگلے انتخابات جتوانے کیلئے کام شروع کیا گیا اس سے اتو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ آٹھ ارب روپے بھی "خیراتی قوم"

کے " خیراتی لیڈر" خیرات سمجھ کر ہڑپ کر جائینگے اور دو ٹکے کے عوام ساری عمر "بول و براز والا وٹامن سے بھرپور" پانی پی کر "زندہ باد اور مردہ باد" کرتے رہینگے۔

خوبصورت چہرے تیزاب گردی کا شکار

بیتے دنوں کی بات ہے جب پختون معاشرے میں عورت اور بچوں پر ہاتھ اٹھانا انتہائی بے غیرتی اور عزت کے منافی سمجھا جاتا خواہ عورت یا بچہ کسی جانی دشمن کا ہی کیوں نہ ہوتا۔ عورتوں کی عزت پختون معاشرے میں بہت زیادہ کی جاتی لیکن یہ ہماری بدقسمتی کہ جس طرح ہم "دو نمبر کے پختون" بن گئے ہیں اس لئے ہماری روایات بھی دم توڑ رہی ہیں۔اپنی لالٹین والی سرکار کے دور حکومت میں جہاں ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں وہیں پر ہماری پختون روایات بھی دم توڑ رہی ہیں حالانکہ یہی "پختونوں" کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں اور لوگوں کو توقع تھی کہ "پختونوں کے ٹھیکیدار اپنے عوام کیلئے کچھ کرلینگے لیکن وائے افسوس!۔گذشتہ روز پشاور کے ایک مقامی ہوٹل میں تیزاب گردی کے واقعہ پر بنائی گئی ایک رپورٹ دکھائی گئی جس میں متاثر ہونیوالی معصوم طالبہ نے بتایا کہ رشتے سے انکار کے بعد اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا گیا جس کے باعث اس کے چہرے کا ایک رخ مکمل طور پر مسخ ہوگیا۔وہ خاتون رشتے سے انکار پر بدصورت بنا دی گئی اب وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مردوں سے بدتر زندگی گزار رہی ہیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں مسخ چہروں کو کوئی نہیں پوچھتا یہ اور بات کہ ہمارے اپنے چہرے خواہ کتنے ہی "مسخ" شدہ ہو لیکن ہمیں اپنا آپ نظر نہیں آتا۔ تیزاب کا شکار ہونیوالی خواتین

کیلئے ہماری اسلامی فلاحی ساتھ میں عوامی اور جمہوری پاکستان میں سرکاری طور پر کوئی ادارہ قائم نہیں پرائیویٹ طور پر کچھ این جی اوز کام کررہی ہیں اوران متاثرہ خواتین کو معاشرہ کا کارآمد شہری بنانے کیلئے اقدامات کررہی ہیں۔

تیزاب گردی ہمارے معاشرے کا ایک ایسا المیہ ہے جسے ابتداء میں ہمارے ہاں لوگ دوسرے صوبوں کا مسئلہ قرار دیتے تھے اور اس کی روک تھام کیلئے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے لیکن اب افسوسناک بات یہ ہے کہ خیبر پختونخواہ میں بھی خواتین پر تیزاب پھینکنے کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے سال 2009 کی رپورٹ کے مطابق پاکستان بھر میں 43 سال 2010 میں 55اور2011 میں سو فیصد اضافے کیساتھ یہ تعداد تک پہنچ گئی تھی صوبہ خیبر پختونخواہ میں تیزاب گردی کے 10 رجسٹرڈ واقعات 150 ہوئے جس میں زیادہ تر واقعات پشاور مردان اور ڈیرہ اسماعیل خان سمیت کرم ایجنسی ہوئے - یہ وہ واقعات ہیں جن کی ایف آئی آر درج کردی گئی اور باقاعدہ اخبارات میں رپورٹ ہوئی جس کا پتہ اس حوالے سے کام کرنے والے اداروں کو ہوا تاہم صوبے ہیں اصل واقعات کی تعداد اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہے کیونکہ لوگ اپنی بدنامی کے ڈر سے ان واقعات کو رپورٹ ہی نہیں کرتے اور پرائیویٹ طور پر متاثرہ خواتین کا علاج کرتے ہیں ۔

ہمارے ہاں تیزاب ایک ایسا کیمیکل ہے جو شہر کے مختلف علاقوں سمیت کھلے عام بازار میں فروخت ہو رہا ہے اور اسکو لینے والے افراد کی چیکنگ و مانیٹرنگ کا کوئی انتظام نہیں نہ تو فروخت کے وقت کوئی دکاندار خریدنے والے کا شناختی کارڈ چیک کرتا ہے اور نہ ہیخریدنے والے سے یہ پوچھتا ہے کہ تیزاب کو کس مقصد کیلئے لیا جارہا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اپنی دشمنیوں/ذاتی اختلافات پر لوگوں خصوصا خواتین پر تیزاب پھینکتے ہیں جس کا شکار ہونے کے بعد متاثر ہونیوالی خواتین نہ صرف جسمانی طور پر تباہ حال ہو جاتی ہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو مفلوج تصور کرتی ہیں۔ تیزاب کا شکار ہونیوالی خواتین کی بحالی اور ان وارداتوں میں ملوث افراد کو سزا دینے کیلئے ابھی صوبائی سطح پر قانون سازی ہونا باقی ہے خواتین کیلئے کام کرنے والے صوبائی وومن کمیشن نے اس سلسلے میں ڈرافٹ تیار کرلیا ہے تاہم ابھی بھی اس میں کچھ خامیاں ہیں جسے مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے رابطہ کرکے ختم کیا جارہا ہے لیکن سب سے افسوسناک بات جو مجھ سمیت تیزاب گردی کے پروگرام میں ہر شخص نے محسوس کی کہ خواتین کی نمائندگی کا دعوی کرنے والی کچھ خواتین کی معلومات اس حوالے سے ہماری طرح "زیرو" ہی ہیں قانون سازی کے حوالے سے اس پروگرام میں شامل صوبائی حکومت کی دو خواتین ممبران اسمبلی تیزاب گردی کی روک تھام اور اس کیلئے سزا ئوں پر بات کے بجائے دہشت گردی پر آ گئی اور ان کارونا "تیزاب گردی" سے "دہشت گردی" کی طرف چلا گیااور ہم یہ

سمجھ بیٹھے کہ "تیزاب گردی اور دہشت گردی" شائد آپس میں رشتہ دار ہیں خواتین ممبران اسمبلی کے پروگرام میں بات سننے سے پتہ چلا کہ ہم تو یہاں پر لوگوں اور خصوصا خواتین کیلئے "دودھ اور شہد" کی نہریں بہانے آئے تھے لیکن پشتو مثل کے مصداق کہ "کچھ جوار کے دانے بھیگے تھے اور کچھ آٹا بنانے والی مشین خراب تھی "ہمیں تو اس بات پر افسوس ہوا کہ خواتین کے مسائل پر بھی یہ خواتین ممبران اسمبلی بھی روٹین کی " آئیں بائیں شائیں" کرتی نظر آئی۔

قابل افسوس بات یہ ہے کہ خواتین پر تیزاب پھینکنے کے واقعات میں جہاں دوسرے لوگ ملوث ہوتے ہیں وہیں پر کچھ ایسے واقعات بھی رپورٹ ہوئے جس میں والدین نے اپنی بچی کے سر پر تیزاب ڈال دیا یا پھر والدین نے بچی کو زبردستی تیزاب پلا دیا سمجھ ہی نہیں آتا کہ ہم لوگ حیوانیت کے کونسے درجے پر ہیں -چاہیئے تو یہ کہ جس طرح سے تیزاب گردی کے واقعات بڑھ رہے ہیں ان متاثرہ افراد کیلئے شہر کے مختلف ہسپتالوں میں خصوصی وارڈ قائم کئے جائیں اسی کے ساتھ ساتھ میڈیکل کالجز میں تیزاب سے متاثرہ افراد کی بحالی کیلئے نئے کورسز کے اجراء کیساتھ ساتھ ذہنی بحالی کیلئے مراکز قائم کئے جائیں۔

لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والے " حکمرانوں "کی عیاشیوں کیلئے بہت کچھ ہے ان کی گاڑیوں جسے ان کی بیگمات اور بچے شاپنگ

کیلئے استعمال کرتے ہیں ان گاڑیوں کے پٹرول/سی این جی کیلئے خزانے میں پیسہ تو بہت ہیں لیکن تیزاب گردی کا شکار افراد کیلئے بننے والے ہسپتال کیلئے کوئی فنڈز نہیں۔جس کا رونا بھی صوبائی اسمبلی کی خاتون رکن اسمبلی نے بھی رویا بقول اس کی خزانے والے ایسی منصوبے منظور ہی نہیں کرتے جس پر اخراجات آتے ہوں ۔اسی طرح تیزاب گردی کا شکار متاثرہ لوگوں کے کیسز بھی روٹین کے کیسوں میں عدالتوں میں زیر سماعت اسی باعث انصاف کی فراہمی کا سلسلہ بھی ست روی شکار ہے اور متاثرہ ہونیوالے افراد اتنی مالی طاقت نہیں رکھتے کہ روزانہ عدالتوں کے چکر لگائے اس لئے وہ بھی ان بکھیڑوں سے بچنے کیلئے عدالتوں سے دور بھاگتے ہیں اگر اس طرح کے کیسوں کا ٹرائل "دہشت گردی "کی خصوصی عدالتوں میں کیا جائے اور اسے دہشت گردی ایکٹ میں شامل کیا جائے تو یقینا بہت حد تک کمی آسکتی ہے ۔ویسے تو ان واقعات کی روک تھام کیلئے اللہ تعالی نے بڑا خوبصورت انصاف '' قصاص "مقرر کیا ہے جس میں اگر تیزاب پھینکنے والے شخص / خاتون کو اسی طرح تیزاب کا نشانہ بنایا جائے جس طرح اس نے کسی اور کو بنایا ہو تو ہمارے معاشرے کے لوگ "اپنے چہروں" کو بچانے کیلئے آئندہ اس طرح کے واقعات نہیں کرینگے۔

انتخابی عمل اور ڈرامے بازیاں

میدان سیاست بہت عجیب و غریب اور ظالم چیز ہے اسی کی خاطر بہت سارے لوگ اپنا نظریہ دین اور ملک تک چھوڑ جاتے ہیں اور یہ صرف ہمارے ملک میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں سیاست کا شعبہ ایسا ہی ہے لیکن اپنے ملک جو الحمد اللہ اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری بھی ہے یہاں پر سیاست کا انداز ہی نرالا ہے ۔گذشتہ پانچ سال جمہوریت کے پھل کھانے والے لیڈروں کو آخر کار اگلے انتخابات کیلئے "دو ٹکے "کے بے وقوف عوام کو مزید بے وقوف بنانے کا خیال آہی گیا ہے - سیاسی شعبدہ بازوں نے نت نئے ڈرامہ بازیوں کا سلسلہ شروع کردیا ہے کچھ پرانے بازیگر نت نئے ڈراموں اور فنکاروں کیساتھ زور آزمائی کررہے ہیں جبکہ کچھ ایسے لوگ جو کبھی دوسروں کے جلسوں میں "کرائے پر لوگ" لاکر اپنا حصہ وصول کرتے تھے وہ بھی ماشاء اللہ یہاں پر الیکشن کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں- میدان سیاست کے پرانے کھلاڑی خود تو کیمرے کے پیچھے ہیں لیکن انہوں نے شہریوں کو بے وقوف بنانے کیلئے "گامے فیدے " کو آگے لاکر کھڑا کردیا ہے جو اپنے نمک حلال کرتے ہوئے شہر کے مختلف دیواروں پر اپنے آقائوں کی شان میں نعرے بھی لکھ رہے ہیں اور بعض نے بینرز بنالئے ہیں جن میں اپنے لیڈروں کی گذشتہ پانچ سال میں غلطی سے کی جانیوالے "ایک ہی کام" کو بڑاچڑھا کر پیش کرکے جذباتی قوم کو تیار کررہے ہیں کہ اگلے

انتخابات میں پھر انہیں ووٹ دو اور پھر جمہوریت کے پھل کا "مزہ" چکھو اور مزے چکھنے کے شوقین پاکستانی خصوصا خیبر پختونخواہ کے "خوار" عوام پھر بھی "آوے ہی آوے" کے نعرے لگا رہے ہیں-ان پروگراموں سے سب سے زیادہ فائدہ" گامے اور فیدے" جیسے لوگوں کا ہے جن کے نام آج کل بینرز پر "غلام اور فرید لکھے جارہے ہیں،اور انہیں اس غلامی اور بے وقوف اور دو ٹکے کے عوام کو مزید بے وقوف بنانے کے بدلے میں " شوڑا" بھی مل رہا ہے۔

گذشتہ پانچ سالوں سے "دو ٹکے "کی عوام کو روٹی کپڑا اور مکان کیلئے خوار کرنے والے بھی اگلے انتخابات کیلئے میدان میں اتر آئے ہیں سمجھ ہی نہیں آتا کہ آیا یہ لوگ شرم "سے بالکل عاری ہے یا پھر "دو ٹکے "کے عوام میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں" کیونکہ مخصوص قسم کے لوگ "آوے ہی آوے"کے نعرے لگا کر گلیوں بلکہ اب تک گندگی کے ڈھیروں پر بھی جلسے منعقد کروائے جارہے ہیں جس میں ایسے ایسے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں جن کی باتیں سن کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ "اپنی باری"کا انتظار نہیں کررہے -ہمارے اپنے محلے میں ایک خالی پلاٹ ہے جس میں مجھ سمیت ہر کوئی اپنے گھر کا گند پھینک رہا ہے تقریبا ایک ماہ قبل ایک بہت بڑی شخصیت کی آمد وہاں پر ہوئی چونکہ ان کا تعلق "باری" والی پارٹی سے ہے اور انہوں نے وہ جذباتی نعرے لگائے کہ دوسری صبح سویرے محلے کا نانبائی مجھے بتا رہا تھا کہ لوگ اس دفعہ " باری "کا انتظار کرنے والوں کے

حق میں ہیں اور انہیں زیادہ ووٹنگ پڑینگے -کچھ دنوں بعد "لالٹین والی سرکار" کی ایک بہت بڑی شخصیت نے اسی علاقے کا دورہ کیا -ان کی آمد کی وجہ سے محلے کی دکانیں بند کردی گئی اور روڈ بھی بلاک رہا کیونکہ انہیں سیکورٹی کا خدشہ تھا لالٹین والی سرکار کے نمائندے نے "امن " کیلئے زبردست نعرے لگائے لیکن اپنے ساتھ پولیس کی سیکورٹی کے علاوہ ان کے اپنے کلاشنکوف بردار بھی تھے اور ہمارے علاقے کے عوام ان کیلئے بھی زندہ باد"کے نعرے لگائے-ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ "عدم تشدد "کی پرچار کرنے" والے خود اسلحہ لئے پھرتے ہیں کہ کوئی "امن کے داعیوں" کو نقصان نہ پہنچائے- اسلحہ کی چھائوں میں "امن کا پرچار "ہم نے بھی پہلی مرتبہ دیکھا ہے -حالانکہ اسی علاقے میں لالٹین والی سرکار کے ایک ایم پی اے بھی منتخب ہوا تھا وہ بھی "مفت "میں خیر ترقیاتی کام تو کیا ہونا تھا ابھی تک اس علاقے کی روڈ نہیں بن سکی لیکن پھر بھی لوگ لالٹین والی سرکار آوے ہی آوے "کے نعرے لگاتے رہے -دوسرے دن ہمارے ہی" علاقے کے لوگ اسی لیڈر کو وہ گالیاں دے رہے تھے - عجیب سی ذہنیت ہی ہمارے لوگوں کی بھی جب میں ان سے بات کرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا علاقے میں پینے کا پانی نہیں سڑک بدحالی کا شکار ہیں گندگی کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں اور یہ صرف ہمارے علاقے کا نہیں پورے پشاور پورے صوبے اور پورے ملک کا یہی حال ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ ووٹ دینے والوں کے پاس عقل نہیں اور اس کے ساتھ اندھے بھی ہیں جبکہ ووٹ لینے والے اپنے حال میں گذشتہ

۔ پانچ سالوں سے مست رہے اور اب انہیں پاکستانی "بے وقوفوں "کا خیال آرہا ہے روزانہ کے اخبارات کا مطالعہ کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں لی ڈروں کو خوش کرنے کیلئے کون کونسے ڈرامے کئے جاتے ہیں جیسے جیسے " جمہوری "حکومت کا دور پورا ہوتا جارہا ہے ویسے ویسے انتخابی عمل میں تیزی لانے کیلئے نت نئے نعرے بیانات میں تیزی لائی جارہی ہیں طوفان لانے کا دعوی کرنے والے بھی کسی سے کم نہیں ایسے ایسے نمونے بھی " تبدیلی "اور عوام کی زندگیوں میں " بہار "لانے کے دعوے کررہے ہیں جن کے اپنے ملازمین کی تنخواہیں بنیادی تنخواہ سے بھی کم ہیں اور وہ بھی وہ قسطوں میں یعنی سہ ماہ اور شش ماہی بنیادوں پر اپنے ملازمین کو دیتے ہیں لیکن اللہ کی شان ہے کہ وہ بھی "لی ڈری" کا دعوی کررہے ہیں کوئی بیروزگاری ختم کرنے کے دعوی کررہا ہے کوئی مہنگائی اور کوئی لوڈشیڈنگ سمیت صحت کی سہولیات کی فراہمی کا دعویدار ہے یہ الگ بات کہ یہ صرف دعوے ہیں اور ان میں حقیقت بالکل نہیں کیونکہ ان نام نہاد " عوامی پارٹیوں "کے پاس نہ تو اپنے متعلقہ شعبوں کے لوگ ہیں نہ ہی ان کے پاس کوئی لائحہ عمل یعنی اگر یہ لوگ حکومت میں آئے تو پھر کیسے یہ سسٹم چلائیں گے یعنی صحت کے شعبے کیلئے ڈاکٹروں کی اپنی ٹیم ہو اور انکا صحت کے حوالے سے کوئی لائحہ عمل ہو روزگار فراہم کرنے اور صنعتیں لگانے کیلئے

سرمایہ داروں کی ایک ٹیم ہو جن کے پاس آئیڈیار بھی ہوں کہ کس طرح صنعتوں کو بہتر کرنا ہے روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے لیکن ایسا نظام میں کسی بھی پارٹی کے پاس نہیں خواہ وہ شہیدوں کی پارٹی ہو باری کا انتظار کرنے والے " بے دم والے شیر " سمیت " لالٹین والی سرکار "اور دیگر تانگہ پارٹیاں لیکن پھر بھی لی ڈر لوگ نعرے لگاتے ہیں اور جذباتی اور عقل سے عاری عوام ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ آنیوالی جمہوری حکومت بھی چمچوں اور کف گیروں پر مشتمل ہوگی جو اگلے مزید پانچ سال اس قوم کو جمہوریت کے وہ مزے چکھوائے گی کہ یہ پاکستانی قوم موجودہ حکمرانوں کے ظلم بھول جائے گی اور کفن چور باپ بیٹے کے قصے کو یاد کرینگے

نادرا کی نادر کارکردگی

غلطی کرنا اور اسے تسلیم کرنا بہت بڑی بات ہے لیکن ہمارے ہاں یہ تصور ہی کوئی نہیں کرسکتا کہ کوئی غلطی کرکے اس کی معافی مانگ لے ۔ اگر کوئی انفرادی طور پر بھی غلطی کرتا ہے تو یہ شان کے منافی خیال کیا جاتا ہے کہ اس غلطی کو مان لیا جائے جس طرح ہم لوگ انفرادی طور پر اپنی غلطیوں کو نہیں مانتے اسی طرح ہمارے ہاں ادارے بھی اپنی غلطیاں نہیں مانتے اب تو لوگوں کیساتھ ادارے بھی اپنی غلطیوں پر ڈٹ جاتے ہیں ۔گذشتہ دنوں ایک پولیس اہلکار سے ملاقات ہوئی موصوف نے دو سال قبل اپنے بیٹے کیلئے کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ بنوانے کیلئے اپلائی کیا تھا لیکن دو سال گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کے بیٹے کا کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ نہیں بن سکا کیونکہ نادرا نے نادر کارروائی کرتے ہوئے پولیس میں ڈیوٹی انجام دینے والے اہلکار کے بیٹے کو افغان مہاجرین کی فہرست میں ڈال دیا ہے اس کے باپ کی 23 سال کی نوکری بھی دو سال گزرنے کے باوجود ابھی تک افغان مہاجرین کی فہرست سے اسے نہیں نکلوا سکی ۔ متعلقہ پولیس اہلکار شریف آدمی ہے ورنہ تو یہاں پر ایسے پولیس اہلکار موجود ہیں جو افغان مہاجرین کی کارڈ بنوا گئے تھے ۔خیر دو سال سے خوار ہونے والے پولیس اہلکار اپنی ڈیپارٹمنٹ کی تمام ریکارڈ نادرا تصدیق کرکے لے گیا ہے تاہم نادرا کی تسلی نہیں ہورہی اور

وہ غریب پولیس اہلکار رو رہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کی روزگار کیلئے اس کا کمپیوٹرائزڈ کارڈ بنوا رہا تھا لیکن نادرا کی نادر کارروائی نے مجھے ذہنی تناؤ کا شکار کردیا ہے بقول پولیس اہلکار کے تاریخ پر تاریخیں دے رہی ہیں لیکن ہاتھ کچھ نہیں آرہا میں نے اس پولیس اہلکار کو دم دلاسہ تو دیا لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ باپ 23 سال تک "اسلامی جمہوری عوامی اور فلاحی "پاکستان میں خدمات انجام دے اور بیٹا افغان مہاجرین کی فہرست میں شامل ہو۔ویسے مجھے تو لگ رہا ہے کہ وفاقی ادارہ مردان" سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پولیس اہلکار کیساتھ اظہار محبت کر رہا ہے کیونکہ " مردان آکسی زمانے میں " پیڑوں "کیلئے مشہور تھا آج کل لہٰذی لوڈ کی وجہ سے مشہور ہے اور لگتا ہے کہ نادرا کے نادر نمونے اس شریف پولیس اہلکار سے "لہٰذی لوڈ" مانگ رہے ہوں متعلقہ پولیس اہلکار کو اب یہ کہا جارہا ہے کہ کچھ کر سکتے ہوں تو کرلو ہم تو ویسے کارڈ نہیں بنوا کر دینگے۔ایک طرف یہ حال ہے کہ نادرا کارڈ نہیں بنا کر دے رہا جبکہ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دو دو کارڈ بنا رکھے ہیں اور مختلف شہروں سے اسی کارڈ پر پاسپورٹ بھی بنائے ہوئے ہیں لیکن چونکہ "ایلیٹ کلاس "اور بیلٹ والی سرکار کی سرپرستی میں ہے اس لئے ان کی شکایت کرنے پر بھی نادرا ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کررہا یہ وہ امتیازی سلوک ہے جو اسلامی فلاحی جمہوری اور عوامی "ریاست میں " قانون سب کیلئے برابر ہے "کا نعرہ لگانے والوں کیلئے بھی چیلنج ہے کاغذوں میں قانون تو

سب کیلئے برابر ہے لیکن حقیقت میں "تاجے" نائی کا بیٹا اگر فرسٹ کلاس ماسٹر بھی کرلے تو اس کی اوقات نہیں لیکن اگر مخصوص طبقے کا طبقہ اگر بی اے بھی" جھٹکوں سے گوری چمڑی والوں کے اداروں سے پاس کرے تو وہ "ڈی ایٹ "اجلاس میں بھی بیٹھ" سکتا ہے اور ملک کی نمائندگی کرسکتا ہے۔

آج کل کے دور میں کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ بنانے والے خوش قسمت ہیں جو صرف ایک مرتبہ خوار ہوتے ہیں ہم نے تو وہ دن بھی دیکھے ہیں جب ہم 18 سال کی عمر میں اپنے لئے شناختی کارڈ بنانے گئے تھے اس وقت کمپیوٹرائزڈ کا دور نہیں تھا ہم نے وپرانا شناختی کارڈ بنوانے کیلئے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں وہ ہمیں پتہ ہے اس لئے اس لئے ہم نے " تبرک" کے طور پر پرانے شناختی کارڈ اپنے ساتھ گھر میں رکھ چھوڑے ہیں کہ کیا پتہ ہمیں یہ افغان مہاجر کی فہرست میں شامل نہ کرے اور ہمیں پتہ بھی نہ ہوں اور کسی افغان مہاجر کو ہمارے خاندان میں ڈال کر ہمارا بھائی کردیا ہو پاکستانیوں کی خاندانوں میں افغان مہاجرین کو بیٹے کی فہرست میں شامل کرنے کا "شوڑا" تو نادرا ملازمین کو ملتا ہے لیکن اس کا عذاب ان لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے جنہیں بعد میں پتہ چلتا ہے اور ان کے خاندان کے تمام افراد فہرست بلاک کردی جاتی ہیں۔نادرا کے آغاز میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ "دو ٹکے" کے عوام کی بہتری کیلئے یہ کام کیا جارہا ہے اور اب کمپیوٹرائزڈ کام ہوگا اور یہاں پر "لینزی لوڈ" کا چکر نہیں ہوگا لیکن

اللہ بچائے ایسے پاکستانیوں سے جو نادرا کا کمپیوٹر بھی " لیزی لوڈ" پر چلاتے ہوں۔ہم لوگ تو اللہ بخشے اداکارہ نادرا کے نام پر دھوکہ کھا گئے تھے یہ الگ بات کہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ بنانے والے غریب اب کارڈ بنوانے کیلئے ادارے کے سامنے " ٹھمکے "لگاتے نظر آتے ہیں ۔کچھ عرصہ قبل نادرا کے ملازمین کو نکالنے کا پروگرام شروع ہوا تھا اور خدا گواہ ہے کہ اس ادارے کے ملازمین کو سڑکوں پر احتجاج کرتے ہوئے مجھ سمیت ہر شہری کو بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ جس طرح یہ لوگوں کو تنگ کرتے ہیں ان کی کرتوتوں"کی وجہ سے لوگ بہت خوش تھے کہ یہ بازاروں میں اپنے لئے احتجاج کرتے" پھرے ۔ پریس کلب کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے میں نے ان کے رہنما کو بھی کہا تھا کہ تم لوگ ابھی "انسان کے بچے "بن گئے ہو ورنہ تم لوگوں کا رویہ صحافیوں کیساتھ بھی بدمعاشوں والا ہوتا ہے عام لوگوں کیساتھ رویہ بھی اس سے بدتر ہوتا ہے ۔ان دنوں ان سب کا رویہ سب کیلئے "آپ جناب" والا تھا کیونکہ بیروزگار ہونے کا ڈر تھا اور صحافیوں کیساتھ تو خصوصی طور پر بہت اچھے تعلقات بنائے تھے کیونکہ ان کو پتہ تھا کہ ہماری "بک بک " یہی لوگ آگے پہنچا سکتے ہیں ۔ان کی " بک بک "کام آگئی اور روزگار ۔کا سلسلہ ٹھیک ہوا تو اب یہ پھر اپنی اوقات بھول گئے ہیں

سب سے عجیب بات کہ نادرا کے نادر اہلکاروں اور افسران بالا پر شکایات کا کوئی اثر بھی نہیں ہوتا کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک ساتھی نے لوگوں کی شکایات

شہر کے ایک بڑے پلازہ میں واقع نادرا دفتر کا دورہ کیا اور لوگوں کی شکایات ریکارڈ کی جس پر نادرا کے "نادر" ملازمین نے "بے حیثیت صحافی" کی وہ دھنائی کردی جس طرح ہمارے ہاں لوگ اپنے کھیت میں کسی دوسرے کی گدھے کی موجودگی کی اطلاع پر " گدھے " کا کرتے ہیں بعد میں جب مسئلہ بنا تو یہاں کا سربراہ آگیا اور یقین دہانی کرادی کہ اس کی انکوائری ہوگی انکوائری چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی نہ ہو سکی اور آج ہم اپنے ساتھی کو تنگ کرنے کیلئے اس کی "دھنائی "یاد کراتے ہیں - سچی بات یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس "ایزی لوڈ" کیلئے پیسہ نہیں یا اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ نہیں تو یقین جانیئے کہ کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ بنوانے کیلئے بھی آپ کو مہینوں خوار ہونا پڑے گا روزانہ لائنوں میں کھڑے ہونے کا عمل کہنے میں تو آسان ہے لیکن جب آپ سارا دن لائن میں رہتے ہیں اور نادرا کے اہلکار اپنی "مشروٹی " دکھاتے ہوئے "ایزی لوڈ" دینے والے افراد کو لائن میں سب سے آگے لے جاتے ہیں تو کیا حال ہوتا ہے کاش کسی دن نادرا کے افسران بالا جن میں بہت بڑے بڑے نام شامل ہیں وہ خود اور ان کے اپنے خاندان کے لوگ "لائن میں کھڑے" ہو اور انہیں اس عذاب کا پتہ چلے کہنے کو تو ہم آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ پاکستانی لوگ لائن میں کھڑے نہیں ہوتے لیکن لائن میں کھڑے ہونے والوں کیساتھ جو ڈرامے ہوتے ہیں وہ لائن میں کھڑے ہونے والے ہی جانتے ہیں -

یہاں ہم نادرا میں بیٹھے ہوئے "نادر" ملازمین سے اپیل کرتے ہیں کہ خدارا لوگوں کی عزت نفس کا خیال کرو اور ان کی مشکلات کم کرنے کیلئے اقدامات اٹھائے ورنہ پھر جس طرح آج کل لوگ ڈنڈے اور بیلٹ والی سرکار کو "شہید" بنانے کیلئے اپنے ساتھ بارود رکھ کر اڑاتے ہیں لگتا یہ ہے کہ پھر ستائے ہوئے لوگ ان کیلئے سپیشل طور پر آئیں گے اور نادرا کے نادر ملازمین کو "شہدائ" کے عہدوں پر سرفراز کرینگے کیونکہ ہمارے پاس کچھ نہ ہو شہید اور ان کیلئے پیکج بہت ہیں۔

پریس سپرمین صحافی اور بریکنگ

دو ٹکے کے عوام میں شمار ہونیوالے "بے حیثیت صحافی" اپنے آپ کو بہت اعلی اور سپرمین تصور کرتے ہیں اور اس کا اظہار کئی جگہوں پر یہ لوگ کرتے ہیں کوئی اپنی گاڑی پر واضح الفاظ میں "پریس" کی نیم پلیٹ لگاتا ہے اور کوئی اس کی آڑ میں کسی مجبور کو خرچہ پانی پر مجبور کرتا ہے اور یہی ہماری مخصوص لوگوں کی صحافت بھی ہے اب تو صورتحال یہ بن گئی ہے کہ "ان مخصوصص لوگوں" سے ہر ایک ڈرتا ہے اسی بناء پر ہر آٹھواں شخص اپنے آپ کو "پریس سے وابستہ" ہوں متعارف کروا کر آگے جانے کی کوشش کر رہا ہے اس عمل میں کئی "کپڑے پریس" کرنے والے بھی "پریس" کی آڑ میں اپنا کام نکال لیتے ہیں ہم نے تو چند "سینئر" کے پاس چار پہیوں والی گاڑیاں دیکھی ہیں لیکن وہ لوگ بھی گاڑیوں پر "پریس" نہیں لگاتے ۔ اگر آپ جی ٹی روڈ پر کھڑے ہو جائیں تو لینڈ کروزر سے لیکر موٹر سائیکل پر "پریس" کا نیم پلیٹ لگا نظر آتا ہے اب ہمیں نہیں پتہ کہ کن "صحافیوں" کے پاس لینڈ کروزر آگئے ہیں حالانکہ کچھ لوگ تو انفارمیشن کے "پے رول" پر ہیں اور باقاعدہ مضامین چھپوا کر "خرچہ پانی" خفیہ فنڈز سے نکال لیتے ہیں لیکن وہ بھی اتنا نہیں ہوتا کہ چار پہیوں والے گاڑیاں خریدیں۔

چھ ماہ قبل ایک موٹر سائیکل پر ایک ٹی وی چینل کی نیم پلیٹ دیکھی میرے ساتھ میرا ایک اور صحافی دوست بھی تھا اسی موٹر سائیکل والے کو روکا اور کہا کہ تم کہاں سے صحافی " ہوں جو تم نے اتنا بڑا پریس کا بورڈ لگایا ہے پہلے تو اس نے ہمیں "دبانے" کی کوشش کی کہ تم کون ہو پوچھنے والے جب ہم نے تعارف کروا دیا تو جواب میں وہ صاحب جواب دینے پر رضامند ہو گئے اور کہا کہ میرا ماموں کا بیٹا متعلقہ ٹی وی چینل میں ہے اسی وجہ سے میں نے اپنی گاڑی پر اس کی ٹی وی چینل کا نیم پلیٹ لگایا ہے اس کے فوائد بیان کرتے ہوئے بقول اس صاحب کہ میرا کام سیلز کام ہے اور سیلزمین کی حیثیت سے میں پشاور کے مختلف علاقوں میں جاتا رہتا ہوں کبھی کبھار مجھ سے ٹریفک کراس کرتے ہوئے غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی میں کاغذات بھول جاتا ہوں تو ٹریفک اہلکار میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور یہ تعاون اس صورت میں بھی ہوتا ہے کہ میں کسی بلڈنگ میں جاتا ہوں تو بائیک روڈ کنارے ٹریفک پولیس والوں کے پاس کھڑی کر دیتا ہوں اور وہ کچھ نہیں کہتے اور کبھی کبھار دو تین بندے موٹر سائیکل پر لے جاتا ہوں تو یہ کچھ نہیں کہتے ۔ سچ کہتا ہوں میں اس کی باتیں سن کر اس سے جیلس بھی ہوا تھا کہ اس کو کہتے ہیں "چوری اور اس پر سینہ زوری" یعنی صحافت سے وابستگی بھی نہیں اور مزے کر رہا ہے حالانکہ ہم نے قسطوں میں کسی زمانے میں موٹر سائیکل لی تھی اور ٹریفک پولیس کی مہربانی سے وہ فروخت بھی کر دی۔ صرف ایک دفعہ سنٹرل جیل کے سامنے تعینات پولیس اہلکار نے "اوے" کہہ کر روکا اور

کہا کہ کیا کرتے ہوں اور کدھر جارہے ہوں تو میں نے جواب دیا کہ بھائی تمھاری خبر کسی اور اور کسی اور کی خبر آپ کو پہنچانے کا کام دیتا ہوں اور گھر جارہا ہوں۔ تو وہ پولیس اہلکار واپس مڑگیا اور کہا کہ چلے جائو میں نے پوچھ لیا کیوں تلاشی نہیں لینی تو اس نے کہا کہ خیر ہے تم "اخبار والے ہو" میں نے اسے جواب دیا کہ بھائی تلاشی لو" خبریں ادھر سے ادھر لے جانے کا کام ہمارے گائوں میں "نائی" بھی کرتے ہیں لیکن وہ اس ٹریفک اہلکار نے مجھے جانے دیا کہ تم اخبار والے ہو ٹھیک ہے چلے جائو اور میں بھی بڑے زعم سے موٹر سائیکل لیکر چلا گیا کہ پولیس نے میری تلاشی نہیں لی۔ موجودہ دور میں جس طرح کے حالات کا ہم شکار ہیں اس میں تو ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ موٹر سائیکل نہیں اور پیدل ہی آتے جاتے ہیں کیونکہ آج کل تو "شہیدوں والی پارٹی" کی سرکار کبھی موٹر سائیکل پر پابندی لگاتی ہے کبھی موبائل فون پر پابندی لگاتی ہے لگتا ہے کہ عوامی جمہوری فلاحی اور ساتھ میں اسلامی ملک میں بہت جلد "کپڑے پہننے" پر بھی پابندی لگائے گی کیونکہ خودکش حملوں کا خطرہ ہے آنے والے انتخابات میں "شہیدوں والی سرکار" دو ٹکے کے عوام کو کہہ دے گی کہ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ ہماری حکومت نے لگا دیا تھا مکان کے معاملے سیلاب نے ہماری مدد کی روٹی کیلئے اب کتوں سے بھی بدتر خوار ہورہے ہوں اور رہی کپڑے کی بات تو یہ بھی ہم نے اتار دیئے سو "شہداء کی پارٹی" عوام سے کئے گئے وعدے پورے کرنے میں کامیاب رہی۔ اور ہم لوگ "آوے ہی آوے" کے نعرے لگاتے رہینگے۔

خیر یہ ہم کہاں سے اپنے دل کے پھپھولے لے بیٹھے بات ہو رہی تھی صحافیوں کی کچھ دن قبل پولیس نے ایک موٹر سائیکل والے کو روکا جس کے آگے بائیک پر پریس اور پیچھے پولیس لکھا ہوا تھا پولیس کے روکے جانے پر اس نے جواب دیا کہ کزن میرا اخبار میں اور چاچا کا دوست پولیس میں ہے اس لئے دونوں کی نمائندگی کر رہا ہوں لیکن حقیقت یہ تھی کہ دونوں باتیں غلط نکلیں اور پولیس چھترول سے پتہ چلا کہ موصوف افغان مہاجر ہے بعد میں ایک بہت.بڑے " صحافی "نے اس کی سفارش کرکے اس کی جان چڑھوا دی- پریس کیساتھ منسلک ہونے کی عجیب سی بیماری ہے پریس کلب میں جا کر اندازہ ہوتا ہے کہ چار سو کے قریب رجسٹرڈ صحافی پشاور میں کام کر رہے ہیں جن میں کچھ "سلیپنگ " پارٹنر بھی ہیں کیونکہ ان کے "اخراجات" مختلف ڈیپارٹمنٹ.برداشت کرتے ہیں اور انہیں تنخواہیں کہیں اور سے بھی آتی ہیں بازار میں پریس کے نیم پلیٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس شہر میں ہر کوئی صحافی ہے اور اپنے آپ کو سپر مین سمجھتا ہے-ایک ہفتہ قبل جی ٹی روڈ پر بم ناکارہ کرنے کے دوران مشاہدہ ہوا کہ ہر کوئی دور کھڑے ہو کر کوریج کر رہا ہے ہمارے ایک ساتھی کیمرہ مین نے نزدیک جانے کی کوشش کی تو میں نے بتا دیا کہ بھائی میرے تم ابھی ابھی " باپ "بنے ہوں اگر خدانخواستہ نشانہ بن گئے تو پھر تم پر پروگرام کرنا پڑے گا اور ہم اس میں کہیں گے کہ مرحوم ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے اپنے نوزائیدہ بچے کو بھی بھول گئے اور انا

اللہ ہوگئے جس پر اسے عقل آ گئی اور وہ پیچھے ہٹ گئے تاہم ایک اور میری طرح کا " بے حیثیت صحافی " بم ڈسپوزل یونٹ کیساتھ کھڑا تھا پولیس نے بہت کہا لیکن وہ صاحب بم ڈسپوزل یونٹ کیساتھ کھڑے رہے آخر کار میں نے اسے سب کے سامنے میں نے سنائی تو وہ شرم کے مارے پیچھے ہٹ گیا پولیس والے تو ہنس رہے تھے کیونکہ میں نے کہا تھا کہ بھائی میرے دس ہزار روپے کیلئے اپنے آپ کو " شہادت " کے عہدے پر سرفراز کرنے پر تلے ہوئے ہوں کیونکہ بم کا ٹکڑا بغیر کسی پہچان کے سب کو لگتا ہے اور پھر ہم ہی تمھارے لئے سڑکوں پر " خوار " ہونگے جس کی وجہ سے میرا وہ بھائی جائے وقوع سے دور ہوگیا۔

ایکسلیسیوز اور بریکنگ کی ریس نے ہم لوگ کیا کیا کرتے ہیں یہ ہمیں ہی پتہ ہے اور اسی وجہ سے ہم نشانہ بھی بن جاتے ہیں بعد میں کہا جاتا ہے کہ صحافی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے زخمی ہوگیا اگر صحافی اپنے آپ کو سپر مین نہ سمجھے اور عام آدمی کی طرح کام کرے اور جن حالات سے ہم آج کل دوچار ہیں ان میں اگر لو پروفائل رہے تو صحافی کبھی بھی نشانہ نہ بنے ۔کچھ غلطی ہماری اپنی ہے اور کچھ ہمارے حکمرانوں کی بھی ہے جو ہمیں گاہے بگاہے " مکھن " لگاتے ہیں کہ " تم لوگ چوتھے ستون ہو " اور پھر صحافی لوگ اسی " مکھن " پھر پھسلتے رہتے ہیں ۔اللہ ہم پر رحم کرے۔

گومل زام ڈیم کے اغواء شدہ ملازمین اور حکمرانوں کا رد عمل

پاکستان کے "دو ٹکے "کے عوام پر حکمران طبقے میں میں اتنا دم نہیں کہ پندرہ اگست 2012 سے اغواء ہونیوالے گومل زام ڈیم کے ملازمین کو رہائی دلا سکے کیا حکمرانی کرنے والوں میں شرم اور حیا نام کی کوئی چیز ہے تو آج کل بڑے بڑے اشتہار چھپ رہے ہیں کہ ہم نے عوامی اسلامی فلاحی اور جمہوری ملک میں "دودھ اور شہد کی نہریں" بہادی ہیں جس کی وجہ سے پاکستانی عوام بہت خوش ہیں اور آنیوالے انتخابات میں "دو ٹکے "کے عوام پھر بھی انہی "نام نہاد لی ڈروں" کو چن لے گی -دکھ و درد کا احساس ان اغواء ہونیوالے افراد کیلئے ہر شہری کے دل میں ہے لیکن نہیں تو صرف حکمرانوں کو - گذشتہ تین دنوں سے میں پشاور پریس کلب میں گومل زام ڈیم سے اغواء ہونیوالے آٹھ ملازمین کے خاندان والوں کو دیکھ رہا ہوں جو ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں کہ شائد ان کا مسئلہ حل ہو اور ان کے معصوم بچوں کیلئے کوئی آواز اٹھائے ہر کوئی انہیں " لارا لپہ "دے رہا ہے لیکن اللہ گواہ ہے کہ مجھے دلی اطمینان نہیں کیونکہ یہ آٹھ ملازمین " کمی کمینوں "کے اولاد میں سے ہیں جن کی اوقات صرف " انتخابات" کے دنوں میں ہر ایک کو یاد آتی ہیں اگر یہ کسی : "وڈیرے چوہدری خان یا سردار کے خاندان سے ہوتے تو پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتا -

گومل زام ڈیم سے اغواء ہونیوالے آٹھ اہلکار جو کہ چینی اشتراک سے بننے والے منصوبے پر کام کر رہے تھے کو 15 اگست کو اغواء کیا گیا تھا 11 ستمبر کو ان کی ویڈیو منظر عام پر آ گئی ابتداء میں عسکریت پسندوں نے اپنے کمانڈروں کی رہائی سمیت اٹھارہ کروڑ پاکستانی کرنسی کا مطالبہ کیا لیکن بعد میں صرف پندرہ کروڑ روپے پر راضی ہو گئے ۔گذشتہ کئی ماہ سے ان آٹھ افراد کے خاندان کے لوگ ہر اس در کو کھٹکھٹا رہے ہیں کہ خدارا ہماری مدد کی جائے ۔ عسکریت پسندوں نے تین دسمبر تک ڈیڈ لائن دی ہے کہ اگر ادائیگی نہیں کی گئی تو ان بے گناہ افراد کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ان آٹھ ملازمین کے خاندان کے افراد حکمرانوں کے ڈیروں اور ایوانوں پر حاضریاں لگا لگا کر تھک گئے لیکن " پختون خوار "میں وفاق کی نمائندگی کرنے والا " بابو جی " کبھی ان متاثرہ خاندانوں کو ایک طرف بھیج دیتا ہے اور کبھی دوسری طرف لیکن ان کی کوئی مدد نہیں ہو رہی اور اب یہ لاچار اور بے بس خاندان ان " بابو جی اور ان جیسے بے شرموں " کو " شرم " دلانے کیلئے بھوک ہڑتالی کیمپ بھی لگا رہے ہیں تاکہ اگر شرم ذرہ برابر بھی ہو تو شائد ان کے بچوں کیلئے کوئی اقدام اٹھایا جا سکے۔ ان متاثر ہونیوالے خاندانوں کے بقول ہمیں نہیں پتہ کہ ہمارے بچوں کیساتھ ایسا ہوگا۔ ہمارے بچے تو " سرکار " کے ملازم تھے ان کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہے لیکن !

عسکریت پسندوں کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کیا انہیں معلوم نہیں کہ "دو ٹکے "کے عوام کی کہیں پر اہمیت نہیں اور ایسے "ب حیثیت" لوگوں کو اغواء کرنے سے انہیں کیا ملے گا یہ غریب تو یومیہ مزدور ہیں یعنی دیہاڑی دار ملازمین ہیں اور دیہاڑی دار کے ہمارے ہاں کیا اوقات ہیں یہ تو ہر ایک کو پتہ ہے اگر دیہاڑی دار ملازم ایک دن مزدوری کرے گا تو اس کے گھر کا چولہا جلے گا ورنہ پھر فاقے ایسے میں ان بے چاروں کی اغوائیگی سمجھ میں نہ آنیوالی بات ہے اور کیا انہیں یہ نہیں پتہ کہ ہمارے حکمران آج کل اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں حکمرانوں کو آنیوالے انتخابات کی تیاری کرنی ہے کچھ لوگوں کو اپنے "بچوں" کو تیار کروانا ہے کہ اگلے انتخابات میں کس طرح ڈرامہ "کرکے بے وقوفوں کو "مزید بے وقوف "بنا کر "آوے ہی آوے "کے نعرے" لگانے ہیں کچھ لوگ "بھرتیوں "میں اپنے لئے "کمیشن "بنانے کے چکروں میں مصروف عمل ہیں اور کچھ "لی ڈر" اس چکر میں ہیں کہ کس طرح اسے "عوامی فلاحی اسلامی اور جمہوری "مملکت سے سیاسی پناہ کے نام پر نکلیں اور اپنی فیملی کو بیرون ملک میں ایڈجسٹ کرے تا کہ وہ اور ان کی اولاد یہاں کی آلودہ ماحول سے متاثر بھی نہ ہوں اور جب انہیں "آرڈر اور موقع "ملے تو پھر وہاں سے "عوامی خدمت "کا منصوبہ لیکر آجاہیں اور " ب حیثیت "لوگوں کی مزید خدمت کر سکیں۔ کچھ عرصہ قبل صومالی قزاقوں نے کچھ پاکستانیوں کو اغواء کیا تھا اور انہوں نے ڈیمانڈ بھی اربوں میں کی تھی

لیکن اس کیلیئے پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ نکل آئے اور سڑکوں پر لوگوں نے پیسے جمع کروا کر ان پاکستانیوں کو رہا کروادیا-کیا اغواء ہونیوالے یہ آٹھ ملازمین "پاکستانی" نہیں یا پھر اس صوبے سے وابستگی کی وجہ سے ان کی اوقات بس اتنی ہی ہے مجھے کسی اور سے تعصب نہیں اللہ تعالی ہر ایک کو اس عذاب سے بچائے لیکن جب اس صوبے سے وابستگی کی بناء پر "ہمارے ساتھ تعصب" برتا جاتا ہے تو ہم کیا کریں-

ویسے ایک بات جو ہمارے ہاں ہر کوئی کر رہا ہے کہ ہمارے " پختون خوار" کے لی ڈروں سے تو کراچی کے "غنڈے" اچھے ہیں جو اپنے شہریوں کیلیئے آوار تو اٹھاتے ہیں کیونکہ ان کی " غنڈہ گردی" کرنے والوں کی ہر جگہ بدمعاشی چلتی ہے جبکہ ان کے مقابلے میں ہمارے خیبر پختونخوا جسے آج کل کچھ لوگ پختون خوار بھی کہتے ہیں میں قومیت" کی بنیاد پر سیاست کرنے والوں کو کچھ نظر ہی نہیں آتاں گذشتہ چار سالوں" سے "شہیدوں کی پارٹی" سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کے " جوتے سیدھی" کرنے والے آنیوالے انتخابات میں "ملا" کیساتھ اتحاد کیلیئے تیار ہوگئے ہیں حالانکہ ان پانچ سالوں میں ان لوگوں نے "ملا" کے پیچھے کونسا ڈرامہ نہیں کیا لیکن خیر یہ بھی سیاست ہے- افسوس کی بات ہے کہ اب تک " لالٹین والی سرکار "کے کسی لی ڈر نے انا غواء شدہ ملازمین کیلئےغلطی سے بیان بھی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی اقدام اٹھایا ہے اگر اس صوبے سے تعلق رکھنے

والے "لی ڈر" جن کے خیر سے ملائشیا میں پام آئل کی فیکٹریاں اور دبئی اور ناروے میں ہوٹل ہیں اگر اپنے مال سے کچھ "زکواۃ" ہی نکال دے تو ان آٹھ افراد کی رہائی ممکن ہوسکتی ہے لیکن وائے افسوس لیٹزی لوڈ۔جو حکمران اپنے عوام کو تحفظ تعلیم خوراک سمیت مختلف بنیادی ضروریات فراہم نہیں کرسکتی ایسے میں ان "مفت خوروں"کا اپنے اوپر مسلط کرنے کا مقصد کیا ہے اسمبلیوں میں بیٹھ کر بیان دینے سے کچھ نہیں ہوتا نہ اس دو ٹکے کے عوام کے "ٹیکسوں"پر چلنے والی گاڑیوں میں عیاشیاں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا جو لوگ آٹھ افراد کا تحفظ نہیں کرسکتے وہ ملک کے عوام کا کیا تحفظ کرینگے - ان نام نہاد لی ڈروں کو اپنے "ریڈ زونوں" سے باہر نکلنا ہوگا اگر پھر بھی یہ لوگ نہیں نکلتے تو پھر انہیں نکالنا ہوگا جس کیلئے "آوے ہی آوے"کے نعرے لگانے والوں کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا کیونکہ ان کے ذریعہ "صاحبان" میدان عمل میں آئیں گے اور اس "بھوکی ننگی قوم"کیلئے کچھ کریں گے - ورنہ ایسے نام نہاد لی ڈروں کی " دو ٹکے"کے عوام کو ضرورت نہیں۔

خیبر پختونخواہ تاریخ و ثقافت کانفرنس اور بابو جی کے ارشادات

نشہ کسی بھی چیز کا ہو برا ہوتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بہت سارے لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں جب نشہ کرسی اقتدار پیسے اور طاقت کا ہو تو ایسے ایسے کام انسان سے سرزد ہو جاتے ہیں جو اس کے خواب و خیال میں نہیں ہوتے اور انسان ساری عمر اپنی کئے گئے کاموں پر افسوس کرتا رہتا ہے ۔ہمارے برادری میں تو کچھ لوگ " پینے پلانے " کا نشہ کرتے ہیں اور اب یہ ایک سٹیٹس سمبل بن گیا ہے کہ ہم "پیتے " ہیں پینے والے نشہ کا صرف ایک ہی فائدہ ہے کہ انسان " سچ بولنے "لگ جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں "اقتدار اور کرسی "کا نشہ ایسا " نشہ " ہے کہ بہت سارے لوگ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں اور پھر "بکواس "شروع کردیتے ہیں۔اس کا تجربہ گذشتہ دنوں پشاور یونیورسٹی میں صوبے کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے تین روزہ عالمی کانفرنس کے موقع پر ہوا۔ پروگرام تو بہت اچھے وقت میں اور صوبے کی بہتری کیلئے کیا گیا تھا لیکن آغاز ایسا ہوا کہ پھر دوسرے دن جانے کی ہمت نہیں رہی۔ سیکورٹی کے نام پر اس دن پشاور یونیورسٹی میں جو ہو رہا تھا اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ایریا سٹڈی سنٹر کی طالبات کو جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی کیونکہ ہمارے ہاں وفاق کی نمائندگی کرنے والے " بابو جی " نے آنا تھا باقاعدہ تلاشی کے بعد طالبات کو جانے دیا گیا تاہم اس دوران " خفیہ والوں "کا رویہ ان

طالبات اور یہاں پر آنیوالے لوگوں کیساتھ ایسا تھا جیسے ان لوگوں کیلئے "خفیہ والوں "کے گھر سے کھانا آتا ہو موجودہ حالات میں سیکورٹی کے نام پر تلاشی ہمیں بھی قبول ہے لیکن وہ پشتو مثل کے بقول " آیئے جناب کھانا کھایئے "اور "اوئے آکر زہر کھالو "اگر "خفیہ والے" سیکورٹی لیتے ہوئے مہمانوں اور خصوصا طالبات کا احترام کریں تو یہ کسی کو بھی برا نہیں لگتا۔لیکن وہاں پر انہیں دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہمارے ہاں "خفیہ والے "کتنے " تعلیم یافتہ" ہیں۔

صوبے کی تاریخ و ثقافت پر ہونیوالی تین روزہ کانفرنس کا مقصد دہشت گردی کے حوالے سے بدنام صوبے کی تاریخ و ثقافت سے آگاہ کرنا تھا جس میں پانچ ممالک سے مندوبین شریک ہوئے اور انہوں نے صوبے کے آٹھ مختلف شعبوں پر اپنی ریسرچ/مقالے پیش کئے تاہم سچی بات ہے کہ میرے لئے تو اہم بات صوبے کی موجودہ حالات تھے کیونکہ ہمارا آج آنیوالے کل کی تاریخ ہے اور ہمیں اندازہ ہے کہ ہم اپنی آج کیساتھ کیا کررہے ہیں پروگرام کیلئے وقت ساڑھے نو بجے دیا گیا تھا تاہم ہمارے "بابو جی" چونکہ لیٹ اٹھتے ہیں اس لئے ان کی آمد کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بھر سے آنیوالے مندوبین ذہنی تناؤ کا شکار تھے بلکہ پانچ مختلف ممالک سے آنیوالے غیر ملکی بھی حیران تھے کہ دنیا بھر کو صوبے کی تاریخ سے آگاہ کرنے والے کتنے "سست رو" لوگ ہیں کیونکہ پروگرام "بابو جی "کی لیٹ آنے کی وجہ سے افتتاحی پروگرام پونے گیارہ بجے شروع ہوا۔ صوبے میں بننے والی

ایک بڑی یونیورسٹی کے سربراہ نے بڑی اچھی بات کی کہ صوبے کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے رہنماؤں کو نصاب میں ڈالاگیا ہے جو کہ اچھی بات ہے کیونکہ مجھ سمیت صوبے کی ہر ایک فرد کو "اپنے نامور" افراد کے بارے میں معلومات کا موقع ملے ابھی تو صرف ہماری نصابی کتب میں ہم نے "رحمان بابااور خوشحال بابا" کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا چلو اچھی بات ہے نئی نسل کو صوبے کے "اپنے" اسلاف "کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گاتاہم یہاں صرف عرض کرتے ہیں کہ اس میں تمام لسانی گروپوں کو برابری کی بنیاد پر اگر اہمیت دی جائے تو صوبے میں " تقسیم کرواور ووٹ لو" کی صورتحال پیدا نہیں ہوگی۔

خیر بات ہورہی تھی صوبے کی تاریخ و ثقافت پر بین الاقوامی کانفرنس کی پروگرام کے دوران کئی مرتبہ تو سٹیج پر بیٹھے "بابوجی" سوگئے جب ہم اپنے ساتھی کو کہا کہ جلدی سے اس کی تصویر لویا فلم بناؤ کیونکہ یہ بھی ہمارے لئے خبر ہے کہ ہمارے "بابوجی" کو صوبے کی تاریخ و ثقافت سے کتنی دلچسپی ہے لیکن اندازہ ہوا کہ ہمارے "بابوجی" بڑے ہوشیار تھے کیونکہ جب وہ دیکھتے کہ فوٹوگرافر تصویر بنارہاہے یا فلم بن رہی تو اپنے آپ کو بڑا "ایکٹیو" دکھاتے ۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے "بابوجی" کا کہنا تھا کہ یونیورسٹیاں ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں پر ہر چیز کو کہنے کی آزادی ہونی

چاہئیے اور پابندی کا اصول ختم کرنا چاہئیے موصوف نے یہ ارشاد کرنے کے بعد کہا کہ جس نظریئے پر پاکستان بنا تھا آج وہ نظریہ ہمیں کمزور کر رہا ہے" ۔اس کی ارشاد کو" سننے کے بعد میں بھی چونک گیا اور میرا ساتھی صحافی بھی حیران رہ گیا کہ " بابوجی "کیا فرما رہے ہیں اس دوران ہمارے دائیں طرف بیٹھی طالبات نے پینے کے پانی کی حاجت ہوئی تو وہاں پر موجودہ ایک "سوٹڈ بوٹڈ" صاحب کہنے لگے کہ یہ کیا وقت ہے پانی پینے کا ہم لوگ احساس کمتری کے شکار وہ قوم ہیں کہ "سوٹ" پہن کر بہت کچھ بھول جاتے ہیں کرائے کے "سوٹ " میں سوٹڈ بہت سارے پشاور یونیورسٹی کے "بابوئوں" کو ہم نے دیکھا کہ ان کے رویئے سے لگ رہا تھا جیسے ان لوگوں نے "آسمان "کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا ۔

افتتاحی تقریب کے بعد جب ہم نے اسلامی جمہوری عوامی اور فلاحی پاکستان کے صوبہ " پختون خوار" میں تعینات " بابوجی" جو شائد جلدی میں "ناک" صاف کرنا بھول گئے تھے کیونکہ ہمارے ساتھی صحافی کہہ گئے کہ یارا اتنے بڑے عہدے پر آنیوالا شخص کتنا لاپرواہ ہے کیا اسے اندازہ نہیں کہ لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ اقتدار اور اور حرام شے کی نشے " ہیں مدھت ہمارے " بابوجی "اس دن اپنی دل کی بات کہہ گئے موصوف کا کہنا" تھا کہ جس نظریئے پر پاکستان بنا تھا وہ نظریہ ہمیں آج کمزور کر رہا ہے بقول ان کے مذہب ہمارا بڑا مسئلہ ہے اور اہمیت

ریاست کو دینی چاہئیے نہ کہ نظریئے کو "بابوجی" نے مزید ارشاد فرمایا کہ روس چین یورپ نے اپنے نظریات کو وقت کیساتھ بدلا ہے اور نظریہ پاکستان سے زیادہ ریاست کو اہمیت دینی چاہئیے اسلامی نظریہ پر بننے والے اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری ملک کے اعلی کرسی پر بیٹھے یہ "بابوجی "کے ہیں اس موقع پر ہمیں پتہ نہیں کونسے شاعر کا ایک شعر ذہن میں آرہا کہ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے "تعلیمی درسگاہیں کسی بھی ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے ان درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہونیوالے طلبائوطالبات ملک کے مستقبل کے امین ہوتے ہیں لیکن اپنے امینوں کے دل و دماغ میں اگر ایسی باتیں ڈالیں گے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اثرات کیا نکلیں گے ۔بابوجی کے ارشاد عالیہ پر اب تو مختلف لوگوں کی رائے آرہی ہیں کوئی کہہ رہا ہے کہ شائد وہ حرام "شے کی نشے میں تھے اس لئے یہ بات کہہ گئے لیکن مجھ سمیت دیگر ساتھی جو اس" وقت وہاں موجود تھے نے خود سنا کہ بابوجی جاتے جاتے اپنے "ساتھیوں" کو کہہ گئے کہ بس اتنی تمنازعہ بات بہت ہے" یہ کہنے کے بعد واپس چلے گئے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ " موصوف کو نشہ "کرسی واقتدار کا ہے "اس لئے ایسی باتیں کررہے ہیں اگر یہاں پر صحیح معنوں میں "اسلامی " حکومت ہوتی تو "بابوجی" شائد "پینے پلانے " کی وجہ سے اندر ہوتے ۔روس امریکہ اور یورپ کی کیمونزم اور سوشلزم کی مثالیں دینے والے اوران میں ترمیم کی باتیں کرنے والے بابوجی کیلئے ہم اتنا عرض کرتے ہیں کہ الحمد اللہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور

یہاں پر نظام اسلام ہی کا آیگا اور آخری بات کہ اسلام مکمل دین حیات ہے اور اسلامی نظریہ پر بننے والے پاکستان میں ان جیسے بہت سارے آئے اور گئے کچھ اپنے آپ کو شہداء " بھی کہتے ہیں لیکن کامیاب اور شہید وہی ہے جس نے اسلام کیلئے آواز اٹھائی " اور اسلام کیلئے موت کو چنا۔

میری باتیں بہت سارے لوگوں کو بری لگیں گی اور شائد کچھ لوگ اسے ذاتیات پر مبنی بھی سمجھیں لیکن سچ یہ ہے کہ اگر اس طرح کے لوگ ہماری حکمران رہیں گے تو ہمیں دشمنوں کی ضرورت نہیں صوبے کی تاریخ و ثقافت پر پروگرام کرنے والے اگر کسی پروفیسر ڈاکٹر کو مہمان خصوصی کے طور پر بلاتے تو شائد بہتر ہوتا کیونکہ تعلیم و تحقیق سے وابستہ لوگ ہی اس ملک کے اصل وارث ہیں اور ان کی آج کی کاوش ہمارے آنیوالے کل کا تاریخ ہیں۔

سالہ تاج محمد کی عظمت کو سلام10

سرد ہوائیں اس کی جسم کو چھو کر گزر رہی تھی اور ان ہوائوں کی وجہ سے اس کا جسم کپکپا کر رہ جاتا پھر بھی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھال جس میں) ڈونیٹ (پڑے ہوئے تھے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اس کی آنکھیں سڑک پر تھی اور اپنے بوجھ کو بھی دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر عزم تھا جو اس کے خوبصورت چہرے اور کھلے پیشانی سے جھلک رہا تھا -دسمبر کی سخت سردی میں اس کے پائوں میں جراب بھی نہیں تھی اس کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے -سردی کا مقابلہ کرنے کیلئے اس نے لنڈے کی جیکٹ پہنی تھی لیکن وہ بھی سردی کو کم کرنے کا باعث نہیں بن رہی تھی - سرد ہوائوں کی وجہ سے اس کی ناک سر سر کر رہی تھی-یہ سارا احوال 10 سالہ تاج محمد کا ہے جسے راقم نے صبح سویرے ہاتھوں میں)ڈونیٹ (کی تھال اٹھائے روڈ پر کھڑے دیکھا-

دسمبر کی پہلے ہفتے میں صبح سات بجے راقم دفتر جانے کیلئے روڈ کنارے مسافر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک معصوم بچہ جس کی سر پر)ڈونیٹ (کا تھال تھا روڈ کنارے کھڑا تھا مسافروں کو لے جانے کیلئے ایک سوزوکی آئی اس سے سواریاں اتر گئیں اور خالی ہوگئیں جب اس بچے نے سوزوکی میں داخل ہونے کی

کوشش کی تو اس نے اپنا تھال آگے کردیا کہ کوئی اس کے تھال کو پکڑے تاکہ اسے آسانی سے اوپر آنے کا موقع ملے لیکن سوزوکی میں پانچ چھ بیٹھے مسافروں میں کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس معصوم بچے سے تھال لیتے اور اسے اوپر آنے دے اسی دوران پھر کنڈیکٹر نے آواز لگائی -جانے دے استاد اور سوزوکی روانہ ہوگئی -وہ معصوم بچہ تھال لئے ایسے ہی کھڑا رہا اور دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا کہ پھر کوئی گاڑی آئیگی اور اسے گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملے اس سوزوکی کے بعد ایک اور گاڑی بھی آئی لیکن کسی نے اس معصوم کو جس کے کندھوں پر اس سے وزن سے زیادہ بوجھ پڑا تھا کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی -کچھ دیر بعد چنگ چی آئی راقم بھی اس میں سوار ہوگیا تاہم وہ بچہ کھڑا رہا میں نے اسے آواز دی کہ بیٹے ادھر آجائو لیکن وہ کھڑا رہا میں نے دوبارہ اسے آواز دی اور کہا کہ بیٹے آجائو میں کرایہ دے دونگا تو وہ آگیا اور راقم نے اس کے ہاتھ سے تھال لیا اور اسے بیٹھنے کیلئے کہا بعد میں اس کے بیٹھنے کے بعد تھال واپس کردی تاہم اس تھال سے)ڈونیٹ (کے شیرے نے راقم کے ہاتھوں کو گندا کردیا جو معصوم تاج محمد نے دیکھ لیا اور اس نے آنکھیں شرمندگی سے نیچے کرلی لیکن راقم نے اسے کہا کہ اس کو چھوڑو کچھ نہیں ہوا اور وہ آرام سے بیٹھ گیا -چونکہ سفر زیادہ تھا اور وہ معصوم بچہ اور راقم اکیلے بیٹھے تھے اس لئے راقم نے اس سے گپ شپ شروع کی -

راقم کیلئے دس سالہ بچے کی اتنی صبح سویرے سڑک پر آمد اور بازار میں آنا باعث حیرت تھا کیونکہ ایک تو سخت سردی تھی اور دوسری اتنی صبح ایک معصوم بچے کو سڑک پر دیکھنا حالانکہ اس کے عمر کے بچے سکول جارہے تھے - سردی کی وجہ سے راقم نے تو اپنے آپ کو مکمل کور کیا ہوا تھا اور سخت سردی کی وجہ سے ہر کسی نے اپنے آپ کو گرم کپڑوں چادر سے چھپایا ہوا تھا تاہم اس معصوم بچے کی جسم پر کچھ نہیں تھا بقول اس معصوم محنت کش بچے کی کہ وہ پشاور کے نواحی علاقے خزانہ کا رہائشی ہے اور روزانہ صبح پونے چھ بجے وہاں سے نکل کر پشاور آتا ہے اس کی والدہ اسے جگاتی ہیں معصوم تاج محمد نے بتایا کہ اگر آنکھ جلدی کھل گئی تو میں چائے بھی پی لیتا ہوں ورنہ منہ دھونے کے بعد پشاور اپنے فیکٹری میں جلدی پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں معصوم تاج محمد کے بقول روزانہ وہ صبح سات بجے سے شام چار بجے تک شہر کے مختلف بازاروں میں جا کر) ڈونیٹ (فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس کے مجھے ایک سو روپے دیہاڑی ملتی ہے -سردی سے ٹھٹھرنے والے اس معصوم بچے نے مزید بتایا کہ چھ ماہ قبل اس کے والد جو کہ سڑک کنارے چھابڑی فروش کیساتھ مزدوری کرتے تھے کو ایک ٹوڈی والے نے سڑک کراس کرتے ہوئے پیچھے سے زخمی کردیا اور والد کے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے اور چھ ماہ سے اپنے گھر کا میں خرچہ کرنے کیلئے بازار میں یہی کام کررہا ہوں ڈیڑھ ہزار روپے کے کرائے کے مکان میں رہائش رکھنے والے معصوم محنت کش تاج محمد کا ایک اور بھائی بھی ہے تاہم وہ چھوٹا ہے اور اپنے زخمی والد ماں،اور چھوٹے

بھائی کی ذمہ داری اس کی ہے اس لئے وہ صبح سویرے سردی یں گھر سے نکل کر آتا ہے اور شام چار بجے تک مزدوری کے بعد گھر جانے کے بعد علاقے میں واقع مدرسے میں پڑھتا بھی ہے چنگک چی کے مقابلے میں سوزوکی پر بیٹھنے کی وجہ بتاتے ہوئے اس معصوم بچے کا کہنا تھا کہ سوزوکی کا کرایہ پانچ روپے ہوتا ہے جبکہ چنگک چی کا کرایہ دس روپے اس لئے وہ پیسے بچانے کی خاطر سوزوکی میں بیٹھتا ہے معصوم بچے اور راقم میں باتیں ہو رہی تھی کہ اس محنت کش بچے کا سٹاپ آگیا اور وہ اپنا بوجھ اٹھائے اتر گیا اور راقم کو سوچوں میں چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ صرف ایک معصوم بچے تاج محمد کی کہانی ہے پتہ نہیں ہمارے ارد گرد کتنے تاج محمد اپنے معصوم ہاتھوں میں اپنے وزن سے زیادہ بوجھ اٹھائے مزدوری کر رہے ہیں کیا ہم لوگ درد صرف اپنے بچوں کیلئے رکھتے ہیں تاج محمد جیسے بچے ہمارے خاندان سے نہیں لیکن یہ اس قوم کے بچے ہیں جس سے ہم سب کا مستقبل وابستہ ہیں کیا ہم اپنے بچوں کو اسی طرح سڑکوں پر مزدوری کرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں نہیں لیکن شائد وہ پشتو مثل کہ کہ اگر بے غیرتی پر کسی کے سینگ نکلتے تو آج پتہ نہیں ہمارے سروں پر بے غیرتی کے کتنے سینگ ہوتے کیا اس معصوم بچے کے محلے میں کسی کو توفیق نہیں کہ اس معصوم کے خاندان کی کفالت کرے اپنے ارد گرد دیکھ لیں ہمارے محلوں میں کتنے ایسے بچے ہیں اگر ہم اپنے بچوں کیلئے ہزاروں روپے خرچ کر سکتے ہیں تو ان معصوم بچوں کیلئے سینکڑوں

روپے خرچ نہیں کر سکتے۔ویسے تو ہم سب لوگ پانچ وقت زمین پر مرغ کی طرح جھٹکے مار کر نماز بھی پڑھ لیتے ہیں لیکن ہمیں ان نمازوں سے فائدہ بھی نہیں کیونکہ ہم اس کی حقیقت کو سمجھے بغیر پڑھ رہے ہیں ۔کیا ہمیں اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ حقوق العباد پر زیادہ توجہ دینا ہے اللہ تعالی اپنے حقوق کو معاف کر سکتا ہے لیکن اپنے بندوں کے حقوق معاف نہیں کرتا۔کیا اسلام میں بچوں کے حقوق نہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم سب منافق ہیں اسلام کے لبادہ اوڑھے ہوئے منافق جنہیں صرف اپنا آپ نظر آتا ہے۔ خدا کو حاضر وہ ناظر سمجھ کر ہر کوئی سوچ لے کہ اگر اس طرح اس کے اپنے بچے سخت سردی میں مزدوری کرے اور وہ خود گھر میں زخمی پڑے ہوں تو کیسا محسوس کرینگے شائد اس طرح ۔ہم لوگوں کی خمیر میں پڑی ذرا سی "غیرت اور انسانیت" جاگ اٹھے

صوبہ پختون خوار میں اگر واقعی "دودھ اور شہد کی نہریں" بہہ رہی ہوتی تو معصوم تاج محمد جیسے بچے ان نہروں سے اپنے خاندان والوں کیلئے کچھ نہ کچھ رزق تو آسانی سے کما لیتے لیکن "اندھوں کے شہر میں ریوڑھیاں باٹنے کا کوئی فائدہ نہیں" یہاں قومیت کی بنیاد پر "سیاسی دکان داری" کرنے والی "لالٹین والی سرکار" دعوے تو بہت کرتی ہیں ۔لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے

سپورٹس خباثت اور پیداگیری

دور طالب علمی میں سنا کرتے تھے کہ پڑھو لکھو بنو گے نواب کھیلو کودو ہو گے خراب
پڑھنا لکھنا پڑھنا ہم سے ہوتا نہیں تھا اور کھیلنے کودنے سے گھر والے منع کرتے تھے اس
لئے ہم کچھ نہ بن سکے ۔پھر ایک دور آیا جب ہر کوئی سنا تھا کہ پڑھو گے لکھو ہو گے
خراب کھیلو کودو گے بنو گے نواب اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ ہمارے ہاں نواب زیادہ
بن گئے کھیل کے میدان سے بننے والے ان نئے بننے والے نوابوں نے اپنے عادات بھی
نواب جیسے بنا لئے جس کی وجہ سے "جواری" بن گئے اور ملک کے نام کو داغدار کر گئے
شکر ہے کہ پکڑے جانیوالے نوابوں کو گوری چمڑی والوں نے پکڑا ہوا تھا ورنہ ہماری
طرح کالے چمڑی والے پکڑتے تو "ایزی لوڈ" کرکے نکل جاتے اور ملک کی
خدمت "کھیلوں کے میدان" میں کرتے اور جذباتی قوم ان کیلئے زندہ باد کے نعرے
لگاتی خیر وہ سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن ان لوگوں کے کئے گئے "کارناموں" سے
لوگ اب ان پر اعتبار نہیں کرتے۔

جس طرح کا اعتبار فیصل آباد سے آنیوالی ایک جوجتسو کی ایک خاتون کھلاڑی پر کوئی
نہیں کررہا اپنی اس بے اعتباری کو ختم کرنے کیلئے متعلقہ کھلاڑی نے اب کھیلوں کی
وزارت سمیت ہمارے بابو جی اور دیگر اداروں کے رہنماؤں کو

درخواست دی ہیں جس میں انصاف کا مطالبہ کیا گیا ہے موصوفہ کا تعلق جوجستو کے کھیل سے ہے بقول اس کے لاہور میں منعقدہ پنجاب یوتھ گیمز کے نیشنل جیوجٹسو ٹورنامنٹ میں فاٹا اولمپک ایسوسی ایشن کا سیکرٹری جنرل نے اسے کہا کہ آپ فاٹا کی نمائندگی کرو، اگر میڈلز جیت جاؤں گی تو جسطرح فاٹا کے دوسرے کھلاڑیوں کو انعامی رقم ملے گی اس طرح آپ کو بھی انعامی رقم دی جائے گی۔مذکورہ کھلاڑی کے مطابق میں نے، مذکورہ ٹورنامنٹ میں فاٹا کی نمائندگی کرکے دو،برائونز میڈلز جیتے۔اور جب میں نے لاہور میں ایونٹ کے اختتام پر انعامی رقم کا مطالبہ کیا تو مجھے کہا گیا کہ میں آپ کو بتادوں گا۔لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اسلام آباد میں ایک پروگرام ہوا جسمیں فاٹا کے کھلاڑیوں کو پیسے دیئے گئے اور میرا انعام ایک اور ایک لڑکی کو دیدیا گیا۔اور جب میں نے متعلقہ سیکرٹری کو فون کیا کہ میرا انعامی رقم کب ملے گا تو انھوں نے مجھے پشاور آنے کو کہا کہ اور اسکے کہنے پر انعامی رقم لینے فیصل آباد سے پشاور پہنچی، تو میں سمجھی کہ میں پشاور کے خواتین سپورٹس ہاسٹل میں قیام کروں گی، لیکن مجھے باڑہ روڈ صدر کینٹ میں واقع خیبر سپر مارکیٹ میں ایک پرائیوٹ فلیٹ پر لیکر گیا اور کہا کہ ہم فاٹا کی خواتین کھلاڑیوں کو یہی قیام کراتے ہیں۔اور اسی جگہ مجھ پر ہاتھ ڈالا اور بدتمیزی کرنے لگا اور میری مزاحمت کرنے پر مجھے دھمکیاں دینے لگا اور بولا کہ تم یہاں سے زندہ نہیں جاؤ گی۔ متعلقہ خاتون کھلاڑی نے اپنی درخواست میں بہت کچھ لکھا ہے اور اس نے

اپنی درخواست کی نقول بہت ساروں کو بھیج دی ہیں ۔ متعلقہ ادارے اس حوالے سے کیا کرتے ہیں ہمیں پتہ نہیں لیکن حیرانی اس بات پر ہو رہی ہے کہ فاٹا کے کھلاڑی کے نام پر دوسرے صوبے کے کھلاڑی کو کس طرح شامل کیا گیا لیکن اس معاملے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس معاملے میں سب اندر سے ملے ہوئے ہیں ۔ قبائلی علاقہ تو ویسے بھی دہشت گردی کے حوالے سے بدنام ہے اب اگر ایسی صورتحال رہی تو پھر ہمارے فاٹا سے کوئی پاگل ہی کھیل کے میدان کیلئے نکل سکتا ہے ۔

کسی زمانے میں راقم کو کھیلوں کی رپورٹنگ کا بڑا شوق تھا اس دوران اس شعبے کو اندر سے دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس شعبے کو نہ صرف میدان سیاست کے لی ڈروں نے تباہ حال کر دیا بلکہ مختلف ایسوسی ایشن کے نام نہاد "مشران "جنہیں اور تو کچھ نہیں آتا لیکن عہدوں کیلئے بھاگ دوڑ کرنا خوب آتی ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس اعلی سرکاری عہدے ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے مختلف ایسوسی ایشن کے عہدے سنبھالے ہوئے ہیں کبھی ایک ایسوسی ایشن اور کبھی دوسرے ایسوسی ایشن کے ساتھ ان کے نام دیکھے جاسکتے ہیں کچھ ایسے ایسوسی ایشن بھی ہیں جن کے مشران کو اور تو کچھ نہیں آتا ہاں انہیں مکھن لگانے کا فن آتا ہے اور اسی فن کے ذریعے کھیلوں کے نام پر صرف اپنی اور اپنے مخصوص لوگوں کی پرموشن میں مصروف رہتے ہیں اور ملک بھر اور غیر ممالک کا دورہ کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان کے

مکھن لگانے کے فن کو دیکھ کر حیرانگی ہوتی ہے کہ بازاروں میں پراٹھے فروخت کرنے والے کیسے ایسو سی ایشن چلاتے ہیں ۔سب سے عجیب بات کہ اس شعبے پر جس طرح مخصوص لوگوں کا گروہ قابض ہے اس طرح ہمارے ہی شعبے سے وابستہ کچھ صحافی جن میں بڑے نامور لوگ شامل ہیں کھیلوں کے ایسو سی ایشنز پر قابض ان لی ڈروں کے چمچے "بنے ہوئے ہیں اور کھیل کے پروموشن کے نام پر آنیوالے فنڈز میں صحافی بھی اپنا" حصہ وصول کرکے صوبہ پختون خوار میں کھیلوں کی پروموشن کرنے میں مصروف عمل ہیں ۔

کھیلوں کی پروموشن کیسے ہورہی ہیں اس کا اندازہ صرف ایک ہی پروگرام سے بخوبی کیا جاسکتا ہے اور دو ٹکے کے عوام کے ٹیکسوں سے لیا جانیوالا پیسہ کس بے دردی سے استعمال ہورہا ہے جاپان سے تعلق رکھنے والے انوکھی پہلوان نے گذشتہ دنوں پشاور کا دورہ کیا اپنے دورے کے دوران ریسلنگ امن فیسٹیول بھی پشاور کے قیوم سپورٹس سٹیڈیم میں منعقد کرایا گیا صرف اس ایک مقابلے کی پروموشن کیلئے تقریبا80ہزارروپے ایک گلائیڈر) ہوائی جہاز (کرائے کے مد میں دیئے گئے جس میں ان مقابلوں کے حوالے سے پروموشنل بروشرز فضا سے گرائے جانے تھے پتہ نہیں گلائیڈر سے وہ پروموشن بینرز کہاں پر گر گئے کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پشاور کے چاروں اطراف میں جہاز سے بینرز گرائے گئے لیکن خدا گواہ ہے کہ رنگ روڈ پر شہریوں کو اس مقابلے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا

حالانکہ اس حوالے سے شہریوں میں معلومات فراہم کیلئے مخصوص صحافیوں کے "جیب بھی گرم" کئے گئے لیکن خیر خیریت رہی دوسری طرف پی کے 4 کے چوبیس سکولوں کے بچوں کو بلوایا گیا اور ان سرکاری تعلیمی اداروں کے سربراہان کو پچاس روپے فی طالب علم پیسے دیئے گئے کہ وہ "تالیاں" بجانے کیلئے سکول کے بچوں کو لے آئیں اب اللہ ہی جانے کہ کس نے کتنی رقم استعمال کی۔

ان چند سطروں کے ذریعے ہم کھیل کے میدان پر مسلط لی ڈروں سے التماس کرتے ہیں کہ خدارا ایسے مرد و خواتین انسٹرکٹرز جن کی واقعی سپورٹس کے شعبے میں نمایاں کارکردگی ہو انہیں کھیلوں کے میدانوں میں آگے لایا جائے جو سکولوں میں نرسری سطح پر بچوں کو مختلف کھیلوں میں تربیت دے اور انہیں ملکی سطح کے مقابلوں کیلئے تیار کرے انہی سطور کے توسط سے ہم اپنے چند ساتھیوں کو بھی گزارش کرتے ہیں کہ خدارا بہت کما لیا ہے جس کی وجہ سے آپ لوگوں کے پیٹ بھی نکل گئے ہیں اور کچھ نے تو بنگلے بھی خرید لئے ہیں کچھ قلم کی حرمت کا خیال کریں کیونکہ ذات باری تعالی یہ بھی پوچھے گا کہ " بے حیثیت "انسان میں نے تمھیں وہ قلم جس کی میں نے قسم کھائی ہے لوگوں کی مداح سرائی اور اپنے ذاتی مفاد کیلئے نہیں دی تھی۔

ہفتہ جہاں ہے جیسے کی بنیاد پر

پیر : جس کام کیلئے آپ نے سرکاری شخصیت کو لانڈری لوڈ کیا تھا وہ کام اس ہفتے ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا حالانکہ آپ سے اس سے لانڈری لوڈ میں بھی کمیشن لیا گیا تھا۔ لیٹرینوں کے ٹھیکے میں آپ کو نقصان ہوتا ہوا نظر آرہا ہے کیونکہ صفائی کرنے والا بھاگ جائیگا اس لئے اس کاروبار کو ختم کرلیں تو اچھا ہوگا آپ نے اپنے گاؤں کے جس رشتہ دار کو سرکاری ہسپتال میں داخل کیا ہے اگلے ہفتے تک اس کی بیماری کی تشخیص ہو جائیگی نرس نے غلطی سے آپ کے گاؤں کے مریض کی رپورٹ کسی اور کو دی ہیں اس لئے اس ہفتے ٹسٹ ملنے کا امکان ہے تھوڑے سے خرچہ پانی سے آپ کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے ہاں اس دوران گاؤں والا مریض ہسپتال میں پڑے پڑے نئے بیماری کا شکار ہو جائیگا۔ سسرالی مریض کو آپ نے جس پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کروایا ہے اس کی بلوں کی ادائیگی بھی آپ کو کرنی ہے اور امکان ہے کہ اس ہفتے آپ کے جیب پر اضافی اخراجات پڑیں گے اور آنیوالا ہفتہ آپ کیلئے نئے مسائل پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔

منگل : آج کا دن آپ کیلئے مشکلات پیدا ہوسکتی ہے آپ بجلی اور گیس چوری سے جس فیکٹری کو چلا رہے ہیں اس میں بھی دو نمبر ادویات بن رہی ہیں گذشتہ ہفتے

آپ نے ہفتے بھر کا خرچہ اور حصہ داری اپنے متعلقہ پولیس سٹیشن کو نہیں پہنچائی اس لئے آپ کے گھر پر بھی چھاپہ لگنے کا امکان ہے جس میں آپ کے بھاگ جانے اور آپ کے مہمان پکڑے جانے کا خدشہ ہے اور ان کی چھترول کا امکان ہے لیکن آپ جس کاروبار سے وابستہ ہے اس میں عزت آنی جانی چیز ہے سو دل چھوٹا مت کریں اگر پھر بھی آزمائشوں سے ڈر لگتا ہے تو مال حرام میں خیرات کریں اور یہ خیرات ان لوگوں کو کھلائیں جو کھائیں بھی اور کھانے کے بعد بدمعاشی بھی کرے یعنی صحافیوں اور پولیس والوں کو امکان ہے اس کی وجہ سے آپ کا ہفتہ اچھا گزرے گا۔

بدھ: سڑک کے جس کنارے پر آپ بیٹھ کر بھیک مانگ رہے ہیں اس ہفتے اس پر نئے ٹھیکیدار کی آمد متوقع ہے آپ کا ریٹ کم ہے جبکہ نئے آنیوالا بھیک منگوں کا ٹھیکیدار زیادہ پیسے دے رہا ہے اس لئے آپ کیلئے بازار میں مسائل پیدا کر سکتا ہے آپ اپنے اپنے جعلی بنائی لنگڑی پاؤں کا خاص خیال کرنا ہے کیونکہ لگ رہا ہے کہ نیا ٹھیکیدار لوگوں کے سامنے آپ کے پول کھول دے گا اور ستاروں کی چال سے اندازہ ہو رہا ہے کہ محلے اور بازار میں آپ کی دھنائی کرکے حقیقی طور پر آپ کو لنگڑا کردینگے جس جگہ پر آپ بیٹھے ہیں وہاں سے بھی مال نکلنے کا امکان ہے اس لئے کوشش کریں کہ جلدی سے یہاں سے کہیں اور جا کر ٹھکانہ بنالیں کیونکہ لنگڑے پاؤں اور لاکھوں رروپے کی حفاظت ایک ساتھ نہیں ہو سکتی

جمعرات :اس ہفتے رشتہ ہونا مشکل نظر آ رہا ہے آپ جوے کے کاروبار سے وابستہ ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو محلے میں بہت شریف النفس بنایا ہوا ہے چونکہ آپ کا اس ہفتے رشتہ ہو رہا ہے اس لئے لہٰزی لوڈ یعنی غیر نصابی سرگرمیوں سے دور رہیں لڑکی والے اس ہفتے آپ کے کسی پرانے دوست کیساتھ ملیں گے جو آپ کے سارے کرتوت انہیں بتا سکتے ہیں - آپ کی بدقسمتی کہ چوری کی مرغی جو آپ اور آپ کے دوستوں نے پکائی تھی کا قصہ بھی آپ کے سسرال والوں کو پتہ لگنے کا امکان ہے جس کے باعث امکان ہے کہ رشتہ بھی نہ ہو - ستاروں کی چال بتا رہی ہے کہ جو قرضہ آپ نے محلے کی دکاندار سے لیا تھا اور اب اس پر بدمعاشی کرکے نہیں دے رہے تھے وہی دکاندار محلے میں آپ کا منہ کالے کرکے گدھے پر چکر بھی لگوائے گا اگر ان تمام حالات سے بچنا ہے تو ہفتہ رفتہ بتانے والے بابا کو لہٰزی لوڈ کردیں-

جمعہ : ستاروں کی چال بتا رہی ہے کہ گذشتہ دو جمعے آپ نے نماز نہیں پڑھی اس لئے پہلے تو باقاعدہ نہا کر نماز پڑھیں اور عہد کریں کہ مسجدوں سے جوتے چرانے کا کام بھی نہیں کرنا دو ہفتے قبل آپ کیلئے اسی کالم میں ہدایت کی تھی کہ مسجد سے جوتے چراتے ہوئے پکڑے جانے کا خدشہ ہے لیکن آپ نہیں مانے

اور مسجد آنیوالے مسلمانوں نے جو حال آپ کا کیا ہے وہ تو سب کو پتہ ہے تاہم اب صحیح معنوں میں جمعہ کی نماز کیلئے جایا کریں اور مسجدوں کے جوتے چرانے کا سلسلہ بند کردیں آپ پر منحوسیت کا دائرہ ختم ہوتا دکھائی دے رہا ہے دودھ کا جو کاروبار آپ نے شہر کے باہر کے نالے کیساتھ شروع کیا ہے اس میں پانی ڈالتے ہوئے احتیاط کریں اس ہفتہ دودھ سے مینڈک نکلنے کا خدشہ ہے -

ہفتہ : جن لوگوں کی ڈیوٹی شہر کے مختلف چوراہوں پر عوام کی سیکورٹی کیلئے ہے ان کیلئے خوشخبری ہے کہ اس ہفتے افغان مہاجرین زیادہ آپ کے ہاتھ لگنے کا امکان ہے اور بیداگیری زیادہ ہوگی لیکن آپ نے سنبھل کر شوٹرا ماری نہیں کی تو آپ سے حصہ لینے والا افسر چھاپہ مار کر ٹی وی کے سکرینوں پر اپنے آپ کو ہیرو بنا سکتا ہے آپ کے ستارے بتارہے ہیں کہ محلے میں پانچ سال بعد کسی ممبر اسمبلی کی آمد متوقع ہے جس کیلئے آپ کو دیگر لوگوں کیساتھ گندے ٹماٹر اور گندے انڈے جمع کرنا ہونگے دوسری صورت میں محلے کے لوگ ممبر اسمبلی کیساتھ ساتھ آپ کا بھی بھرکس نکال سکتے ہیں

اتوار : آج آرام کا دن ہے سرکار تو ویسے بھی سات دنوں میں کچھ نہیں کرتی اس لئے آپ کے ستارے اس ہفتے یہ بتارہے ہیں کہ اگر آپ کام نہیں کرینگے تو کوئی قیامت نہیں آئیگی کام تو ویسے بھی لوگ گدھوں کی طرح کرتے ہیں ہے آپ بھی

اتوار کے روز کام نہ کریں اور کسی چیز میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں کھانے پینے نہانے دھونے سمیت گھر کا سودا سلف لانے سے چھٹی کریں۔

نجی تعلیمی ادارے اور پختون خوار صوبے کا نیا بل

صبح گھر سے نکلتے ہوئے ان والدین کو جن کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں جس ذہنی تناؤ اور اذیت سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ کرنا بہت ہی مشکل ہے صبح سویرے کبھی بچوں کی سکول میں پارٹی کیلئے رقم دینی ہوتی ہے اور کبھی کبھار بیپر منی کے نام پر والدین کے نام پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے کبھی کسی ٹور کیلئے بچوں پر زور ڈالا جاتا ہے اور اگر پرائیویٹ سکول دور ہیں تو پھر ان بچوں کو سکول لانے اور لے جانیوالے گاڑیوں کے مالکان کے نخرے اور ان کے اخراجات.برداشت کرنا دل گردے کا کام ہے ایسے میں اگر پرائیویٹ سکولز کے مالکان احتجاج کرے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ والدین کے دلوں پر کیا گزرتی ہیں خصوصا ان بچوں کے جن کے آج کل سمسٹرز کے امتحانات چل رہے ہیں -

گذشتہ دنوں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی تنظیم کی کال پر صوبے بھر میں تمام پرائیویٹ اداروں کے مالکان نے صوبائی حکومت کی طرف سے ریگولیٹری بل کے نام پر ان کی مانیٹرنگ کیلئے لائے جانیوالے بل کی مخالفت میں احتجاجا ایک روز کیلئے تعلیمی ادارے بند کردیئے مالکان کا موقف ہے کہ جو نیا بل لایا جارہا ہے ان میں ان کی مشکیں کسنے کیلئے اقدامات کئے جارہے ہیں اور بیوروکریسی

اپنی بد معاشی اور ان اداروں میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیلئے اس طرح کے اقدامات کر رہی ہیں ان مالکان کا یہ کہنا ہے کہ نئے بل کے بعد اگر کسی تعلیمی ادارے سے غلطی ہو گئی تو ان کے مالکان کیلئے سزائیں مقرر کی گئی ہیں جو غلط اقدام ہیں اسی طرح ان رجسٹرڈ اور غیر معیاری اداروں کی روک تھام کیلئے بھی قانون سازی کی جارہی ہیں جو ان مالکان کو قبول نہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ تعلیمی اداروں میں کی گئی اپنی سرمایہ کاری ختم کرلیں گے۔ دوسری طرف صوبائی حکومت کا موقف ہے کہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی ملازمت چھٹی اور انہیں دی جانیوالی مراعات سے متعلق کوئی قانون موجود نہیں نہ ہی پرائیویٹ سکولوں کے اساتذہ کیلئے کوئی تعلیمی معیار مقرر ہے صوبائی محکمہ تعلیم کے مطابق پرائیویٹ سکولوں کی درجہ بندی کی گئی ہیں اور اگرپرائیویٹ سکولز مالکان کو اس پر اعتراض ہے تو وہ ان کے اعتراضات دور کرنے کیلئے تیار ہیں صوبائی محکمہ تعلیم نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ نئے بل کے بعد وجود میں آنیوالے ادارے کیلئے سرکاری عہدے کا شخصیت سربراہی کریگا اور اس میں کسی قسم کی سیاسی مداخلت نہیں ہوگی۔

اس وقت ہمارے صوبے میں پچیس ہزار سے زائد تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں جن میں لاکھوں بچے زیر تعلیم ہیں حیران کن بات یہ ہے کہ ہر تعلیمی ادارے کا اپنا نصاب ہے سرکاری سکولوں سے ویسے پہلے کلرک نکلتے تھے اب تو کلرک کے

بجائے وہاں پر مزدور بنانے کا سلسلے جاری ہے جبکہ کلرک بنانے کا یہ ٹھیکہ آج کل درجہ سوم کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے پاس ہے جو بین الاقوامی معیار کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں ان ہیں عام لوگوں کے بچے تو پڑھنے سے رہیں ایک مخصوص طبقہ ان اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلواسکتا ہے ان کے اخراجات اتنے ہیں کہ عام لوگوں کے گھروں کے ماہوار اخراجات بطریق احسن پورے ہو سکتے ہیں ایلیٹ کلاس کے بچوں کیلئے بننے والے ان تعلیمی اداروں میں خان خوانین کے بچے پڑھتے ہیں اور ان سب تعلیمی اداروں کا نصاب " پاکستان کا مطلب کیا کھا پی اور مزے اڑا" والا ہے انہی تعلیمی اداروں سے پڑھ کر آنیوالے قانون سازی اور حکمرانی کیلئے آتے ہیں اور یہی اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری ملک پاکستان میں بسنے والے بے وقوفوں کے سروں کا سودا کرتے ہیں درجہ اول کے ان پرائیویٹ سکولوں کے مالکان بھی ایلیٹ کلاس سے ہیں درجہ دوم کے پرائیویٹ سکولوں کا نصاب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اس سے فارغ التحصیل ہونیوالے گریڈ 15 تک کے لوگ ہوتے ہیں ان پرائیویٹ سکولوں کے مالکان زیادہ تاجر ہیں جو مکھی سے بھی جوس نکالنے کے ماہر ہیں رہے اسی باعث ان اداروں میں پڑھنے والے طلباء کو نصاب کتب سے لیکر یونیفارم تک انہی تاجروں کے قائم کردہ مخصوص دکانوں سے لینی پڑتی ہے جس میں ان۔ مالکان کا اپنا لانڈری لوڈ اور کمیشن ہوتا ہے تین ماہ کی چھٹیوں کا خرچہ بھی انہیں تاجر نما لوگوں نے شروع کیا ہے اور بچوں کی تین ماہ کی چھٹیوں کے دوران بھتہ بھی والدین کو انہی سکولوں کے

مالکان کو ادا کرنا پڑتا ہے درجہ سوم کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کلرک پیدا کرنے کی فیکٹریاں ہیں آدھے انگریز اور آدھے پاکستانیوں کے یہ تعلیمی ادارے اور تو کچھ نہیں کر رہے یہاں پڑھنے والے بچوں کو اے آلو بی بھالو اور سی سموسہ سکھا رہے ہیں۔
صوبہ خیبر پختون خوار میں سرکاری سکولوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے جو سرکاری تعلیمی ادارے ہیں ان میں ایک کلاس روم میں سینکڑوں بچے زیر تعلیم ہیں نصاب تو سب کا ایک جیسا ہے لیکن یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم نہ تین میں ہوتے ہیں اور نہ تیرہ میں اوراس میں ان کی اپنی غلطی بھی نہیں ہوتی ہمارے ہاں تعلیم کا شعبہ ایسا شعبہ ہے جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ایسے ایسے لوگ اس شعبے کے وزیر بنائے گئے جن کی تعلیمی قابلیت انگوٹھا چھاپ ہی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس وزیر کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا اسے تعلیم اور صحت کا شعبہ دیا جاتا ہے کہ چلو بسم اللہ اس قوم کے مستقبل پر تجربے کرو ویسے بھی یہ بڑی ہمت والی قوم ہیں یہ ہر قسم کے تجربے کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہیں اسی باعث تعلیمی شعبے کے وزراء تجربوں کیساتھ ساتھ اس شعبے میں بین الاقوامی امداد دینے والے اداروں سے لیزی لوڈ اور کمیشن کھاتے رہتے ہیں اس دوران تعلیم کا شعبہ ترقی کرے نہ کرے یہ وزراء ترقی کرتے رہتے ہیں۔

خیبر پختون خوار میں دہشت گردی اور اس کی آڑ میں کی جانیوالی سر گرمیوں میں سب سے زیادہ تعلیمی اداروں کو نقصان پہنچا صوبے کے مختلف علاقوں میں واقع سکولوں کو دھماکوں سے اڑایا جارہا ہے ان میں بعض علاقوں میں بہت سارے لوگ اپنا کام بھی نکال جاتے ہیں حالانکہ ان سرکاری اداروں کیلئے دو اور بعض مقامات پر چار چوکیدار ڈیوٹی تعینات کئے جاتے ہیں لیکن کچھ کاغذوں میں ڈیوٹی دیتے ہیں اور کچھ مخصوص وجوہات کی بناء پر صرف تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور سکولوں کی حفاظت نہیں ہوتی اسی باعث ان تعلیمی اداروں کو بموں سے اڑانے کے بعد انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کیلئے پروپوزل پی سی ون بنتے ہیں اور ان تعلیمی اداروں کے نام پر آنیوالے کروڑوں بلکہ اربوں کے فنڈز آتے ہیں اوران میں بھی "لینڈری لوڈ" ہو جاتا ہے اسی باعث بہت سارے تعلیمی ادارے تباہ ہونے کے بعد بھی سالوں میں تعمیر نہیں ہوتے۔ دوسری طرف پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں پڑھانے والے اساتذہ کا کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں جو سرمایہ کار ہے اس کا نالائق بھائی بہن بیوی جو کہ اگر میٹرک پاس بھی ہے تو اس ادارے کا پرنسپل بنا ہوا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ ہیں انہیں پانچ ہزار سے دس ہزار تک تنخواہیں دی جاتی ہیں ان کے روزگار کی کوئی سیکورٹی نہیں نہ ہی ان کی تربیت کا کوئی پروگرام ہیں ۔ بعض پرائیویٹ سکولوں کے اساتذہ تو خوش ہوتے ہیں کہ بچے غیر حاضری کریں کیونکہ دوسرے دن جرمانے کے

-نام پر طلباء وطالبات سے سبزیاں بھی منگوائی جاتی ہیں

راقم نے ایسے پرائیویٹ تعلیمی ادارے بھی اسی شہر میں دیکھے ہیں جن میں سکول کے پرنسپل اپنے بچوں کیساتھ رہائش پذیر ہیں ان میں رات کو گھر کے افراد رہائش اختیار کرتے ہیں اور دن کو بچوں کو مرغیوں کے ڈربے نما کمروں میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے ان تعلیمی اداروں کی مانیٹرنگ کیلئے کوئی انتظام نہیں یہی ادارے رجسٹرڈ بھی ہیں ان کا سب سے بڑا تعلق محکمہ تعلیم سے وابستگی ہوتا ہے کچھ ایسے بااریش مالکان بھی ہیں جنھوں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدے اٹھائے اور رشتہ داروں کے سکولوں کو رجسٹرڈ کیا اور اب بچوں کے مستقبل کیساتھ کھیل رہے ہیں- جن حالات میں درجہ سوم کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے ملک کیلئے کلرک پیدا کر رہے ہیں ان میں انہیں مسائل سے دوچار کرنا تو ظلم ہے ویسے بھی ہماری سرکار نے سرکار کے ذریعے چلنے والے تعلیمی اداروں میں کونسا تیر مار لیا ہے جو اب پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے پیچھے لٹھ مار کر پڑے ہوئے ہیں ابھی تو والدین اور اساتذہ تو اس بات پر خوش ہیں کہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی مانیٹرنگ بھی ہو اور ان سے بھی کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو لیکن اس کی آڑ میں "خرچہ پانی "کا سلسلہ اگر شروع ہوگیا تو اس کا بوجھ بھی والدین کو برداشت کرنا پڑے گا-

ایمانداری اور گھرداری

مجھے پتہ ہے کہ جن لوگوں کے پیٹ اور حرص اللہ تعالی نہیں بھر سکا ان کے موٹے پیٹ دنیا کی کوئی طاقت بھر نہیں سکتی مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ حرام کا مال جمع کرنے والوں کیلئے عذاب ہے اور اس عمل میں مدد کرنے والے بھی اسی عذاب کا مزا چکھیں گے لیکن جو عذاب مجھ پر اس دنیا میں پولیس کی شکل میں مسلط ہے اس عذاب سے کون میری جان چھڑاتا ہے روزانہ بازار میں بے عزتی اور گھر میں جوان بہنوں کا سوچ کر ہیں پولیس والوں کی رشوت لینے میں مدد کرتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے اور میں نے کیا برائی کی ہے اخبار والے کونسے پارسا ہوتے ہیں کئی اخبار والے تو ان ٹریفک اہلکاروں سے پیسے لینے چوک میں آتے ہیں اور ان کا بھی کام چل رہا ہے ۔

یہ الفاظ چودہ سالہ بچے کے ہیں جو اس وقت پشاور کے ایک معروف بازار میں سبزی اور فروٹ کی ریڑھی لگاتا ہے یہ ریڑھی سبزیوں اور فروٹ سے بھرنے کے بعد اسے سڑک کنارے فروخت کرتا ہے تاہم ٹاؤن ون اور پولیس کے اہلکار اسے تنگ کرتے ہیں اسی سے بچاؤ کیلئے وہ مختلف اوقات میں ٹریفک پولیس کی مدد کرتا ہے جو اسی چوک میں کھڑے ہو کر ٹریفک کنٹرول کرتے ہیں ٹریفک پولیس اہلکار اس چودہ

سالہ بچے کو احکامات جاری کرتے ہیں کہ فلاں گاڑی سے اتنے پیسے لو اور سڑک کنارے یہ معصوم بچہ ریڑھی لگانے کے ساتھ ساتھ ان حرام خور ٹریفک پولیس کے اہلکاروں کیلئے " شوٹرا ماری" بھی کرتا ہے بقول اس بچے کے روزانہ میں پانچ سو سے پندرہ سو روپے ان ٹریفک پولیس اہلکاروں کیلئے پیدا کرتا ہوں جو وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں سے لئے جاتے ہیں ان گاڑیوں سے پیسے لینے کی ہدایت مجھے یہی ٹریفک پولیس کے اہلکار کرتے ہیں ان میں باریش پولیس اہلکار بھی شامل ہیں کبھی کبھار موٹر سائیکل پر گشت کرنے والے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں تاہم ان کی کمائی اپنی ہوتی ہے اور میں صرف ٹریفک پولیس اہلکاروں کیلئے پیداگیری کرتا ہوں ۔اس معصوم بچے کے بقول گاڑیوں کے مالکان مجھے گالیاں دیتے ہیں کہ یں ان پولیس اہلکاروں کیساتھ مل کر ان کو لوٹ رہا ہوں حالانکہ مجھے اس حرام کی کمائی سے کوئی مطلب نہیں اور نہ ہی یہ لوگ مجھے یہ پیسے دیتے ہیں ان کیلئے میں ایک معمولی ملازم ہوں ۔ ٹریفک اہلکار جن گاڑیوں سے پیسے لینا چاہتے ہیں ان سے کاغذات لیتے ہیں اور پھر مجھے مخصوص اشارہ کردیتے ہیں جس کے بعد میں گاڑی مالکان کے پاس جاتا ہوں اور ان سے پیسے وصول کرکے انہیں کاغذات دیتا ہوں رشوت کی یہ رقم بعد میں پولیس اہلکاروں کو دیتا ہوں لوگوں کے سامنے یہ ٹریفک اہلکار بڑے شریف بنتے ہیں لیکن ان کی شرافت کا مجھے پتہ ہے کہ کتنا حرام مال یہ اپنے خاندان والوں کیلئے چوک سے لیکر جاتے ہیں۔

یہ ساری کہانی اس معصوم بچے کی ہیں جو پشاور کے نواحی علاقے میں کرائے کے مکان میں رہائش پذیر ہیں والد ٹی بی کے مرض کی وجہ سے انتقال کر چکے ہیں اپنی معذور ماں اور تین جواں سال بہنوں کی کفالت کا ذمہ اس معصوم بچے کے ذمے ہیں جس کی وجہ سے چودہ سالہ یہ معصوم بچہ روزانہ منڈی چکر لگاتا ہے اور وہاں سے سبزی اور فروٹ خرید کر اپنے ٹھیلے پر لگاتا ہے جس سے اس کی گزر بسر ہو رہی ہیں تاہم چونکہ اس کا تعلق غریبوں کے اس طبقے سے ہیں جن کی اوقات صرف اتنی سی ہے کہ حکمران ان کے نام پر قرضے لیتے ہیں اور عیاشیاں کرتے ہیں اس معصوم بچے کے ٹھیلے کیلئے کوئی اجازت نامہ نہیں اس لئے وہ ٹھیلا لیکر کبھی ایک علاقے اور کبھی دوسرے علاقے جایا کرتا تھا اور اس میں اچھی خاصی آمدنی مل جایا کرتی تھی تاہم ایک دفعہ ایک گلی میں جھگڑا ہوا اور جھگڑے کے دوران اس نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی مارنے والے اس کی بیچ بچاؤ کی کوشش میں اس کی درگت بناگئے اور اس کی رقم بھی لوٹ لی اور اس کا ٹھیلہ بھی توڑ دیا جس کے بعد اس معصوم بچے نے گلیوں میں اشیاء کی فروخت کا سلسلہ بند کر دیا اور اپنا ٹھیلہ بازار میں لگا دیا تاہم یہاں پر ٹاؤن / میونسپل کے اہلکار مفت میں سبزیاں اور فروٹ لے جانے کے عادی تھے جو اس غریب کیلئے مشکل تھا اس لئے اس نے قانون کی آڑ میں اپنا کاروبار شروع کر دیا اور چوک میں ٹھیلہ لگانا شروع کر دیا لیکن ٹریفک پولیس والے اس کی جان کی دشمن بن گئے لیکن پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ٹریفک پولیس اہلکار نے ایک ٹرک کو جو کہ اوور لوڈ تھا کو پکڑ

لیا اور ایک ٹریفک اہلکار نے اس معصوم بچے کو کہہ دیا کہ جا کر ٹرک والے سے کاغذات لے آئو تاہم ٹرک والے نے کاغذات کے بجائے پیسے دیئے جو اس معصوم بچے نے پولیس کے حوالے کردیئے اور پھر یہی سلسلہ شروع ہوگیا یہ معصوم بچہ اس دن سے لیکر آج تک چوک میں اپنا ٹھیلہ لگاتا ہے اور ٹریفک پولیس اہلکار بھی اسے کچھ نہیں کہتے لیکن اس کے بدلے معصوم بچے کو ٹریفک پولیس اہلکاروں کیلئے "داداگیری" کرنا پڑ رہی ہے جو یہ معصوم بچہ مجبورا کر رہا ہے - ایک مرتبہ اس بچے نے گھر میں اپنی والدہ کو یہ بات کہہ دی کہ پولیس والے اس طرح اسے استعمال کرتے ہیں جس پر اس کی والدہ نے اسے منع کیا اور دوسرے دن بازار میں آنے کے بعد اس نے پولیس کیلئے کام کرنے سے انکار کیا لیکن پھر اس دن سارا دن اس کی بے عزتی ہوتی رہی پولیس والے بھی اسے تنگ کرتے کبھی ایک جگہ ٹھیلہ بھیجتے اور کبھی دوسری جگہ اور پھر ٹائون والے بھی اس کی جان کو آگئے اس دن دکانداری تو نہیں ہوئی لیکن اس کی بے عزتی اتنی ہوگئی اور گھر میں کھانے کیلئے بھی کچھ نہیں لے جاسکا کیونکہ جو وہ روزانہ کماتا ہے وہ شام کو اس کی کھانا ہوتا ہے - اس دن کے بعد چودہ سالہ بچے نے بازار کی بات گھر میں نہیں بتائی

راقم نے کئی مرتبہ اس چودہ سالہ بچے کو گاڑیوں کے مالکان کے سامنے کھڑے ہو کر پیسے لیتا دیکھا گندے کپڑوں خراب بالوں میں یہ بچہ گاڑیوں سے پیسے لیتا

ہے اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر یہ رقم پولیس اہلکاروں کو دیتا ہے اس دوران چوک میں ٹریفک کنٹرول کرنے کیلئے تعینات پولیس اہلکار جن میں کئی کی باریش داڑھیاں بھی ہیں اخبار کھول کر دیکھنے لگتے ہیں تاہم ان کی نظریں بچے اور گاڑی پر ہوتی ہے کئی مرتبہ کوشش کے باوجود میں اس بچے کی تصویر نہیں بنا سکا کئی مرتبہ وہاں پر تعینات پولیس اہلکار راقم کو وہاں پر دیکھ کر کھسک جاتے ہیں اور گاڑیاں بھی نکل جاتی ہیں اور وقت نہ ہونے کی وجہ سے راقم کا کام رہ جاتا ہے اس بچے کو آج بازار میں دیکھ کر راقم اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ تم کیوں ان حرام خوروں کیساتھ ملکر اپنے آپ کو تباہ کررہے ہو تو اس لڑکے نے یہ کہانی سنادی اور کہا کہ اگر ایمانداری کرتا ہوں تو مجھ پر مسلط لوگ ایمانداری نہیں کرنے دیتے اور حرام خوری میں پولیس کی مدد کرتا ہوں تو تمھارے جیسے نام نہاد مولوی نما صحافی آکر تقریریں شروع کردیتے ہیں۔ چودہ سالہ بچے کی تلخ اور سچ باتیں سن کر میں نے سرنیچے کی اور گھر کیلئے روانہ ہوگیا کہ نہ تو میرے بس میں کچھ تھا اور نہ ہی میرے پاس بچے کے کسی سوال کا جواب تھا لیکن ایک سوچ اس وقت میرے دماغ میں تھی کہ جن کے بس میں یہ سب کچھ ہیں تو وہ کیوں سو رہے ہیں۔

انتخابات لوٹے اور سرکاری وسائل کا استعمال

انتخابی عمل سر پر آنے کے بعد جہاں صوبے کے مختلف علاقوں میں لوٹوں کی ڈیمانڈ میں اضافہ ہوا ہے اور ایک پارٹی سے دوسرے پارٹی میں شمولیتی ڈرامے شروع ہوگئے ہیں وہیں پر لوٹے نما لی ڈروں کی اوقات کا بھی کسی حد تک بے وقوف اور جذباتی قوم کو پتہ چل گیا ہے کہ ان کے آگے دنیا جہاں ایک کرنے والے حقیقت میں کیا ہیں کل تک ایک دوسرے کو گالی دینے والے لی ڈر سیٹوں کیلئے کیسے شیر و شکر ہورہے ہیں یقین ہی نہیں آتا لیکن یہ میدان سیاست ہے یہاں پر نظریات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ۔بس جہاں مفاد نظر آیا وہیں پر سر ٹیک دینا ہمارے لوٹے نما لی ڈروں کا کمال ہے ۔ کسی کو اگر یقین نہیں آتا تو صوبے کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوٹے نما لی ڈروں کی گذشتہ چھ ماہ کی سرگرمیاں دیکھ لیں ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں چھلانگ لگانے کا سلسلہ کتنی تیزی سے یہ لوگ مکمل کررہے ہیں انہیں دیکھ کر حقیقی طور پر بندر ہی ذہن میں آتے ہیں جو ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف چھلانگیں لگاتے ہیں۔

انتخابات کیلئے سرگرمیوں کے آغاز میں لالٹین والی سرکار کو بھی پختون خوار

قوم کا خیال آہی گیا ہے روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر شہداء کی پارٹی کیساتھ گذشتہ پانچ سالوں میں جو ڈرامے پختون خوار کے لوگوں کیساتھ کئے گئے وہ یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہاں تعصب کی بنیاد پر سیاست کرنے والے پختون خوار کے لی ڈروں نے قوم کیلئے اتنی خواری کی کہ امن کی تلاش میں ان کے لی ڈر خوار ہوتے ہیں اور بیرون ملک پانچ سال سے خوار ہوتے رہے اور ناروے دبئ اور ملائشیاء میں ہوٹلوں اور کارخانوں میں امن صوبے کیلئے تلاش کرتے رہے اور پانچ سال سے گدھے کی سینگ کی طرح غائب رہے اور انہیں صوبے کے عوام کیلئے امن نہیں ملا اب چونکہ انتخابی عمل شروع ہونے والا ہے اس لئے اب انہیں خیال آہی گیا ہے کہ امن کا ڈرامہ تو اپنے صوبہ پختون خوار میں پھر بھی چل سکتا ہے ہے تو کیوں نہ یہاں پر اسے تلاش کیا جائے اس لئے لی ڈروں نے واپس اپنے صوبے کا رخ کرلیا ہے اور اب ڈنڈے والی سرکار کے تعاون سے سرکاری جلسے کرائے جارہے ہیں جس میں باوجود کوشش کے چند ہزار لوگ ہی شریک ہوتے ہیں ان جلسوں میں پختون خواروں سے وعدے کئے جارہے ہیں کہ اب انشاء اللہ ہر ماہ آپ کے آگے ہم نظر آئیں گے۔

اپنی زمین پر امن کے دعویداروں نے گذشتہ پانچ سالوں میں اس صوبہ پختون خوار کے عوام کیساتھ کیا ڈرامے کئے یہ زندہ باد مردہ باد کرنے والوں کو بھی پتہ ہے لیکن ان کے عقل پر پردے پڑے ہیں لالٹین والی سرکار اور روٹی کپڑا

اور مکان کے نام پر بے وقوف بنانے والی پارٹیاں ایک مرتبہ نئے ڈرامے کیساتھ پرانے ہدایت کار کے تعاون سے انتخابی عمل کیلئے تیاری کرنے لگے ہیں اور اس عمل میں اب تو سرکاری وسائل بھی استعمال ہو رہے ہیں لیکن ایسے اندھے الیکشن کمیشن میں بیٹھے ہیں کہ ان کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔پختون خوار قوم کے لی ڈر دعوے تو امن کے کرتے ہیں لیکن جتنا اسلحہ یہ لی ڈر اپنے جلسوں میں لاتے ہیں اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلحے کی زور پر یہ یہاں پر امن لائیں گے اپنے ہی لوگوں میں اسلحہ کے زور پر آنیوالوں کو شرم بھی نہیں آتی کہ یہ کس طرح اپنے آپ کو عوام کا نمائندہ لی ڈر کہلواتے ہیں۔اپنوں میں کوئی اسلحہ لیکر آتا ہے اسلاف کے کارناموں پر خوش ہونے اور نسوار کھانے والی اس قوم کو اب جلسوں میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ان کے اسلاف نے دہلی تک فتوحات کے جھنڈے گاڑے تھے اسی ڈرامے پر پختون خوار کے لوگ ٹھمکے بھی لگاتے ہیں حالانکہ سوال یہ ہے کہ گذشتہ پانچ سالوں میں ان لوگوں نے کی کینوں کیلئے کونسے کام کئے ہیں یا اس کے لی ڈروں نے کونسے تیر مارے ہیں لی ڈر اپنے گذشتہ پانچ سال کا " گھوں " آخری چھ ماہ میں صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یعنی پشتو مثل کے مصداق "گھوں کو پیشاب " سے صاف کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں جس کا اندازہ مختلف علاقوں میں جلدی میں شروع ہونیوالے تعمیراتی کاموں سے بھی کیا جاسکتا ہے اب کی بار جلسوں میں بڑے وعدے بھی کئے جارہے ہیں اور اس کی آڑ لیکر طرم خان بھی بن رہے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک ڈرامہ انتخابی عمل کی وجہ سے اخبارات میں بھی چل رہا ہے کہ کسی بھی لی ڈر کی تصویر جس میں وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بات کررہا ہوتا ہے یا پھر کسی درخواست کو دیکھ رہا ہوتا ہے اس کی تصویر اخبار میں چھپ جاتی ہیں اس کے نیچے کیپشن لگا ہوتا کہ موصوف اپنے حلقے کے لوگوں کے مسائل پر اپنے حجرے میں بیٹھ کر ہدایات دے رہے ہیں یا درخواستوں پر عملدرآمد کیلئے مختلف محکموں کو احکامات جاری کررہے ہیں -اب سمجھ میں نہیں آتا کہ بھائی تم کس مرض کی دوا ہو اگر درخواستوں پر
عملدرآمد نہیں کروگے یا مسائل کے حل کیلئے درخواست نہیں دوگے تو کس چیز کے ممبر یا وزیر ہو یعنی اپنا کام کرکے بھی جذباتی قوم کو احسان مند کیا جارہا ہے یہ سلسلہ آج کل بہت زیادہ ہورہا ہے اور ہر حلقے کا وہ ممبر جو پانچ سال سے کہیں پر نظر نہیں آرہا تھا اب تصویروں میں اپنے چند مخصوص چچوں اور کفگیروں کیساتھ دکھائی دے رہا ہے جیسے پانچ سالوں میں ان لی ڈروں نے جن میں ہمارے لالٹین والی سرکار اور شہداء والی پارٹی کے لی ڈر شامل ہیں نے عوام کیلئے بڑے کام کئے ہیں- یہ شکر ہے کہ انتخابات پانچ سال بعد ہورہے ہیں اسی لئے لالٹین والی سرکار سمیت ان کے اتحادیوں کو بھی یاد آگیا کہ یہاں کے عوام کے مسائل بھی ہیں گذشتہ پانچ سال کے اپنے سیاہ کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہے اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ دہشت گردی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا حالانکہ ان میں کچھ

لی ڈر توڈر کی وجہ سے اپنا علاقے چھوڑ گئے اور کچھ لی ڈروں نے قربانی کے لئے ڈنڈے والی سرکار کے لوگوں کو آگے کردیا قربانی تو صوبے کے جذباتی قوم نے دی جبکہ تصاویر لی ڈروں کی چھپتی رہی جو میڈیا میں اعلانات کرتے رہے کہ ہم نے عوام کیلئے بہت کچھ کیا ہے اور دھماکوں میں تباہ وبرباد ہونیوالوں کیلئے لالٹین والی سرکار نے شہد اور دودھ کی نہریں بہادی ہیں جبکہ حقیقت یہیں گذشتہ پانچ سال سے دہشت گردی میں زخمی / جاں بحق ہونیوالوں کی صحیح تصویر قصہ خوانیخودکش حملے میں اپنے ایک آنکھ کی نظر سے محروم ہونیوالے ظفر خٹک ہی بیان کرسکتے ہیں جن میں اتنی ہمت ہے کہ اتنی بڑے نقصان کے بعد بھی صوبے کے عوام کے ساتھ ہونیوالی زیادتی کو صحیح اندار میں بیان کرسکتے ہیں۔

مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا اور بلڈی سویلین

بچپن سے سنتے آرہے تھے کہ زندہ ہاتھی ایک لاکھ کا ہوتا ہے اور مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ لیکن اس مقولے کی سمجھ نہیں آتی کہ کس طرح مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے لیکن اپنے فلاحی اسلامی ملک میں کنٹونمنٹ بورڈ کو چلانے والے بیلٹ والی سرکار کے ریٹائرڈ اہلکاروں کو دیکھ کر اس مقولے کی سمجھ آ گئی ۔ جس سیانے نے بھی یہ مقولہ کہا تھا شائد اسے پہلے سے اندازہ تھا کہ اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری ملک میں کنٹونمنٹ بورڈ بنیں گے اور ان کنٹونمنٹ بورڈ میں ریٹائرڈ بیلٹ والی سرکار کے اہلکار ڈیوٹی دینگے اور اندھے ہونے کے باوجود بھی ان کی اپنی بدمعاشی ہو گی ۔

اس وقت بلوچستان میں خضدار لورالائی ارمارہ کوئٹہ اور ژوب میں کنٹونمنٹ بورڈ ہیں خیبر پختون خوار میں ایبٹ آباد بنوں ڈیرہ اسماعیل خان کوہاٹ مردان نوشہرہ پشاور رسالپور نوشہرہ حویلیاں کالا باغ اور مری گلیات کنٹرونمنٹ بورڈز ہیں پنجاب میں سب سے زیادہ کنٹونمنٹ بورڈ ہیں جن میں اٹک سنجوال بہاولپور چکلالہ گجرانوالہ جہلم کامرہ کھاریاں منگلہ ملتان مری اکاوڑہ راولپنڈی سرگودھا شورکوٹ سیالکوٹ ٹیکسلا لاہور واہ اور والٹن کنٹونمنٹ بورڈز ہیں صوبہ سندھ میں کلفٹن کنٹونمنٹ فیصل کنٹونمنٹ حیدر آباد کنٹونمنٹ

کراچی کورنگی ملیر منوڑہ اور پنوں عاقل شاہ کنٹونمنٹ بورڈ کے علاقے ہیں ملک میں اس وقت 43 کے قریب کنٹونمنٹ بورڈز ہیں جن میں رہائش پذیر لوگوں کیلئے الگ سہولیات ہیں اور ان کو چلانے والے بھی الگ قسم کے لوگ ہیں۔

کچھ دن قبل ڈبگری میں واقع گورنمنٹ گرلز جامعہ سکول کی طالبات نے احتجاج کیا ان کا احتجاج کنٹونمنٹ بورڈ کے خلاف تھا کیونکہ کنٹونمنٹ بورڈ اپنے زیر انتظام مارکیٹ کو دو منزلہ بنانے کیلئے تعمیرات کروا رہی ہیں جس کے باعث نہ صرف وہاں پر طالبات بلکہ سکول کی استانیوں کی بے حرمتی بھی ہورہی ہیں اور کنسٹرکشن مکمل ہونے کے بعد سکول کی عمارت میں گھپ اندھیرا ہو جائیگا جس کے باعث طالبات کو پڑھنے میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اسی کے ساتھ ساتھ مارکیٹ میں تجارتی سرگرمیاں زیادہ ہونے کے باعث یہاں پر لوگوں کی آمد زیادہ ہوگی اور طالبات کو چھیڑنے اور ہراساں کئے جانے کے خدشات بھی ظاہر کئے جارہے ہیں اس صورتحال پر متعلقہ سکول کی طالبات نے احتجاج کیا احتجاج کرنے والی سکول کی انتظامیہ کا موقف بھی ہے کہ اس بارے میں کنٹونمنٹ بورڈ کو آگاہ کیا گیا لیکن شائد وہاں پر اندھے بیٹھے ہیں اس لئے انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔چونکہ یہ اس سکول میں بلڈی سویلین کی بچیاں پڑھ رہی ہیں اس لئے ان کیلئے قانون الگ ہیں اور ان کے سرپر بدمعاشی کرنے والے افسران اور وزراء بھی خاموش ہیں کہ ان کی اوقات اتنی نہیں کہ وہ کنٹونمنٹ بورڈ والوں

سے یہ پوچھ لیں کہ یہ کونسا ڈرامہ ہو رہا ہے۔حالانکہ طالبات کے نام پر تعلیم کے ڈرامے تو یہاں بہت سارے لوگ کر رہے ہیں لیکن جب حقیقت میں صورتحال بنتی ہے تو پھر ان لوگوں کی گھگھی بندھ جاتی ہیں۔

ایک روز قبل کنٹونمنٹ بورڈ کے اہلکاروں نے امریکی قونصل خانے کے باہر بننے والی بلٹ پروف دیوار بھی گرادی بقول ان کے یہ غیر قانونی طور پر بن رہی تھی حالانکہ اس دیوار کو بنے ہوئے بھی کئی ماہ گزر چکے ہیں اب سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کنٹونمنٹ بورڈ کے متعلقہ اہلکار کیا سو رہے تھے یا پھر انہیں "ڈالروں" کی بارش نے اندھا کر دیا تھا جو انہیں اتنی بڑی دیوار نظر نہیں آرہی تھی جو سڑک کنارے بنائے جارہی تھی اگر گرانا ہی تھا تو پہلے ہی گرادیتے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کنٹونمنٹ بورڈ والوں کی بدمعاشی اس شہر میں غریب لوگوں پر ہی چلتی ہیں اور اندھوں کی طرح کام کرنے والے یہ لوگ شائد ڈالروں کی وجہ سے اندھے بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے شہر کے اہم جگہوں پر بدمعاشی کرنے والے کنٹونمنٹ بورڈ کے اہلکاروں کو دیکھا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جن کی موٹاپے کی مثال دی جاتی ہیں اور اسی موٹاپے کی وجہ سے ان اہلکاروں کی آنکھیں ہر وقت بند رہتی ہیں شائد یہ ادارے کا اثر ہے جنہیں بازار میں سڑک کنارے پندرہ سو یا پانچ ہزار روپے کی چھابڑی اور ٹھیلہ تو نظر آتا ہے اور بدمعاشوں کی طرح غریبوں سے ان کی کمائی کی وسیلہ چھین لیا

جاتا ہے اور اگر مزاحمت کرے تو ان غرباء کیساتھ ان کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے زمین کا نظام اللہ سے ان لوگوں سے لیا ہو اور زمین پر خدائی کے دعویدار یہ لوگ ہوں یقین نہیں آتا تو شعبہ بازار سے لیکر صدر روڈ کے مختلف علاقوں میں کی جانیوالی ان کی آپریشن کو دیکھ لیں اندازہ ہو جائیگا کہ کنٹونمنٹ بورڈ والے کتنے غریب دشمن لوگ ہیں - بات ہو رہی تھی مرے ہوئے ہاتھی کی میرا مطلب ہے کنٹونمنٹ بورڈ میں تعینات ریٹائرڈ بیلٹ والی سرکار کی بدمعاشی کی ماشاء اللہ اتنے وسیع اختیارات کے مالک ہوتے ہیں کہ ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی حتی کہ ہمارے نام نہاد لیڈر بھی ان کے سامنے دم نہ ہونے کی وجہ سے سرہلا دیتے ہیں اسی باعث بڑے لیڈر بھی خاموشی سے سر جھکا کے چلتے ہیں کنٹونمنٹ کے زیر انتظام علاقوں میں صفائی کرنے والے سینکڑوں اہلکاروں سے بیگار کیمپ کی طرح کام لیا جارہا ہے ڈیوٹی صبح سات بجے سے شام پانچ بجے تک کی کمینوں سے لی جارہی ہیں اور تنخواہ بھی اسلامی فلاحی عوامی جمہوری ملک کے حکمرانوں کے اعلان کردہ تنخواہ سے کم دی جارہی ہیں لیکن کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کیونکہ یہاں مرا ہوا ہاتھی میرا مطلب ہے کنٹونمنٹ بورڈ سے پوچھنے کی ہمت کس میں ہے کہ ان میں بیلٹ والی سرکار کے ریٹائرڈ ہیں جو مخصوص لوگوں کیلئے "یس سر" اور ہم جیسے " بلڈی سویلین " کو " سوری نو وے " کہتے ہیں - کنٹونمنٹ بورڈ میں " بلڈی سویلین " کیلئے جگہ تو ویسے بھی نہیں ان کی گاڑیوں کو گزرنے کیلئے کیلئے باقاعدہ سٹکرز جاری ہوتے ہیں اگر سٹکرز

نہیں تو پھر کسی کمین کی گاڑی کنٹونمنٹ بورڈ میں داخل بھی نہیں ہو سکتی بھلے سے کچھ بھی ہو جائے۔ کنٹونمنٹ بورڈ میں دی جانیوالی سہولیات سے شہر کے عام علاقوں میں رہائش پذیر کمینوں کو اپنے اوقات کا پتہ چلتا ہے۔

صحافت جو کریا میراثی

آپ کو کبھی زندگی میں یہ تجربہ ہوا ہے کہ آپ ننگے ہوں اور آپ کے بچے بھوکے ہوں لیکن پھر بھی آپ کے پاس کروڑوں روپے کی رقم ہو جسے آپ عیاشی کیلئے دوسروں کو استعمال کرنے دیں کہ خیر ہے میں ننگا اور میرے بچے بھوکے سہی لیکن دوسرے لوگ عیاشی کرے اور جو مرضی آئے کریں اس طرح کا اگر کوئی اقدام اٹھاتا بھی ہے تو آپ کے ذہین میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو اس طرح کام کرنے والا کوئی پاگل ہے یا پھر بہت زیادہ عیاش کہ اسے اپنے ننگے پن اور بھوک کا احساس نہیں لیکن دوسروں کو عیاشی کیلئے رقم دے رہا ہے۔ یقینا آپ کیلئے میری باتیں سمجھ میں نہ آنیوالی والی ہونگی لیکن اس بات کی وضاحت میں آپ کو اس صورتحال سے کرنا چاہوں گا کہ حال ہی میں صوبہ محکمہ اطلاعات نے صوبے کی اہم صحافیوں پر مشتمل وفد کو دورہ کروایا۔ صحافیوں پر اعتراض کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں نہ تو ہماری اوقات اتنی ہے نہ ہم "بارہ سال "میدان میں رہنے کے باوجود "سینئر کی فہرست" میں شامل ہوسکے۔ لیکن اتنی جسارت تو کرسکتے ہیں یقینا میری یہ جسارت میرے بہت سارے ساتھیوں کو ھضم نہیں ہوگی کیا واقعی اس صوبے میں امن و امان کی صورتحال ابتر ہے ہمارے صوبے کے کی کمین جسے عوام بھی کہا جاتا ہے کی حالت ابتر ہے اور ان حالات میں ہم صحافیوں پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہیں۔

ہمارے ہاں ہر ایک کے پاس اختیار ہے ہر کوئی اپنا اختیار استعمال کرنا چاہتا ہے وزیر سے لیکر صحافی تک ہر شعبے کے لوگ اپنے اختیارات استعمال کرتے ہیں کچھ کے پاس اعلی اختیارات ہوتے ہیں لیکن یہ اختیارات کی کمینوں کے بجلی پانی گیس سمیت مختلف مدات میں لی جانیوالی ٹیکسوں سے جمع ہونیوالی رقم پر ہر کوئی استعمال کرتا ہے مخصوص صحافیوں اور کالم نگاروں کیلئے کوئی اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے رقم مختص کرتا ہے کہ یہ رقم متعلقہ محکمے کے وزیر اپنے اعلی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے دی جارہی ہیں راقم سمیت ہر کوئی اس رقم کیلئے خوش ہوتا ہے کہ چلو "مفت" میں شوڑا ہاتھ آرہا ہے لیکن کیا یہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں ۔کوئی یہ پوچھنے کی جرات ہی نہیں کرتا کہ بھائی میرے کیا یہ رقم وزیر صاحب اپنے جیب سے دے رہے ہیں یا پھر کی کمینوں کے ٹیکسوں سے جمع ہونیوالی رقم ہیں ۔لالٹین والی سرکار کے دور میں بم دھماکوں میں خوار ہونیوالی کی کمینوں کا خون چوسنے کے مترادف نہیں کمی کمینوں کے ٹیکسوں پر پلنے والے وزراء کو دیکھ کر اگر گھن آتی ہے تو ان سے زیادہ گھن اپنے صحافی برادری کے کارناموں پر بھی آتی ہے کہنے کو تو ہم میں ہر کوئی پاکباز بنتا ہے لیکن مفت کی مے دیکھ کر جس طرح قاضی کی رال ٹپکتی ہے اس طرح ہمارے صحافی بھی رال ٹپکانے سے باز نہیں آتے ۔

بات کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے ہماری خیبر پختون خوار میں محکمہ اطلاعات

واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کی ویب سائٹ آن لائن نہیں اسی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کر کیا رہا ہے ہاں اس کی اہمیت اسی وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ سرکار کے گھوں کو پیشاب سے صاف کرنے والے اسی ڈیپارٹمنٹ میں یہاں تعینات ہوتے ہیں اور ان کی اتنی بدمعاشی ہوتی ہے کہ اس کے زور پر اخبار کے مالکان کو اسی وزارت سے تعلق رکھنے والے لوگ بدمعاشی دکھاتے ہیں کہ اگر سرکار کی مدح سرائی نہیں کروگے تو اشتہارات نہیں ملیں گے اگر کمی کمینوں عرف عام کے عوام کی صحیح بات اپنے اخبار میں لکھوگے تو پھر بھی اشتہارات تم پر بند ہیں اور اگر صحافت کے نام پر سرکار کیلئے پالش اور مکھن باری کرینگے تو پھر سب کچھ ہیں اسی باعث بڑے بڑے طرم خان صحافی جو آج کل ایڈیٹر بھی ہیں اسی ڈیپارٹمنٹ میں آتے جاتے ہر ایک کو" سلام صاحب جی " کرتے نظر آتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے خیبر پختون خوار میں صحافیوں کے حقوق کیلئے آوازیں بھی بڑی اٹھتی ہیں کیونکہ اب تو اس کا ٹرینڈ چل رہا ہے لیکن حقیقت میں کیا ہے اس کا اندازہ بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ پشاور سے چھپنے والے مختلف اخبارات کے صحافیوں کو تین تین ماہ سے تنخواہیں نہیں مل رہی یہ تنخواہیں بھی چھ سے دس ہزار کے مابین ہیں کیا یہ محکمہ اطلاعات کا کام نہیں کہ ان اخبار کے مالکان پر زور دیں کہ اپنے ملازمین کو تنخواہیں ادا کرے اور اگر مالکان تنخواہیں ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تو کیا محکمہ اطلاعات کو صحافیوں کے نام پر ملنے والے فنڈز میں صرف یہاں پر تعینات اہلکاروں کا حصہ ہے یا پھر ایسے لوگوں کا جو

صبح و شام یہاں پر آ کر "صاحب سلام ہے" کرتے نظر آتے ہیں۔ ویسے تو یہ بھی خیبر پختون خوار کی محکمہ اطلاعات کا کمال ہے کہ ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں سسر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے تو اس نے اپنے داماد کو بھی تعینات کیا داماد نے آگے اپنے ایک اور کزن کو نوکری دی ہیں یعنی ایک ڈیپارٹمنٹ میں چلنے والے معمولی سی ریڈیو چینل پر خاندانی لوگ قابض ہیں اور کمی کمینوں کا ٹیکس ایک ہی خاندان میں جا رہا ہے کیا پختون خوار ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہے اور اس میں ایک اور ڈرامہ کہ جہاں پر صحافیوں کی تربیتی پروگرام ہوتا ہے وہاں پر سسر صاحب سرکار کی ڈیوٹی کے بجائے تربیتی سیشن میں دکھائی دیتے ہیں کہ شائد تربیت لینے کے بعد وہ بھی صحافی بن جائے حالانکہ ان کی تربیت ہماری بیلٹ والی سرکار سے بھی زیادہ ہوئی ہے اور یہ لوگ "لیس سر" جی سر" کرنا ہی جانتے ہیں صحافت ان کی بس کی بات نہیں۔

کرائے کے مکانات میں رہنے والے پشاور کے صحافیوں کیلئے سابق وزیراعلی اکرم درانی نے میڈیا کالونی کا اعلان کیا تھا صحافی برادری اس کی مشکور ہیں کیونکہ راقم سمیت بیشتر صحافی جسے ہمارے ہاں "خشاکیان" بھی کہا جاتا ہے کرایوں کی وجہ سے خوار ہوتے ہیں لیکن لالٹین والی سرکار کی وجہ سے اب یہ میڈیا کالونی ہمارے گلے کا طوق بن گیا ہے کیونکہ پانچ سال سے اس پر تعمیراتی کام نہیں کیا جارہا اور گذشتہ پانچ سالوں سے خشاکیانو کو احسان

تلے دبایا جارہا ہے کہ کمی کمینوں کیلیئے لکھنے والے "میراثیوں" اگلے مزید پانچ ہماری مدح سرائی کروگے تو تب ہی تم لوگوں کی کالونی کیلیئے رقم مختص کی جائیگی اور اس پر تعمیراتی کام ہونگے یقینا ہماری صحافی۔برادری کو لفظ میراتی پر غصہ بھی آئے لیکن صحافت تو اب کہیں پر ہو نہیں رہی اب تو ہم لوگوں خصوصا ایلیٹ کلاس کو خوش کرنے والے اداکار ہیں اور لوگوں کو خوش کرنے والوں کو عرف عام میں یا تو جوکر کہا جاتا ہے یا پھر میراثی اب یہ ہماری۔برادری اپنے کام سے فیصلہ کرے کہ وہ صحافی ہے جوکر ہے یا میراثی -

معذور قبائلی طالب علم کا دکھ

اس نے نوماہی امتحانات کیلئے خوب تیاری کی تھی اور آج اس کا دوسرا پیپر تھا صبح جب وہ سکول آرہا تھا تو اس کی والدہ نے اسے ہدایت کی تھی کہ بیٹا حالات خراب ہے اور خیال سے سڑک پار کیا کرو اپنے علاقے میں امن وامان کی ابتر صورتحال کی سوچ لئے تیرہ سالہ طالب علم نے پیپر جلدی جلدی مکمل کیا اس کے ذہن میں تھا کہ آج میں گھر جا کر اپنی بے بے کو بتادونگا کہ بے بے تمھارا بیٹا کتنا لائق ہے کہ وقت سے پہلے ہی پیپر مکمل کرکے گھر واپس آیا اپنے استاد کو امتحانی پیپر دینے کے بعد اس نے اپنے ساتھ والے دوست کو ہاتھ سے مسکرا کر اشارہ کیا کہ میں نے تمام سوالات کے جوابات لکھ کر دیدیئے ہیں اور اب گھر جارہا ہوں دوست نے اسے اشارہ میں بتادیا کہ باہر جا کر رک جائو ساتھ ہی جائیں گے لیکن اس کے ذہن میں گھر جا کر فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا اور اسی شوق کی خاطر اس نے اپنے ساتھی کا انتظار نہیں کیا اور روڈ پر آکر گاڑی کا انتظار کرنے لگا کہ اس دوران دھماکہ ہوگیا جس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو درد کی لہریں اس معصوم کے دونوں پائوں سے اٹھ رہی تھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پائوں کو کاٹا گیا ہوں اس نے اپنے پائوں کو حرکت

دینے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا اس نے سرہانے اپنے بڑے چچازاد ہدایت اللہ کو دیکھا جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظریں پڑتے ہی ہدایت اللہ نے آنکھیں چرالیں جس کی وجہ سے اس معصوم کی حیرانی ہوئی کہ کیا ہوا ہے اس نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن بیڈ کیساتھ کھڑی نرس نے اسے اشارہ کیا کہ نہ تو بات کرو اور نہ ہی اپنے جسم کو حرکت دو۔جس کے بعد اس نے بیڈ پر پڑے اپنے جسم کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کفن کی طرح سفید چادر اس کے جسم پر پڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اپنے جسم سے یہ سفید چادر ہٹا کر دیکھ لیں کہ اس کے پاؤں کو کیا ہوا لیکن اس نے کوشش کرکے ہاتھ سے اپنے جسم پر پڑے چادر کو ہٹایا تو اپنے پاؤں کو دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہوگیا۔

یہ کہانی تیرہ سالہ اس معصوم طالب علم کی ہیں جو جمرود بازار میں ہونیوالے کار بم دھماکے کا نشانہ بنا گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول نمبر 1 جمرود کا چھٹی جماعت کا طالب علم حضرت اللہ پرچہ دیکر سکول سے گھر جانے کیلئے نکلا وہ جمرود بازار کے بس سٹاپ پر پہنچا اور بس کا انتظار کرنے لگا بس تو نہ آئی لیکن بم دھماکے نے ایک لمحے میں حضرت اللہ کے خواب چھین لئے بم دھماکے کا نشانہ بننے کے بعد اسے ہسپتال پہنچادیا گیا اور اب ہسپتال میں اس کے علاج پر تعینات ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا دایاں پاؤں مکمل طور پر ناکارہ ہو

چکا ہے جس کی بنیادی وجہ بارودی مواد میں پڑے شیل نے اس کے پاؤں کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تیرہ سالہ حضرت اللہ کو فٹ بال کھیلنے کا جنون ہے اس کے چچازاد ہدایت اللہ کے مطابق وہ سکول سے واپس آنے کے بعد سارا وقت فٹ بال کھیلتا رہتا تھا اور اب ہسپتال کے بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے حضرت اللہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اب وہ کبھی فٹ بال نہیں کھیل سکے گا۔ حضرت اللہ کے والدہ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ لے گا تو اس کے معصوم بچے کی زندگی اچھی ہو جائیگی انتہائی غربت میں تعلیم دینے والے اس خاندان کے لوگوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا ۔ کہ اس طرح کا واقعہ ان کے بچے کیساتھ پیش آسکتا ہے

ہسپتال میں اس کے رشتہ داروں کو اب یہ غم کھایا جارہا ہے کہ کہنے کو تو مریضوں کو مفت سہولیات دی جاتی ہیں لیکن گذشتہ دو دنوں میں ہسپتال انتظامیہ نے دوائیوں کے چٹ لکھ لکھ کرانہیں جس ذہنی تناؤ کا شکار کردیا وہ انہیں پتہ ہے کیونکہ حضرت اللہ کو لگائے جانیوالے ڈرپ مارکیٹ سے لائے جارہے ہیں جس کی ادائیگی بھی اس کے رشتہ دار کررہے ہیں یہی سلسلہ صرف حضرت اللہ کیساتھ نہیں بلکہ جمرود بم دھماکے میں زخمی ہونیوالے ہر قبائلی کیساتھ ہورہا ہے ہسپتال کی انتظامیہ انہیں اس ہدایت کیساتھ کہ ہسپتال کے سامنے فلاں میڈیسن کی دکان سے یہ دوائی لے کر آجاؤاور یہ معصوم لوگ کبھی اپنی

جیب کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے مریض کو لیکن مریض کی حالت کو دیکھ کر سب کچھ بھول کر دوستوں رشتہ داروں کو فون کرکے قرض پیسے منگواتے ہیں کہ ان کے پیارے ہسپتال میں پڑے ہیں اور ان کے علاج کیلئے پیسے درکار ہیں۔اور روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ دینے والے لوگوں سمیت اپنی زمین پر اپنی بدمعاشی کے نعرے دینے والوں نے تو صحت کی بنیادی سہولیات کی فراہمی کا وعدہ نہیں کیا تھا اس لئے یہ سہولت انہیں نہیں مل رہی ۔ زبانی جمع خرچ کے مصداق یہاں پر ہر کوئی قبائلیوں کو اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری مملکت پاکستان کے بغیر تنخواہ کے سپاہی کہتے ہوئے تھکتے نہیں لیکن ان کیلئے آج تک کیا ہوا آغاز میں ان کے مخصوص ملکان کو پگڑیاں پہنا کر جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے والے قبائلی عوام کو ترقی کے عمل سے روکا گیااور انپر "چوری کرے مونچھ والا اور پکڑا جائے داڑھی والا" قانون لاگو کیا گیا اور ابھی تک یہ لوگ ایف سی آر کے کالے قانون کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔

دکھ اس بات کا نہیں کہ انہیں تعلیم و ترقی کے مواقع نہیں دیئے جارہے بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ آج بھی ان کیساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک کیا جارہا ہے اور ان پر احسان بھی جتایا جارہا ہے آج اگر ایک حضرت اللہ اپنے پاؤں سے محروم ہوگیا تو اس کا ذمہ دار کون ہے یہ وہ سوال ہے کہ جو حضرت اللہ اور اس جیسے لاکھوں قبائلی کرنا چاہتے ہیں پہلے ان کو قومی مفاد کے نام پر جہاد کے

نام پر مروایا گیا جب ان قبائلیوں میں دم خم نہ رہا تو پھر باہر سے اس وقت کی حکمرانوں نے جہاد کیلیئے امریکی ڈالروں کے زور پر کرائے پر جہادی منگوا لئے جب ہ سرخ ریچھ کے خلاف لڑ رہے تھے تو اس وقت جہاد تھا لیکن آج اگر یہی لوگ ان کے خلاف ہو گئے ہیں تو پھر یہ لوگ "دہشت گرد" بن گئے قبائل کا صرف جرم اتنا تھا کہ ملک صاحبان کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس وقت بھی کچھ نہیں کہا تھا اور آج بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں پہلے بھی ان کی اوقات نہیں تھی اور آج بھی نہیں ہے اگر آج بھی یہ آواز اٹھاتے ہیں تو پھر بھی یہ لوگ دہشت گرد قرار دیئے جاتے ہیں قبائلی دھماکوں میں مر رہے ہیں یا پھر اپنی جسمانی اعضاء کھو رہے ہیں لیکن فائدہ اس وقت بھی حکمرانوں کو تھا اور آج بھی حکمرانوں کو ہے۔

حضرت اللہ کے معذوری کا ذمہ دار کون ہے جہادی دہشت گرد یا حکمران اس کا سوال حضرت اللہ کے خاندان کو کون دے سکتا ہے اگر آج حضرت اللہ کی ماں رو رہی ہے تو یقینا کل بہت ساروں کی مائیں روئیں گی ان میں ایسوں کے رشتہ دار بھی روئیں گے جن کے جہاز ہوا میں اڑ گئے تھے اور پھر ان کی قبروں میں کسی کی ہاتھ اور کسی کا پائوں رکھ کر جنازہ کرنا پڑا اگر ہم اس دکھ کو سمجھ لیں تو شائد ہمارے بہت سارے دکھ ختم ہونگے۔

قصہ خوانی کا دکھ

جو ماں اپنے بیٹوں کے خون سے لہو لہو کردی گئی ہو اس کا دکھ کیا ہوتا ہے کاش تم لوگ سمجھ سکو اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والو دھرتی) ماں (کا دکھ کیا ہوتا ہے اس ماں سے پوچھو جو اپنی ہی بچوں کی خون سے لت پت کردی گئی ہو زمین بھی ماں ہی ہوتی ہے اور ماں کو بچوں کے خون سے رنگین کرنے والا بہت ہی ظالم ہوتا ہے ۔ اے لوگو! اپنے آپ کو انسان کہلوانے والو کیا تم میں احساس نام کی کوئی چیز موجود ہے کہ نہیں ۔ کہنے کو تو مجھے قصہ خوانی کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن اب اتنا خون میرے اطراف میں گر گیا ہے کہ شائد آنیوالی نسلیں قصہ خوانی کے بجائے " خون خوانی" کے نام سے مجھے پکاریں اور یاد کریں ۔اے اس شہر کے باسیو ! تم نے میرا دامن لہو لہو کردیا ہے ۔ تم لوگ کہتے ہوں کہ دھرتی ماں ہوتی ہیں لیکنکون اپنے ماں کو لہو لہان کرتا ہے یہ اعزار بھی تم لوگوں کو حاصل ہے اپنی نصاب کی کتابوں میں تم لوگوں نے میری اعزار میں بڑی باتیں لکھی ہیں مجھے و قصہ گو کا بازار کہلواتے اور لکھتے ہو۔ نصاب میں اس بازار سے متعلق بڑی بڑی تاریخی باتیں لکھی ہیں ۔

پہلے بھی اس بازار ہیں دنیا بھر سے تاجر کاروبار کیلئے آتے تھے جو بازار میں

واقع سرائے میں رات گزارتے رات کے اندھیرے میں آگ کی روشنی میں بیٹھ کر داستانیں سنتے اور سناتے ان کی محبت بہار مذہب اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل ہونے کی کہانیاں ہوتی تھی اسی دوران وہ قہوہ بھی پیتے اور انہی کہانیوں کے دوران ان کے تعلقات دوستیاں بنتی اسی رابطوں اور قصوں کی وجہ سے میرا نام یعنی قصہ خوانی بازار کا نام بھی چہار سو پھیل گیا دنیا کے کونے کونے سے لوگ اس بازار کو دیکھنے کیلئے آتے یہاں سے جانیوالے دوبارہ یہاں آنے کی دعائیں مانگتے کہ قصہ خوانی بازار میں تھڑے پر بیٹھ کر ایک دوسرے کیساتھ مل بیٹھ کر بات گپ شپ کرینگے قہوہ دوستوں کیساتھ پی لینگے اسی بازار میں تھڑوں پر بیٹھ کر لوگوں نے ایک دوسرے کیساتھ رشتہ داریاں بھی کی یہاں پر رہنے والوں کے کاروبار دیانتداری محبت ایمانداری کی مثالیں دی جاتی تھیں ایک عالم میں میرے بازار کا شہرہ تھا۔

اے میرے شہر کے رہنے والو! بغداد بصرہ روس سے لیکر چین تک کے لوگ اس شہر کے لوگوں کی محبت بہادری کی داستانیں سناتے تھے تم لوگوں کی پختون ولی مہمانداری کی مثالی دی جاتی تھی اس وقت بازار میں دکانیں بھی کچی مٹی کی بنی ہوتی تھیں اور ساتھ میں کچے گھر بھی اسی طرح کے تھے پیسہ بھی نہیں تھا لیکن ایک دوسرے کیساتھ محبت اخلاص اور رواداری تھی مہمانوں کیساتھ اچھا سلوک ہوتا تھا اے میرے شہر کے لوگو! تم لوگوں کو کیا ہوگیا جب اس زمین پر

انگریز کے دور میں گولیاں برسائیں گئ تو تم لوگ ہندو سکھ اور مسلمان کے چکر میں نہیں پڑے تھے تو کیسے بغیر کسی مذہبی تفریق کے ایک دوسرے کی مدد کیلئے کیسے آگے آئے تھے ہر کوئی اپنے مذہب میں خوش تھا اس دور میں دوسروں کی مذہب مسلک اور رائے کا احترام ہوتا تھا اس وقت تم لوگوں میں اتنی تعلیم نہیں تھی لیکن تم میں شعور تھا ایک دوسرے کو برابر رتبہ دینے کا لیکن!

اے میرے شہر کے لوگو آج تمھیں کیا ہوگیا آج اس بازار میں بلکہ شہر میں روشنیاں تو بہت ہیں لیکن تم لوگوں کے دلوں میں اندھیرا ہے آج تو تم لوگوں نے بازار میں شہداء کی یاد میں یادگاریں بھی بنادی ہیں لیکن جو خون تم لوگ ابھی بو رہے ہو اس کی یادگاریں کیا تمھاری آنیوالی نسلیں بنائیں گہ کیسے اس دور کے رہنے والوں نے ایک دوسرے کی گلے کاٹے کیا تم لوگ محبت کا آفاقی پیغام بھول گئے ہو کیا تم لوگ اسلام کا وہ راستہ بھول گئے ہو جس کی روشنی میں سارے پختون مسلمان ہوئے تھے مجھ سمجھ نہیں آرہا تھی تم لوگوں کو خون کی کونسی بیماری لگ گئی ہیں تم لوگ آئے روز میرے ہی اس بازار کو خون میں نہلاتے ہو اور یہ صرف میرا نہیں بلکہ پورے شہر صوبے میں خون گرانے کا یہی سلسلہ جاری و ساری ہے تم لوگوں کی دشمنیوں کے بھی کوئی اصول ہوتے تھے لیکن آج تم نہ جانے کس جرم کی سزا اپنے آپ کو دے رہے ہو یا یہ سزا مجھے دے رہے ہو کہ اس شہر میں ہر جگہ خون کا بازار گرم ہے کیا یہ کسی انسان کا خون نہیں جس

کے بارے میں کہا گیا کہ جس کسی نے ایک بے گناہ نسان کو قتل کیا تو گویا اس نے
- پوری انسانیت کو قتل کیا کیا تم لوگ اللہ کے احکام بھی بھول گئے ہو
اے میرے شہر کے لوگو ! دنیا کتنی خوبصورت ہے اس کا مزہ کیا ہے تم لوگوں کی بھی
آنکھیں ہیں لیکن تم نے اپنے آپ مفاد کیلئے اندھا کر دیا ہے اور اس اندھے پن میں
تمھیں دنیا کی خوبصورتی کا اندازہ نہیں ہو رہا - دنیا کے مزے اور خوبصورتی کا پتہ اس شخص
سے پوچھ لو جو قریب المرگ ہو اور اس نے بھرپور زندگی گزاری ہو میرے اس شہر میں
رہنے والا ہر کوئی زندہ رہنا چاہتا ہے اسکے مزے اور اس خوبصورتی سے لطف اندوز ہونا
چاہتا ہے اے اس شہر کے لوگو تم لوگ میرے لئے بچوں کے برابر ہو کیونکہ میں نے
اپنی زمین تم لوگوں کیلئے کھول دی ہیں میری ایک بات سن لو یہاں ہر کوئی یہ سمجھتا ہے
کہ دوسرا شخص مرے گا اور میں بچ جاؤں گا لیکن دنیا کا چکر گول ہے جو بھی اس چکر میں
آیا ہے اسی چکر میں گھومتے ہوئے اپنی زندگی کا وقت پورا کر کے چلا گیا اور سپرد خاک
ہو گیا- تو وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے تم دوسرے کا خون بہانے پر لگے ہو اور ایک
دوسرے کو گولیوں بموں چھریوں کے وار سے مار رہے ہوں کیا تم لوگ ایک دوسرے
کے حصے کا رزق لینے کی چکر میں ہو وہ رزق جس کا ذمہ اللہ تعالی نے لیا ہے طاقت پیسے
اور اپنے نام کیلئے کیسے اللہ تعالی کی مخلوق کا خون بہا رہے ہو اپنی من مانیاں کرنے کیلئے
- دوسروں کو کتنا دکھ دیتے ہو

اے میرے شہر کے لوگو اور میرے بچو اپنے ارد گرد دیکھ لو کتنی بے سکونی ہے اس شہر میں ہر کوئی اپنی حیثیت پر قانع نہیں دوسروں کا حق مار کر سکون تو ملنے سے رہا خدا کیلئے ایک دوسرے سے محبت بڑھاؤ ایک دوسرے کا گلہ مت کاٹو ابھی بھی تم لوگوں کا دنیا بھر میں مذاق اڑایا جارہا ہے کہ کس طرح ایک دوسرے کو کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں اب سنبھل جاؤ کہ بھائی اپنے بھائی کو بموں سے نہیں اڑاتا۔

پریس کلب سیاست اور صح آفت

او ہو بھائی کیا حال ہے بہت دن بعد آپ سے ملاقات ہوئی یار آپ تو کسی کا پوچھتے ہی نہیں اپنے ووٹ میں مجھے یاد رکھنا انشاء اللہ آپ کیلئے بہت کچھ کرونگا یہ وہ باتیں ہیں جو گذشتہ دنوں پریس کلب کے انتخابات کے موقع پر راقم سمیت بہت سارے صحافیوں کو پریس کلب میں داخلے کے موقع پر سننے کو ملی پورے سال میں صرف ایک ہی دن ہے جس دن ممبران کو وی آئی پی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں ووٹ ہوتا ہے جسے امیدوار اپنے حق میں لینے کیلئے بہت ساری ایسی باتیں بھی کرتا ہے جو وہ عام حالات میں نہیں کرتا اور یہی ایک دن ہوتا ہے جس میں تمام صحافیوں کو ملنے کا موقع بھی ملتا ہے اور اس دن بڑا کھانا بھی ہوتا ہے اور ہر صحافی پریس کلب کے انتخابات والے دن اپنے آپ کو وی آئی پی سمجھتا ہے جبکہ راقم کی طرح خشاکیان سمجھنے والے بہت سارے صحافیوں کو عزت مل جاتی ہیں جس کا عام دنوں میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صحافی عام لوگوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی معلومات رکھتے ہیں جس کی بنیادی وجہ اپنے شعبے سے وابستگی اور حالات حاضرہ پر نظر رکھنا ہے اسی باعث ملک میں سیاسی فضاء میں صحافی عام لوگوں سمیت سیاستدانوں پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں کہکمی کمینوں کے پاس عقل عام کی کوئی چیز نہیں اور ہر دفعہ ایسے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جن سے انہیں کچھ نہیں

ملتا اور سیاستدان ایسے ہیں کہ انتخابات والے دن لوگوں کے گلی محلوں میں نظر آتے ہیں اس بارے میں کارٹون بھی چھپتے ہیں جس میں سیاستدانوں کو لتاڑا جاتا ہے لیکن اپنے انتخابات کے موقع پر ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں انہیں اپنا غلط بھی نظر نہیں آتا اور بہت ساری ایسے کام ہوتے ہیں جنہیں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا اس صورتحال کا اندازہ راقم کو انتخابات والے دن امیدواروں حامیوں اور ووٹروں کے مابین جھگڑے سے ہوا جو گالی گلوچ یہاں پر دیکھنے کو ملا اس سے اندازہ ہوا کہ اپنے آپ کو آسمان پر سمجھنے والے صحافی بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں ۔ باہر سے صاف نظر آنے والے صحافی کتنی گل ۔ افشانی کرتے ہیں اس کا اندازہ اگر کسی نے کرنا ہے تو وہ پریس کلب آکر دیکھ لے

پریس کلب صحافیوں کیلئے گھر اور ایک ادارے کی حیثیت رکھتا ہے یہ واحد جگہ ہے جہاں پر مختلف النوع شعبوں سے تعلق رکھنے والے صحافی ایک دوسرے کیساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگاتیمیں اور مختلف خبروں کا تبادلہ بھی کرتے ہیں جبکہ عام لوگ اور سیاسی ورکرز اپنے خبروں کی اشاعت کو یقینی بنانے کیلئے پریس کلب میں پروگرام کرتے ہیں جس سے جہاں ان کی خبریں بہتر اور تمام اخبارات میں چھپ جاتی ہیں وہیں پر صحافیوں کو بھی اپنے گھر پر خبریں مل جاتی ہیں تاہم اس کیلئے مخصوص صحافی ہوا کرتے ہیں جو باقاعدگی سے پریس کلب میں آتے ہیں اور مختلف پروگراموں کی کوریج کرتے ہیں جبکہ دیگر شعبوں میں کام کرنے والے

صحافی یہاں آکر انٹرنیٹ کی سہولت سمیت دوستوں سے رابطوں اور دوپہر کے کھانے کیلئے بھی اسے استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ اسے اپنے منفی مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں - بات ہو رہی تھی پریس کلب کے انتخابات کی جس طرح کے منفی پروپیگنڈے سیاستدان اپنے مخالفین پر کرتے ہیں اسی طرح کے ڈرامے پریس کلب کے انتخابات کے دوران دیکھنے کو ملتی ہیں ایک دوسرے کیساتھ ہر مشکل میں کام آنے والے صحافی کیسے اپنے ساتھیوں کے پیٹ میں چھرا گھونپتے ہیں ووٹروں کو اپنی جانب راغب کرنے کیلئے ایسی ایسی باتیں سننے کو مل جاتی ہیں جس سے بہت سارے صحافیوں کی ماضی کا بھی پتہ چلتا ہے افسوسناک امر یہ ہے کہ انتخابات والے دن مختلف امیدوار اور ان کے ساتھی دست و گریباں بھی ہو جاتے ہیں جس کے اثرات بعد میں نکلتے ہیں - ان اثرات میں مخالف گروپ سے تعلق رکھنے والے ممبران صحافیوں پر تربیتی پروگراموں میں مواقع نہ دینا سمیت مستحق صحافیوں سالانہ گرانٹس میں مشکلات پیدا کرنا اور بعض اوقات ساتھیوں کو بیروزگار کرنے کی کوششیں بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے بہت سارے صحافی براہ راست کسی سے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ -اگر ان دنوں میں کسی سے رابطہ کر لیا تو پھر مستقبل میں مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جس طرح ہمارے دیگر شعبے استعمال ہوئے وہیں اسی کی وجہ سے بہت سارے اداروں کی توجہ خشاکیانو) میرا مطلب صحافیوں (کی طرف بھی

مبذول ہو گئی ہیں اسی باعث بہت سارے این جی اوز نے پروپوزل بھیج کر خشاکیانو کے نام پر فنڈز بھی حاصل کرلئے ہیں کہ خشاکیانو کی تربیت ضروری ہے اسی کی آڑ میں بہت سارے منظور نظر لوگ ٹریزز بن گئے ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں خشاکیانو کو تربیت دے رہے ہیں عجیب ڈرامہ یہ ہے کہ ایسے ایسے لوگ ٹریننگ دے رہے ہیں جو کسی زمانے میں سیاسی لوگوں کے پی آر اوز بنے ہوئے تھے اور یہ سلسلہ پورے پاکستان میں جاری ہے سب سے اذیت ناک چیز یہ ہے کہ تربیت لینے والے بھی مخصوص صحافی ہی ہوتے ہیں یعنی جو پریس کلب میں روزانہ آکر "صاحب جی" سلام کرتے ہیں اور یہ وہی صحافی ہی ہیں جنہیں صحافیوں کی سیکورٹی کی ٹریننگ سے لیکر کمپیوٹر ٹریننگ تک کیلئے منتخب کیا جاتا ہے راقم نے ایسے صحافی بھی ٹریننگ میں دیکھے ہیں جنہیں کمپیوٹر کھولنا بھی نہیں آتا لیکن انہیں کمپیوٹر سیکورٹی کے ٹریننگ میں بٹھا دیا جاتا ہے کیوں کہ وہ مخصوص لوگوں کے رشتہ دار ساتھی یا پریس کلب کے انتخابات میں سپورٹ کرنے والے ہوتے ہیں یا پھر ایسے لوگ تربیت لیتے ہیں جنہیں تیل لگانے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے تربیت لینے والے صحافی فیلڈ میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں ۔جس طرح شعبہ سیاست نے ملک کا بیڑہ غرق کیا ہے اسی طرح ہمارے شعبے میں ہونیوالے سیاست نے صحافیوں کی آپس کے رشتے دوستیاں ختم کردی ہیں مخصوص صحافی اپنے سیاسی مذہبی نظریات ہر جگہ پر تھوپتے نظر آتے ہیں اور انہیں سپورٹ بھی مخصوص لوگ ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ

جیلسی)حسد(تو ہر ایک شعبے میں زیادہ ہے لیکن اپنے صحافت میں جتنی جیلسی اور منافقت ہیں وہ کہیں پر بھی نہیں۔

جس طرح شعبہ سیاست میں ووٹ لینے کے بعد کمی کمینوں کی اوقات ختم ہوجاتی ہیں اور انہیں پانچ سال کیلئے پوچھا نہیں جاتا اسی طرح پریس کلب کے انتخابی عمل پورا ہونے کے بعد صحافی ایک سال کیلئے کمی کمینوں سے بدتر ہوجاتے ہیں اور ان کی اوقات نہیں رہتی لیکن اگر ہمارے صحافی عوام کو تلقین و نصیحت کے بجائے اپنے آپ کو ٹھیک کرتے ہوئے صحافت سے سیاست کو دور کریں اور تعلق.برادری کے بجائے میرٹ پر ووٹ دیں اور انتخابی عمل پر سیاست نہ کرے تو یقینا راقسمیت بہت سارے خشاکیانو کی حالت بہتر ہوسکے گی اور ان کے کام بھی میرٹ پر ہونگے ساتھ میں صحافیوں کی تعلقات خراب نہیں ہونگے خصوصا انتخابات کے دنوں سے لیکر عام دنوں تک۔

تپ دق اور کرائے کی بلڈنگ

خدا کیلئے کسی ماہر ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کراؤ گذشتہ ایک ماہ سے مسلسل ہونیوالی کھانسی نے ہمیں بھی متاثر کیا پتہ نہیں تمھیں کیا بیماری ہے لیکن ہمیں تو بیمار مت کرو یہ وہ مکالمہ ہے جو ہمارے ایک دور کے رشتہ دار کو اس کی بیگم کہہ رہی تھی جبکہ مسلسل بخار اور کھانسی کی کیفیت میں مبتلا وہ صاحب اپنی بیگم کو کہہ رہے تھے بیگم تمھیں پتہ ہے کہ میں صبح کام کیلئے جاتا ہوں اور شام تک دکان پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے مجھے ڈاکٹر کیلئے وقت نہیں ملتا اب میں کیا کروں ان دونوں کی باتیں سن کر راقم نے اپنے رشتہ دار کو مشورہ دیا کہ جا کر کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کرواؤ لیکن پھر بھی اس نے بات نہیں مانی دو دن بعد راقم نے دوبارہ رشتہ دار سے رابطہ کیا اور پوچھا تو انکار پر خود اسے لیکر ہسپتال پہنچ گیا جہاں پر ڈاکٹروں نے اس کے ٹیسٹ کئے اور پتہ چلا کہ اسے ٹی بی کی بیماری ہے جو کہ ابتدائی سٹیج میں ہے جس کیلئے اس نے ادویات کھانا شروع کردی اور مسلسل علاج کے بعد ٹی بی کا وہ مریض آج کل بھرپور صحت مند زندگی گزار رہا ہے۔ یہ واقعہ تقریبا دس ماہ قبل کا ہے جب راقم اپنے رشتہ دار کے ہاں ملنے کیلئے گیا اور وہاں پر ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا اور بعد میں اس طرح کی صورتحال سامنے آئی۔

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ صحت کے حوالے سے کتنے لاپرواہ ہیں اسی لاپرواہی کی وجہ سے ہمیں بعض اوقات بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غربت و افلاس ایک ہی گھر یا کمرے میں گنجائش سے زیادہ افراد کی رہائش سیلاب جیسے قدرتی آفات اور خیموں میں زندگی کئی امراض کو جنم دیتی ہیں ٹی بی کے مرض میں اضافے کی وجوہات میں بھی یہ عوامل شامل ہیں ٹی بی کی شرح مردوں کے مقابلے میں خواتین اور خصوصا بچوں میں بہت زیادہ ہے جس کی وجہ خواتین کا اپنی صحت پر توجہ نہ دینا شامل ہیں۔ تپ دق سو فیصد قابل علاج مرض ہے لیکن تشخیص اور علاج میں تاخیر اسے مہلک بنا دیتی ہے۔ خیبر پختونخوا میں ہر سال پچاس ہزار افراد اس موذی مرض کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مریضوں میں 54 فیصد خواتین شامل ہوتی ہیں۔ پاکستان ٹی بی کی شرح کے اعتبار سے دنیا میں چھٹے نمبر پر ہے پاکستان تپ دق کے حوالے سے آٹھویں نمبر پر تھا لیکن جس طرح دیگر شعبوں میں آگے آیا ہے اس طرح اس بیماری میں اضافے کی وجہ سے دو درجے مزید اوپر آگیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مرض زیادہ تر 18 سے 35 سال کی عمر کے نوجوانوں کو شکار بناتا ہے یہ لوگوں میں اب بھی اس خطرناک بیماری سے متعلق آگاہی نہیں اور یہ جان لیوا مرض اب بھی ہمارے ہاں موجود ہیں صرف پشاور میں اس وقت 26 کے قریب ٹی بی کی بیماری کے تشخیصی مراکز کام

کررہے ہیں جبکہ 76 بیسک ہیلتھ یونٹس میں علاج معالجے کی سہولت فراہم کررہے ہیں لیکن ہمارے ہاں سب سے افسوسناک امر یہ دیکھنے میں آرہاہے کہ لوگ اول تو اس بیماری پر توجہ ہی نہیں دیتے حالانکہ اس بیماری کی تشخیص کیلئے کئے جانیوالے ٹیسٹ مفت ہوتے ہیں دوسراسب لوگ مفت میں ملنے والے ادویات کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھتے ۔ جبکہ بچوں میں ماﺅں کی طرف سے ملنے والے تپ دق کی جراثیم کے خاتمے کیلئے پیدائش کے وقت مخصوص ٹیکہ لگایا جاتا ہے لیکن اس بارے میں بھی لوگوں میں آگاہی بالکل نہیں ۔ایسی ایک خاتون سے راقم کی ملاقات ہوئی جس کے بیٹے نے علاج تو شروع کیا تھا لیکن بعد میں اس کے دیگر رشتہ داروں نے اسے کہا کہ دن میں تین گولیاں کھانا تمھارے لئے خطرناک ہے اور تمھیں یرقان بھی ہوسکتا ہے خود تشخیصی اور لوگوں کی باتوں میں آکر ٹی بی کے مریض نے ادویات ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کھانا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ٹی بی کی بیماری ایک مرتبہ پھر حملہ آور ہوئی اور اس مرتبہ نوعیت سخت تھی جس کی وجہ سے وہ مریض ابھی مشکلات کا شکار ہے تاہم اب وہ خاتون اپنے بیٹے کو علاج کیلئے دوبارہ لارہی ہیں خاتون کے بقول اگر اس کا بیٹا اپنا علاج مکمل کرواتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

اس طرح کا ایک دلچسپ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک مریض جس میں ٹی بی کے جراثیم انتہائی خطرناک سطح پر تھے کے بقول اس نے ابتداء میں ادویات کو مفت سمجھ کر

توجہ نہیں دی کہ اس سے کیا ہوگا اور وہ ادویات باقاعدگی سے نہیں کھائی جس کا نقصان یہ ہوا کہ کھانسی کی بیماری بڑھ گئی وزن کم ہوگیا اور اب دوبارہ سنٹر میں آکر ٹیسٹ میں پتہ چلا کہ اسے ٹی بی کی خطرناک جراثیم لگے ہیں یہ ایک ایسے مریض کی داستان ہیں جس نے ٹی بی کی بیماری کے دوران ملنے والے ادویات کو توجہ نہیں دی اور لاپرواہی نے اس کی بیماری کو مزید خطرناک بنا دیا۔ طبی ماہرین کے مطابق ہر سال پاکستان میں ٹی بی کے مرض سے ہونیوالی ہلاکتوں کی تعداد 48000 ہے ہر سال تقریبا تین لاکھ افراد ٹی بی کی بیماری تشخص ہو جاتی ہیں جن میں 75 فیصد معصوم بچے شامل ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں کام کرنے والے ٹی بی کے مرض کی روک تھام کرنے والے ادارے کی کوشش ہے کہ 2015 تک اس بیماری سے ہونیوالے ہلاکتوں کی تعداد کو 50 فیصد تک کم کیا جائے جس کیلئے اقدامات تو اٹھائے جارہے ہیں لیکن صورتحال ابھی بھی حوصلہ افزاء نہیں۔

تقریبا پچاس سال قبل پشاور شہر میں جب ٹی بی کے مریضوں کیلئے ڈسٹرکٹ ٹی بی سنٹر کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس وقت بلڈنگ نہیں تھی اسی بنیاد پر کرائے کی بلڈنگ میں سلسلہ شروع کیا گیا اور ابھی تک ٹی بی کے مریضوں کیلئے کام کرنے والا یہ سنٹر کرائے کی بلڈنگ میں کام کررہا ہے بلڈنگ کے مالک نے ابتداء میں کرایہ لیا لیکن بعد میں ٹی بی کے مریضوں کی وجہ سے کرایہ لینا

بند کردیا لیکن اب پھر وہ متعلقہ انتظامیہ کو وارننگ دے چکا ہے کہ بلڈنگ کو خالی کیا جائے کیونکہ متعلقہ ایریا کمرشل ہے اور مالک اپنے مفاد کیلئے بلڈنگ کو خالی کرنا چاہتا ہے ٹی بی سنٹر کی انتظامیہ کے مطابق روزانہ تقریبا تین سو کے قریب ٹی بی کے مریض او پی ڈی کیلئے یہاں پر آتے ہیں اور یہاں پر مریضوں کو سہولت ہے کیونکہ شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے چارسدہ روڈ کوہاٹ روڈ چمکنی روڈ سمیت مختلف علاقوں سے مریضوں اور خصوصا خواتین کو آنے میں آسانی ہے انتظامیہ کے بقول اگر انہیں کہیں پر اچھی بلڈنگ مل جائے تو وہ شفٹ بھی ہو جائے اور وہاں پر ایکسرے مشین بھی انسٹال کرے لیکن تاحال ان کی امید بر نہیں آتی اور لگ یہی رہا ہے کہ اگر یہ سنٹر کہیں اور منتقل ہوگیا یا بند ہوگیا تو پھر تپ دق کے مریضوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائیگا جو ہم سب کیلئے پریشانی کا باعث بنے گا اس لئے محکمہ صحت کے ٹھیکیداروں سے گزارش ہے کہ اس صورتحال کا نوٹس لیتے ہوئے مسئلے کے حل کیلئے فوری اقدامات اٹھائے جائیں۔

جندول کا غریب طالب علم

ماں نے اپنے سترہ سالہ بیٹے کا ماتھا چوم لیا اور اس کے کمزور اور زرد چہرے پر ہاتھ پھیر کر سفید کپڑے سے اس کا سر باندھ لیا اس کی چھوٹی بہنوں نے اپنے بھائی کی موت کا یقین ہوتے ہی بین کرنا شروع کر دیا گذشتہ ایک سال سے ان کا بھائی تو ویسے بھی کوما میں تھا لیکن پھر بھی دل میں ایک آس تھی کہ شائد ان کا بھائی اٹھ جائے اور معجزہ ہو جائے اور یہ معجزہ بھی ہو جاتا لیکن اگر انہیں اپنے بھائی کے علاج کیلئے اخراجات مل جاتی لیکن کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان کے کوما میں پڑے بھائی کیلئے اخراجات دیتا۔ یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ یہ سترہ سالہ اس طاالب علم پر بیت جانیوالی سچ بیتی ہے جو گذشتہ دنوں ایک مقامی اخبار میں چھپی جس میں بتایا گیا کہ جندول میں خودکش حملے میں زخمی ہو کر کوما میں چلا جانیوالا نویں کلاس کا طاالب علم زندگی کی بازی ہار گیا ہم سب کیلئے یہ ایک معمولی خبر ہے لیکن ان کیلئے قیامت ہے جن کا یہ بیٹا تھا جن کا یہ بھائی تھا اور جن کا یہ آسرا تھا۔ تقریبا ایک سال قبل نویں کلاس کے طاالب علم جو اپنے رشتہ دار کے جنازے میں اپنے والد کیساتھ شریک ہوا تھا میں خودکش حملہ ہوا جس میں اس کے والد زخمی

ہونے کیساتھ ساتھ بہرے بھی ہوگئے جبکہ یہ طالب علم زخمی ہو کر کوما میں چلا گیا ابتداء میں اسے ایک مقامی سرکاری ہسپتال میں داخل کردیا گیا جہاں پر اس کی ظاہری علاج تو کیا گیا لیکن کوما میں جانے کے بعد ڈاکٹروں نے اسے ہسپتال سے باہر نکال دیا کیونکہ یہ طالب علم اس ملک کے کمی کمینوں کے اولاد میں سے تھا جن کی اوقات نہیں ہوتی۔ کوما میں پڑے جندول سے تعلق رکھنے والے اس طالب علم پر روزانہ ساڑھے تین ہزار روپے کا خرچہ آتا تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق اس طالب علم کے علاج پر آٹھ سے دس لاکھ روپے اخراجات آتے تھے جو اس غریب خاندان کے بس سے باہر تھے پختون خوار میں اپنی زمین پر اپنی بدمعاشی کا دعوی کرنے والے حکمرانوں نے حاتم طائی کے خزانے پر لات مار کر ایک لاکھ روپے احسان کرکے اس غریب خاندان کو دے دیئے اور پھر حکمران اس معصوم طالب علم سمیت اس کے زخمی اور دھماکے کے باعث بہرے ہونے والے والد کو بھول گئے سترہ سال طالب علم کے بھائی نے حکمرانوں کو یاد دہانی کیلئے کئی جگہوں اور کئی مقامات پر پختون خوار کے وزراء سے رابطے بھی کئے درخواستیں بھی دیئے لیکن معصوم طالب علم کے علاج کیلئے سرکار کی طرف سے نہ تو کچھ ملنا تھا اور نہ ہی مل سکا اور گذشتہ روز ایک سال کا عرصہ خوار ہونے کے بعد وہ طالب علم زندگی کی باری ہار گیا میڈیا میں دو کالم خبر چھپ گئی اور سب کچھ ختم کیونکہ یہ کمی کمینوں کی قسمت ہے۔

جس دن جندول سے تعلق رکھنے والے اس غریب طالب علم کا جنازہ تھا اسی دن شام کو جمہوریت کی آڑ میں اسلامی فلاحی عوامی ملک میں میں کی کمینوں کو لوٹنے والوں کا ڈرامہ گڑھی خدا بخش میں جاری تھا اور اس ڈرامے میں اگر باپ اپنے آپ کو سیر بتا رہا تھا تو بیٹا اپنے آپ کو سوا سیر بتا رہا تھا خاندانی پارٹی سے تعلق رکھنے رہنماء اپنے آپ اپنے باپ ماں اور ماناکی شان میں کیا سے کیا قصیدے کہہ رہا تھا رٹے رٹائے بیانات میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ غریبوں کیلئے ایک ہزار روپے ماہانہ سپورٹ پروگرام شروع کیا گیا اور وہاں پر بیٹھے کرائے کے کمی کمینوں نے زندہ باد کے وہ نعرے لگائے جس سے اندازہ ہوگیا کہ اس پروگرام کیلئے شائد انہیں کرایہ زیادہ دیا گیا تھا کسی نے اٹھ کر یہ سوال نہیں کیا کہ ایک ہزار روپے ماہانہ سپورٹ پروگرام میں سے کیا ہوتا ہے خود کروڑوں روپے کی گاڑیوں میں گھومنے والے ان نام نہاد لی ڈروں کو اندازہ بھی نہیں کہ سات سو روپے پر بیس کلو آٹے کا تھیلہ آتا ہے جو کہ ایک اوسط گھرانا ایک ہفتہ کیلئے استعمال کرتا ہے مہینے کے تین ہفتے غریب آدمی کیا کرے اگر یہ سوال وہاں پر بیٹھے کچھ مخصوص صح آفی بھی پوچھ لیتے تو شائد "دودھ اور شہد" کی نہریں تقریروں میں بہانے والے لی ڈروں کو کچھ عقل ہی آجاتی لیکن جس طرح حکمرانوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور انہیں صرف اپنا آپ اور خاندان ہی نظر آتا ہے اسی طرح مخصوص صح آفیوں کو بھی سرکار کے جلسوں میں "چمچہ گیری" پر خرچہ پانی بھی ملتا ہے اس لئے خرچے پانی کی

وجہ

سے ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور یہ بھی کی کمینوں کی طرح ہر طرف واہ واہ اور زندہ باد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جندول کے نویں کلاس کے طالب علم کی موت کی ذمہ دار کون ہے یہ وہ سوال ہے جسے ہم سب کو اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے ٹھیک ہے کہ وہ دہشت گردی کا نشانہ بن گیا لیکن کن کی وجہ سے یہ دہشت گردی ہوئی یہ وہ ابتدائی سوال ہے جسے ہر ایک شخص کو پوچھنا چاہئیے اپنے آپ سے اور ان سے جو اپنے آپ کو معتبر سمجھتے ہوئے عوامی نمائندہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اگر دہشت گردی کا واقعہ پیش آیا تو پھر نویں کلاس کے طالب علم کی صحت کی ذمہ داری کیا ریاست کی نہیں روٹی کپڑا اور مکان کے دعوے کرنے والے کیا اپنے آپ کو صحت کی بنیادی سہولیات بھی فراہم نہیں کر سکتے کہنے کو تو ہمارے ٹھیکیدار جنہیں اللہ کی مہربانی سے صحت کا شعبہ ملا ہے کی صحت کے شعبے میں کئے جانیوالے کارناموں کے حوالے سے بڑی بڑی باتیں چھپتی ہیں لیکن حقیقت میں کیا ہو رہا ہے اس کا اندازہ نویں کلاس کے طالب علم کیساتھ ہسپتال میں روا رکھے جانیوالے رویئے اور اسے علاج کیلئے رقم نہ دینے کی صورتحال سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے ایک سال بعد کوما کا شکار طالب علم زندگی کی بازی ہار گیا۔

کہنے کو تو غریب غرباء کیلئے بیت المال اور زکواۃ کی رقم بھی ادویات کی مد میں دی جاتی ہیں لیکن اس کیلئے کسی بڑے "گناہ گار" کی سفارش کا لانا ضروری ہے جس کے بعد اس ملک میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے والے غریبوں کو زکواۃ کی مد میں رقم مل جاتی ہیں لیکن قربان جایئے اپنی زمین پر اپنی بدمعاشی کا دعوے کرنے والے حکمرانوں کے جن کے دور میں زکواۃ کی رقم سیلاب زدگان کے نام پر نکال لی گئی اور بعدازاں قسطوں میں جی آلوں اور اپنی زمین پر اپنی بدمعاشی کیساتھ نعرے بازی کرنے والوں کو مل گئی -اب ان حالات میں معصوم طالب علم کا کون پوچھے

ہمارے کرتوت اور مذہب کی بدنامی

شہر کے مختلف علاقوں میں واقع بڑے۔بڑے پلازوں کے مالکان اور کاروباری مراکز نے اپنی کاروبار کو بچانے کیلئے مذہب کا سہارا لینا شروع کردیا ہے اور بڑے۔بڑے بلڈنگز پر کلمے اور قرآنی آیات والے بینرز لگا دیئے ہیں تاکہ کوئی ان کے پلازوں اور مراکز پر پتھراﺅ نہ کرے اور انہیں مستقبل میں کسی قسم کے نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔یہ اقدام توہین رسالت کے واقعے کے بعد شہر کے مختلف علاقوں میں ہنگاموں کے دوران بڑے پلازوں اور بلڈنگز پر ہونیوالے حملوں اور پتھراﺅ کے واقعات کے بعد اٹھایا گیا ہے ان واقعات میں شہر کے مختلف علاقوں میں واقع بڑے بلڈنگز پر شرپسندوں نے پتھراﺅ کیا تھا جس کے باعث ان پلازہ مالکان کو کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا ۔کاروباری اداروں کے مالکان کی طرف سے اٹھایا جانیوالا یہ اقدام اپنی کاروبار کی حفاظت کیلئے اٹھایا گیا ہے لیکن کاروباری مراکز کے مالکان شائد یہ بھول گئے ہیں کہ شرپسندوں نے توہین رسالت کے حوالے سے ہونیوالے احتجاج کے دوران ان پلازوں کو بھی نہیں بخشا تھا جن پر قرآنی آیات والے بینرز لگائے گئے تھے مذہب کی آڑ میں شرپسندوں کی طرف سے کی جانیوالا یہ اقدام قابل مذمت ہے لیکن دوسری طرف کاروباری مراکز کی طرف سے کلمے اور قرآنی آیات والے بینرز لگانے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ

لوگ بھی اپنے آپ اور کاروبار کو بچانے کیلئے مذہب کو بھی استعمال کر رہےہیں جو اس سے بھی زیادہ قابل مذمت عمل ہے۔ حالانکہ ان میں ایسے کاروباری حضرات اور پلازوں کے مالکان بھی ہیں جن کا مذہب سے واسطہ صرف اتنا ہی ہے جتنا ہمارے حکمرانوں کو اس ملک میں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے والے کمی کمینوں سے ہے۔ کچھ عرصہ قبل اقتدار میں آکر کمی کمینوں کا بیڑہ غرق کرنے والی خاندانی پارٹی جن کا نعرہ تو روٹی کپڑا اور مکان تھا جو نانا سے لیکر داماد کے دور حکومت میں بھی کمی کمینوں کو نصیب نہیں ہوا اور عوام چار مرتبہ دھوکا کھا گئے اسی پارٹی نے اپنی دور حکومت میں کئے جانیوالے والے کارنامے لوگوں کی نظروں سے چھپانے اور ایک مرتبہ پھر انہیں بے وقوف بنانے کیلئے مذہب کا سہارا لیا اور یا اللہ یا رسول اور چور بے قصور کا نعرہ لگایا حالانکہ سوچ کی بات یہ ہے کہ ملک کو لوٹنے والوں کا حساب تو اللہ تعالی نے کرنا ہے کرائے کے نعرے لگانے والے کمی کمینوں کے نعرے بازی سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی انہی کا دور ہے کہ آج مذہب کی تضحیک ہو رہی ہیں حالانکہ اپنے آپ کو بے قصور کروانے کیلئے نعرے لگانے والے اگر اپنے کارناموں پر نظر دوڑائیں تو یقینا عمر بھر مذہب کی آڑ نہیں لیں گے لیکن انہیں پتہ ہے کہ مذہب کے نام پر بننے والے اسلامی فلاحی عوامی اور ساتھ میں جمہوری ملک کے کمی کمین مذہب

کیلئے جان دے سکتے ہیں اس لئے اب یہ لوگ بھی مذہب کی آڑ لیکر دکانداری اور کاروبار چمکا رہے ہیں -اب تو اپنے آپ کو سیکولر قرار دینے والے کئی سیاسی پارٹیاں بھی -مذہب کے نام پر کمی کمینوں کیساتھ ڈرامہ بازی میں مصروف عمل ہیں

خیر بات ہو رہی تھی کاروباری مراکز کو بچانے کی کان میں اذان سن کر مسلمان ہونیوالوں کو مذہب کی حقیقت کا اندازہ ہی نہیں مذہب اسلام کو جتنا نقصان ہم نام نہاد مسلمانوں نے پہنچایا ہے شائد ہی کسی نے پہنچایا ہو بد بختی کے اس عمل میں ہم سب شریک عمل ہیں اپنے ارد گرد نظر دوڑایئے بہت ساری ایسی چیزیں آپ کو نظر آئیں گی جو انتہائی حد تک غلط ہیں لیکن ہم لوگوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ہمارے ہاں کچھ مذہبی نما سیاسی لیڈروں کی غلطیوں کی وجہ سے اب ہمارے ہاں مذہب کو تضحیک کا نشانہ - بنایا جا رہا ہے جس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یوں بھی دی جا سکتی ہے کہ موبائل فون پر روزانہ کتنے ہی لطیفے ایس ایم ایس کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو بھیجتے رہتے ہیں یقینا ہر کوئی اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ایس ایم ایس کے ذریعے بھیجے جانیوالے زیادہ تر پیغامات / لطیفوں میں جہاں سردار

پٹھان کو نشانہ بنایا جاتا ہے وہیں پر ان سے بھی دگنا مذہب مولوی اور داڑھی والے حضرات کو نشانہ بنایا جارہا ہے جسے ہر کوئی مزاق میں اسے اپنے دوستوں پیاروں کو بھیجتا ہے اور ہم تضحیک کا عمل کرتے رہتے ہیں یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ ہمارے ہاں یہ تاثر عام ہے کہ مذہب سے وابستگی رکھنے والے ہمارے اس معاشرے کے دشمن ہیں داڑھی والے حضرات کی خصوصی طور پر تضحیک کی جاتی ہیں مذہب داڑھی کو دہشت گردی سے منتھی کرنے والوں کی آنکھیں اب کھل جانی چاہیئے ایس ایم ایس سوشل میڈیا کی مختلف سائٹس پر جس غیر محسوس انداز میں مذہب ان سے وابستہ افراد اور داڑھی کی تضحیک کی جارہی ہیں اس پر ہم سب نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اگر کوئی اس بارے میں بات کرتا ہے تو جوابا اسے جاہل کہا جاتا ہے ماڈرن ازم کے نام پر ہم اپنے دین کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ جس طرح کسی ایک شخص کی انفرادی غلطی کی سزا پوری کمیونٹی کو نہیں دی جاسکتی یہی اصول مذہب مذہبی لوگوں کے حوالے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں مذہب کو استعمال میں دیکھ کر اب تو بعض غیر سرکاری ادارے جن کی سربراہ سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے بیگمات ہیں نے بھی اب مذہب کے نام پر دکانداری کا عمل شروع کردیا ہے حالانکہ ان لوگوں کا مذہب سے واسطہ اتنا ہی ہوتا ہیکہ عام لوگوں کی طرح یہ بھی کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتی

ہیں کسی زمانے میں اپنے ایجنڈے کیلیئے مغرب کی نقالی کرنے والی خواتین اب ہمارے ہاں مذہب کو درمیان میں لا رہی ہیں کیونکہ انہیں اندازہ ہوگیا ہے کہ یہاں پر عمر بھر نمازیں نہ پڑھنے والا مسجدوں سے جوتی چوری کرنے والا چوری کے گیس اور بجلی استعمال کرنے والا پڑوسیوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والا راستے میں خواتین کو چھیڑنے والا اور کرپشن کرنے والا بھی بھی مذہب کیلیئے جان دیتا ہے اس لئے مذہب ہمارے ہاں کاروبار کی حیثیت اختیار کرگیا ہے اور یہ ایسا کاروبار ہے جس میں سیاستدانوں سے لیکر ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا مرنے کے بعد شہید کہلایا جاتا ہے اسی باعث اس کاروبار نے اب دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی تمیز بھی ختم کردی ہیں -

چیف جسٹس کے نام کھلا خط

خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی کا دعوی کرنے والے پختون خوار کے حکمران بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی کے مصداق اپنے آخری دنوں میں کیا کچھ نہیں کر رہے اس کا اندازہ آپ کو شہر کے ایک بڑے ہسپتال کے ملازمین کی طرف سے بھیجے گئے درخواست سے کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے عدلیہ سے بچوں کے ہسپتال میں ہونیوالی گھپلوں کے نوٹس لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ محکمہ صحت اور ہسپتالوں کو ٹھیکے پر چلانے والے ٹھیکیدار کے صوبائی پارٹی سربراہ نے حال ہی میں بیان دیا کہ اگر اس ملک کے کمی کمین انہیں اگلے پانچ سال کیلئے پھر منتخب کریں تو ہم یہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں گے جس کی انہوں نے گذشتہ پانچ سالوں سے منصوبہ بندی کی ہے۔ عدلیہ کو لکھے جانیوالے اس خط کے مندرجات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے غریب عوام پر مسلط حکم ران غریبوں سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس خط میں ملازمین نے اپنے نام چھپائے ہیں کیونکہ انہیں محکمے پر مسلط ٹھیکیدار سے کارروائی کا خطرہ ہے۔

محترم چیف جسٹس! ہمیں آپ سے انصاف کی توقع ہے ایک ایسے دور میں جب ہر کوئی پیسے طاقت کے بل بوتے پر سرکاری ڈیپارٹمنٹس میں سب کچھ کروا سکتا ہے ہم وہ

سرکاری ملازم ہیں جنھیں حالات نے اس حد تک مجبور کر دیا ہے کہ اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں پر بھی کھلے عام بات نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں محکمانہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ محترمی ! ہم چلڈرن ہسپتال کے ملازمین ہیں اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں کیساتھ ساتھ ہم آپ کو اس ہسپتال میں ہونیوالی گھپلوں کے بارے میں بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس کا آپ سوموٹو نوٹس لے سکتے ہیں اور حرام کھانے والے مخصوص لوگوں کے خلاف آپ ہی ایکشن لے سکتے ہیں۔

محترمی !اس ہسپتال میں گذشتہ اٹھارہ سال سے ایک ہی عہدے پر تعینات اہلکار سٹور میں تعینات ہے محکمہ صحت کے اعلی افسران اور سیکرٹریٹ میں بیٹھے لوگوں کے تعاون سے دوائیوں میں گھپلے کر رہا ہے اور ڈسپوزایبل سرنج سے لیکر ڈرپ تک اپنے من پسند افراد سے خریدتا ہے محکمے کی طرف سے ادائیگی بہتر ادویات کیلئے کی جاتی ہیں لیکن کمیشن کی خاطر مخصوص ادویات ہسپتال میں لائی جاتی ہیں جن میں بھی ڈی ہائیڈریشن کے شکار بچوں کو کم ملتی ہیں زیادہ تر ادویات سرنج اور ڈرپس ہسپتال میں تعینات ایک ایل ایچ وی جس نے اپنے علاقے میں کلینک کھول رکھا ہے وہاں پر استعمال ہو رہی ہے ہسپتال کا دیگر سامان جن میں کرسیاں تک شامل ہیں اسی پرائیویٹ کلینک میں زیر استعمال ہیں جس کی آپ خفیہ انکوائری کر سکتے ہیں۔

ہسپتال میں علاج کیلئے لائے جانیوالے بچوں کیلئے مخصوص سرنج ہوتے ہیں لیکن ہسپتال میں تعینات اہلکار بڑے سرنج خریدتا ہے جو کہ نہ صرف غیر قانونی عمل ہے بلکہ ان بڑے سرنجوں کے سوئی کے باعث بچوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جاتی ہیں لیکن ہسپتال انتظامیہ کے لوگ ان سے ملے ہیں اس لئے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسی اہلکار نے محکمہ صحت سے اپنی بیوی کے کلینک کیلئے گائنی میں استعمال ہونیوالا سرکاری بیڈ بھی ہسپتال کے نام پر حاصل کرلیا ہے حالانکہ چلڈرن ہسپتال میں اس بیڈ کا کوئی کام نہیں کیونکہ یہ گائنی ہسپتال نہیں لیکن محکمہ صحت سے لینے کے بعد غریب لوگوں کے ٹیکس سے خریدا جانیوالا قیمتی بیڈ پرائیویٹ کلینک میں منتقل کردیا جائیگا۔

جناب عالی! بچوں کے ہسپتال میں انتظامی عہدے پر تعینات اہم شخصیت جنہیں محکمہ صحت کے ٹھیکیدار کی حمایت حاصل ہے کھلے عام شراب استعمال کرتا ہے اس شراب نوشی میں مدد کرنے والا ہسپتال کا ایک عیسائی ملازم ہے جو ڈیوٹی انجام نہیں دیتا لیکن چونکہ اس کے پاس شراب کا لائسنس ہے اس لئے اس مدد کی وجہ سے اس پر ڈیوٹی کرنا حرام ہے۔ نئے بننے والے ریسکیو کے اہلکار جنہوں نے ہسپتال کی بلڈنگ میں غیر قانونی طور پر قبضہ لیا ہوا ہے بھی شراب نوشی کے عمل شریک ہوتے ہیں اور یہ لوگ ہسپتال کے بجلی تک استعمال کرتے ہیں۔

محترمی چیف جسٹس ! کسی بھی سرکاری ہسپتال میں لگائے جانیوالے درخت سرکاری ہی ہوتے ہیں اور اس کی کٹائی بھی باقاعدہ محکمے سے اجازت لینے کے بعد دی جاتی ہیں لیکنیہاں تعینات اہلکار نے سرکار کے مال کو مال مفت سمجھ کر ہسپتال میں کھڑے لاکھوں روپے کے الائچی کے درخت کاٹ دیئے ہیں جس کی نہ تو منظوری لی گئی ہیں اور نہ ہی کوئی ٹینڈر ہوا ہے لیکن چونکہ پوچھنے والا نہیں اس لئے کٹائی کے بعد اب ان درختوں کو فروخت کیا جارہا ہے اور سرکار کا مال ذاتی گھر کو جارہا ہے جس کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اسی طرح جنریٹر کیلئے فنڈز بھی روزانہ لئے جاتے ہیں لیکن جنریٹر کو استعمال نہیں کیا جاتا اور پٹرول کا سارا فنڈز مخصوص لوگ کھا رہے ہیں۔اس ہسپتال میں ہونیوالے اخراجات کی آڈٹ رپورٹ بھی نہیں ہوتی کیونکہ یہاں پر تعینات لوگ آڈٹ کیلئے آنیوالے افراد کو پیسے دیکر خرید لیتے ہیں اس لئے کوئی چیز چیک ریکارڈ دیکھا نہیں جاتا۔

محترمی ! جنرل فضل الحق کے دور میں اس ہسپتال میں نرسوں کی رہائش کیلئے ہاسٹل قائم کیا گیا تھا جو ابھی تک قائم ہے لیکن یہاں پر دی جانیوالی سہولیات کا کوئی ریکارڈ نہیں معذرت کیساتھ یہاں پر مخصوص نرسوں کیلئے بہت کچھ ہیں ان سہولیات میں سرکاری ریفریجریٹر سمیت دیگر سہولیات بھی شامل ہیں جناب چیف جسٹس ! محکمہ صحت شہر میں واقع اس ہسپتال کے بجلی گیس کے بلوں کی ادائیگی کیلئے ہر ماہ باقاعدگی سے ادائیگی کرتا آرہا ہے لیکن یہ رقم غائب

ہو رہی ہیں جس میں بھی انتظامیہ کا ہاتھ ہے جس کی وجہ سے اب ہسپتال پر 71 لاکھ روپے کا صرف بجلی کا بل واجب الادہ ہے کچھ عرصہ قبل انتظامیہ کے ایک اہم عہدیدار نے ہاسٹل میں رہنے والے نرسوں سے پانچ پانچ ہزار روپے فی کس لئے تھے اور کہا تھا کہ بل کی ادائیگی کرنی ہے یہ پانچ پانچ ہزار روپے نرسوں اور دیگر سٹاف سے لئے گئے اور اسے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرنے کی ہدایت کی ہے جس کی باقاعدہ رسیدیں بھی موجود ہیں جبکہ بعض لوگوں کو سفید کاغذ پر پانچ پانچ ہزار روپے کے چٹیں دی گئی کہ یہ سارے پیسے سرکار کے کھاتے میں جمع ہوگئے ہیں حالانکہ سرکار کے نام پر یہ سب فنڈز ایک مخصوص شخص کے ذاتی اکاؤنٹس میں جمع ہوگیا۔

جناب عالی! اتنی بدعنوانیوں اور کرپشن کے باوجود دو بڑے اہلکار آج بھی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں اگر آپ اس سلسلے میں خفیہ انکوائری کروائیں تو سب کچھ سامنے آجائیگا۔

ہم سرکاری ملازمین آپ کی اس کاوش پر آپ کیلئے دعاگو ہونگے۔ والسلام ہسپتال ملازمین

بیروزگار نوجوان اور انصاف

عوامی حکمرانی کا دعوی کرنے والے حکمران اس ملک کے کمی کمینوں کے خون پسینے کی کمائی پر عیاشی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور انہی کمی کمینوں کے نام پر فنڈز نکالتے ہیں بین الاقوامی خیراتوں سے لیکر قرضوں تک اس ملک کے جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے والے شہریوں کے نام پر لئے جاتے ہیں لیکن ان غریب غرباء کو اپنا حق بھی نہیں دیا جاتا کسی زمانے میں مشرق وسطی کے شیخوں سے زکواۃ خیرات صدقات اسی مد میں وصول کئے جاتے تھے پھر یہ سلسلہ ڈونرز اداروں اور یورپی ممالک تک پہنچ گیا جہاں سے قرضے کمی کمینوں کی بہتری کیلیئے لئے جاتے رہے لیکن نہ تو اسلامی فلاحی عوامی اور جمہوری ملک کے غریب غرباء کی حالت بدلی اور نہ ہی انہیں اپنا حق ملا۔نعروں کی حد تک غیرت مند پاکستانی عوام کو ڈونرز کے سامنے بھوکا ننگا بتا کر قرض خیرات صدقات اب بھی لئے جارہے ہیں اور یہ امداد اب بھی اپنی کروڑوں کی گاڑیوں پر خرچ کررہے ہیں اور غریب غرباء کو یہ حکمران یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہی تم لوگوں کے نجات دہندہ ہیں ۔ گدھوں کی طرح کام کرنے والے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں لیکن اپنے حق کیلیئے آواز نہیں نکال سکتے۔

دو دن قبل راقم کی ملاقات پشاور پریس کلب میں لائیو سٹاک ڈیپارٹمنٹ کے دو ملازمین سے ہوئی ان میں ایک ناگمان کے علاقے کا رہنے والا گریجویٹ ہے جبکہ دوسرے پنجگی کا رہائشی ہے اور اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے دونوں نے بتایا کہ وہ پریس کانفرنس کیلئے قرض رقم لیکر آئے ہیں کیونکہ ان دونوں کو بیروزگار کردیا گیا ہے اور ابھی انصاف کے حصول کیلئے پریس کلب آئے ہیں دونوں بمشکل چوبیس اور چھبیس سال کے عمر کے ہیں دونوں ہی کلاس فور کے ملازمین کی حیثیت سے لائیو سٹاک ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہے تھے ایک کا کام دفتر میں چائے بنانا تھا جبکہ دوسرا کمینوں پر مسلط بیوروکریسی کیلئے سرکاری فارم سے ان کے گھرپر دودھ فراہم کرتا تھادونوں پشاور کے ڈومیسائل رکھنے والے نوجوان ہیں دو سال قبل انہیں ڈیپارٹمنٹ میں ڈیلی ویجز ملازمین کام مل گیا تھا دونوں اس بات پر خوش تھے کہ ایک تو ان کا روزگار شروع ہوگیا دوسری انہیں ڈیپارٹمنٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر مستقبل میں کہیں مستقل نوکریاں آئیں تو انہیں رکھ لیا جائیگا لیکن ایک ماہ قبل انہیں یہ کہہ کر فارغ کردیا گیا کہ اب ان کی ضرورت نہیں دونوں کے ارمان خاک میں مل گئے کیونکہ روزگار مستقل ہونے کے بجائے انہیں بیروزگار کردیا گیا بقول ان کے محکمے کے اعلی عہدوں پر تعینات چار رکنی کمیٹی نے اپنے ہی علاقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے جعلی ڈومیسائل بنا کر انہیں تعینات کردیا جبکہ ان بھرتی ہونیوالوں سے ایک ایک لاکھ روپے بھی لئے گئے ان دونوں نوجوانوں کے

بقول چونکہ وہ ایک لاکھ روپے ادا نہیں کر سکتے اسی باعث ان کا حق ہونے کے بجائے انہیں بیروزگار کر دیا گیا بیروزگار ہونیوالے ان دونوں نوجوانوں نے مزید بتایا کہ ڈیپارٹمنٹ میں اٹھارہ ڈیلی ویجز ملازمین کے نام پر تنخواہیں نکالی جارہی ہیں لیکن وہاں پر صرف پانچ ملازمین کام کررہے ہیں جن میں کچھ انتظامی عہدے پر تعینات صاحب کے گھر میں چوکیداری کررہے ہیں اور ان کا تعلق قبائلی علاقہ باجوڑ ایجنسی سے ہے۔ان ملازمین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان اٹھارہ ملازمین کی فہرست خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی جمانے والے پارٹی کے وزیر کو بھی دی گئی لیکن انہوں نے بھی حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کرلی اور اپنی آنکھیں بند اور کان بہرے کرلئے اسی باعث اب یہ دونوں نوجوان انصاف کے حصول کیلئے میڈیا کی طرف آئے ہیں۔راقم نے جب ان دونوں یہ سوال کیا کہ دو سال تک ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے تم دونوں نے کتنی ہی بے قاعدگیاں دیکھی ہونگی تو تم نے میڈیا کے سامنے یہ بات کیوں نہیں کی جس کا جواب دونوں کے پاس نہیں تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس وقت ہمارا روزگار لگا تھا اسی وجہ سے ہم بات نہیں کرسکتے تھے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زندہ باد اور مردہ باد کرنے والوں کے جب اپنے مفاد پر ضرب پڑتی ہے تو تب یہ لوگ احتجاج کرتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں کہ زیادتی کسی اور کیساتھ ہورہی ہیں ۔اس لئے خاموشی ہی بہتر ہے اور یہی عمل ہم سب کو تباہ کررہا ہے

یہ صرف دو نوجوانوں کیساتھ ہونیوالی زیادتی نہیں بلکہ ملک اور خصوصا اس صوبے کے ہر تیسرے نوجوان کا مسئلہ ہے اول تو یہاں روزگار ملنے سے رہا لیکن اگر کہیں غلطی سے گریڈ سات کی سرکاری نوکری مل بھی جائے تو پھر ان کے ساتھ ایسے ڈرامے کئے جاتے ہیں سب سے بڑا ڈرامہ جو اس ملک کے غریب عوام کیساتھ حکمران کر رہے ہیں وہ انہیں دی جانیوالی تنخواہیں ہیں حکومت نے مئی 2012 ء میں کم از کم تنخواہ مزدور کیلئے آٹھ ہزار روپے مقرر کی لیکن سرکاری ڈیپارٹمنٹس میں کام کرنے والے ان دونوں ملازمین کی طرح کتنے ہی ڈیلی ویجز ہیں جنہیں حکومت اپنی ہی مقرر کردہ تنخواہ نہیں دے رہی ان دونوں نوجوانوں کو ابتداء میں 5200روپے دیئے جاتے تھے جن میں سے دو سو روپے ڈیپارٹمنٹ کا کیشیئر "دس خوشی" میں ان غریبوں سے لیتا اور بعد میں ان کی تنخواہ 6675ہو گئی جو ان کی آخری تنخواہیں تھی اب حکمرانوں سے کوئی یہ پوچھے کہ جب تم لوگ خود ہی اپنی ہی احکامات پر عملدرآمد نہیں کرتے تو پھر اس ملک میں کام کرنے والے پرائیویٹ ادارے کس طرح قانونی تنخواہ اپنے ملازمین کو دے سکیں گے۔

مملکت خداداد میں کی کمینوں پر حکمرانی کرنے والوں اور ان کے میدان سیاست میں نوزائیدہ بچوں کے بقول گذشتہ پانچ سالوں میں انہوں نے غریب غرباء کی حالت بدل دی ہیں اور کی کمین عیاشی کر رہے ہیں حکمرانوں کی بات بھی صحیح ہے کیونکہ مہنگائی امن وامان کی ابتر صورتحال لوڈشیڈنگ کرپشن بیروزگاری اور

لینڈی لوڈکے ہوتے ہوئے بھی اس ملک کے کمی کمین اگر دو وقت کی روٹی کھاتے ہیں تو یہ بھی عیاشی ہیں کیونکہ ان کی تو کوشش ہے کہ انہیں بھوکا ننگا رکھ کر خیرات صدقات اور زکواۃ لینے کیلئے زندہ رکھا جائے۔
یہاں پر راقم کو حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا ایک فرمان یاد آرہا ہے جس میں بتایا گیا کہ غربت و افلاس بھی انسان کو کفر کی حد تک لے جاتی ہیں مذکورہ بالا نوجوان انصاف کے حصول کیلئے کہاں پر جائے کیونکہ ان غریبوں کے پاس تو آنے جانے کیلئے کرایہ تک نہیں وکلاء کی فیس اور عدالتوں کے چکر ان کی بس کی بات نہیں اب اگر یہ نوجوان ناامید ہو کر اپنے حق کیلئے اسلحہ اٹھاتے ہیں یا پھر کسی تخریب کار کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو پھر بھی انہی نوجوانوں کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ نوجوان طبقہ ملک میں تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہے حالانکہ اگر حق اور انصاف نہیں ملتا تو پھر کون اپنے حق کیلئے خوار ہوتا ہے ویسے بھی بقول شاعر "کون جیتا ہے تیرے زلف کے سر ہونے تک "

آزاد صحافت سچ اور صحافیوں کے سر قلم کرنا

شہداء والی پارٹی کے دعویدار پارٹی کے پختون خوار میں نئے بننے والے سربراہ نے گذشتہ دنوں تلوار کا تحفہ وصول کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں نے یہ وصول کیا تو اس سے صحافیوں کا سر قلم کروں گا اور اس میں کسی سے رعایت نہیں برتوں گا ہمیں تو موصوف سے یہی امید تھی کیونکہ گذشتہ پانچ سالوں سے ان کی پارٹی نے کمی کمینوں کیساتھ کیا نہیں کیا اور خاص کر صحافیوں کیساتھ ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی آزاد میڈیا کے حق میں ہے ان کے حق میں نعرے بلند کرنے والے اور مضامین لکھنے والے تو صحافی ہے اور ان کیلئے مراعات بھی بہت ہیں بلکہ کچھ ہمارے ہاں کے صحافی جو کسی زمانے میں اپنے آپ کو کارکنوں کا نمائندہ کہلواتے تھے خاندانی پارٹی کے سربراہ سے تعلق کی بناء پر سرکاری نیوز ایجنسی کے سربراہ بن گئے اور پھر انہیں یہاں کے کارکن بھی یاد نہیں رہے لیکن اب انہیں وہاں سے کک آؤٹ کر دیا گیا اسی لئے اب خیبر پختون خوار کے کارکن پھر انہیں یاد آ گئے خیر سچ لکھنے اور بولنے والے صحافی نہ تو ہماری شہداء والی پارٹی کے گڈ بک میں ہیں اس لئے سچ بولنے والوں کے سر قلم کرنے کی خواہش بھی ان جیسے لی ڈروں کی دلوں میں ہے سچ پر سر قلم کرنے والے سر پھرے میدان صحافت میں بہت سارے ہیں ویسے بھی گذشتہ دنوں انہی کے پارٹی سے

تعلق رکھنے والے ایک وفاقی وزیر جو آج کل صحافیوں اور اخبارات کو ٹھیک کرنے والی وزارت کے وزیر بھی ہے نے کیا خوب فرمایا کہ ملک میں سینکڑوں صحافی ہیں اور ہر ایک صحافی کو سیکورٹی فراہم بھی نہیں کی جاسکتی ساتھ میں یہ بھی کہا کہ حکومت آزادی صحافت پر قدغن نہیں لگائے گی بے حیثیت صحافی سیکورٹی لینے کے خواہشمند بھی نہیں سوائے چند نام نہاد میراثیوں کے جو صحافت کی آڑ میں اپنا کام نکالتے اور ان کی وجہ سے بہت سارے صحافی اور میدان صحافت بدنام ہوا ہے۔

اخبارات کو اشتہارات کی لگام سے پکڑ کر چلانے والے حکمران اپنے بارے میں کتنا سچ برداشت کرتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ دنوں قومی اسمبلی میں سی این جی کے حوالے سے بحث ہوئی اس دوران انکشاف ہوا کہ صرف سات سی این جی پمپس روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر آنیوالے حکمرانوں کی کابینہ میں ایک ایسے وزیر کے ہیں جنہیں مکھن لگانے میں خصوصی ملکہ بھی حاصل ہے اور انہیں اوصاف کی بناء پر انہیں اخبارات کو لگام دینے والی وزارت کا قلمدان بھی دیا گیا سات سی این جی پمپس کے مالک کے حوالے سے رپورٹ سرکار کی مدح سرائی کرنے والی سرکاری نیوز ایجنسی نے چلادی جو ان کی ویب سائٹ پر بھی لگ گئی جس سے مختلف اخبارات نے اٹھا لی اور چلادی تاہم اس کا پتہ چلنے پر رات گئے ادارے کے سربراہ خود ہیڈ کوارٹر آئے اور ویب سائٹ سے خبر ختم

کرتے ہوئے خبر بنانے والے صحافی سمیت ڈائریکٹر کو بھی گھر بھیج دیا کہ تم لوگ چاپلوسی اور مکھن نہیں لگا سکتے اور جی سر کی اضافی صلاحیت بھی تم لوگوں میں نہیں سو انہوں نے صحافیوں کو مستقل طور پر گھر بھیج دیا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں میں برداشت کتنی ہے اور سچ کو برداشت کرنیکی ہمت کتنی ہے کچھ عرصہ قبل تھائی لینڈ کی شہزادی نے خیبر پختون خوار کا دورہ کیا تھا اس دوران سرکاری نیوز ایجنسی نے خبر چلوادی کہ دہشت گردی سے متاثرہ صوبے میں کسی بھی غیر ملکی شخصیت کا یہ پہلا دورہ ہے خبر اخبارات میں آنے کے بعد تھائی وزارت خارجہ نے نوٹس لیا اور کہا کہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس معاملے کو میڈیا پر نہیں لایا جائیگا لیکن اس طرح سے ہمیں تو مسئلہ ہوگا جس کے بعد سخت اقدام اٹھاتے ہوئے سرکار کی مدح سرائی کرنے والے کچھ صحافی لائن حاضر کردیئے گئے تاہم بعد میں حالات اور معافی تلافی کے بعد معاملہ سلجھ گیا حالانکہ ان صحافیوں نے حالات کے پیش نظر سچ لکھا تھا لیکن سرکار کو یہ سچ بھی برداشت نہیں حالانکہ دہشت گردی کے نام پر انہیں ڈالر بھی بہت ملتے ہیں - کچھ عرصہ قبل خیبر ایجنسی سے چلنے والے ایک سرکاری ایف ایم ریڈیو میں کام کرنے والے صحافی نے تیراہ میں ہونیوالی بمباری کے بعد مقامی لوگوں کے تاثرات لئے جس میں مقامی لوگوں نے اسے ظلم قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ "کلا دبے بے وار اور کلا دا بابا وار" یعنی کبھی بابا کی باری اور کبھی اماں کی باری" قبائلی صحافی نے وہ رپورٹ متعلقہ ریڈیو سے آن ائیر کردی اور یہ سچ

ہمارے ہاں وفاق کی نمائندگی کرنے والے بابو جی کو اتنا برا لگ گیا کہ وہ غریب قبائلی صحافی بھی سرکار کی نوکری سے نکلوا دیا گیا کچھ عرصہ فاٹا سیکرٹریٹ اور بابو جی ہاؤس چکر لگانے جی حضوری کے بعد اب اسے پروبیشن پر دوبارہ لگا دیا گیا اب اسے کہا گیا ہے کہ اگر اس مرتبہ سچ بول دیا تو یہ عارضی نوکری بھی چلی جائے گی اور پھر بازار میں چنا چاٹ فروخت کرتے پھروگے چنے چاٹ کی دکان کھولنے کے ڈر سے اب وہ صحافی ہر جگہ کانٹ چھانٹ کر خبر بناتا ہے۔ ۔حالانکہ چنے چاٹ والے کی کمائی صحافی کی کمائی سے زیادہ ہوتی ہے ویسے سرکار کی ترجمانی کرنے والے مخصوص قسم کے صحافی ہی حکومت کو اچھے بھی لگتے ہیں جو ان کی بکواس کو دنیا جہاں کا سچ بنا دیں انہیں منہ پھٹ اور سچ لکھنے والے لوگ اور صحافی تو بہت زیادہ برے لگتے ہیں ۔

کچھ دن قبل بشیر بلور کے گھر میں تعزیت کیلئے راجہ رینٹل نے آنا تھا الیکٹرانک میڈیا سے تعلق رکھنے والے صحافیوں نے چار دنوں سے بلور ہاؤس میں ڈیرہ جمایا ہوا تھا جس دن راجہ رینٹل نے آنا تھا اس ان ان کی سیکورٹی کے افراد آئے اور کہا کہ نتھو خیرے قسم کے صحافی ادھر سے نکل جائے صرف سرکاری صحافی ہی یہاں پر رپورٹنگ کر سکتے ہیں جب ہم نے تصدیق کیلئے متعلقہ ایس پی سے بات کی تو اس نے بھی کہا کہ ہمیں اوپر سے آرڈر ہے اس لئے باہر نکل جائے پولیس نے بھی اپنے آپ کو معصوم بنا دیا ہم نے بھی کہہ دیا کہ راجہ رینٹل کو

دیکھنے کا ہمیں بھی کوئی شوق نہیں نہ وہ اتنا خوبصورت ہے کہ ہمیں اس کا دیدار ہونے سے کچھ ملے گا وہاں سے باہر نکلنے کے بعد سیکورٹی والوں نے بھی آنکھیں بدل ڈالی اور آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں اس بات کا پتہ چلنے والے مرحوم بشیر بلور کے بھائی کو غصہ آیا اور انہوں نے سیکورٹی والوں کو کہہ دیا کہ یہ کون صاحب ہیں جو ہمارے گھر سے صحافیوں کو نکال رہے ہیں انہوں نے راجہ رینٹل کے متعلقہ اہلکاروں کے نام پوچھے تاہم حالات کا پتہ چلنے پر سیکورٹی اہلکار اور انفارمیشن کے لوگ معافی مانگتے ہوئے صحافیوں کو اندر لے آئے اس عمل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرکار کو وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو کنٹرول خبریں ہی دیا کرے اور ان کے گھوں کو صاف کرے اور ان کے کرتوتوں کو کارناموں میں بدل ڈالیں تاکہ کرتوت کی کمینوں کو صاف انداز میں بتا دیا کرے۔

لیڈروں کا میڈیا سے شکوہ

پختون خوار کے زیادہ تر لی ڈر میڈیا اور خصوصا الیکٹرانک میڈیا سے گلہ کرتے ہیں کہ انہیں قومی سرکٹ پر خبروں میں شامل نہیں کیا جاتا اور ان کی آواز کو اٹھانے والا کوئی نہیں اس طرح کے گلے شکوے تقریبا ہر جگہ پر سننے کو ملتے ہیں اور ان کا یہ گلہ اور شکوہ کسی حد تک درست بھی ہے کہ پنجاب اور سندھ سے لانچ ہونیوالے ٹی وی چینل اپنے مقامی علاقوں کی خبروں کو زیادہ وقت دیتے ہیں جبکہ ان کی بہ نسبت ہمارے پختون خوار کی خبروں کو کم وقت دیا جاتا ہے بعض مخصوص چینل اور اخبارات تو ہفتے میں ایک بار حاضری لگوانے کیلئے خیبر پختون خوار کی خبریں پیکجز چلوا دیتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جن لوگوں نے اس شعبے میں سرمایہ کاری کی ہے انہیں نہ تو اس صوبے سے اشتہارات ملتے ہیں تو یہاں پر وقت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے ہاں خبروں اور خصوصا دھماکوں کے حوالے سے بننے والی خبروں کیلئے خیبر پختونخوار ہی سب کو یاد ہے لیکن اب روز ہونیوالے دھماکوں میں بھی ہمارے صوبے کیساتھ متعصبانہ رویہ رکھا جاتا ہے ۔جس کا اندازہ کراچی میں ہونیوالے کریکر دھماکے میں تین زخمیوں کی خبر اور قبا ئلی علاقوں میں ہونیوالے بمباری اور دھماکے میں مرنے والے پانچ دس افراد کی ہلاکتوں کی خبر سے لگایا جاسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک نیوز ڈائریکٹر جن کا تعلق کراچی سے

ہے پشاور دورے پر آئے تھے ملاقات میں انہوں نے سوال کیا کہ یہاں پر آپ لوگوں کو کیا کیا مسائل درپیش ہیں ۔اس سطح کے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی ادارے میں صحافیوں کے درمیان دراڑ ڈال کر اندر سے خبریں نکالنے کی کوشش کریں راقم نے جواب میں کہا کہ مسئلہ تو بہت سارے ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے اور یہاں کی خبروں کی کوریج ٹھیک نہیں ہوتی جبکہ اس کی بہ نسبت دیگر صوبوں خصوصا پنجاب اور سندھ پر کرم نوازی بہت ہے جس پر نیوز ڈائریکٹر نے مزید وضاحت چاہی تو راقم نے بتایا کہ ہمارا صوبہ صرف دھماکوں کی خبروں کیلئے آپ کو یاد ہے لیکن اس میں بھی یہاں کے لوگوں کو وہ کوریج نہیں ملتی جو دوسرے صوبوں کے زخمیوں کو ملتی ہیں ہمارے ہاں ہلاک ہونیوالوں کو بھی نہیں ملتا جس پر موصوف غصے میں آگئے اور کہا کہ اس طرح کی باتیں مت کرو اور کچھ اور بتا دو ۔راقم نے رسپانس دیکھ کر جواب دیا کہ اور کوئی مسئلہ ہی نہیں۔جس پر وہ خاموش ہوگئے لی ڈروں کی میڈیا پر تنقید سے پہلے اگر بہت سارے لی ڈر جنہوں نے ماشاء اللہ لینڈ لوڈ کی وجہ سے جائیدادیں اور زمینیں بنا لی ہیں اس صوبے میں سرمایہ کاری نہیں کررہے خصوصا میڈیا کے شعبے میں نہ تو کسی یہاں نے لی ڈر نے ٹی وی چینل کا لائسنس حاصل کیا نہ ہی ریڈیو چینل اور نہ ہی کسی اخبار میگزین کا آغاز کیا کہ چلو یہاں پر کام کرنے والے خشکیانو) صحافیوں (کو روزگار کے

مواقع بھی ملیں گے اور اس کی مدد سے وہ اپنی آواز بھی آگے لے جا سکیں گے لیکن مجال ہے جو کبھی کسی نے اس حوالے سے سوچا بھی ہو بقول پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی دوست کہ موجودہ پٹھان اب صرف پھٹے آن رہ گئے ہیں ان کے لی ڈر بھی نسوار کی فیکٹریاں اور اسلحہ کی دکان کھولنے کو منافع بخش کاروبار سمجھتے ہیں انہیں لکھنے لکھانے سے کیا کام۔ پختون خوار میں کوریج نہ دینے کا گلہ ہمارے ہاں خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے والے حکمران زیادہ کرتے ہیں لیکن ان کی سمجھ اور بوجھ اتنی ہی ہوتی ہے کہ علاقائی سیاست اور کمی کمینوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے تقریریں پشتو زبان میں کرتے ہیں،اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں 9 بجے کے بلیٹن میں دکھایا جائے اب اسلام آباد میں بیٹھے کسی عام شخص بیوروکریٹ سفیر کو کیا پتہ کہ پشتو زبان میں موصوف کیا فرمارہے ہیں اگر تقریر اردو میں ہو تو پھر بھی وہاں پر بیٹھے لوگوں کو سمجھ آجاتی ہیں کہ انہیں کیا مسئلہ ہے قومی سرکٹ پر چلنے والے اردو کے ٹی وی چینل پر کوئی پاگل ہی ہوگا جو پشتو زبان میں کی گئی گفتگو کو نشر کرے گا۔ اور اگر یہ سلسلہ اس طرح شروع ہوا تو پھر سندھ کے لوگ اپنی زبان میں پنجاب کے لوگ پنجابی میں اور بلوچستان کے لوگ بلوچی میں بات کریں گے اور ڈیمانڈ بھی کوریج کا کرینگے جس کے بعد ٹی وی چینل خبریں تو نہیں البتہ زبانوں کا ملغوبہ چلائیں گے ۔

ہمارے ہاں الیکٹرانک میڈیا میں کام کرنے والے صحافی جانتے ہیں کہ پختون خوار کے لی ڈر جو جلسوں میں دھوم دھڑکے والی باتیں کرتے ہیں انہیں کتنی مشکل ہوتی ہے کئی مرتبہ ان کے لی ڈروں کے سیکرٹریز کو سمجھانے کیلئے چٹیں بھجوانی پڑتی ہے کہ خدا کیلئے دو تین جملے اردو میں بھی کہہ دیں تاکہ آپ کی آواز صوبے سے بھی باہر نکل جائے اور چٹیں بھیجنے کی یہ مشق ہر مرتبہ جلسے جلوس میں کرنی پڑتی ہے -کچھ عرصہ قبل پولیس لائن چارسدہ میں سرکار کے چھتری تلے ہونیوالے جلسے میں ایک بڑے لی ڈر نے اردو میں بات کرنے سے قبل کہا کہ "پہ پختوکے چہ خبرہ اوکڑم نہ ٹرے یخ شی" یعنی پشتو زبان میں بات کرنے سے کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے اب موصوف کو کون بتائے کہ اگر کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا شوق ہے تو ٹھنڈا پانی پی لیا کرے لیکن اپنی آواز پورے پاکستان میں پہنچانے کیلئے قومی زبان اردو میں بات کرنا ضروری ہے تب ہی قومی سرکٹ پر چلنے والے چینل خبر چلاتے ہیں-اس صوبے میں کام کرنے والی کچھ سیاسی پارٹیاں ان کے لی ڈر اور مردہ باد زندہ باد کی آوازیں نکالنے والے کمی کمین صحافی اور اخبارات کو اپنا ذاتی ملازم سمجھتے ہیں خصوصا اگر پارٹیاں حکومت میں ہوں حکومت میں رہنے والوں کا رویہ تو صحافیوں کیساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے صحافیوں کے گھروں میں کھانا ان کے حجروں سے جاتا ہے یا انہیں رزق دینے والے یہی لوگ ہیں ان میں پچاس فیصد قصور اگر پارٹیوں کا ہے تو پچاس فیصد ہمارے اپنے صحافی برادری کا بھی ہے جو جی حضوری اور تالی سٹ ہونے کو اپنا قانونی اخلاقی اور

دینی فریضہ سمجھتے ہیں حالانکہ صحافی کسی بھی پارٹی سے نہیں ہوتا۔گذشتہ پانچ سالوں کے دوران حکومتی پارٹیوں کی کوریج کا بدترین تجربہ راقم سمیت بہت سارے صحافیوں کو ہوا ہے سب سے عجیب بات کہ ان کے جلسوں میں ڈھول بجانے والے کیلئے تو جگہ ہوتی ہے لیکن صحافی کے بیٹھنے کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ایسے میں یہ لوگ گلہ کرتے ہیں کہ ہمیں عزت اور مقام نہیں ملتا اگر صحافیوں کو دوران ڈیوٹی بے عزتی ملے گی تو پھر ان سے عزت کی توقع رکھنا بھی عبث ہے ۔یہی صورتحال خاندانی پارٹی کے پروگراموں کی بھی ہے یا اللہ یا رسول اور چور بے قصور کے نعرے لگانے والے صحافیوں کی درگت بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے یہ لوگ صحافیوں کو بھی سندھی وڈیروں کے ملازم سمجھتے ہیں خود کو پھنے خان سمجھنے والے لیڈر کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی آپس جھگڑوں کی خبریں نہ آئے لیکن جو بکواس وہ کرتے ہیں وہ نمایاں جگہ پر شائع یا براڈکاسٹ ہو ان کے مقابلے میں مخصوص مذہبی پارٹیوں کے کارکن اور لیڈروں میں قدرے تمیز بھی ہے اوران کا رویہ بھی صحافیوں کیساتھ قدرے شائستہ ہوتا ہے یہ بھی صحافیوں کا مشاہدہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اپنے کرتوتوں سے متعلق سوال پر بعض اوقات صحافیوں کو لتاڑ دیتے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں مذہبی جماعتوں کے لیڈر اس طرح کی حرکات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ان حالات میں اگر صحافی سچ بول دیتے ہیں تو لیڈروں اور کارکنوں کو برا بھی

لگتا ہے خیر ہماری علاقائی سیاست کرنے والوں لی ڈروں سے گزارش ہے کہ اگر
الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے گلہ کرنے کے بجائے اگر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ
لیں تو یقینا انہیں اندازہ ہو جائیگا کہ اس صوبے سے تعلق رکھنے والے صحافیوں نے پھر
بھی ان پر ہاتھ ہولا رکھا ہوا ہے اس لئے اگر گلہ کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں پر نظر
ڈالیں تو شائد اس اقدام سے بہتری آجائے

شہدا بے حس لوگ اور حکمران 21

سنگلاخ چٹانوں میں مسلسل اٹھارہ گھنٹے تک ڈیوٹی انجام دینا کتنا مشکل کام ہے یہ کوئی ان سے پوچھے جو وطن کی حفاظت کیلیئے دن اور رات کی تمیز کئے بغیر ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں گھروں سے اپنے پیاروں سے دور وطن کے یہ بیٹے کتنی مشکل سے زندگی کے دن گزارتے ہیں کبھی عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا نہ ہی محلوں میں رہنے والے حکمرانوں کو اس بات کا اندازہ ہے اور یہ انہی لوگوں کی خاصیت ہے کہ جب بھی خون کا قطرہ بہا تو سب سے پہلے انہی جوانوں نے وطن کیلیئے اپنی جانیں نچھاور کردی ۔سرحدوں کی حفاظت سے لیکر ملک کے اندر دہشت گردی کے نام پر ہونیوالے خوفناک جنگ میں سیکورٹی فورسز نے جوانوں نے لازوال قربانیاں دی ہیں اور یہ انہی کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ ہم سب اپنے گھروں میں آرام سے سوتے ہیں آرام سے دفتروں بازاروں میں بیٹھ کر سیکورٹی فورسز کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اس عمل میں چند نام نہاد این جی اوز کے ڈالرزادہ مرد و خواتین اور کچھ مخصوص صحافی بھی شامل ہیں جن کے بقول فورسز کا کام ملک کی حفاظت کرنا ہوتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ فورسز کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہوتی ہے لیکن اس کے بدلے میں انہیں کیا مل رہا ہے کوئی اپنی جان کا ندرانہ پیش کرتا ہے کوئی عمر بھر کی معذوری کا شکار ہو جاتا ہے لیکن ہمارا معاشرے نہ تو ان
معذور ہونیوالوں کو

سپورٹ کرتا ہے اور نہ ہی جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے جنازوں میں شریک ہوتا ہے حکمرانوں سے اس بات کا گلہ تو نہیں ہو سکتا لیکن ہم اپنے آپ اس معاشرے میں رہنے والوں سے شکوہ تو کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری اجتماعی بے حسی کی زندہ مثال ہے اور حکمرانوں لی ڈروں کیلئے شرم کا مقام بھی ہے جن کے دعوے تو آسمان سے تارے توڑنے والے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس ملک کیلئے کون اپنی جان کی قربانی دے گیا انہیں صرف اس بات سے غرض ہے کہ ان کی زندگیاں محفوظ ہو گئی ہیں۔

دسمبر کو ایف آر پشاور کے علاقے میں شہید کئے جانے والے 21 لیویز اہلکاروں کے 29 پیاروں کی دادرسی کے لئے ابھی تک کوئی نہیں پہنچا۔ ایف آر پشاور میں ہونیوالے اس بھیانک واقعے میں منڈئی جنا کوڑ کے علاقے کا عبداللہ بھی تھا شہید اہلکار عبداللہ شاہ فرنٹئیر کور بلوچستان سے ریٹائرمنٹ کے بعد دوبارہ ملک و قوم کے دفاع کی خدمات انجام دیتے ہوئے شہید ہو گئے بہادر سپاہی عبداللہ کو دہشت گردوں نے 27 اور 28 دسمبر کی درمیانی شب اغوا کے بعد 29 دسمبر 2012 کو ان کے دیگر 20 ساتھیوں سمیت شب خون مار کر شہید کر دیا۔ شہید عبداللہ نے 16 سال تک بلوچستان ایف سی میں بطور لانس نائیک فرائض انجام دیئے۔ وہاں سرخرو ہونے کے بعد ملک و قوم کی خدمت اور شہادت کا جذبہ انہیں لیویز میں لے آیا جہاں ان کی شہادت کی تمنا پوری ہو گئی بے حس انتظامیہ اور

حکمرانوں نے عبداللہ شاہ سمیت 21 شہید اہلکاروں کے جنازوں کو کندھا دینے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔اور نہ ہی ان بے سہارا معصوموں کے لئے کسی امدادی پیکج کا اعلان کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یتیم کے بہتے آنسو جہنم کی آگ کو بھی ٹھنڈا کر دیتے ہیں، لیکن ملک و قوم پر قربان ہونے والے ایک شہید کا بے آسرا بچہ دست شفقت سے بھی محروم ہوگیا عبداللہ کے معصوم بیٹے شاہد شاہ کا کہنا ہے کہ اس کے عظیم بابا کی تمنا تھی کہ وہ اسے بڑا افسر بنائے گا، بے رحم ہاتھوں سے یتیم ہونے والے شاہد کی پر نم آنکھوں میں اپنے بابا کا خواب اور زیادہ روشن ہوگیاتاہم اسے غم بھی کھائے جارہا ہے کہ زندگی کی تھپیڑوں کا وہ کیسے مقابلہ کرینگے - بڑا افسر بنانے کی خواہش لیویز اہلکار عبداللہ کے اپنے چھ بیٹوں کیلئے بھی تھی جس میں سب سے بڑا بیٹا سترہ سال کا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ 21 لیویز اہلکاروں کا اغواء اور پھر بے دردی سے قتل خبریں بریکنگ نیوز پر چلنے کے بعد جس طرح میڈیا ان لوگوں کو بھول گیا اسی طرح حکمران بھی بھول گئے اور یہی عمل سوسائٹی کے ہر فرد نے کیا جن کی حفاظت کیلئے عبداللہ جیسے 21 جوانوں نے اپنی زندگی ہار دی -ہم پر مسلط حکمرانوں کیلئے شرم کا مقام ہے کہ عبداللہ سمیت 21 جوانوں نے اس ملک کیلئے قربانی دی لیکن اس علاقے میں ابھی تک صرف اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کے علاوہ جن کا دورہ بھی صرف اس ہاسٹل تک محدود تھا جہاں پر 30 سے زائد جوان موجود تھے جن میں کچھ نے باتھ روم میں گھس کر اپنی جان بچائی تاہم 21 جوان شہید ہوگئے صرف اسی

ہاسٹل کا دورہ کرنے اور جگہ دیکھنے تک ہی تھا اس کے بعد وہاں سے سیکورٹی اہلکاروں کو نکال دیا گیا لیویز کی جلی ہوئی گاڑی بم دھماکوں سے تباہ ہونیوالے ہاسٹل کی دیوار شہید ہونیوالے جوانوں کی ٹوپیاں وردی اور دیگر سامان ابھی تک زمین پر پڑا ہے اور علاقے کے لوگوں کو خود سیکورٹی کا کہتے ہوئے انتظامیہ نے آنکھیں بند کر لی- ان 21 جوانوں کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہیں ان کے معصوم بچے مائیں بہنیں بیٹیاں اور خاندان کس دکھ درد کا شکار ہیں کوئی ان کیلئے آواز بھی نہیں اٹھاتا چند روز قبل پریس کلب کے باہر این جی او کی ایک نام نہاد نیٹ ورک نے این جی اوز کے اہلکاروں کے تحفظ اور انہیں حکومتی اہلکاروں کی طرح مراعات دینے کیلئے ریلی بھی نکالی مظاہرہ بھی کیا جسے میڈیا نے بھی خوب اچھالا لیکن شہید ہونیوالے افراد کے متاثرہ خاندانوں کیلئے آج تک کوئی آواز نہ اٹھ سکی نہ تو میڈیا نے اپنی ذمہ داری پوری کی نہ ہی کسی این جی او نے اور نہ ہی کسی لیڈر اور حکمران نے شہید ہونیوالے 21 خاندانوں سے رابطہ کیا.

ان حالات میں ملک و قوم کیلئے ڈیوٹی انجام دینا جہاں پر ستائش کیلئے لکھتے ہوئے بھی صحافیوں کے قلم رک جاتے ہیں امداد کے نام پر شہیدوں کو ان کا اپنا حق دیتے ہوئے حکمرانوں کا بیڑہ غرق ہوتا ہے وہاں پر اس طرح کی خدمات سرانجام دینا کتنا عذاب دہ کام ہے لیکن پھر بھی سلام ہے کہ ان جوانوں کو جو

آج بھی ہم بے جیسے بے حس قوم اور بے غیرت حکمرانوں کیلیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں -

آٹا مہنگائی اور کفن چور

آٹے کی بیس کلو تھیلے کی قیمت 800 روپے ہو گئی ہے اس لئے ڈیڑھ سو روپے مزید ادا کرے یہ الفاظ دکاندار نے گذشتہ روز راقم سے ساڑھے چھ سو روپے لینے کے بعد کہے جب راقم نے دکاندار کو ساڑھے چھ سو روپے ادا کئے اور کہا کہ بیس کلو کے آٹے کا تھیلا دے دیں جس پر اس نے مزید ڈیڑھ سو روپے کا مطالبہ کیا اس کی بات نے راقم کو حیران کر دیا اور پوچھا کہ دس دن پہلے تو ساڑھے چھ سو روپے تھی اب یکدم آٹھ سو تک کیسے پہنچ گئی جواب میں دکاندار نے اسلامی جمہوری عوامی اور فلاحی مملکت کے حکمرانوں کی شان میں وہ مغلظات بکی جو یہاں پر شائع کرنے کے قابل نہیں ۔ دکاندار کو ڈیڑھ سو روپے مزید ادا کرنے کے بعد راقم نے دکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ شکر ہے کہ میرے والد وفات چکے ہیں یہ بات دکاندار کو حیران کر گئی اس نے سوال کیا کہ یہاں پر والد کا کیا ذکر اور کیوں یہ بات کی تو جواب میں راقم نے اسے قصہ سنا دیا تقریبا پانچ سال قبل بازار سے بیس روپے کا تھیلا اور پانچ کلو گھی کا ڈبہ خریدنے کے بعد راقم گھر گیا تو والد جو کہ تقریبا آٹھ سال سے دل کی بیماری کی وجہ سے گھر پر پڑے تھے نے سوال کیا کہ بیٹا مارکیٹ یں آٹے اور گھی کا کیا بھاؤ ہے راقم نے بتا دیا کہ ایک ہزار روپے میں چار سو روپے گھی اور چار سو روپے آٹے کا بیس روپے کا تھیلا

لایا ہوں جس پر والد صاحب حیران ہو کر رہ گئے اور کہا کہ یہ کیسا وقت آگیا ہے کہ چار سو روپے میں بیس کلو کے آٹے کا تھیلا مل رہا ہے ان کیلئے یہ بات حیران کن تھی سو بازار میں دکاندار کو راقم نے بتایا کہ شکر ہے کہ والد وفات پا چکے ہیں کیونکہ وہ تو چار سو روپے کا سن کر حیران ہو گئے تھے اب اگر آٹھ سو روپے سنتے تو شائد انہیں دل کا دورہ ہی پڑ جاتا۔ جس پر دکاندار نے بات ہنسی میں اڑا دی اور راقم آٹے کا تھیلا اٹھا کر گھر لے آیا تاہم یہ اضافی ڈیڑھ سو روپے راقم کیلئے مشکل پیدا کر گئے کیونکہ پہلے سے بنائے گئے بجٹ سے اضافی ادا کرنا پڑے اسی باعث دو دن رکشے کے بجائے پیدل ہی دفتر جانا پڑا۔ گھر سے دفتر تک پیدل جاتے ہوئے کچھ دوستوں نے آواز بھی دی کہ کیوں خیر تو ہے کیا کرایہ نہیں جو پیدل جا رہے ہو لیکن راقم نے دل کڑا کر جھوٹ بولا کہ نہیں یار اصل میں وزن کچھ زیادہ ہوگیا ہے اور موٹاپے کی ڈر کی وجہ سے اب پیدل چلنا شروع کر دیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ صورتحال صرف راقم کیلئے پریشان کن نہیں بلکہ ہر اس کمین کیلئے ذہنی تناؤ کا باعث ہے جو گھر کی ذمہ داریوں کا سامنا ہے اور حلال طریقے سے اپنے گھر والوں کیلئے روزی روٹی کمانے کے چکر میں مصروف عمل ہے۔

آٹے کی قیمتوں میں اضافے کو صوبائی محکمہ خوراک نے معمولی قرار دیتے ہوئے اسے پچاس روپے اضافہ قرار دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے گندم اور آٹے کی

افغانستان.برآمدات کو قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس ابھی بھی گندم وافر مقدار میں موجود ہے جو اپریل تک صوبے کے صارفین کیلئے کافی ہے ان کے مطابق صوبے کی ضرورت چالیس لاکھ ٹن ہے جبکہ صوبے میں گندم کی سالانہ پیداوار دس لاکھ ٹن ہے۔ بقول محکمہ خوراک کے ڈائریکٹر جنرل کے آٹے کی تھیلے کی قیمت میں پچاس روپے اضافہ ہوا جبکہ حقیقت میں قیمت میں ڈیڑھ سو روپے اضافہ ہوا ہے اس ملک کے غریب غرباء پر مسلط بیورو کریٹس کو زمینی حقائق کا پتہ ہی نہیں ہوتا اس باعث انہیں اضافہ بھی کم لگتا ہے جس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ انہیں امدادی قیمتوں پر سب کچھ ملتا ہے دو دن قبل لائیو سٹاک ڈیپارٹمنٹ میں بیورو کریٹس کے گھروں پر روزانہ دودھ پہنچانے والے ایک بیروزگار نوجوان سے ہوئی تھی جس نے بتایا کہ خیبر پختونخوار کے چیف سیکرٹری ہوم سیکرٹری سمیت 85 کے قریب بیورو کریٹس کے گھروں پر روزانہ سرکاری فارم سے چالیس روپے لیٹر دودھ پہنچانے کا کام وہ کرتا تھا حالانکہ اوپن مارکیٹ میں فی کلو دودھ کی قیمت 80 روپے ہے جبکہ لیٹر 100 اور 110 روپے میں ملتا ہے اب ان حالات میں کمی کمینوں کا خون چوسنے والے ان بیورو کریٹس کو کیا پتہ کیونکہ یہ خود سرکار امدادی قیمت پر اشیاء خوردنوش لیتے ہیں اسی باعث انہیں ڈیڑھ سو روپے اضافہ بھی معمولی لگتا ہے اور یہی صورتحال مختلف اشیاء خوردنوش کے حوالے سے ہی یکساں ہیں کروڑوں کی گاڑیوں میں پھرنے والے کمی کمینوں کے ٹیکسوں پر پلنے والوں کو کیا پتہ کہ اس ملک کے عوام پتہ نہیں کس

گناہ کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ محکمہ خوراک کے مطابق گذشتہ چار سالوں سے ملک میں گندم کی مقدار بڑھ رہی ہیں اسی باعث گندم کی برآمدات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا سال 2010-11 ء میں 25.21 ملین ٹن گندم پیدا ہوئی جبکہ 2011-12 ء میں 23.52 ملین ٹن گندم ریکارڈ گندم پیدا ہوئی چونکہ تقریبا تین ملین ٹن اضافی گندم پیدا ہوئی اسی باعث دیگر ممالک کو بھی امپورٹ کی گئی جس کے باعث قیمتوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

مئی 2008 ء سے اس ملک کے کمی کمینوں پر مسلط ہونیوالی خاندانی پارٹی اور ان کے اتحادیوں کی بدولت جن میں ہمارے پختون خوار کے خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے والے لی ڈر بھی شامل ہیں اگر مئی 2008 سے دسمبر 2012 تک مختلف اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کا جائزہ لیں تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کمی کمینوں کیلئے جئے کا نعرہ کتنا بربادی ساتھ لایا ہے مئی 2008 ء میں پٹرول کی قیمت 56 روپے تھی جو کہ اب 103 روپے تک پہنچ گئی ہیں ڈیزل کی قیمت 39 تھی جو کہ اب 116 روپے تک پہنچادی گئی سی این جی جو 30 روپے تھی اب 90 روپے تک پہنچادی گئی اسی طرح موٹر سائیکل کی قیمت 50000 روپے سے 75000 روپے تک پہنچ گئی ایئر کنڈیشنر کی قیمت پندرہ ہزار سے چوالیس ہزار امریکی ڈالر کی قیمت 60روپے سے 98 روپے تک آٹے کی قیمت سولہ روپے سے 38روپے تک چینی کی قیمت 25 سے 65روپے تک کھانے کی تیل کی قیمت 70 روپے سے 190 روپے تک

پہنچ گئی جی ایس ٹی جو پہلے پندرہ فیصد تھی موجودہ حکمرانوں نے 25 روپے تک پہنچا دی بجلی کی فی یونٹ ڈھائی روپے سے 12 روپے تک پہنچا دی گئی حالانکہ یہاں پر اپنی بجلی اپنا اختیار کا نعرہ صوبے کے کمی کمینوں کے سامنے لگایا گیا سونے) گولڈ (جو کہ چھبیس ہزار روپے تولہ تھا اب اڑسٹھ ہزار روپے تک پہنچا دی گئی اسی طرح ایس ایم ایس اور موبائل فون کی کال پر ٹیکس پندرہ فیصد سے اکیس فیصد کر دیا گیا یہ وہ عام اشیاء ہیں جو گھروں میں استعمال ہو رہی ہیں ان میں ایئر کنڈیشنر اور سونا کو نکال دیا جائے کیونکہ اب یہ بھی سفید پوش طبقے کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے ان حالات میں کمی کمین اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ کہیں ان کیساتھ کفن چور والا قصہ نہ ہو جائے کیونکہ ان سے پہلے والے کفن چور تھے تو موجودہ کفن چور کے بیٹے نکلے جو کفن بھی چوری کرتے ہیں اور پھر مردوں کی بے عزتی بھی کرتے رہیں اللہ خیر کرے آنیوالے کہیں کہیں کفن چور کے بیٹے سے بھی بدتر نہ ہو کیونکہ کفن چور کا بیٹا تو مردے کی صرف چوری اور بے عزتی کرتا تھا اور اگر ان سے بدتر آگئے تو پھر مردے کی کفن کی چوری اور بے عزتی کے بعد اس کی ویڈیو بھی بنائیں گے اللہ ہم پر رحم کرے -

کارکن سیاسی اور مذہبی پارٹیاں

میں گذشتہ کئی سالوں سے ایک سیاسی تحریک سے وابستہ کارکن ہو جب بھی ہماری پارٹی کا کوئی پروگرام ہوتا خواہ کہاں پر بھی ہوتا میں اپنے دوستوں ساتھیوں کو لیکر جاتا تاکہ پارٹی کے لوگوں میں اپنی حیثیت بھی بنا سکوں اور کوئی ہماری پارٹی کے حوالے سے یہ نہ کہیں کہ اس میں کارکنوں کی کمی ہے اس لئے بعض اوقات اپنے جیب سے اخراجات کرتا جو کبھی کبھار مجھے مل جاتے لیکن زیادہ تر مجھے نہیں ملے اسی طرح پارٹی کے پروگراموں میں زندہ باد کے نعرے میں نے ہی زیادہ لگائے اپنے پارٹی کیلئے میں نے جیل بھی کھائی اور ڈنڈے بھی کھائے۔ جس کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ میں اپنی پارٹی سے مخلص تھا لیکن آج ہماری پارٹی میں لوٹوں کی بھرمار ہے ایسے لوگ ہماری پارٹی میں گھس آئے ہیں جو پہلے نہ صرف ہمیں بلکہ ہمارے رہنما کو بھی گالیاں دیتے تھے لیکن اب اسی زبان سے جس سے ہمارے خلاف باتیں کرتے تھے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں ان میں کچھ ایسے لیڈر بھی شامل ہیں جن کے پاس تو کچھ نہیں لیکن پیسہ وہ بھی حرام کا بہت ہے اسی وجہ سے پارٹی میں آہستہ آہستہ یہ لوگ اپنی جگہ بنا رہے ہیں اور قبضہ مافیا کی طرح ہر جگہ پر گھس آئے ہیں اسی پیسے کے بل بوتے پر ان کے مخصوص کارکن اب ہماری جگہ لئے بیٹھے ہیں اپنی پارٹی کیلئے ڈنڈے جیل میں نے کاٹی لیکن اب میری

اوقات نہیں اور ان لوگوں کی اوقات ہیں جو پارٹی میں پیسہ خرچ کرتے ہوں یا پھر چاپلوسی کرنا جانتے ہوں مجھ جیسے پارٹی کارکنوں کی کوئی وقعت نہیں اب میرا اپنی پارٹی سمیت ہر سیاسی پارٹی سے دل بھر گیا ہے حالانکہ میں گذشتہ 15 سالوں سے اپنی پارٹی کیساتھ وابستہ رہا ہوں لیکن نہ تو ہماری کوئی سنتا ہے نہ ہمیں کوئی لفٹ کراتا ہے پارٹی کے رہنمائوں کواب مجھ جیسے کارکنوں کی ضرورت نہیں شائد۔ یہ کچھ جملے اور دل کی بھڑاس تھی جو گذشتہ دنوں ایک سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے ایک کارکن نے لکھ کر دیئے تھے اس کا مقصد تھا کہ اس طرح کرنے سے شائد ہمارے معاشرے میں پائے جانیوالے "کمینوں" میں عقل آجائے اور زندہ باد اور مردہ باد کے چکر سے نکل جائے۔

کارکن کسی بھی ادارے /سیاسی تحریک میں پارٹی کا اہم سرمایہ ہوتے ہیں کتنی ہی بڑی تحریک /ادارہ کیوں نہ ہو اگر ان کے کارکنوں میں خلوص اور کام کرنے کا لگن نہ ہو تو ہر چیز کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے ہمارے اداروں کا تو اللہ ہی حافظ ہے یہاں پر سیاسی پارٹیوں سے وابستہ کارکنوں کی بات کرتے ہیں ہمارے پشتو میں ایک مثل مشہور ہے چہ دا" مینخے یار سنڈاوی" یعنی دوستیاں اور رشتہ داریاں ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ہوتی ہیں خیر ہمارے ہاں جس طرح کے سیاست دان اور لی ڈر ہے اسی طرح ان کے کارکن بھی ہے بلکہ سیاست کے میدان میں اس ملک میں کارکن اپنے لی ڈروں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل

رہے ہیں خواہ یہ معاملہ لوٹ مار کا ہویا شوٹرا ماری کا بہت سارے کارکن راقم نے ایسے خود دیکھے ہیں جن کے اپنے پارٹی لی ڈروں کیساتھ رابطے ہیں اور انہی رابطوں کو استعمال کرتے ہوئے شوٹرا ماری کررہے ہیں یعنی بھرتیوں سے لیکر لوگوں کے بنیادی اور جائز کام تک پیسے لیتے ہیں جن میں ان کارکنوں کا اپنا ایک پرسنٹیج ہوتا ہے اسی چکر میں بہت سارے "تش پاٹڑے" ورکروں نے اپنے لئے لینڈ کروزور اور بنگلے بھی خرید لئے ہیں۔کچھ عرصہ قبل خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے والے پختون خوار کی پارٹی میں ایک سابق سالار سے راقم کی ملاقات ہوئی تھی چارسدہ سے تعلق رکھنے والے سالار کی عمر 50 سال سے اوپر تھی اور اس نے ساری عمر اپنی پارٹی کی خدمت کی تھی بقول اس کے پارٹی کے چکر یں اس نے شادی بھی نہیں کی اب جبکہ ہر کوئی اپنے خاندان کیساتھ زندگی گزار رہا ہے وہ سالار کچہری روڈ پشاور پر بوجھ اٹھاتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے اس نے پختون خواروں کی حکومت آتے ہی اپنے لئے کوئی روزگار مانگنے کی کوشش کی جو اسے نہیں ملی بعد ازاں اس نے زکواۃ کی مد میں رقم کیلئے درخواستیں دی لیکن ایک خان سے دوسرے خان کا سفر کرنے کے باوجود اسے زکواۃ کی رقم بھی نہیں ملی اسی باعث اب وہ اپنے آپ کو گالیاں دے رہا تھا اور آخر کار اس نے جی ٹی روڈ پر اپنے سالاری کی وردی بھی جلاڈالی بقول اس سالار کے جب اس عمر میں میرا کوئی پوچھنے والا نہیں تو پھر اس نے اس پارٹی کو کرنا ہی کیا ہے۔

ہمارے ہاں مختلف سیاسی پارٹی سے وابستہ کارکنوں کی سیاسی تربیت بالکل نہیں ہوئی جس کا اندازہ مختلف پارٹیوں کے جلسوں پروگراموں میں ان کے کارکنوں کی ہلڑ بازی طوفان بدتمیزی اور بدمعاشیوں سے کی جاسکتا ہے کچھ عرصہ قبل طوفان لانے اور اپنے آپ کو پھنے خان سمجھنے والی پارٹی کے کارکن حقیقت میں طوفان تو نہیں البتہ طوفان بدتمیزی برپا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اپنے لی ڈر کیساتھ تصاویر لینے کے چکر میں کارکن کیا نہیں کرتے اس کا اندازہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے وابستہ صحافیوں کو خوب ہے زیادہ تر نوجوان طبقے پر مشتمل طوفان بدتمیزی برپا کرنے والے اس پارٹی کے کارکنوں میں بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں ۔خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی بنانے والے پختون خوار کے ٹھیکیداروں کی پارٹی کے کارکنوں کا بھی یہی حال ہے ڈھول کی تاپ پر ٹھمکے لگانے والے کارکن ہر ایک کو اسلحہ کی زور پر ٹھیک کرنا اپنا فرض العین سمجھتے ہیں عام لوگ کیساتھ رویہ تو الگ صحافت سے وابستہ لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ ان کے کارکنوں ہیں نہیں ہاں اگر ان کا اپنا مقصد ہو تو پھر بقول کسی کے گدھے کو بھی باپ بنانے سے گریز نہیں کرتے ۔اپنے آپ کو شہداء کی پارٹی قرار دینے والی خاندانی پارٹی کا بھی یہی حال ہے لی ڈر اگر سیر ہے تو کارکن چوری اور اور سینہ زوری میں سواسیر ہے گذشتہ پانچ سالوں میں اس ملک کے کمی کمینوں کا خون چوسنے والے پارٹی کے کارکن کتنی دیدہ دلیری سے لوگوں میں پھر سے انتخابات کی چکر میں گھوم رہے ہیں ہر چیز کو پیسے کے بل بوتے پر

لینے کے خواہشمند اس پارٹی کے کارکنوں میں وفاداری نام کی کوئی چیز نہیں ہفتہ پہلے کسی اور کے حق میں نعرے لگانے والے دو ہفتے بعد اسی کو گالیاں دیتے ہوئے اور نئے آنیوالے کیلئے خیر مقدمی بینرز لگانے میں پیش پیش ہیں جسے روڈ کنارے دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نہ تو ان میں شرم اور حیا نام کی کوئی چیز ہے اور نہ ہی انہیں.برداشت کرنے والے کمی کمینوں میں غیرت نام کی کوئی چیز ہے -ان کے مقابلے میں کسی زمانے میں مذہبی جماعتیں اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے کارکن کسی حد تک منظم ہیں اور ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں کرتے لیکن ان میں بھی سیاسی پارٹیوں کے دیکھا دیکھی بدتمیزی والے جراثیم آنا شروع ہوگئے ہیں-ان حالات میں پارٹی لیڈروں سے گزارش ہے کہ پہلے اپنے کارکنوں کی تربیت کا اہتمام کرے ساتھ ہی ان کے حقوق / فرائض بھی انہیں سمجھادیں تو شائد شکایتوں کا سلسلہ ختم جائے اور کارکن اپنی پارٹیوں سے بھی لوٹے نہ بنیں.

قبائلی لوگو! ہم سب شرمندہ ہیں!

تم لوگوں نے رویئے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں ہمارے گھروں میں مرنے والے بچے خواتین اور بزرگوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ہمیں احتجاج کا حق بھی نہیں دیا گیا حالانکہ ہمارا احتجاج صرف انصاف کے حصول کیلئے تھا لیکن گورنر ہاؤس کے سامنے ہونیوالے احتجاج میں قبائلی علاقے خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کیساتھ تم لوگوں نے جس طرح کا سلوک کیا اس سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہماری اس ملک میں حیثیت کیا ہے ہم مر بھی جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں اس لئے میں مجاہدین زندہ باد کا نعرہ لگا رہا ہوں لعنت ہو تم لوگوں اور تمھارے اس سسٹم پر جس ہیں غریب قبائلی شہری کو کوئی حق حاصل نہیں۔

یہ اس نوجوان کے جذبات ہیں جس کا تعلق قبائلی علاقہ خیبر ایجنسی سے تھا اس کا چچا زاد بھائی ان اٹھارہ لاشوں میں شامل تھا جسے فائرنگ کرکے قتل کردیا گیا تھا ان افراد میں ایک بچی اور ایک خاتون بھی شامل تھی جسے خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے افراد نہیں لائے تھے صرف سولہ لاشیں اٹھا کر یہ لوگ رنگ روڈ پر احتجاج کیلئے آئے تھے۔ لیکن جب یہ ہجوم سربند کے علاقے میں پہنچ

گیا تو وہاں پر تعینات پولیس اہلکاروں کو متعلقہ علاقے کے ایس ایچ او نے فائرنگ کرکے مظاہرین کو منتشر کرنے کا حکم دیا اور لاشیں شہر کی طرف نہ لے جانے کے احکامات دیئے پولیس نے فائرنگ تو کردی لیکن مظاہرین منتشر تو نہیں البتہ مشتعل ضرور ہوگئے جس کے بعد رنگ روڈ پشاور پر ہونیوالا مظاہرہ باڑہ سے تقریبا چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے پشاور صدر سے ہوتا ہوا پریس کلب پہنچا جہاں پر پولیس نے خاردار تاریں رکھ کر روڈ بلاک کرنے کی کوشش کی تاہم جن لوگوں کے رشتہ دار اس واقعے میں جاں بحق ہوگئے تھے وہ انتہائی مشتعل تھے اور انہوں نے روڈ کنارے پڑے وائر کو ختم کرکے گورنر ہاؤس کا رخ کرلیا راستے میں پولیس افسران اور انتظامیہ ان سے مذاکرات کی کوشش کرتی رہی تاہم ان لوگوں کا موقف تھا کہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔انصاف کے حصول کیلئے آنیوالے ان مظاہرین نے گورنر ہاؤس کے باہر سولہ میتیں رکھ کر مظاہرہ کیا مختلف سیاسی ومذہبی جماعتوں کے رہنماء موقع پر آئے تند و تیز تقریریں کیں اس موقع پر قبائلی ممبر اسمبلی بھی ساڑھے چار سال بعد آئے اور بات کرنے کی کوشش کی تاہم لوگ مشتعل ہوگئے اور انہوں نے قبائلی ممبر اسمبلی کی درگت بنا دی تاہم بعد میں ان کے سیکورٹی گارڈ نے فائرنگ کرتے ہوئے اسے لے جانے میں کامیاب ہوگئے فائرنگ سے ایک شخص زخمی ہوگیا سولہ میتیں رکھ کر مظاہرین کا دھرنا تقریبا پندرہ گھنٹے تک جاری رہا جس کے بعد گورنر ہاؤس میں دس رکنی کمیٹی سے مذاکرات ہوئے اسی دوران پولیس نے میڈیا کو وہاں سے ہٹانے کیلئے یہ

افواہ پھیلا دی کہ مظاہرین میں خود کش داخل ہوگیا ہے اور اس کے بعد شیلنگ فائرنگ اور پانی ڈال کر لوگوں کو منتشر کردیا گیا اور میتیں ہسپتال منتقل کر دی گئی۔ حکمرانی کے مزے لوٹنے والوں کیلئے یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن راقم نے سربند کے علاقے سے لیکر گورنر ہاؤس تک ہونیوالے مظاہرے کی کوریج کے دوران جتنی نفرت سیکورٹی فورسز اور پولیس کیلئے ان مشتعل مظاہرین اور خصوصا کالج کے طلباء میں دیکھی وہ آج تک نہیں دیکھی ان لوگوں نے مجاہدین زندہ باد کے نعرے لگائے اور سیکورٹی فورسز کو دیکھ کر گالیاں دی۔ اس موقع پر موجود صحافیوں نے کوشش کی کہ صورتحال مزید کشیدہ نہ ہو ۔ اور فائرنگ کا واقعہ پیش نہ آئے

رات کو گورنر ہاؤس میں ہونیوالے میٹنگ کے دوران پولیس کی فائرنگ شیلنگ اور پانی مظاہرین پر چھوڑ دینے کے واقعے کے بعد ایک قبائلی نوجوان کی راقم سے ملاقات ہوئی جس نے پہلے تو میڈیا کو گالیاں دی کہ ان کے علاقے میں ہونیوالے سولہ لاشوں کو کوریج صحیح نہیں کی الیکٹرانک میڈیا سے اس قبائلی نوجوان کا گلہ تھا کہ اس طرح کا ظلم کی کوریج نہ کرنا بھی ظلم ہے اور میڈیا بھی اس ظلم میں برابر کا شریک ہے ۔اس قبائلی نوجوان کے بقول کراچی میں مرنے والے کسی ایک شخص کی قتل پر پوری بلیٹن لگی ہوتی ہیں اسی طرح پنجاب میں ہونیوالے واقعات پر بھی پورا دن خبریں چلائی جاتی ہیں لیکن ہمارے سولہ لاشوں کی

کوریج کس طرح میڈیا نے کی یہ سب لوگوں کو پتہ ہے کیا ہم جانوروں سے بھی بدتر ہیں جو ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جا رہا ہے ایک طرف آپریشن کے نام پر ہمیں مارا جا رہا ہے دوسری طرف ظلم کو لوگوں کے سامنے لانے والے خاموش بیٹھے ہیں ان حالات میں تم قبائل سے کیا توقع رکھتے ہو کہ تمھاری حفاظت کیلئے اپنی جانیں قربان کرینگے تف ہے تم لوگوں پر اور ان لوگوں پر جو حکمران بنے بیٹھے ہیں قبائلی نوجوان یہ باتیں کرتے ہوئے روپڑا اس کا کہنا تھا کہ ایک لی ڈر کی موت پر میڈیا والے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور اسے شہادت کے اعلی مرتبے پر پہنچا دیتے ہیں لیکن ہمارے قبائلی کیا کتوں سے بھی بدتر ہیں جن کی بے گناہ موت کا کسی کو غم نہیں لیکن غم مت کرو یہ اگر قبائلی عوام کیساتھ ہو رہا ہے تو انشاء اللہ جلد یہ صورتحال اس ملک کے اندر آئیگی اور پھر تمھاری میڈیا بھی ان لوگوں کا نشانہ ہوگی پھر تم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ قبائلیوں کیساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے روتے ہوئے اس قبائلی نوجوان نے کہا کہ لعنت ہے تم پر تمھارے سسٹم پر اس سسٹم میں بیٹھے حکمرانوں پر اور بے حسی دکھانے والے ہر شخص پر جس کے دل میں ہمارے قبائلی لوگوں کا دکھ و درد نہیں اور میں اس قبائلی کو نہ تو دلاسا دے سکا اور نہ ہی اسے کوئی جواب دے سکا بلکہ خاموش کھڑا قبائلی نوجوان کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا کیونکہ میرے ہاتھ خود بھی خالی تھے۔

تعلیم ترقی کی کنجی لیکن کنجی کا حال !

تعلیم ہی ترقی کی کنجی ہے اور اس کے بدولت قومیں بام عروج پر پہنچتی ہیں یہ وہ خوبصورت جملہ ہے جو ہر جگہ پر سننے کو ملتا ہے اور پختونخوار میں ہم جیسے کی کمینوں پر مسلط حکمرانوں کے دعوے کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے یہ دعوے کس حد تک درست ہیں اس کا اندازہ گذشتہ دنوں اپنے ہی گاؤں کے ایک مسجد سکول کو دیکھنے کے بعد ہوا کہ آفیسر میس میں کارپٹڈ ماحول میں بیٹھ کر ہمارے حکمران جتنی بکواس میڈیا کے سامنے کرتے ہیں حقیقت میں اس حوالے سے کچھ بھی نہیں - خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی کا دعوی کرنے والے پارٹی کے رہنماء کے اپنے حلقہ یعنی این اے سیون اور پی کے 19 جس میں انہی کی اپنی بدمعاشی ہے کی سکول کی حالت زار ایسی ہے جسے دیکھ کر نہ صرف اپنے آپ سے شرم آتی ہیں بلکہ کی کمینوں پر مسلط حکمرانوں پر تف کرنے کو دل کرتا ہے اگر کسی کو حکومت کی تعلیم کی بہتری کے حوالے سے دیئے جانیوالے بیانات کا حقیقی حال دیکھنا ہے تو وہ گورنمنٹ مسجد پرائمری سکول عبدالاکبر خان عمرزئی کا رخ کرلے مسجد کنارے بننے والے اس سکول میں طلباء و طالبات کی تعداد 140 ہے جن میں 60 کے قریب طالبات ابھی بھی پڑھ رہی ہیں نرسری سے چہارم تک سکول ہیں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہیں 1979 سے بننے والے اس سکول میں ہر مہینے بچوں کی تعداد کم ہورہی ہیں جس کی وجہ یہاں

پر بننے والے غیر سرکاری سکول ہیں اور والدین اپنے بچوں کو سرکاری سکول سے اٹھا رہے ہیں کیونکہ ان کے بچوں کو تعلیم تو مل رہی ہیں لیکن ان کے بچوں کو تحفظ حاصل نہیں۔ دہشت گردی کی لہر میں اپنے لئے سیکورٹی کے نام پر لاکھوں روپے اڑانے والے ان حکمرانوں کو غریب غرباء کی بچوں کا اتنا خیال ہے کہ اس پرائمری سکول میں بنیادی سہولیات تک موجود نہیں نرسری سے لیکر کلاس چہارم تک پڑھنے والے ان بچوں کیلئے پینے کا پانی تک موجود نہیں نہ ہی سکول کی چار دیواری ہے جس کی وجہ سے سکول ختم ہونے کے بعد یہاں پر ہیروئنچی ہیروئن اور چرس پیتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھار سکول میں قیمتی چیز ٹاٹ یا چاک کا ڈبہ چوری کرکے لے جاتے ہیں بچے پھٹے پرانے ٹاٹوں پر پڑھ رہے ہیں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ان معصوم بچوں کیلئے باتھ روم کی سہولت تک نہیں سکول کے بچوں کے بقول وہ سکول کے اطراف میں واقع مقبرے میں جا کر رفع حاجت کرتے ہیں جس پر مقامی لوگ ان بچوں کو مارتے ہیں لیکن شرم کا مقام ہے کہ ساتھ طالبات جو اس سکول میں پڑھ رہی ہیں کیلئے کوئی واش روم تک نہیں اسی باعث ان طالبات کو جن مشکلات کا سامنا ہے وہ یہی طالبات ہی بیان کر سکتی ہیں۔ ملالہ کے نام پر خیرات زکواۃ جمع کرنے والے حکمران لڑکیوں کی تعلیم کے دعوے تو بہت کرتے ہیں اور طالبان کو تعلیم دشمن قرار دیتے ہیں لیکن ان کی اپنی پالیسی تعلیم کے

حوالے سے کیا ہے اس سکول کی حالت زار دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میڈیا پر بیان دینا الگ ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ہر شہری کو تعلیم کی فراہمی کس کی ذمہ داری ہے یہ وہ سوال ہے جو اس سکول کے معصوم بچے ان کے حلقے پر مسلط خدائی خوار کے لیڈروں سے کرنا چاہتے ہیں -

گورنمنٹ مسجد پرائمری سکول عبدالکبر خان عمرزئی میں بچوں کیلئے بلیک بورڈ تک نہیں چار اساتذہ کیلئے کرسیاں تک موجود نہیں سکول میں کرسیاں اور بلیک بورڈ دوسرے سکولوں سے عاریتاً لی گئی ہیں اورجب سکول بند ہوجاتا ہے تو یہ سامان اساتذہ چوری کے ڈر کے اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں کیونکہ نہ تو سکول کی چار دیواری ہے اور نہ ہی سکول کا چوکیدار ہے اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے اس سکول کو سالانہ دو ہزار روپے دیئے جاتے ہیں جس میں سکول کے بچوں کیلئے پنسل اور شاپنر بھی خریدے نہیں جا سکتے حالانکہ قانوناً پی ٹی سی فنڈز سالانہ کے حساب سے آٹھ ہزار روپے بنتا ہے لیکن یہ چھ ہزار روپے کہاں غائب ہورہے ہیں اس کا جواب تو اس محکمہ تعلیم میں تعینات مگر مچھ ہی دے سکتے ہیں جو کہ کمینوں کا ٹیکس بھی ان معصوموں کو نہیں پہنچا رہے حالانکہ یہی مگر مچھ ہر تین ماہ بعد یہاں پر آکر انسپکشن بھی کرتے ہیں اور حالت زار بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن یہاں پر چونکہ غریب غرباء کے بچے اور بچیاں پڑھ رہی ہیں اس لئے سکول میں کھانے پینے کے بعد ڈکار لیکر دفتر آجاتے ہیں اور پھر انہیں

مسجد میں پڑھنے والے بچے یاد بھی نہیں رہتے یہ الگ بات کہ انہیں یاد دہانی کیلئے درخواستیں بھی سکول کے اساتذہ کی طرف سے دی جاتی ہیں لیکن وہ بھی دفاتر میں ردی کی ٹوکریوں کی نذر ہورہی ہیں۔ سب سے خطرناک بات سکول کی موجودہ عمارت ہے جو بقول واقفان حال کہ اس سکول پر علاقے کے دو خوانین کا مسئلہ ہے قبضہ گروپ کی وجہ سے حکومت نے بھی آنکھیں بند کرلی کہ کون خان خوانین کو کمی کمینوں کیلئے ناراض کرسکتا ہے غریب لوگ اور ان کے بچے تو ویسے بھی ووٹ کیلئے ضروری ہیں باقی حکمرانی کیلئے انہیں خوانین کی ضرورت ہے سو اس حوالے سے بھی کوئی کارروائی نہیں کی جارہی ۔

یہ خوانین کو سپورٹ کرنے والے اس علاقے کا حال ہے جہاں پر خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی کا دعوی کرنے والے حکمران اگلے انتخابات کیلئے سرکاری مقامات پر جلسے کرکے دعوے کرتے ہیں کہ انہوں نے دودھ اور شہد کی نہریں اس صوبے میں بہادی ہیں جس کی وجہ سے کمی کمین اور ان کی اولادیں عیاشیوں میں مصروف عمل ہیں حالانکہ دہشت گردی کی وجہ سے تین ہزار سے زائد سکول جو مختلف علاقوں میں تباہ ہوگئی ہیں ان کی دوبارہ آبادکاری کا عمل بعض علاقوں میں تو شروع ہی نہیں ہوا اور جن جگھوں پر شروع کیا گیا وہاں پر اتنی سست روی کا شکار ہے کہ ان علاقوں کے بچوں مجبورا ہاتھوں میں قلم کے بجائے کلاشنکوف اٹھانے پر مجبور ہونگے ایسے میں تعلیم ترقی کی کنجی ہے والا بیان تو میڈیا

کی حد تک اچھا ہے لیکن اس کنجی کی حالت زار کیا ہے صرف ای ایک سکول سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

طاہر القادری ایک نظر میں

ڈاکٹر طاہر القادری عرف عبدالشکور قادری کو رائل کینڈین مانیٹرنگ پولیس نے پانچ فروری کو کینیڈا میں طلب کرلیا جہاں پر ان سے سیاسی پناہ کا حلف توڑنے پر وضاحت لی جائیگی کینڈین قانون کے مطابق کینیڈا میں سیاسی پناہ لینے والا شخص اس ملک میں واپس نہیں جاسکتا جہاں اس کی جان کو خطرہ ہو ڈاکٹر طاہر القادری نے 2008 ء میں عبدالشکور قادری کے نام سے کینیڈا میں سیاسی پناہ مانگی اور کہا تھا کہ انہیں لشکر جھنگوی سپاہ صحابہ اور طالبان کی طرف سے خطرہ ہے اکتوبر 2009 ء کو کینیڈین حکومت نے ان کا کیس منظور کرلیااور چھ ماہ قبل انہیں کینڈا کی شہریت اور پاسپورٹ دے دیا گیااس کے علاوہ ڈاکٹر طاہر القادری مختلف امراض کی مد میں ویلفیئر فنڈز بھی کینڈین حکومت سے لیتے رہے۔جس کیلئے انہوں نے تین رکنی وکلاء پینل تشکیل دیدیا ہے جو کینڈین عدالت میں ان کا دفاع کرینگے۔

فریدالدین قادری کے ہاں 19 فروری 1951 ء کو پنجاب کے قبیلے سیال میں جنم دینے والے ڈاکٹر طاہر القادری کا تعلق جھنگ سے ہے انہیں چار سال کی عمر میں وہاں پر داخل کیا گیا تھا ان کے ادارے کی ویب سائٹ پر دیئے معلومات کے مطابق اس کے بعد مدرسہ العلوم الشریعہ مدینہ میں انہوں نے تعلیم حاصل کی

تاہم یہ نہیں بتایا گیا کہ ڈاکٹر طاہر القادری نے وہاں پر کتنی تعلیم حاصل کی تاہم یہاں تک بتایا گیا کہ دسویں تک ان کے والد نے انہیں تعلیم دی البتہ مذہبی تعلیم کے حوالے سے کوئی معلومات نہیں دی گئی ڈاکٹر طاہر القادری نے 19 سال کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری لی 1972 میں ایم اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی سے کیا جبکہ 1974 ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی اور 1978 ء تک جھنگ میں بحیثیت وکیل بھی کام کیا بعد ازاں انہیں پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر نوکری مل گئی اور انہوں نے وکالت چھوڑ دی اسلامک لاء میں پی ایچ ڈی کے دعویدار ڈاکٹر طاہر القادری کی اپنی ویب سائٹ پر اس حوالے سے کوئی معلومات نہیں دی گئی کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری انہیں کب اور کہاں ملی۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے اکتوبر 1981 ء میں منہاج القرآن قائم کیا جس کیلئے کئی ہزار ایکڑ زمین لی گئی تاہم اس کی تعمیر کیلئے فنڈنگ کہاں سے ملی یہ سوال کسی کے پاس نہیں ادارہ منہاج کے جھنڈے کا رنگ بھارتی جھنڈے کی طرح ہے تاہم اس میں صرف تبدیلی بھارت کے جھنڈے کے درمیان چکرا کا نشان ہے جو کہ ادارہ منہاج کے جھنڈے میں نہیں۔ 25 مئی 1989 ء کو انہوں نے پاکستان عوامی تحریک کے نام سے سیاسی تحریک کا آغاز کیا اور 1990 ء کے انتخابات میں حصہ لیا لیکن بدقسمتی سے انہیں کوئی سیٹ نہیں ملی۔ 1991 ء تحریک نفاذ فقہ

جعفریہ کیساتھ معاہدہ کیا۔ 20 اکتوبر 2002 ء کو ہونیوالے انتخابات میں پچیس ہزار ووٹوں سے ڈاکٹر طاہر القادری قومی اسمبلی پہنچ گئے ان کے حریف پانچ ہزار کے ووٹوں سے رہ گئے 29 نومبر 2004 ء کو انہوں نے یہ کہہ کر قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفی دیا کہ حکومت ناکام ہے اور اس بارے میں ڈاکٹر طاہر القادری نے 41 صفحات پر مشتمل استعفی بھجوادیا جس میں استعفی دینے کی وجوہات بھی بیان کی گئی مارچ 2012 ء میں برطانیہ کے رائل ایئر فورس سے ریٹائرڈ ہونیوالے جوئل ایس اے ہائیورڈ کو سٹریٹجک پالیسی ایڈوائزر کی حیثیت سے لیا یہودی نسل کے جوئل ایس اے ہائیورڈ ء میں نیوزی لینڈ میں پیدا ہوئے تھے جوئل ایس اے ہائیورڈ کے بارے میں کہا 1964 جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہوئے ہیں ڈاکٹر طاہر القادری اپنے خواب سنانے کے حوالے سے بہت مشہور ہیں جن میں ان کا دعوی تھا کہ امام ابو حنیفہ ان کے خواب میں آئے۔

ڈاکٹر طاہر القادری کی تبلیغی زندگی کی ابتداء میاں محمد شریف کے اتفاق مسجد سے شروع ہوئی اور ایک مرتبہ میاں محمد نواز شریف انہیں کندھا دیکر غار حرا لے گئے تھے بعد ازاں ڈاکٹر طاہر القادری نے کہا تھا کہ ایک کشمیری فرشتہ انہیں لے گئے تھے۔ ڈاکٹر طاہر القادری کے بارے میں بھارتی تنظیم correct islamic faith foundation نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جن میں ان کی ذات کے حوالے سے مختلف باتیں لکھی ہیں جن میں ان کے بچپن میں عیسائی مشنری میں تعلیم حاصل کرنے کے حوالے بھی موجود ہیں تاہم رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر ڈاکٹر طاہر

۔ القادری سیاست سے دور رہتے تو بہتر تھا اور ان کی صحت کیلئے دعاء بھی کی گئی ہیں ڈاکٹر طاہر القادری نے لانگ مارچ کرکے جہاں ملک کے اندر اپنی حیثیت منوالی وہیں پر ملک میں دھرنے کی ایک نئی سیاست کا آغاز بھی کردیا ہے کچھ لوگ انہیں کینڈین انقلاب کا نام دیتے ہیں اور حکومت سے معاہدہ ہونے کے بعد انہیں مبارکباد بھی دی جارہی ہیں کہ معاہدے کے بعد ملک میں کرپشن ختم ہوگئی ہے مہنگائی ختم ہوگئی ہے اور یزید کی حکومت بھی ختم ہوگئی ہے اور اب اس ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنا شروع ہوجائینگی جس سے اس ملک میں رہنے والے غریب غرباء عیاشی کرسکیں گے جبکہ ہمارے کچھ ساتھی ڈاکٹر طاہر القادری سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ ڈرون حملوں میں شہید ہونیوالے بے گناہوں کا خون کس کے سر پر ہے اور ڈرون حملوں کی مذمت کرنے میں کیا رکاوٹ ہے جامعہ حفصہ کی بچیوں کی مظلومانہ شہادت کی مذمت اب تک انہوں نے کیوں نہیں کی کراچی میں صرف ایک سال 2012 میں مرنے والے تقریبا 2200 بے گناہوں کا تذکرہ انہوں نے دھرنے کے دوران کیوں نہیں کیا ڈاکٹر طاہر القادری نے پاکستان میں امریکی دراندازی کی مذمت کیوں نہیں کی چور جرنیلوں کے احتساب کا نعرہ انہوں نے کیوں نہیں لگایا سابق صدر مشرف کی حمایت کرنے پر قوم سے معافی کیوں نہیں مانگی ابھی تک انہوں نے اپنے اثاثوں کا حساب قوم کو نہیں دیا کہ کرائے کی

موٹر سائیکل سے بلٹ پروف کنٹینر اور پجارو کا سفر انھوں نے کس طرح مکمل کیا) شائد ان کی یہ روداد ہم جیسوں کے کام آئے (اسی طرح شہادت حسین کی راہ میں نکلنے والے ڈاکٹر طاہر القادری نے بم اور بلٹ پروف کنٹینر میں رہائش کیوں اختیار کی اور کیا حضرت امام حسین نے قافلے والوں سے الگ کنٹینر میں قیام کیا تھا -

سال 2013 قبائلی علاقوں کیلئے مزید خطرناک

سال 2013 ء قبائلی علاقوں کیلئے مزید خطرناک ثابت ہوگا جس کی وجہ پاکستان میں انتخابی سال ہونا قرار دیا جارہا ہے حکمران طبقہ وفاداری دکھانے کیلئے بہت کچھ کرینگے دوسری اسی سال کے آغاز میں ڈرون حملوں میں طالبان کے متعدد اہم لیڈر نشانہ بنائے گئے اور ان حملوں میں مزید شدت آنے کا امکان ہے اسی کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے واقعات میں اہم لیڈروں کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات میں اضافہ بھی قرار دیا جارہا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے ایک لیڈر نے گذشتہ دنوں عدالت عالیہ پشاور کے سامنے قبائلی جوانوں سے اپنے خطاب میں مزید تین سال قبائلی علاقوں کیلئے سخت ترین قرار دیئے ہیں۔ سال 2013 ء میں کے گآغاز میں تحریک طالبان پاکستان کے مولوی نذیر 3 جنوری 2013 ء اپنے دس ساتھیوں سمیت امریکی ڈرون کا نشانہ بنے مولوی نذیر اپنے قافلے کے ہمراہ وانا جارہے تھے ان کا قافلہ بیرمل سے سرکنڈی کی طرف جاتے ہوئے ڈرون میزائل کا نشانہ بن گیا مولوی نذیر تحریک طالبان پاکستان کے اہم دوسرے کمانڈر تھے جو بیت اللہ محسود کے بعد ڈرون حملے کا نشانہ بنے بیت اللہ محسود 2009ء میں ڈرون حملے کا نشانہ بن گئے تھے مولوی نذیر کے امریکی جاسوس طیارے کے میزائل حملے میں جاں بحق ہونے کے بعد بہاول خان عرف صلاح الدین ایوبی کو ان کی جگہ تحریک طالبان پاکستان کا نیا

کمانڈر تعینات کردیا گیا-2007 ء میں مولوی نذیر نے اس وقت شہرت حاصل کی جب اس نے احمد زئی قبائل کے علاقے میں غیر ملکی عسکریت پسندوں کے خلاف آواز اٹھائی اس وقت اسلامک موومنٹ آف ازبکستان کے سربراہ طاہر یلدوف تھے جس کے بعد مولوی نذیر نے حکومت پاکستان سے امن معاہدہ بھی کیا جس کے نتیجے میں فورس پر حملے نہ کرنے کا عندیہ دیا گیا مولوی نذیر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نہ صرف القائدہ سے ان کے نزدیکی تعلقات تھے بلکہ حقانی گروپ سے بھی منسلک رہ چکے تھے اور حزب اسلامی کے ممبر بھی تھے مولوی نذیر کو 29 نومبر 2012 اور 4 دسمبر 2012ء خود کش حملے کا نشانہ بنایا گیا تھاتاہم وہ ان حملوں میں بچ نکلے تھے جس کے بعد 5 دسمبر کو مولوی نذیر نے محسود قبائل کو علاقے سے نکلنے کی ہدایت کی تھی اور اسی پر حکیم اللہ محسود گروپ کے ترجمان احسان اللہ احسان نے ان خود کش حملوں سے برءیت کا اعلان کیا تھا اور کہا کہ ان کا گروپ ان حملوں یں ملوث نہیں رہا ابھی یہ مسئلہ جاری تھا کہ کمانڈر مولوی عباس کو تین ساتھیوں سمیت نشانہ بنایا گیا جس کے بعد مولوی نذیر بھی ڈرون حملے کا نشانہ بن گئے۔

جنوبی وزیرستان میں ایک رپورٹ کے مطابق 2012 ء میں 261 ء جبکہ سال 2011 ء میں 281 ء واقعات دہشت گردی کے ریکارڈ کئے گئے تھے دہشت گردی کے حوالے سے کام کرنے والے ایک ادارے کی رپورٹ کے مطابق 2009 ء میں 636 سویلین 350 فوجی اور 4252 عسکریت پسند دہشت گردی کے واقعات میں جاں بحق ہوئے اسی طرح 2010 ء

میں 540 سویلین 262 فوجی اور 4519 عسکریت پسند جاں بحق ہوئے سال
ء میں 488 سویلین 233 فوجی اور 2046 عسکریت پسند دہشت گردی کے 2011
واقعات کی نذر ہو گئے سال 2012 ء میں 549 سویلین 306 فوجی اور 2046
عسکریت پسند مختلف واقعات میں جاں بحق ہو گئے جبکہ سال 2013 ء میں ابھی تک
اس علاقے میں 12 سویلین اور 72 عسکریت پسندوں کی ہلاکتوں کی اطلاع ہے جو
تقریبا 84 بتائی جاتی ہیں ان میں کسی فوجی کی ہلاکت کی اطلاع نہیں-سال 2011 ء
میں 185 بم دھماکوں میں 203 افراد کی ہلاکتیں ہوئی جبکہ 2012 ء میں 297 بم
دھماکوں میں 441 افراد کی ہلاکتیں ریکارڈ کی گئی اسی طرح 2011 ء میں آٹھ
خودکش حملے ریکارڈ کئے گئے جن میں 77 افراد جاں بحق ہو گئے اس کے مقابلے میں
سال 2012 ء میں 10 خودکش حملوں میں 151 افراد کی جاں بحق ہونے کی
اطلاعات تھی-

سال 2012 ء میں سات قبائلی ایجنسیوں میں خیبر ایجنسی میں تشدد کے زیادہ واقعات
ریکارڈ ہوئے جنوری تک اکتوبر 2012 ء کے دوران 96 بم دھماکے صرف خیبر ایجنسی
کے مختلف علاقوں میں ہوئے اسی طرح لشکر اسلام انصار اسلام حاجی نامدار گروپ اور
عبدالعزام بریگیڈ کے آپسی تصادم کے واقعات بھی سال 2012 ء میں ریکارڈ کئے گئے
اسی علاقے میں اغواء برائے تاوان کے واقعات میں اضافہ بھی ہوا جبکہ کرم ایجنسی خیبر
ایجنسی کے بعد دوسری ایجنسی رہی جہاں پر اہل تشیع کو بھی نشانہ بنایا گیا سال 2012 ء
میں سیکورٹی فورسز کے خلاف عسکریت

پسندوں کی بڑی کارروائی 26 دسمبر کو منظر عام پر آئی جب 400 کے قریب عسکریت پسندوں نے ایف آر پشاور کے علاقے میں حملہ کرکے 22 سیکورٹی اہلکاروں کو اغواء کیا اور بعد ازاں 29 دسمبر کو ان کی لاشیں مل گئیں۔

وزیرستان میں آپریشن کے حوالے سے سال 2012ء میں متعدد مرتبہ حکومت کی جانب سے اعلان کیا گیا تاہم اس کے جواب میں امریکی عہدیداروں کے آپریشن کی حمایت میں بیانات سے نہ صرف حکومت بلکہ سیکورٹی فورسز کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور مذہبی جماعتوں سمیت سیاسی جماعتوں نے بھی اس پر شدید رد عمل کا اظہار کیا جس کی وجہ سے حکومت کو پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اس کے بعد ڈرون حملوں کی شدت میں اضافہ دیکھنے میں آیا حالانکہ اس کے خلاف سال 2012ء میں نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی تنقید کی گئی لیکن ڈرون حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور تحریک طالبان پاکستان کی ٹاپ لیڈرشپ کو نشانہ بنایا گیا سال 2012ء میں 46 ڈرون حملوں میں 344 عسکریت پسند جن میں القاعدہ کے اہم ارکان بھی شامل ہیں ڈرون حملوں کی زد میں آئے اس کے مقابلے میں سال 2011ء میں 59 ڈرون حملوں میں 548 عسکریت پسند نشانہ بنے تھے دہشت گردی سے متعلق کام کرنے والے مختلف اداروں کی رپورٹس کے مطابق سال 2013ء قبائلی علاقوں کے لوگوں کیلئے مزید مشکلات لائے گا اور لوگوں کی بڑی تعداد میں نقل مکانی بھی متوقع ہے۔

میں بہت شوشل ہوں

صبح سویرے فیس بک پر ملنے والا پیغام روزانہ مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے صبح بھیجے جانیوالا یہ پیغام ایک دوست لندن سے روزانہ بھیجتی ہے اور موبائل فون پر آن لائن سوشل ویب سائٹ فیس بک کی وجہ سے میں بھی بہت شوشل ہوں صبح سویرے ملنے والا پیغام گڈ مارننگ کا ہوتا ہے اور مخصوص آواز لگانے کی وجہ سے پہچان کرنے میں بھی آسانی رہتی ہیں اسی باعث میں بستر چھوڑ کر اٹھ جاتا ہوں جس کے بعد باتھ روم جاتے ہوئے یں آن لائن اپنے دوست کیساتھ چیٹنگ ہوتی ہے حالانکہ اس سے قبل میری بیوی کتنی بار مجھے چیخیں مار کر بستر چھوڑنے کا کہتی ہیں لیکن آنکھ ہی نہیں کھلتی نہ ہی بیوی کی آواز سنائی دیتی ہیں سوشل سائٹ پر ملنے والے پیغام کے بعد دن کی سرگرمیوں کا آغاز ہوجاتا ہے۔دفتر جانے سے قبل میں اورکٹ پر ملنے والے دوستوں کو ہیلو ہائے کرتا ہوں یہ واحد جگہ ہے جہاں پر میں اپنے شوشل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تمام دوستوں کی خیر خیریت دریافت کرتا ہوں۔ میرے بچے روزانہ کہتے ہیں کہ ہمیں والد کیساتھ سکول جانا ہے لیکن وقت کی کمی ہوتی ہے اس لئے آن لائن دوستوں کیساتھ محوچیٹ ہوتا ہوں بیگم روزانہ بکواس کرتی ہے کہ بچوں کو خود ہی سکول لے جائو اوران کی انتظامیہ سے بات کرو ٹیچرز سے بچوں کی سکول کی سرگرمیوں کا پوچھ لو لیکن ان روٹین کی چیزوں

کے لئے وقت کہاں پر ہے یہ معمولی باتیں ہیں اور میں آن لائن سوشل سائٹ پر ملنے والے پچیس مختلف ممالک کے دوستوں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا سو بچوں کے سکول جانے کے اوقات میں اپنے دوستوں کیساتھ ہیلو ہائے کرتا رہتا ہوں۔
گھر سے نکلنے کے بعد پڑوسیوں سے رابطے کیلئے وقت نہیں پڑوسی سمجھتے ہیں کہ میں اچھے پوسٹ پر ہوں اور علاقے کے مسائل سمیت مختلف ایشوز پر اپنے عہدے کی وجہ سے میونسپل کمیٹی کے لوگوں سے بات کرسکتا ہوں کئی مرتبہ انہوں نے رابطہ کیا لیکن میں گھر میں ہوتے ہوئے بچوں کو کہہ دیتا ہوں کہ گھر میں موجود نہیں اس کے باوجود تحریری طور پر بھی پڑوسیوں نے چٹ لکھ کر بھیج دیئے کہ ٹائم نکال کر ان سے بات کرو لیکن پڑوسی بھی سمجھتے نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ میرے پاس فالتو وقت بہت ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت کوشش ہوتی ہے کہ کسی پڑوسی سے ملاقات نہ ہو گھر سے دفتر آنے تک ہیں موبائل فون پر یاہو میسنجر کو فون نمبر کیساتھ کنیکٹ کیا ہوا ہے سو اگر کسی دوست کا میسج آجائے تو میں فوری طور پر جواب دیتا ہوں گھر سے دفتر آنے کے بعد فوری طور پر یاہو میسنجر پر آن لائن ہونے کی کوشش ہوتی ہے کیونکہ ایک یونیورسٹی کی طالبہ میرے ساتھ چیٹ کرتی ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ دفتر میں کسی سے بات کئے بغیر کمپیوٹر پر بیٹھ کر چیٹ کرو یہ دفتر کے لوگ بھی اتنی باتیں کرتے ہیں۔

صبح سویرے دفتر میں کام کرنے والا چوکیدار اور مالی بھی اتنی باتیں کرتے ہیں وہ روزانہ میری طبعیت بچوں اور گھر کی خیریت پوچھتے ہیں آخر یہ بھی کوئی طریقہ ہے اتنا وقت کہاں ہوتا ہے ہم جیسے لوگوں کے پاس سوان سے جان چھڑانے کی کوشش کرکے آن لائن سوشل ویب سائٹ پر چیٹنگ کرتا ہوں - یہ شکر ہے کہ سرکاری ملازم ہوں اور فائلوں کے انبار یوں میں روزانہ ڈرامہ کرکے جان چھوٹ جاتی ہیں اور آن لائن رہنے سے دوستوں سے رابطے رہتے ہیں -کچھ روز قبل ایک فائل چیک کررہا تھا کہ آن لائن ہونے کی وجہ سے فیس بک پر پیغام ملا اور جسے دیکھنے کے بعد میں نے میرے منہ سے نکل گیا اوہ نو جس پر دفتر میں آنیوالا شخص سمجھا کہ میرا موبائل جل گیا کیونکہ میں نے غصے میں موبائل نیچے رکھ دیا تھا حالانکہ سوشل سائٹ پر ملنے والی ایک دوست نے مجھ سے دوستی سے انکار کیا تھا موبائل نیچے رکھنے کے بعد سائل نے ادھر ادھر دیکھ کر مجھے پانچ ہزار روپے نئے موبائل کیلئے دیئے اور میں نے بھی جیب میں رکھ کر اس کی فائل اس کے حوالے کردی حالانکہ وہ اس سے قبل منت کررہا تھا لیکن یوں سائلین کیساتھ زیادہ تعلقات نہیں بناتا لیکن اسی سوشل سائٹ کی وجہ سے پیسے ملے اس لئے کچھ سوشل ہونا پڑا -

دوپہر کے اوقات میں زیادہ تر دوست لنکڈ ان پر آن لائن ہوتے ہیں اس لئے دفتر میں بیٹھ کر روزگار کے حوالے سے رابطے ہوتے ہیں اس دوران کھانے کیلئے وقت

بھی نہیں ملتا اس لئے بیٹھے بیٹھے .ر گر ٹھونس لیتا ہوں یہ الگ بات کہ اس کی وجہ سے میری توند بھی نکل رہی ہیں لیکن چونکہ یہ سوشل ویب سائٹ ہم جیسے لوگوں کے کاروباری اور سوشل سرگرمیوں کیلئے ہے اس لئے وقت ضائع کئے بغیر آن لائن سی وینر بھیجنے کی کوشش ہوتی ہے -دفتر کے کئی ساتھی لنچ کرنے کے بعد چہل قدمی کرتی ہے اپنی سرگرمیاں ایک دوسرے کیساتھ شیئر کرتے ہیں لیکن ان کے روزانہ کی بکواس بچوں کی فیسوں میں اضافہ مہنگائی کی بکواس کون سنے ہمیں تو عادت ہو گئی ہے کہ آن لائن دوستوں سے سوشل ویب سائٹس پر بات کرے ویسے بھی یہ پاکستانی قوم رونے کی عادی ہے کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ ان ناپسندیدہ لوگوں کو کمپیوٹر کے بٹن ڈیلیٹ کے ساتھ کنٹرول آلٹ دبا کر ختم کر دیا پھر انہیں بلاک میں ڈال دو کہ یہ لوگ میرا وقت ضائع نہ کرے۔ شوشل ہونے کا ثبوت دینے کیلئے میں آن لائن مختلف ویب سائٹس پر اپنی سرگرمیوں کے بارے میں اپنا سٹیٹس اپ ڈیٹ کرتا ہوں ملکی سرگرمیوں سمیت اپنی ذاتی خیالات بھی ٹویٹر پر دینے کی کوشش ہوتی ہے اسی باعث مجھے مختلف ویب سائٹ پر ملنے والے دوست بہت زیادہ شوشل کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اپنے محلے اور رشتہ دار مجھے مغرور اور ہندو سمجھتے ہیں کیونکہ میں ان کیساتھ بات نہیں کرتا جس کی وجہ صرف اور صرف سوشل ویب سائٹس پر اپنی سرگرمیاں اپ ڈیٹ کرنا اور آن لائن فرینڈز کیساتھ رابطے رکھنا ہے اسی باعث گذشتہ دنوں مسئلہ بھی ہوا جب میں گھر کیلئے شاپنگ کر رہا تھا اور پرس میں پیسے کم ہونے کے باعث دکاندار نے

صرف تین سو روپے کم ہونے کی وجہ سے شاپنگ بیگ سے سامان اتار دیا کہ میں ان کیلیے قابل قبول نہیں تھا یہ تو شکر ہے کہ اس وقت میرا چھوٹا بیٹا وہاں پر خریداری کیلیے آیا اس نے مجھے دیکھ کر بابا کی آواز لگائی تو دکاندار نے اسے پہچان کر سامان واپس شاپنگ بیگ میں رکھ دیا دکاندار کے بقول میں اپنے محلے میں زیادہ شوشل نہیں ہوں اس لئے خیر اس نے معذرت کر لی اور میں نے بھی پروا نہیں کی کون ان لوگوں کو اتنا لفٹ کرائے میں سوشل سائٹس پر شوشل ہوں اب عام لوگوں کیساتھ شوشل ہونے سے تو رہا۔ دفتر سے سیدھا گھر آنے کی کوشش ہوتی ہے نہ کسی رشتہ دار نہ دوست سے رابطے کیلیے کوشش کرتا ہوں سیدھا گھر جانے کی وجہ سے زن مریدی نہیں بلکہ مختلف سائٹ پر کچھ دوست آن لائن ویب کام پر انتظار کرتے ہیں اسی باعث رات گئے تک ان سے سکائپ پر بات ہوتی ہیں،اور بچوں اور بیوی کو اس دوران کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی یہ تو شکر ہے کہ بیگم کی انگلش کمزور ہے اس لئے میرے شوشل ہونے کا اسے نہیں پتہ کہ میں آن لائن سائٹ پر کیا کچھ کہتا ہوں ۔ہاں یہ بات میں مانتا ہوں کہ میں بچوں گھر والوں دوستوں رشتہ داروں محلے والوں کیلیے وقت نہیں نکال سکتا نہ ہی ان سے گپ شپ کرتا ہوں لیکن میرے سوشل سائٹس پر آن لائن دوست کہتے ہیں کہ میں بہت شوشل ہوں اور یہ میرے سب کچھ ہیں۔

پولیس کانسٹیبل کی کہانی اس کی اپنی زبانی

صبح چھ بجے پولیس لائن سے پولیس کی گاڑی میں پہنچنے ہدایت ملی تھی اسی باعث میں ساڑھے پانچ بجے صبح سویرے اٹھ گیا تھا یونیفارم پہننے کے بعد اپنے دیگر ساتھیوں کیساتھ گاڑی میں چارسدہ آگیا ناشتہ بھی نہیں کیا اور اب دن کے ایک بج رہے ہیں رہے ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عیاشی کر رہے ہیں لیکن حقیقت کیا ہے اس کا اندازہ ہی نہیں میں بھوکا کھڑا یہاں پر ڈیوٹی دے رہا ہو کیا میں انسان نہیں ہوں لعنت ہے ان سیاستدانوں پر جن کی سیکورٹی پر ہمیں مامور کیا جاتا ہے یہ وہ شکوے و جذبات ہیں جو گذشتہ دنوں چارسدہ میں ہونیوالے ایک سیاسی پروگرام کی کوریج کیلئے راقم کو پشاور سے مردان سے آنیوالے ایک پولیس اہلکار نے کئے۔ راقم جب اپنی ٹیم کے ہمراہ وہاں پہنچا تو پولیس اہلکار وہاں پر سیکورٹی کیلئے متعلقہ ایریا کو چیک کر رہے تھے چونکہ اس جلسے میں پارٹی کے ایک اعلی عہدیدار اور حکومت کی اہم شخصیات کی آمد متوقع تھی اور اس علاقے میں جلسے سے قبل بھی دھماکہ ہوا تھا اسی باعث سیکورٹی پر خصوصی توجہ دی جارہی تھی جلسے سے قبل دہشت گردوں نے کچرے کے ڈھیر میں بم نصب کیا تھا جو بلاسٹ تو ہوا لیکن خوش قسمتی سے کوئی نقصان نہیں ہوا جس کی وجہ سے بھی پولیس اہلکار سخت ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ وہاں سیکورٹی پر تعینات اہلکار

کامنہ بنا ہوا تھا اور عام لوگوں کیساتھ انتہائی بدتمیزی سے بات کر رہا تھا جب راقم نے اس سے بات کی کوشش کی تو اس کا منہ تو بن گیا لیکن مجبوراً اس کے سامنے دو تین گالیاں حالات کو دینے کے بعد وہ اپنی دل کی بھڑاس نکالنے لگا اور اپنی حالت اور ذہنی کیفیت بتا دی اس کے بقول میٹرک کے بعد غم روزگار نے میرے خاندان اور خصوصاً مجھے ذہنی تناؤ کا شکار کردیا استاد کی نوکری کرنا خواہش تھی لیکن وہ تو نہ ملی البتہ اس کوششوں میں اپنے علاقے کے ایم پی تک رسائی حاصل کی یہ بھی ہمارے جیسے لوگوں کیلئے بڑی ٹینشن تھی لیکن شکر ہے کہ ایم پی اے کے ساتھ کام کرنے والے ایک منشی سے میرے والد کے تعلقات تھے اسی باعث اس نے ایم پی اے بات کی اور طے یہ پایا کہ اگر والد ایک لاکھ روپے ادا کریگا تو مجھے پولیس میں نوکری مل جائیگی اور والدہ نے بہن کیلئے بنائے گئے زیورات فروخت کرکے ایک لاکھ روپے دیدیئے یہ الگ بات کہ والد نے ساری عمر جمع پونجی کرکے میری بہن کیلئے زیور ڈیڑھ لاکھ روپے کا بنوایا تھا لیکن صراف نے ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھایا اور ہم سے وہ ایک لاکھ روپے میں لے لیا-ایک لاکھ روپے ادا کرنے کے بعد مجھے پولیس میں نوکری مل گئی اور والدہ سمیت سب خوش ہوگئے کہ بیٹے کو روزگار مل گیا تربیت ملنے کے بعد پولیس لائن میں میری ڈیوٹی لگ گئی اور صرف سیکورٹی میرا کام تھا لیکن سیکورٹی کی یہ ڈیوٹی بھی پاگل پن ہے میرے ساتھی جنھوں نے میرے ساتھ ٹریننگ لی تھی انہوں نے پیسے خرچ کرکے تھانوں میں تعیناتیاں کروالی لیکن میرے پاس دینے کو کچھ

نہیں تھا اس باعث میں پولیس لائن میں رہ گیا اور اب وی آئی پی سیکورٹی پر ڈیوٹی کرنا میری مجبوری ہے۔ان لوگوں کیساتھ جاتے ہوئے مجھے جتنا ڈر لگتا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں کیونکہ یہ تو چلتے پھرتے بارود کے ڈھیر ہے گاڑی میں جاتے ہوئے یہ ڈر بھی لگتا ہے کہ کوئی ہمیں نہ مارے کوئی بلاسٹ نہ کرے یا کوئی وی آئی پی کو نشانہ نہ بنائے ویسے تو اپنی موت کا ہم جیسے پولیس کانسٹیبلوں کا غم نہیں ہوتا لیکن ہماری ڈیوٹی کے دوران کسی وی آئی پی کی موت ہمارے لئے اور ہمارے خاندان کیلئے موت ہے۔ پولیس کانسٹیبل کے مطابق جلسے کیلئے اسے پانچ بجے لایا گیا بغیر ناشتے کئے بغیر لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ پولیس اہلکاروں کے مزے ہیں لیکن ابھی ایک بج رہے ہیں لیکن مجال ہے کہ کسی نے یہ پوچھا ہو کہ کچھ کھانا ہے پینا ہے میں بھی انسان ہوں پیٹ میرے پاس بھی لگا ہوا ہے میں خاک تو نہیں کھاتا اب پتہ نیہں کہ یہ نام نہاد رہنما کتنی دیر بکواس کرینگے اور یہ جلسہ ختم ہوگا لیکن مجھے ایکٹیو رہنا ہوگا ان جیسے لوگوں کیلئے یہ باتیں کرتے ہوئے پولیس کانسٹیبل جذباتی ہوگیا۔

میں نے اس کی تسلی کیلئے خدائی خواروں کو دل سے دو تین گالیاں نکال دیں کہ یہ لوگ تو تم اور ہم جیسے لوگوں کو اپنا ذاتی ملازم سمجھتے ہیں،اس باعث پولیس اہلکار کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور اس نے بتانا شروع کردیا کہ ان حالات میں مجھے کوئی بتائے کہ میں کیسے عام لوگوں کیساتھ بہتر رویہ رکھومسلسل

چودہ گھنٹے ڈیوٹی نے ہم جیسے اہلکاروں کو پاگل کردیا ہے میں یہاں بھوکا کھڑا ہوا ہوں اب اگر جلسہ ختم ہوا تو مجھے خود پولیس لائن جانا ہوگا اس لئے اگر روڈ پر کسی گاڑی یا ٹیکسی ڈرائیور کو میں زبردستی لے جاؤں تو پھر مجھے کہا جائیگا کہ میں اپنی اختیارات کا غلط استعمال کررہا ہوں لیکن یہ بھی کوئی بتائے کہ مسلسل ڈیوٹی بھوک اور پیاس ہو اور پھر واپس دفتر لے جانے کیلئے کوئی انتظام نہ ہو تو پھر کس طرح محبت سے پیش آیا جاسکتا ہے کس طرح میں لوگوں سے پیسہ نہیں لونگا میں لازما لوگوں سے زبردستی کروں گا پولیس کانسٹیبل کی یہ باتیں اور شکوے سن کر میں پریشان ہوگا کہ اس کی باتیں اور شکوے صحیح تھی اور مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کا جواب میں کیا دو۔

سونامی کا شکار اپنے کارکن

سیاسی پارٹیوں کو جوتے کی نوک پر رکھنے والے خان صاحب کی پارٹی میں کارکنوں کا وہ حال ہے جسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ انقلاب اور تبدیلی کے چکر میں پھنس کر خوار ہورہے ہیں کچھ ایسے کارکنوں سے ملاقات ہوئی جو اپنے آپ کو کوس رہے تھے کہ یہ کہاں آکر پھنس گئے ہیں اس صورتحال کا اندازہ گذشتہ دنوں پشاور میں ہونیوالے ضلعی اور ٹاؤن سطح کی انتخابی عمل دیکھنے کے دوران ہوا جب طوفان لانے کے دعویداروں کی اپنی پارٹی میں جتنی بد نظمی لوگوں کو مل گئی اس سے اندازہ ہوگیا کہ اگر یہ لوگ حکومت میں آگئے تو پھر کیسی طوفان بد تمیزی برپا کرینگے -امیدواروں کیلئے عجیب سا قانون بنایا گیا تھا کہ جو بھی امیدوار ہوگا وہ اپنا ووٹ خود کاسٹ نہیں کرسکے گا اس سلسلے میں کچھ امیدواروں سے بات بھی ہوئی اور وہ اس فارمولے پر خوش بھی نہیں تھے کہ وہ اپنا ووٹ کاسٹ نہیں کر سکتے لیکن کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لئے خاموش کھڑے دیکھتے رہے طوفان بد تمیزی برپا کرنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد رش بنائے کھڑی تھی پشاور کے چاروں ٹاؤنز میں ہونیوالے انتخابی عمل میں صرف بارہ سو ووٹرز نے ووٹ ڈالنے تھے لیکن ووٹنگ بھی نو بجے کے بجائے بارہ بجے دوپہر کو شروع ہوئی اور یہاں پر بھی خواتین سے زبردستی ووٹ لئے گئے اور پولنگ ایجنٹ اور

پریزائڈنگ آفیسرز نے اپنی مرضی سے ووٹ کاسٹ کرلئے۔جس کی شکایت خواتین ووٹرز نے بھی کی لیکن جس طرح ہم خواتین کو پیچھے دھکیلنے کے عادی ہیں ان کی بات پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا گیا ایک امیدوار جو سونامی لانے والی پارٹی کے بنیادی کارکنوں میں شامل ہیں نے ایک جعلی ووٹ پکڑا جس کی شکایت ہوئی تاہم وہاں پر موجود لوگوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی اور اسے کہا کہ میڈیا کے سامنے اس بات کو اچھالنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے پارٹی بدنام ہوتی ہیں یعنی جعلی ووٹنگ ہوتی رہے لیکن پارٹی بدنام نہ ہو۔ جعلی ووٹنگ کی شکایت پر جب فلم بنانے کی کوشش کی تو کچھ لوگوں نے کیمرہ پر ہاتھ رکھ دیا تاہم تو تو میں میں اور ایک امیدوار کی وجہ سے کوریج کی اجازت مل گئی راقم نے خود مشاہدہ کیا کہ خواتین کے ووٹرز مرد حضرات بھروا رہے تھے اور پھر خود ہی کاسٹ کررہے تھے اس سلسلے میں ایک خاتون نے شکایت بھی کی کہ اس کا ووٹ غائب ہوگیا ہے لیکن اپنے آپ کو باغی قرار دینے والے ایک مقامی رہنما نے خاتون کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ " مائی معاف کرو میں کچھ نہیں کرسکتا" انتخابی عمل کے دوران کچھ لوگوں نے اسلحے کی نمائش کی جس کی شکایت پر ایک امیدوار سے بات ہوئی تو جوابا کہا گیا کہ یہ پشاور ہے اور یہاں پر اسلحہ لانا ایک ثقافت ہے اس میں ہم کسی کو منع نہیں کرسکتے۔بعد میں ہلا گلہ کرنے بدانتظامی پر الیکشن کمشنر نے تین ورکروں کی بنیادی رکنیت بھی معطل کردی۔

یہ ایک ایسی پارٹی کے اندرونی انتخابات کا حال ہے جو خود کو سٹیٹس کو کی مخالف اور اصول پسند جماعت کہلوانے کا بڑا پرچار کرتی ہیں سٹیٹس کو کی مخالفت کرنے والے خود کتنے اس پارٹی کے ورکروں سے محبت رکھتے ہیں اس کا اندازہ بھی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پارٹی کارکنوں نے کچھ عرصہ قبل جون جولائی کی سخت گرمی میں اپنے علاقوں میں خود ہی اخراجات کرکے پارٹی کی ممبر شپ کروائی تھی جب رکنیت سازی کی فہرستیں آئیں تو تمام غلط نکلیں کارکنوں نے اس بارے میں شکایات بھی کی لیکن کارکن کی کون سنتا ہے نہ تو ان کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ہی فہرستیں ٹھیک ہوئی۔دوسروں کو اخلاقیات کا درس دینے والے خان کی پارٹی کا اندرونی حال یہ ہے کہ ایسے امیدوار بھی انتخابی عمل میں آئے جن کے خلاف ایف آئی آر بھی درج ہیں لیکن جہاں پیسہ ہو تو پیسہ بہت سارے عیب چھپا دیتا ہے اور ویسے بھی ہماری قوم بڑی بھولی ہے یہ ماضی کو بھولنے والی قوم ہے نہ ہی ماضی سے سبق سیکھتی ہیں اس لئے اگر اوپر بیٹھے لوگوں نے آنکھیں بند کرلی تو نچلی سطح کے کمی کمینوں سے تعلق رکھنے والے کارکن بھی "آوے ہی آوے" سونامی آوے" کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔پشاور میں ہونیوالے اس انتخابی عمل سے سونامی نے ثابت کردیا کہ یہ لوگ روایتی سیاستدانوں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کسی زمانے میں پاشا کے حوالے سے جانے جانیوالی پارٹی کا گراف جہاں پارٹی کے اندرونی اختلافات سے گر رہا ہے وہاں پر لوٹوں کی طرح شامل ہونیوالے لی ڈروں کی وجہ سے بھی اس پارٹی میں اپنی

زندگی خوار کرنے والے کارکن بھی اب بددل ہوتے جارہے ہیں ان حالات میں جہاں کارکنوں کا کوئی پرسان حال نہیں نہ ہی انہیں کوئی تحفظ حاصل ہے اور صرف باتیں کی جارہی ہیں -

اسلام تعصبی نعروں طوفان تبدیلی بنیادی ضروریات سمیت مختلف نعروں پر سیاست کرنے والے ان سیاستدانوں کیلئے کارکن بھی کمی کمینوں کی طرح ہیں صرف ان کے چہروں پر پڑے نقابوں کے رنگ الگ ہیں جسے ہماری طرح کے کارکن خوبصورت جان کر زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگاتے تھے لگاتے ہیں اور لگاتے رہیں گے -

پولیس مفت کھانا اور کراچی میں حالات ہونے کی پیشن گوئی

پشاور میں پولیس گاڑی کو نشانہ بنانے کے واقعے کے بعد پولیس کے حکام نے واضح ہدایات جاری کردی ہے کہ کھانے پینے کا عمل یا تو تھانوں کے اندر کیا جائے یا پھر اگر ضروری بھی ہوا تو پولیس وین میں کھانے پینے کے دوران ایک اہلکار لازمی سیکورٹی کیلئے کھڑا رہے گا جبکہ مسلسل حملوں کا نشانہ بننے کے واقعات کے بعد پولیس کیلئے موبائل وین کو بم پروف بنانے کیلئے بھی اقدامات اٹھائے جارہے ہیں حکام کا پولیس اہلکاروں کیلئے یہ اقدام تو بہتر ہے اور امکان ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس اقدام سے بہت حدتک سیکورٹی کی صورتحال بہتر ہو جائیگی اور اس طرح کے واقعات میں کمی آئیگی لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دہشت گردوں کو کس طرح پتہ چلتا ہے کہ پولیس کی گاڑی فلاں جگہ پر کھڑی ہے اور سربازار وہ لوگ اس میں بم رکھ دیتے ہیں اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یا تو پولیس اہلکار ان لوگوں سے ملی ہوئی ہیں یا پھر عوام کے پیسوں پر پلنے والی یہ مخلوق انتہائی نالائق ہے یا پھر اندھے ہیں کہ کوئی ٹائم بم رکھ کر چلا جاتا ہے اور ان لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا -یا پھر پولیس اہلکار مسلسل ایک ہی جگہ پر آتے ہیں جسکی وجہ سے نشاندہی آسانی ہوتی ہے ہمارے ہاں یہ عجیب سا دستور ہے کہ تحقیقاتی عمل پورا ہونے کے بعد معلومات کی شیئرنگ کا عمل نہیں ہوتا نہ ہی

یہ عمل پولیس کی طرف سے ہوتا ہے اور نہ ہی ہماری میڈیا فالو اپ کرتی ہے جس سے اندازہ ہوسکے کہ خامی کہاں پر تھی اور اس کی روک تھام کیلئے مستقبل میں کیا اقدام اٹھائے گئے

کچھ عرصہ قبل تھانہ سربند کے علاقے بڈہ تل میں پولیس اہلکاروں کو کھانے کے دوران نشانہ بنایا گیا جس میں ہوٹل انتظامیہ سمیت عام لوگ بھی زخمی ہوگئے تھے ابتداء میں بم ڈسپوزل یونٹ نے اطلاع دی کہ ہینڈ گرنیڈ سے حملہ ہوا تاہم بعد میں وہاں زمین میں ہونیوالے گڑھے کی نشاندہی سے پتہ چلا کہ ان پولیس اہلکاروں کیلئے دیسی ساختہ بم وہاں نصب کیا گیا تھا اور پولیس اہلکار جیسے ہی وہاں کھانے کیلئے پہنچے تو دھماکہ کردیا گیا یہ وہ رپورٹ تھی جو شیئر نہیں کی گئی اس سے اندازہ ہوا کہ یہ پولیس اہلکار روٹین کے مفت کھانے کیلئے وہاں پہنچے تھے اور انہیں مسلسل ایک جگہ پر دیکھ دہشت گردوں کو بھی انہیں نشانہ بنانے میں آسانی ہوئی یہی سلسلہ گذشتہ روز فردوس چوک میں بھی ہوا لیکن بات آئی گئی اگر حکام پولیس اہلکاروں کو کھانے کے حوالے سے اس طرح ہدایت کرتے کہ مہربانی کرکے مفت کھانے سے پرہیز کرے اور وہ بھی مسلسل ایک جگہ سے تو شائد اس سے بھی اس طرح کے واقعات میں کمی آجائے لیکن کمی کمینوں کے پیسوں پر پلنے والے یہ اہلکار انہیں اپنے آپ کو نہیں بلکہ کمی کمینوں کو اپنا جوابدہ سمجھتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ٹیکسوں میں تو ان لوگوں

سے تنخواہ وصول کی جائے لیکن مفت میں کھانے پینے کا سامان ملتا رہے تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔لیکن ہماری مصیبت بھی یہی ہے کہ کمی کمینوں کو اپنے حقوق کا پتہ ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی انہیں ڈرانے دھمکانے کا کام کر رہا ہے اب بھلا ہو اپنے ملک صاحب کا جن کا لوگٹ رشتہ اب وینا ملک سے ملا رہے ہیں اور اس بارے میں ایس ایم ایس بھی بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے ایک ہفتے سے کراچی میں دہشت گردی کی پیش گوئی کرنے والے ملک صاحب کی اس بات نے وہاں کے لوگوں کو ذہنی تناؤ کا شکار کر دیا ہے اور حالات بھی سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں -

پاکستانی قوانین کے مطابق اگر شخص کو کسی سے ڈر ہو تو وہ اپنے حفاظت کیلئے اپنے متعلقہ تھانے میں 21/107 کے تحت پرچہ کر سکتا ہے کہ جس میں وہ ڈرانے و دھمکانے والے کے خلاف شکایت کر سکتا ہے اور عدالت بندے کی شخصیت اور حیثیت دیکھ کر ان سے ضمانت بھی لے سکتا ہے ملک صاحب کی دہشت گردی کے حوالے سے بیان سے کمی کمین ذہنی تناؤ کا شکار ہیں کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جس کا کام ملک کی حفاظت کرنا ہے اور جس نے حلف بھی آئین پاکستان کے تحت اٹھایا ہو اگر وہ شخص خود ہی شہریوں کو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع کرے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یا تو متعلقہ شخصیت خود ہی دہشت گردوں سے ملا ہوا ہے یا پھر خود ان کاموں میں ملوث ہے اگر ملک صاحب یہ کہتے ہیں کہ انہیں اس بارے میں اطلاعات ہیں تو پھر یہ اطلاعات کس ایجنسی نے دی ہیں اور یہ کیسی ایجنسیاں

ہیں جنہیں یہ تو پتہ ہے کہ دہشت گردی ہونے والی ہے لیکن انہیں روکنے کیلئے کوئی اقدام نہیں اٹھایا جاتا۔ ملک صاحب کو اپنے ملک کے کمی کمینوں کا خیال ہی نہیں لیکن انہیں بھارت میں رہنے والے فنکار کا بہت خیال ہے فنکار کو ہمارے ہاں لوگ ڈم اور میراثی سمجھتے ہیں اور ہم نے تو یہ سنا ہے کہ ہر ایک کو اپنے رشتہ داروں کا بہت دکھ ہوتا ہے شائد ملک صاحب کی کوئی دور کی رشتہ داری ہو اگر ملک صاحب نے مسلمان ہونے کی وجہ سے بھارتی اداکار کے حوالے سے بیان دیا تو کیا اس مملکت اسلامی جمہوری اور فلاحی ملک میں مسلمان نہیں قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ بھارتی میراثی میرا مطلب ہے کہ فنکار نے جوابا کہہ دیا ہے کہ کسی کو ان کا غم کھانے کی ضرورت نہیں اس حوالے سے بھارتی وزارت خارجہ کا بیان بھی ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے بہت ہے جس میں انہوں نے ملک صاحب کو طعنہ دیا کہ اگر ملک صاحب اپنے عوام کی فکر کریں تو یہ بہتر ہے۔

ترقیاتی کام مدارس اور کمیشن مافیا

انتخابات کیلئے فضاء سازگار ہونے پر کمی کمینوں کیساتھ گذشتہ پانچ سالوں میں مذاق کرنے والے پارٹیوں کے رہنماء اب اپنے علاقے میں ترقیاتی کاموں پر زور دے رہے ہیں اور اس مد میں روکے گئے ترقیاتی فنڈز بھی ریلیز کرنے پر تل گئے ہیں پشاور شہر سمیت مختلف علاقوں میں جتنے کام گذشتہ دو ماہ کے دوران دیکھنے کو مل رہے ہیں اتنے کام کسی بھی ممبر اسمبلی نے گذشتہ پانچ سالوں میں نہیں کئے لیکن جو کام کیا جارہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بھائی کی موت کو کیش کرنے والے ایک سابق کونسلر جو ماشاء اللہ خیبر پختونخوار میں اب ممبر اسمبلی بن گئے ہیں نے اپنے علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی اپنے ہی رشتہ داروں کو دیدیا ہے جسے اب ممبر اسمبلی ہر جگہ پر کیش کررہے ہیں اور کمی کمینوں پر احسان فرماتے ہیں کہ دیکھ لو میرا جیسا ممبر اسمبلی کہیں پر نہیں جاتے جاتے ہماری خدائی خوار کے حکمران کتنا کام کررہے ہیں۔لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ سپلائی روڈ پر بننے والی سڑک پر دو کروڑ روپے سے زائد روپے خرچ کئے گئے لیکن ایک ہی بارش نے یہ حال کردیا ہے کہ دو ہفتے پہلے بننے والی سڑک دوبارہ کھڈے بن چکا ہے اور کمی کمین حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں کیونکہ ٹھیکیدار صاحب نے دس فٹ کی سڑک میں چھ فٹ سڑک بنوادی جبکہ چار

فٹ جو دونوں اطراف سے رہ گئی تھی اس میں ریت کی بجری ڈال کر کام مکمل کرلیا اور سرکار کے کھاتے میں ترقیاتی کام مکمل ہوگیا دو کروڑ میں کتنے خدائی خوار کے ممبر کو ملیں گے کتنے ٹھیکیدار کو ملیں گے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن اگلے انتخابات کیلئے ان کی دکانداری کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہی سلسلہ اس وقت پورے صوبے خیبر پختون خوار میں جاری ہے لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں ۔

پوچھ گچھ تو ان ٹھیکیداروں سے بھی نہیں ہو رہی جنہوں نے سڑکوں سے برف ہٹانے کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا گذشتہ ہفتے ہونیوالی بارش اور برف باری کے باعث جہاں صوبے کے دیگر علاقے متاثر ہوگئے وہیں پر ڈوگ درہ دیر کا حلقہ پی ایف 92 جہاں پر 8 سے دس فٹ برف پڑنے سے راستے مکمل طور پر بند ہوگئے اور ڈوگ درہ دیر کوہستان سمیت مختلف علاقوں میں کھانے پینے کی اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی اسی کے ساتھ ساتھ جانوروں کیلئے چارہ بھی ناپید ہوگیا طبی سہولیات تو اس ایریا میں بہت بڑی عیاشی ہے جو موجودہ حالات میں کوئی افورڈ بھی نہیں کرسکتا ۔اور اس علاقے کے کی کمین دس سے بارہ گھنٹے پیدل سفر کرکے اپر دیر تک پہنچتے ہیں اس علاقے میں پڑنے والی برف کو صاف کرنے کیلئے ٹھیکیدار نے نومبر میں ٹھیکہ بھی لیا تھا لیکن اب جبکہ برف اس علاقے میں پڑ گئی ہیں اور لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہیں ٹھیکیدار غائب ہیں وہاں پر عوام ضروریات زندگی سے محروم ہیں وہاں پر تعینات اے سی /ڈی سی ایک دوسرے پر کام کرنے کی

ذمہ داری ڈال رہے ہیں اور کوئی ان کا پوچھنے والا نہیں ان حالات میں انسانی حقوق کمیشن کیلئے کام کرنے والے مقامی تاجر نے اپنی آواز پہنچانے کیلئے مختلف لوگوں سے رابطے کئے لیکن لیکن کمی کمینوں کو کون حق دیتا ہے لیکن انتظامیہ وہاں ہونیوالے حالات کو بہتر کرنے کے بجائے اب دکانداری پر لگی ہوئی ہیں۔

دکانداری سے یاد آیا گذشتہ روز پشاور پریس کلب میں بچوں کے حقوق کے حوالے سے ایک پروگرام منعقد ہوا جس میں صحافیوں اور سول سوسائٹی کے ممبران کو بچوں کے قانونی حقوق سے متعلق سیشن ہوا اختتامی سیشن کے مہمان خصوصی عوام کو روٹی کی جگہ جوتے کپڑے کی جگہ کفن اور مکان کی جگہ لحد دینے والے پارٹی کے ایک ممبر مہمان خصوصی تھے ان کی قابلیت تو ہماری طرح ہے لیکن چونکہ ان کا تعلق اسی پارٹی سے ہے اسی لئے انہیں آبادی کو کنٹرول کرنے والی وزارت دی گئی۔ موصوف جوش خطابت میں یہاں تک کہہ گئے کہ مدارس دہشت گردی پھیلا رہے ہیں اور کچھ مدارس ایسے ہیں جو طلباء کو دہشت گردی کیلئے تیار کر رہے ہیں حالانکہ موصوف کا تعلق ایسے لوگوں سے جو خود بھی مدارس چلا رہے ہیں لیکن سمجھ نہیں آتا انہیں مدارس سے کیا پرخاش ہیں۔ اس لئے ان کی باتیں سن کر صحافی بھی چونک گئے جب اس بارے میں متعلقہ وزیر سے کیمرے کے سامنے بات کی کوشش کی اور کہا کہ ابھی انہوں نے جو "بکواس "فرمائی ہے اگر کیمرے کے سامنے

دوبارہ کہہ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی تو موصوف کے اوسان خطا ہوگئے اور اگر مگر کی باتیں کرکے اپنی بات سے منکر ہوگئے ہمارے ایک اور ساتھی نے دوبارہ کوشش کی تو انہی کے علاقے سے تعلق رکھنے والے صحافی نے اشارہ کیا کہ ہمارے علاقے کے ممبر اسمبلی سے اس طرح کے سوال کرکے اسے خراب مت کرو کیمرے کے سامنے اگر مگر کی باتیں کرکے وزیر موصوف نے صحافیوں کیساتھ ہاتھ ملایا اور کہا کہ آپ تو ہمارے ساتھی ہیں اور یہ باتیں تو آف دی ریکارڈ تھی یعنی اس سے قبل جو کچھ وہ مدارس کے حوالے سے وہ چالیس بندوں کے سامنے بکواس کررہے تھے وہ آف دی ریکارڈ تھی اور اسے پتہ تھا کہ اب میرے بیان سے مسئلہ بنے گا تو اپنی بات سے ہی مکر گئے-

مکر تو پشاور ایک مسجد کے پیش امام اوران کے سیکرٹری فنانس گئے ہیں جنہیں خدائی خواروں کی حکومت نے مسجد کے امداد کے نام پر چھ لاکھ روپے دیئے ہیں اوران کیساتھ ڈیل یہ ہوئی تھی کہ چھ لاکھ روپے میں پانچ لاکھ روپے اسی وزارت کے وزیر کو واپس دینے ہونگے جنہوں نے مسجد کیلئے فنڈز ریلیز کیا ہے کیونکہ یہ توان کا کمیشن بنتا ہے ابتداء میں تو مسجد کی انتظامیہ اس بات پر خوش تھی کہ ان کے مسجد کو اپنے آپ کو سیکولر قرار دینے والی پارٹی فنڈز دے رہی ہیں ان کا خیال تھا کہ چلو اگر کچھ مل جائیگا تو اس میں "خرچہ پانی " متعلقہ وزارت کے لوگوں کو بھی دیا جائیگا اور اس بارے میں مسجد کی

انتظامیہ بھی رضامند ہو گئی تھی لیکن چھ لاکھ روپے فنڈز ریلیز کرنے کے بعد وزارت کے لوگوں نے مطالبہ کردیا کہ اب ہمیں پانچ لاکھ روپے واپس دوگے جو کہ ہمارا حق ہے ۔اتنی بڑی رقم کا سن کر مسجد کی انتظامیہ بھی انکاری ہو گئی ہے کہ انہیں بھی حساب دینا ہوگا کہ چھ لاکھ روپے کہاں سے آئے تھے اور کہاں پر خرچ ہو گئے اللہ کا حساب تو اللہ ہی جانے لیکن یہاں پر کمی کمینوں کو بھی تو حساب دینا ہوگا دوسری طرف وزارت والے اس چکر میں ہیں کہ انہیں اپنا کمیشن مل جائے۔ باقی سب کچھ جائے بھاڑ میں انہیں نہ تو کمی کمینوں کا خیال ہے اور نہ ہی اللہ کا ڈر ہے جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور ہر ایک شخص سے اس کے ایک ایک لمحے کا حساب بھی لے گا اس میں کمی کمین سے لیکر صحافی مولوی وزیر امیر غریب صنعتکار سرمایہ دار بچے بوڑھا مرد و خاتون کی کوئی تخصیص نہیں

۔

-کیا سپیشل) معذور (افراد کا حق ہم پر نہیں

وہ پنجاب سے معمول کے مطابق ٹرک میں سامان لاد کر خیبر پختونخواہ لا رہا تھا اپنے ساتھی کیساتھ ہنسی مذاق کرنا اس کی عادت تھی اس نے کنڈیکٹر کو آواز دی کہ اس مرتبہ نوشہرہ سے جاتے ہوئے گھر کیلئے گڑ بھی لیکر جانا ہے اس لئے مجھے یاد کروادو۔ جس پر کنڈیکٹر نے اسے جوابا ٹھیک ہے استاد جی کہہ دیا اوراس نے بلند آواز میں پشتو گانا شروع کردیا۔وہ اس وقت راجن پور کی حدود میں داخل ہورہا تھا کہ یکدم اس کی گاڑی کو دھچکے لگنے شروع ہوگئے اور اس نے ٹرک کو قابو کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ گاڑی کا ایکسل ٹوٹ گیا ہے اسی باعث گاڑی ان بیلنس ہو گئی ہیں اس نے گاڑی کو کنٹرول کرتے ہوئے روک دیا۔شاگرد کو آواز دی کہ جیک لیکر نیچے آجائو۔ خدائی خوار پھر لیٹ اپنے گائوں جائینگے یہ کہہ کر وہ ٹرک سے نیچے اترا۔کنڈیکٹر کی مدد سے اس نے اپنی گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے کیلئے جیک لگا کر اسے اٹھانا شروع کردیا اور ٹائر اونچا ہوگیا اس کا شاگرد گاڑی کے ٹائر کے نیچے پتھر رکھنے کیلئے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا گاڑی بھی متوازن تھی اس نے سوچا کہ ذرا پائوں سیدھی کروتاکہ تھکن بھی اتر جائے ۔پھر ٹائر کو تبدیل کرنے کی کوشش کرونگا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی جیسے ہی اس نے پائوں سیدھے کردیئے اسی وقت ٹرک کے نیچے لگے جیک کا ڈنڈا ہل گیا اور ٹرک اس

کی پاؤں پر آگرا۔ درد کی لہر اس کی جسم میں پاؤں کی طرف آئی اسے لگا جیسے قیامت آگئی اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

ہوش آنے پر اسے پتہ چلا کہ وہ راجن پور کے ایک مقامی بیسک ہیلتھ یونٹ میں زیر علاج ہے جہاں پر اسے طبّی امداد دی جارہی ہیں اس نے پاؤں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کنڈیکٹر نے کان میں کہہ دیا کہ استاد جی حرکت مت کرنا اور اسی دوران قصاب نما ڈاکٹر بھی آگیا اس نے ڈرائیور کو ہدایت کردی کہ دوسری طرف منہ کرکے دیکھو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا کہ یکدم دونوں پاؤں سن ہوگئے اور جیسے ہی اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس نے دونوں پاؤں اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ دونوں کا کاٹنا ضروری تھا اور بے بسی کی وجہ سے اس کے آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن وہ کچھ ہی نہ سکا۔اس وقت اس کے دل میں خواہش تھی کہ کاش میرے گھر والے میرے پاس ہوتے اور اس ڈاکٹر سے پوچھتے کہ کیا تم نے مریض سے پوچھا بھی ہے کہ نہیں اسی کی کے ساتھ اس طرح کی حرکت کوئی جانوروں کیساتھ بھی نہیں کرتا کہ زندہ انسان کے پاؤں کاٹ دیئے لیکن وہ یکدم مکمل انسان سے معذور بن گیا اور اس کی اوقات ختم ہو گئی۔

پندرہ سال تک بائیس ٹائر چلانے والا ڈرائیور آج بھی مکمل ہے صرف اس کے پاؤں نہیں لیکن اس پاؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے ہر جگہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ وہ کسی سے بھیک نہیں مانگتا اس کی خواہش ہے کہ وہ

اپنے بچوں کیلئے حلال رزق اپنے ہاتھوں سے کمائے لیکن اسے مواقع نہیں مل رہے۔
حالانکہ اپنے اور اپنے گھروالوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے اس نے اس نے تین پہیو ں والی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر مختلف مزدوریاں کیں۔کارخانو مارکیٹ سے لیکر راولپنڈی تک کپڑے لے جانے کی کوشش وہ کرتا رہاتاکہ اس کے بچوں کو حلال رزق کماسکے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا لیکن پھر بڑے بڑے لوگ اس کاروبار میں آئے اور درہ آدم خیل کے علاقہ شریکرہ سے تعلق رکھنے والے اس شریف اور غریب ڈرائیور کی اوقات نہیں رہی کیونکہ پھر پولیس اور کسٹم بھی اسے تنگ کرنے لگے اسی باعث وہ اپنے علاقے میں پہنچ گیا اور یہ کاروبار ختم کردیا اب اپنے علاقے میں وہ روزگار کیلئے کوشاں ہے۔
تاج محمد نامی ٹرک ڈرائیور جو اب معذور ہے کئی مہینوں سے راقم کیساتھ فون پر رابطے میں ہیں اور اس کی خواہش ہے کہ اسے معذوروں کیلئے بننے والی جاپانی گاڑی فلائنگ کوچ اور موٹر کار اگر فراہم کی جائے تو وہ اپنے بچوں کیلئے حلال رزق کما سکتا ہے اس کی خواہش ہے کہ وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے جیسے لوگوں کو روزگار کے مواقع دے چونکہ وہ ڈرائیور ہے اس لئے سمجھتا ہے کہ بحیثیت ڈرائیور وہ سپیشل افراد کیلئے بننے والی گاڑی کو بہتر طور پر چلا سکتا ہے جو اس وقت بھی جاپان سے پاکستان میں لائی جارہی ہیں جس کی منظوری بھی ٹریڈ پالیسی میں دی جاچکی ہیں لیکن اس کا پراسیس اتنا مشکل ہے

کہ تاج محمد جیسا معذور تو دور کی بات ہے راقم جس کا الحمد اللہ جسم کا ہر حصہ مکمل ہے لیکن اتنے چکروں کی راقم میں اتنی ہمت نہیں۔

موجودہ حکومت نے سال 2010 ء میں معذور افراد کی سہولت کیلئے ساڑھے تیرہ سو سی سی کی گاڑی امپورٹ کرنے کی منظوری دی تھی لیکن یہ سب کچھ کاغذوں میں ہے عملی طور پر اس حوالے سے کچھ نہیں ہو رہا جو معذور افراد ہے ان کی رہنمائی کیلئے کوئی ادارہ کام نہیں کر رہا جبکہ ان سپیشل افراد کے نام پر بہت سارے جاپان سے گاڑیاں منگوا کر استعمال بھی کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن جن کا حق ہے انہیں نہیں مل رہا۔ ہم وہ بے حس لوگ و قوم ہیں جو لوگوں کو معذور تو کر سکتے ہیں لیکن انہیں سہولت فراہم نہیں کر سکتے انہیں زبانی جمع خرچ پر سپیشل کہنے سے کچھ نہیں ہوتا تاج محمد جیسے کتنے لوگ ہیں جو اس معاشرے میں موجود ہیں اور حق حلال کی کمائی چاہتے ہیں لیکن انہیں راہ آسانیاں فراہم کرنے والا کوئی نہیں ۔ وزارتیں تو ان سپیشل افراد کے نام پر بھی وجود میں آئی ہیں لیکن ان میں حکمران اپنی یاریاں دوستیاں نبھانے میں لگے ہیں اور ان میں کام کرنے والے پیدا گیری میں ایسے میں تاج محمد جیسے لوگ جائی تو جائیں کہاں-

خواتین پر تشدد کے بڑھتے واقعات

ہمارے پڑوسی خاتون کو اس کے شوہر نے تشدد کرکے گھر سے نکال دیااور اب وہ ہمارے گھر میں والدہ کیساتھ بیٹھی رورو کر کہہ رہی تھی کہ ماں باپ میرے نہیں بھائی کو خبر کر نہیں سکتی اب میں کیا کروں یہ باتیں میری بیگم نے مجھے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بتائی۔ میں دفتر سے پہنچتے ہی گھر میں داخل ہوکر والدہ کیساتھ بیٹھتا ہوں آج گھر میں داخل ہونے کے بعد والدہ کمرے میں نہیں تھی سو میں نے اپنی بیگم سے والدہ کا پوچھا تو بیگم نے بتادیا کہ پڑوسی خاتون روتے ہوئے آئی تھی اور والدہ ان کے ساتھ بات چیت کر رہی ہیں شائد ان کے ساتھ گھر بھی جائے خیر آدھ گھنٹے بعد والدہ سے بات ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کے شوہر کو کسی پڑوسی نے گلہ کیا کہ آپ کی بیگم نے گھر میں گندگی ڈالنے پر ان کے بچوں کو کوئی بات کہہ دی جس پر خاتون کے شوہر نے بیوی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیااور بعد میں گھر سے صبح ہی باہر نکال دیا کہ میرے گھر سے باہر نکل جاؤ وہ خاتون مار کھانے کے بعد اپنی رشتہ داروں کے گھر گئی تھی اور پھر رات کو اپنے گھر واپس آگئی۔ لیکن شوہر اس کو گھر کا دروازہ کھول نہیں رہا تھا اسی باعث وہ ہمارے گھر آگئی اور بعد میں میری والدہ نے اس کے ساتھ گھر جا کر اس کے شوہر کو باتیں سنائی جس پر وہ اپنی بیوی کو گھر لے گیا اور میری والدہ گھر آگئی۔

والدہ نے آتے ہی رونا شروع کر دیا کہ بیٹیوں کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بیٹیوں کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ بیٹیوں کو برا کوئی نہیں سمجھتا لیکن ہم ان کی قسمت سے ڈرتے ہیں۔ کہ خدانخواستہ اگر ایسا ویسا کچھ ہوگیا تو پھر ہر کوئی ماں باپ کو موردالزام ٹھہراتا ہے اور اب جب شادی ہوجاتی ہے تو پھر اس طرح کے حالات سے ڈر لگتا ہے میں نے اپنی والدہ کو بتا دیا کہ اچھے اور برے ہر جگہ ہوتے ہیں اور جاہلوں کی طرح مارنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن کچھ مردوں کے عقل پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اگر وہ یہ سوچ لیں کہ جس طرح وہ کسی اور کی بیٹی جو اس کی بیوی ہوتی ہے کیساتھ غلط رویہ تشدد جیسے اقدامات کرتا ہے اگر اس کی اپنی بیٹی کیساتھ خدانخواستہ ایسا ہو تو پھر کیسے محسوس ہوگا شائد یہی سوچ کر ہم جیسے لوگوں کے عقل کام کرے۔ یہ ایک روز کا واقعہ ہے جسے میں نے آپ کیساتھ شیئر کیا آپ روزانہ اخبار دیکھیں تو نصف درجن کے قریب خبریں روزانہ ہر اخبار میں عورتوں پر تشدد کی لگی ہوتی ہیں حیرت انگیز طور پر ان میں زیادہ تر واقعات شہروں میں ہونیوالے واقعات کی زیادہ ہوتی ہیں گاؤں کے حوالے سے ان میں خواتین کی قتل کی خبریں چھپتی ہیں۔ان میں ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں جو کہیں پر ریکارڈ/رجسٹرڈ ہی نہیں ہوتی اور خواتین پر گھریلو تشدد کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ زیادہ تر خواتین اپنے ساتھ ہونیوالے برے سلوک/تشدد کے واقعات اپنے والدین کو اس ڈر سے نہیں بتاتی

کہ اس طرح ان کے گھر برباد نہ ہوجائے کیونکہ ہمارے معاشرے میں اگر اس طرح بات سامنے آجائے تو پھر لوگوں میں دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں اور خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے واقعات کا پتہ ان کے میکے کو نہ چلے تاکہ ان کے گھر برباد نہ ہو۔ گھریلو تشدد مشترک چیز ہے جو نچلے طبقے سے لیکر متوسط طبقے اور اعلی طبقے کے لوگوں میں بھی عام ہے۔

ہمارے معاشرے میں لوگ یہ سمجھتے ہیں عورتوں پر گھریلو تشدد کے واقعات صرف نچلے طبقے یا متوسط طبقے میں زیادہ ہوتے ہیں لیکن یہ واحد چیز ہے جو ہر طبقے کے لوگوں میں مشترک ہے۔بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد/ خاندان میں بھی بہوؤں کیساتھ غیر انسانی سلوک یاان پر تشدد کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور یہ ریکارڈ پر ہے کہ پشاور ہی میں ایک بہت بڑے خاندان کے مرد اپنے گھر والوں پر تشدد کیا کرتے تھے جس کی اطلاع ان خواتین کے کے گھر والوں کو ہوئی تو گھر والوں نے کوشش کی کہ حالات کنٹرول میں رہے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوااور ان بہادر مردوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی اور پھر یہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ حالانکہ ان کی خواتین کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن اپنی غلطی کی سزاانہوں نے خواتین کو دی ۔غربت روزگار مہنگائی جہیز بیٹی یا بیٹا نہ ہونے جیسے چھوٹے چھوٹے مسائل سے ہم لوگ اپنی گھروں کو جہنم بنا رہے ہیں۔کچھ عرصہ قبل ایک مقامی غیر سرکاری ادارے میں خواتین پر تشدد کے واقعات اور بیٹوں

اور بیٹیوں کے حوالے سے پروگرام ہوا جس قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمارے حالات بہت حدتک تبدیل ہو گئے ہیں اوراب عورتوں پر تشدد جیسے واقعات نہیں ہورہے اور ہم لوگ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح نہیں دیتیں ۔ ان کی باتیں بھی کسی حدتک ٹھیک ہے لیکن اتنی بہتری نہیں آئی جتنی کہ ہونی چاہیئے لوگوں میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے آگاہی بڑھ گئی ہیں لیکن ان کی حالت پر کوئی فرق نہیں پڑا ۔اسی پروگرام میں شریک ایک خاتون کے بقول اگر خواتین اپنی زبان پر قابو پائیں تو شائد ان پر ہونیوالے تشدد کے واقعات میں کمی ہو ان میں بات میں بھی کسی حدتک وزن ہے کہ گھریلو تشدد کے واقعات میں کچھ قصور خواتین کا بھی ہوسکتا ہے لیکن پشتو مثل کے بقول جو کام زبان سے ہوسکتا ہے اسے ہاتھ یا چھڑی سے کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں پر ایک سال سے چودہ سال کی عمر کی لڑکیاں آبادی کی چودہ فیصد پندرہ سے 64 سال کی عمر کی 53 فیصد اور 65سال سے زائد سال کی عمر یں چار فیصد خواتین رہائش پذیر ہیں تعلیم جیسے شعبے میں خواتین کی نمائندگی 42 فیصد ہے جنوری تا جولائی 2012 ء میں غیر سرکاری ادارے کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں خواتین پر تشدد کے واقعات سب سے زیادہ 1375 جبکہ سندھ میں 878 خیبر پختونخواہ میں 527 جبکہ بلوچستان میں یہ واقعات 352 ریکارڈ کئے گئے تھے یہ ایک سال قبل کے واقعات تھے اس میں مسلسل

اضافہ ہو رہا ہے سال 2000 سے 2012 تک ریکارڈ کئے گئے واقعات کے مطابق گھریلو تشدد کاروکاری ریپ جلانے اغوائیگی زبردستی کی شادی اور پولیس تشدد جیسے واقعات خواتین میں مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ کسی زمانے میں قبائلی علاقوں میں خواتین کی بے حرمتی اور بے عزتی کے واقعات نہیں ہوتے تھے لیکن اب ان علاقوں میں بھی اس طرح کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور انہیں نشانہ بنایا جاتا ہے جس کی واضح مثال خیبر ایجنسی کے مختلف علاقوں میں خواتین کی ہلاکتوں اور انہیں نشانہ بنانے کے مسلسل واقعات ہیں۔

پالش کروانے والے تو ہیں لیکن

جوتے پالش تو نہیں کرنے یہ آواز ایک چھوٹے سے کم عمر بچے نے میرے سامنے آ کر کہا۔ میں اس وقت پشاور یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے صحافی دوستوں کا انتظار کر رہا تھا چونکہ رات کو ڈیوٹی کی تھی اور دفتر سے سیدھے یونیورسٹی آیا تھا سو میں نے اپنے لئے چائے اور پکوڑوں کی پلیٹ کا آرڈر دیا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آٹھ سالہ بچہ میرے سامنے آیا اور اس نے مجھے کہا کہ جوتے پالش تو نہیں کرنے۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ نہیں بیٹا میں نے پالش نہیں کرنی۔ وہ معصوم لڑکا میرے انکار کے بعد دوسرے طلباء کی طرف چلا گیا جو وہاں پر چائے پی رہے تھے اور اس نے کئی طلباء کو کہا کہ جوتے پالش کرنا ہے تو میں کروں لیکن کسی نے بھی اسے ہاں میں جواب نہیں دیا اور وہ لڑکا میرے سامنے سے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہی بچہ میرے پاس دوبارہ آیا اور اس نے پوچھا کہ جوتے پالش کروں اس وقت میں نے غور سے اس بچے کو دیکھا صبح ساڑھے نو بجے کا وقت تھا اس معصوم بچے نے منہ بھی صحیح طریقے سے نہیں دھویا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا اور وہ بڑے معصوم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا میں نے اسے

دیکھا تو مجھے اپنا چھوٹا بچہ اور اپنا بچپن یاد آیا اور میں نے جلدی سے ہاں کہہ دیا لیکن ساتھ میں اسے کہہ دیا کہ میرے نزدیک بیٹھ کر جوتے پالش کرو کیونکہ میں نے کچھ گپ شپ کرنی ہے۔ مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں اس معصوم بچے سے جوتے پالش کروا رہا تھا لیکن میں اس بچے کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور اس کی حالت بھی جاننا چاہتا تھا اس لئے میں اسے اپنے ساتھ بٹھانا چاہتا تھا اگر میں اسے پیسے ایسے دے دیتا تو اسے مفت کی عادت پڑ جاتی اور میں اس کمسن بچے کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔ سو میں نے جوتے اتار کر اسے دیئے اور اس سے گپ شپ شروع کردی ۔

آٹھ سال کے معصوم عبدالمتین بلوسئی کے علاقہ کا رہائشی تھا اور روزانہ صبح آٹھ بجے اپنے والد اور بڑے بھائی کیساتھ پشاور یونیورسٹی آیا اور شام پانچ بجے تک یہاں پر لوگوں کے جوتے پالش کرتا اس نے دسمبر 2012 سے لوگوں کے جوتے پالش کرنا شروع کردیئے تھے اور اس کے کام کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا بقول اس بچے کے روزانہ وہ پچاس روپے تک کماتا تھا جو وہ اپنے والد کو دیتا تھا اس کا والد پشاور یونیورسٹی کے ہاسٹل کیساتھ طلباء اور وہاں پر آنیوالے لوگوں کے جوتے پالش کرتا تھا ۔ اس معصوم بچے کا کہنا تھا کہ اس سے بڑا بھائی بھی جوتے پالش کرتا ہے اور دونوں بھائی اسی جگہ پر لوگوں کی جوتے پالش کرتے ہیں۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ بیٹا تمھیں کیا سکول جانے کی

خواہش نہیں کیا پڑھنا نہیں چاہتے یا پھر تمھارے والد تمھیں بھیجنا نہیں چاہتے اس دوران اس بچے کی تصاویر میں لے رہا تھا اور وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے مجھے جواب دیا کہ جب لوگ صاف کپڑے پہنتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے اور میری بھی خواہش ہوتی ہے کہ میں صاف کپڑے پہنوں اور سکول جاؤں لیکن پالش کا کام ایسا ہے کہ ہاتھ تک گندے ہو جاتے ہیں-اس دوران اس نے شاپنگ بیگ کھول کر اپنی معصوم ہاتھوں سے میرے جوتوں کی صفائی شروع کردی- میرے لمبے پاؤں کی جوتے اس کے ہاتھ میں آتی بھی نہیں تھی لیکن وہ اپنی مقدور بھر کوششوں سے اسے صاف کرنے کی کوشش کررہا تھا-

میں نے اس بچے سے سوال کیا کہ بھوک لگنے کی صورت میں تم کیا کرتے ہو تو وہ بچے مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ میں صبح سویرے اپنے داجی کیساتھ ناشتہ کرتا ہوں اور پھر اس وقت کھانا کھاتا ہوں جب یہاں یہاں پر اذان ہوتی ہے کیونکہ والد نے کہا ہے کہ جس وقت اذان سنو تو یہی وقت کھانے کا ہوتا ہے تو پھر میں نے اپنے لئے روٹی اور پکوڑے لیکر کھاتا ہوں معصوم نے ساتھ ہی کہا کہ کب کبھار مجھے بھوک بہت پہلے بھی لگتی ہے لیکن مجھے والد سے ڈر لگتا ہے اس لئے میں پہلے کھانا نہیں لیتا- کیونکہ پھر داجی غصہ کرتا ہے اور میں اپنے وقت پر کھانا کھاتا ہوں- سخت سردی میں اس معصوم نے کوئی سویٹر نہیں پہنا تھا اور اس نے عام سے چپل پہنے تھے اور کوئی جراب بھی اس کی نہیں تھی-جسے دیکھ کر

میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا کہ پتہ نہیں اس کا والدین کے دل کی جگہ پتھر ہے جو اس معصوم کو یونیورسٹی میں مزدوری کرنے بھیج دیا۔ میں نے پھر اسے سوال کیا کہ بیٹا کیا تمھیں ماں کچھ نہیں کہتی تو اس معصوم نے آنکھیں نیچی کیں اور جواب نہیں دیا اور پھر میں نے دوبارہ اس سے سوال کیا تو اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ میری ماں نہیں کیونکہ میری ماں بہت پہلے مر گئی تھی اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور مجھے اپنی ماں کا چہرہ اور پیار بھرا لہجہ ہر وقت یاد آتا ہے۔اور اس نے سر نیچی کرکے جوتے پالش کرنا شروع کردیئے اور سسکیاں لینا شروع کردی۔مجھے اس وقت اپنے آپ سے اور اپنی صحافت سے نفرت ہوگئی کہ میں نے اس معصوم بچے کے دل کو دکھ دیا اور میں خاموش ہوگیا۔ جلدی سے میں نے اس معصوم سے پوچھا کہ کتنے پیسے ہوگئے اس نے بیس روپے مانگے جو اسے میں نے دیدیئے اور وہ شاپنگ بیگ میں برش پالش کے ڈبے ڈالکر جانے کی تیاری کرنے لگا اور اس دوران میرے صحافی دوست وہاں پہنچ گئے اس معصوم بچے نے اس سے بھی پوچھا کہ پالش تو نہیں کرنا لیکن اس نے انکار کیا اور پھر وہ بچہ خاموشی سے پشاور یونیورسٹی کے ہاسٹل کی طرف چلا گیا اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس آٹھ سالہ بچے کا قصور کیا ہے اور کون اس کے حالت کا ذمہ دار ہے اور ہمارے ارد گرد کتنے معصوم ہیں جو اس وقت مزدوری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کی طرف ہم لوگ توجہ ہی نہیں دیتے۔ یہ وہ سوال تھا جو میں نے اپنے صحافی

دوستوں سے پوچھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کیا یہ معصوم بچہ پاکستان کا مستقبل نہیں کیا اس کی ذمہ داری صرف اس کے والدین کی ہے میری نہیں آپ کی نہیں یونیورسٹی میں پڑھنے پڑھانے کیلئے آنیوالے طلباء وطالبات اساتذہ صرف اپنے آپ کیلئے جواب دہ ہے کیا ریاست اور اس کے اس بچے کی ذمہ دار نہیں۔شائد نہیں کیونکہ ہم سب لوگوں کو صرف اپنے آپ نظر آتا ہے حکمرانوں کو صرف اپنا بلاول حمزہ وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں جن کیلئے یہ لوگ کیا سے کیا نہیں کرتے۔میں اس وقت اسلام کی بات نہیں کر رہا اللہ کے ہاں جب جائیں گے تب وہ پوچھے گا لیکن کیا یہی بچہ یونیورسٹی میں پالش کرتے کرتے کیا بنے گا اگر یہ کسی کے ہتھے چڑھ گیا اور انہوں نے اس معصوم کو اپنے مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا جو ہمارے ہاں اب ایک نیا سلسلہ ہے اگر کسی نے اسے جیکٹ پہنادی اور کہا کہ جا کر اللہ اکبر کہہ کر اپنے آپ کو اڑا دو تو پھر ہر کوئی دہشت گردی کی گردان کرے گا لیکن اصل وجوہات کی طرف کوئی توجہ نہیں دے گا کہ کیوں اس حال میں لوگ پہنچتے ہیں اور کون انہیں پہنچاتا ہے کیا اسکا جواب ابھی کوئی دے سکتا ہے شائد کوئی نہیں کیونکہ جوتے پالش کروانے والے تو بہت ہیں لیکن جوتے پالش کرنے والے کی حالت پر توجہ دینا شائد ہماری فطرت ہی نہیں۔

صحافیوں کی سستی اور تربیتی ورکشاپ

صحافت سے وابستہ زیادہ تر افراد اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں یہ ایک عام مشاہدہ ہے اور کچھ ہو نہ ہو " قل قلا خانی" کی عادت تقریبا ہر صحافی میں عام ہے جسے کچھ صحافی مانتے بھی ہیں - کچھ دن قبل عدالتی رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کیلئے چیف جسٹس پشاور ہائیکورٹ کی ہدایت پر جوڈیشل اکیڈمی خیبر پختونخواہ کی انتظامیہ نے ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا تربیتی ورکشاپ منعقد کروایا۔جس میں مختلف اخبارات / ٹی وی چینلز سے وابستہ صحافیوں کو مدعو کیا گیا تھا لیکن افسوسناک بات یہ ہوئی کہ تربیتی سیشن جو کہ نو بجے شروع ہونا تھا ہمارے اپنے صحافیوں کی تساہل کی وجہ سے ساڑھے دس بجے شروع ہوا جس کی وجہ سے تربیتی ورکشاپ میں ایک دو لیکچررز کے سلسلے کو ختم کردیا گیا جس کا مجھ سمیت تربیت کیلئے آنیوالے زیادہ تر صحافیوں کو افسوس بھی ہوا ۔ سب سے حیرت کی بات یہ دیکھنے کو ملی کہ جو صحافی اس وقت فیلڈ میں موجود ہیں وہ تربیت کیلئے نہیں آئے جبکہ جو ابھی جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں پڑھ رہے ہیں ان میں بہت سارے زیر تربیت صحافی تربیتی سیشن میں شامل ہوئے اور انہوں نے اسے ورکشاپ کو اپنے عملی زندگی کیلئے بہتر قرار دیا۔

تربیتی سیشن میں جوڈیشل اکیڈمی کے ڈائریکٹر جنرل حیات علی شاہ سمیت ڈائریکٹر فیکلٹی خورشید خان سینئر صحافیوں سہیل احمد خان اور طلعت حسین نے عدالتی رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کو اپنے تجربات سے آگاہ کیا اور انہیں موجودہ حالات میں اپنے آپ اور رپورٹنگ کو کو بہتر طور لانے کے گر بھی سکھائے۔اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے صحافی سہیل احمد خان جن کا تعلق خیبر پختونخواہ سے ہے نے تربیتی سیشن میں زور دیا کہ معیاری کام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ صحافی عدالتی رپورٹنگ پر توجہ دیں اور عدالتی امور کے دوران عدالتوں میں حاضر رہیں جس سے انہیں نہ صرف بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ان کے تعلقات بھی بن جاتے ہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کورٹس کی رپورٹنگ کرنے والے صحافی صرف کورٹس رپورٹنگ ہی کریں،ان کے بقول اسلام آباد میں سپریم کورٹ کی رپورٹنگ کرنے والے صحافی سپریم کورٹ تک محدود ہیں جب ہم نے ان سے کہا کہ ہمارے ہاں تو یہ کلچر پہلے صرف اخبار میں تھا اوراب یہ ٹرینڈ ٹی وی چینلز میں بھی آگیا ہے کہ نالہ خراب ہے سے لیکر بم دھماکے کی کوریج ایس ایچ او نے اسلحہ پکڑ لیا ہے سمیت عدالتی رپورٹنگ بھی ایک ہی صحافی سے کرائی جاتی ہیں تو ان حالات میں کیا کرنے کی ضرورت ہے اور کیسے معیاری کام کیا جاتا ہے تو اس کا جواب نہ تو ان کے پاس تھا اور نہ ہی اینکر پرسن طلعت حسین کے پاس لیکن ہاں انہوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو آگے لیکر جانا ہے تو ان تمام تر مشکلات اور محدود وسائل میں رہتے ہوئے

بھی کوششیں جاری رکھنی ہے۔

طلعت حسین نے اس موقع پر تجویز دی کہ عدالتی امور کی کوریج کرنے والے صحافیوں کیلئے سپیشلائزڈ کورسز کروانے کی ضرورت ہے جس کیلئے اکیڈمی کو اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ ان سے فارغ التحصیل ہونیوالے صحافی ہی کورٹس کی رپورٹنگ کرسکیں۔ جسے ڈائریکٹر جنرل جوڈیشل اکیڈمی خیبر پختونخواہ نے سراہا اور کہا کہ آج کے ایک روزہ تربیتی ورکشاپ کیلئے انہیں بہت پاپڑ بیلنے پڑے تاہم اس شعبے سے وابستہ صحافیوں کی بہتری کیلئے تین ماہ کا کورس ڈیزائن کرسکتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پہلے تربیتی ورکشاپ میں انکے توقعات کے برعکس بہت کم صحافیوں نے شرکت کی ۔جبکہ ڈین فیکلٹی خورشید خان نے پروگرام کے دوران کئی مرتبہ کہا کہ صحافیوں کی لیٹ آنے کی وجہ سے پروگرام بھی لیٹ شروع کیا گیا جسے سن کر ہم نے بھی سر نیچے کرلیا حالانکہ ہم تین ساتھی مقررہ وقت پر پہنچے تھے لیکن چونکہ ہمارا ہی شعبہ موضوع بحث تھا اس لئے کچھ کچھ شرم بھی آئی جو کہ اس فیلڈ میں رہتے ہوئے نہیں آنی چاہئیے لیکن بارہ سال گزارنے کے باوجود ابھی تک ہم بے شرموں کی اس فہرست میں شامل نہیں ہوئے جو اپنی غلطی پر بھی دوسروں کی گریبان پکڑتے ہیں۔

تربیتی ورکشاپ کے اختتامی سیشن میں قومی ترانہ سنایا گیا جسے سن کر دل بہت خوش ہوا کیونکہ کچھ عرصے سے ہمارے ہاں تو پشتو زبان میں ایک نیا

ترانہ سنایا بلکہ سنانے کے بجائے بجایا جاتا ہے اور اس پر کچھ مخصوص لوگ ٹھمکے بھی لگاتے ہیں لیکن شکر ہے صوبہ خیبر پختونخواہ کی جوڈیشل اکیڈمی میں قومی ترانہ سنا جس کے بعد چیف جسٹس نے تربیت مکمل کرنے والے صحافیوں میں سرٹیفیکیٹس بھی تقسیم کئے لیکن یہاں پر جوڈیشل اکیڈمی والے صحافیوں سے ہاتھ کر گئے۔کچھ ایسے صحافیوں کے نام کے سرٹیفیکیٹس بھی جاری کئے گئے جنھوں نے تربیت میں حصہ بھی نہیں لیا تھا جبکہ جو لوگ تربیت میں صبح سے شام تک بیٹھے رہے ان کا نام تک نہیں لیا گیا جس کی وجہ بھی یہی تھی کہ تربیت کیلئے آنیوالے صحافیوں کی فہرست تو تیار کی گئی لیکن اسے دیکھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی اور نہ ہی تربیتی سیشن کے دوران اس کی تصدیق کی گئی۔ خیر مجھ سمیت متعدد صحافی سرٹیفیکٹس کی تقسیم کے دوران خجل و خوار ہوئے۔

چیف جسٹس پشاور ہائیکورٹ نے اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جوڈیشل اکیڈمی کی انتظامیہ کو ہدایت کی کہ صحافیوں کی تربیت کیلئے تین ماہ کا کورس ڈیزائن کیا جائے اور اس میں عدالت عالیہ جوڈیشل اکیڈمی کیساتھ وسائل کی حد تک تعاون کرنے کیلئے تیار ہے چیف جسٹس پشاور ہائیکورٹ کا کہنا تھا کہ موجودہ حالات میں ملکی اداروں کا تمام بوجھ عدلیہ پر ہے اور میڈیا کو اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے انہوں نے ملک کی موجودہ افسوسناک صورتحال پر کہا کہ پاکستان کی تخلیق میں سنی و شیعہ سمیت تمام مسالک کے لوگوں نے

بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جبکہ آج ہمیں تقسیم کیا گیا جس میں اندرونی اور بیرونی عناصر دونوں شامل ہیں چیف جسٹس پشاور ہائیکورٹ کا کہنا تھا کہ ملک کی موجودہ حالات میں میڈیا کا مثبت رویہ اور کردار ہی ملکی بقاء سلامتی اور ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں او ر صحافیوں کی تربیتی سلسلوں سے انہیں مثبت سمت لایا جا سکتا ہے ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ آئین میں دی گئی اظہار رائے کی آزادی اور معلومات کی فراہمی کا حق ہر ایک کو حاصل ہے تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ اس وقت بھی ملک کے چند حصے صحافیوں کیلئے نو گو ایریا ہے بعد ازاں اپنی نوعیت کا ملکی سطح پر ہونیوالا کورٹ رپورٹر کیلئے کیا جانیوالا تربیتی ورکشاپ اختتام پذیر ہوا۔

ڈاکٹروں کی بے حسی کا شکار معصوم طالب علم

بچے شرارتیں کرتے ہی اچھے لگتے ہیں اور جب عمر بھی بقول سویٹ سیونٹین ہو تو پھر تو ہر چیز بہت زیادہ خوبصورت لگتی ہیں اس عمر میں ہر ایک کو اپنا آپ ہیرو / ہمارزن ہی لگتا اور سمجھتا ہے بھاگنے دوڑنے کو دل کرتا ہے اپنے آپ کو نمایاں اور الگ دیکھنے دکھانے کو بھی دل کرتا ہے والدین کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا/ بیٹی سب سے الگ اور نمایاں ہو خواہ وہ تعلیم کے شعبہ ہو یا دیگر شعبے ۔ لیکن کچھ ایسے بد قسمت بچے ہوتے ہیں جنھیں سویٹ سیونٹین میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے والدن اپنے بچوں کو دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں یہی حال پشاور کے نواحی علاقے بخشو پل کے رہائشی طالب علم اکرام اللہ کا بھی ہے سترہ سالہ اکرام اللہ شرارتیں کیا کرتا وہ تو زندگی کی رنگینیاں دیکھنے سے قبل ہی بستر کا ہو کر رہ گیا ہے ساتویں جماعت کا طالب علم سکول آنے کے بعد اپنی علاقے میں واقع چھوٹی سی دکان پر بیٹھتا اور اپنے گھر والوں کی مدد کررہا تھا لیکن ایک دن سکول آنے کے بعد اسے دکان میں بیٹھے بیٹھے گردوں کی تکلیف ہوئی جسے ابتدائی طور پر معمولی جانا گیا تاہم حالت خراب ہونے پر اسے پشاور کے ہسپتال منتقل کر دیا گیا جسے بعد میں حیات آباد میں واقع سرکاری کڈنی سنٹر میں بھجوایا گیا لیکن جب انسان غریب ہو اور پھر معاشرہ بھی

پاکستانی ہو تو پھر اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا یہی حال اکرام اللہ کا بھی ہوگیا مریضوں کی خدمت کا حلف اٹھانے والے ڈاکٹروں کی غفلت نے معصوم طالب علم کو اس حال تک پہنچا دیا کہ اسے سٹریچر میں گھر لانا پڑا حالانکہ وہ اپنے پاؤں سے ہسپتال علاج کیلئے گیا تھا لیکن وہاں پر تعینات سرکاری ڈاکٹر اس معصوم پر توجہ دینے کے بجائے ایک دوسرے کو ڈیوٹی کیلئے کہتے رہے اور اکرام اللہ کی حالت بدتر ہوتی گئی اور اسے گھر بھجوا دیا گیا-

تین بہنوں اور تین بھائیوں پر مشتمل اسے گھرانے کا واحد کفیل اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر بے وقت ہی بوڑھا ہوگیا ہے دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اسے خوشی تھی کہ اس ہاتھ بٹانے والا دوسرا بیٹا بھی آگیا ہے لیکن اب تو اس حالت میں پہنچنے اور گھر پر بستر پر پڑا رہنے اور علاج نہ ہونے سے معصوم طالب علم کی دماغی حالت بھی متاثر ہو کر رہ گئی ہیں جس کی بڑی وجہ اس کے جسم سے زہریلے مواد خارج نہ ہونا ہے مثانے کی تکلیف تو اب اکرام اللہ کا مستقل مسئلہ بن گیا ہے، اپنے لخت جگر کے علاج کیلئے وزیروں اور مشیروں کے گھروں کی دہلیز پر حاضری دیتے اکرام اللہ کے والد کے جوتے گھس گئے لیکن کسی نے اس کی فریاد سننے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ اسی علاقے کا ممبر صوبائی اسمبلی جس کا گھر بھی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اکرام اللہ کے گھر سے دور ہے اور آج کل تو روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والی پارٹی کا عہدیدار بھی ہے لیکن وہ

اکرام اللہ کے والد کی فریاد پر اتنا ہی کر ہی سکتا ہے کہ غریب اکرام اللہ کیلئے مراسلے تو بھیج سکتا ہے اس پر دستخط کر سکتا ہے لیکن چونکہ مسئلہ غریب آدمی اور اس کے بیٹے کا ہے اس لئے اکرام اللہ کی قسمت میں ممبر صوبائی اسمبلی سے لیکر سپیکر اسمبلی سے لیکر صوبائی وزیر صحت کی طرف سے صرف دم دلاسے اور وعدے ہیں جو 2011 سے جاری ہے لیکن یہ ایفاء ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔

معصوم طالب علم اکرام اللہ کے ہاتھوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے جبکہ اس کی زبان میں لکنت بھی آگئی ہے جو اس کے گھر والوں اور خصوصا بڑے بھائی کیلئے بھی ایک بڑا امتحان ہے کیونکہ بڑے بھائی کی طرف دیکھنا اور ان سے توقع رکھنا تو ہمارے معاشرے میں عام سی بات ہے لیکن معمولی نوکری میں بھائی گھر والوں کے اخراجات پورے کرے چھوٹے بھائی کی علاج کیلئے کوششیں کرے یہ بھی بہت بڑا امتحان ہے بیمار بھائی کیلئے بہت کچھ کرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود وسائل اتنے ہی ہیں کہ سر چھپانے کی کوشش میں پاؤں نظر آتا ہے اور پاؤں چھپانے کی کوشش میں سر نظر آتا ہے ایسے میں بھائی بھی کیا کرے۔اسلام آباد کے ایک نجی ہسپتال میں اس معصوم طالب علم اکرام اللہ کے علاج کیلئے ڈاکٹروں نے پانچ لاکھ روپے جمع کرنے کی ہدایت کی ہیں لیکن لیکن دو وقت کی روٹی کیلئے ترسنے والے اس خاندان کیلئے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن

ہی نہیں ۔ڈاکٹروں کی بے حسی سے اس حال کو پہنچنے والے اکرام اللہ کی خواہش ہے کہ وہ عام بچوں کی طرف اپنے ہم عمر بچوں میں کھیلے کودے گلی میں جائے اپنی کتابوں کا بستہ اٹھائے اس معصوم طالب علم کا کہنا ہے کہ میں نے ڈاکٹر بننا ہے ۔ جب راقم نے اس سے بات کی کوشش کی تو لکنت زدہ لہجے میں معصوم بچے کا کہنا تھا کہ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں جس کی سمجھ تو اس وقت نہیں آئی لیکن بڑے بھائی نے اپنے مریض چھوٹے بھائی کے دل کی بات کہہ ڈالی جب راقم نے دوبارہ پوچھا کہ تمھارا حال تو ڈاکٹروں نے کیا ہے تو پھر کیا تم بھی ایسے ہی ڈاکٹر بنو گے تو جواب میں وہ معصوم مسکرایا اور پھر لکنت زدہ لہجے میں کہا کہ نہیں میں لوگوں کی خدمت صحیح معنوں میں کرونگا اور ہر مریض کو دیکھنے جایا کرونگا اس کی بات سن کر میں اس معصوم بچے کو دیکھتا رہ گیا۔

یہ صرف ایک طالبعلم اکرام اللہ کی کہانی نہیں اس طرح کے کتنے ہی اکرام اللہ جو اپنے غریب والدین کا آسرا ہے اس حالت کو پہنچ گئے ہیں اور اب حکومتی امداد اور مخیّر افراد کی توجہ کے طالب ہیں انہیں اس حالت میں پہنچانے والے قصاب نما ڈاکٹروں سے پوچھ گچھ اور ان کی مدد تو اس ریاست کی ذمہ داری ہے جن کے حکمران ہر وقت آئین کی رٹ ہر وقت لگاتے رہتے ہیں لیکن انہیں آئین صرف اپنے لئے ہی نظر آتا ہے آئین نے بحیثیت حکمرانوں کی جو فرائض ان پر عائد کئے ہیں انہیں وہ یاد نہیں یہ فرائض انہی کے تیار کردہ آئین کے تحت ہیں جس کی

بھی خلاف ورزی ہو رہی ہیں جبکہ جو حق اسلام نے انہیں دیا جس کی تشریح نبی اکرم صلی اللہ والہ وسلم اور اس کے صحابہ نے کی جس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ جیسا باجبروت خلیفہ بھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر عوام کی حالت جاننے کیلیۓ گلیوں میں پھرا کرتا تھا وہ بھی اسلامی ہونے کے دعویدار پاکستان کے حکمران پورا نہیں کر رہے نہ یہ لوگ اسلام کے روسے دیۓ گۓ حقوق پورے کر رہے ہیں نہ اپنی ہی تیار کردہ آئین کے تحت حقوق شہریوں کو دے سکتے ہیں تو پھر ان "حرام خوروں" کو اپنے اوپر لادنے کا مطلب کیا ہے۔

ہمارا نظام تعلیم ماسٹر اور اعزازی ڈگریاں

کچھ دن قبل فیس بک پر ایک ساتھی نے نظام تعلیم کے حوالے سے ایک تصویر شیئر کی جس میں دکھایا گیا تھا کہ بچے ہاتھوں میں بستہ اور کتابیں اٹھائے ایک جگہ کہ جو کتاب تھی اور اس کی تشبیہ تعلیمی اداروں کے حوالے سے دی گئی تھی میں داخل ہورہے تھے جبکہ دوسری طرف سے نکل کر آنیوالے لوگوں نے ڈگریاں اٹھائی ہوئی ہیں لیکن ان کے سر گدھے کے تھے یعنی نظام تعلیم سے نکل کر آنیوالے گدھے ہی تھے۔یہ تصویر دیکھ کر عجیب سا لگا لیکن یہ سچ بھی ہے جسے ہمارے لوگ برداشت نہیں کرپارہے ہمارے معاشرے میں کچھ سا فیشن چل پڑا ہے کہ طالب علم اپنی تعلیمی اداروں کے نام اب گاڑیوں پر سٹکر کی صورت میں لگاتے ہیں یعنی انگریزی زبان میں ادارے کے نام کیساتھ IAN آخر میں لگا کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم نے بڑے نامی گرامی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی ہے جسے دیکھ کر میری طرح ٹاٹ پر تعلیم حاصل کرنے والے انہیں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم TATARIAN لگا نہیں سکتے اور اگر لکھ بھی ڈالے تو لوگوں کو سمجھ نہیں آئیگی کہ یہ کونسا ادارہ ہے شائد لوگ اسے دیکھ کر مرعوب بھی ہو جائیں کہ ہو سکتا ہے یہ بھی بڑے تعلیمی ادارہ ہو لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر کسی نے پوچھ لیا اور ہم نے سچ بتادیا کہ ہم ٹاٹ پر پڑھے ہوئے ہیں اور لفظ TATARIAN ہمارے لئے مزید

-احساس کمتری پیدا کرنے کا سبب بن جائے
اکیس سال قبل جب ہم میٹرک میں تھے اس وقت ہمارے اساتذہ ہمیں نصیحت کیا کرتے تھے کہ نالائقوں خوب پڑھنا ہے جہاں سے ہمارا تعلق ہے اس علاقے میں میٹرک تک تعلیم اعلی تعلیم تھی اس لئے اساتذہ سمجھاتے تھے کہ میٹرک کی اہمیت نہیں بقول ان کے آج کے گدھے کی اگر دم اٹھا کر دیکھ لی جائے تو اس پر لکھا ہوتا ہے کہ میٹرک پاس اور ہم اپنے اساتذہ کی ان مثالوں پر حیران ہوتے کہ اتنی سمجھ بوجھ والے لوگ کیسی باتیں کرتے رہتے ہیں لیکن اب تقریبا اکیس سال بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی باتوں کیں کتنی سچائی تھی اب تو گدھے ماسٹر بھی کرلیتے ہیں لیکن گدھے ہی رہتے ہیں- شائد ہماری بات گدھوں میرا مطلب ہے ماسٹر کرنے والوں کو بھی بری لگ جائے لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ ماسٹر کرنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے شعبے میں ماسٹر بن گئے ہیں لیکن حقیقت میں کیسے ماسٹر ہے اس کا اندازہ گذشتہ دنوں پشاور یونیورسٹی کے ایک ڈیپارٹمنٹ میں زیر تعلیم طلباء سے بات چیت کے دوران پتہ چلا انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے اس دور میں ان طلباء کو نصاب 80 کی دہائی کا پڑھایا جارہا ہے اور انہیں پڑھانے والوں کی سوچ 90 کی دہائی کی ہے ایسے میں ماسٹر کرکے آنیوالے کیسے ہونگے اس کا اندازہ اس لطیفے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک چوزہ سڑک کراس کرتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکراگیا گاڑی کے ڈرائیور نے بے ہوش ہونیوالے چوزے کو اٹھایا اور

گھرلے جا کر پنجرے میں بند کر دیا چوزہ جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو پنجرے میں دیکھ کر سوچنے لگا کہ آہ لگتا ہے کہ ڈرائیور مر گیا ہے کیونکہ میں جیل میں بند ہوں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونیوالے کیسے کیسے ماسٹر بن کر نکل رہے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل ماسٹر کرکے آنیوالے ایک طالب علم نے ایک جگہ انٹرویو دیا cv میں موصوف کہیں سے cut اور کہیں سے paste کرکے بنا کر دی تھی آخر میں اس نے انگریزی زبان میں cv کی جگہ لکھا کہ اگر پوچھا گیا تو بتا دیا جائیگا چونکہ REFRENCE تھی سو انٹرویو کرنے والے نے اس سے انگریزی زبان میں پوچھا کہ کون ہے ریفرنس جس کے بعد ماسٹر کرنے والے کے پاؤں سے زمین نکل گئی کہ یہ ریفرنس کیا بلا ہے اس نے سمجھے بغیر لگا تھا سو جلدی میں موصوف نے ریفرنس لکھ کر کسی کو ایس ایم ایس کرنا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے غلطی سے اپنے کسی دوست کو بھیجنے کے بجائے اس نے انٹرویو کرنے والے کو میسج کر دیا کہ اس کا مطلب کیا ہے انٹرویو کرنے والے کو بھی حیرانی ہوئی لیکن اسے اندازہ ہوا کہ ماسٹر کرکے انٹرویو دینے والا قابلیت کے کس معیار پر ہے ان حالات میں ماسٹر کرنے والے یہ گلہ کرتے ہیں کہ انہیں روزگار نہیں ملتا۔

ہماری مصیبت بھی یہ ہے کہ ہم تعلیم روزگار کیلئے کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب

ڈگریوں کی بھی اہمیت نہیں رہی ڈگریوں کی قطار رکھنے والے اندر سے کتنے چھوٹے اور نالائق ہوتے ہیں اس کا اندازہ تو ہمیں زندگی کی بہت سارے تجربوں سے ہوا ہے کیونکہ کسی زمانے میں سننے میں آتا تھا کہ 70 کی دہائی کا میٹرک پاس 90 کی دہائی کے BA پاس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور اس معاملے میں لائق بھی ہوتا ہے لیکن اب تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ 90 کی دہائی کا بیچلر آج کل کے دور میں PHD ڈاکٹریٹ کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے کسی کو یقین نہ آئے تو ان کی واضح مثال اپنے سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ملک صاحب ہے جنھیں ایک یونیورسٹی نے ڈگری دی ہے اور اب سندھ یونیورسٹی نے بھی اپنے رینٹل راجہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا اعلان کیا ہے جو ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں دی جارہی ہیں جس کی منظوری بھی بیوی کی طرح ہر ہفتے روٹھ کر میکے جانے کی دھمکی دینے والی پارٹی ایم کیو ایم کے گورنر نے دیدی ہے اب یہ نہیں پتہ کہ رینٹل راجہ کو ڈگری قوم کو اندھیروں میں رکھنے اور اپنے سیالکوٹیے ملک صاحب کو ڈگری شائد موبائل فون سروس کی لوڈشیڈنگ کرنے کے اعتراف میں ہو جائینگے اب کو یہ کہے کہ یہ تو اعزازی ڈگری PHD دی جارہی ہو لیکن یہ صاحب بھی ہے لیکن یہاں پر ان کیلئے ایک ہی جملہ ہے کہ "ڈگری ڈگری ہوتی ہے خواہ اعزازی ہو یا اپنی محنت سے حاصل ہونیوالی ڈگری" ویسے بھی ڈگریوں کو چیک کرنے والے ہائیر ایجوکیشن کمیشن پانچ سال بعد خواب خرگوش سے بیدار ہو گئی ہیں حالانکہ جعلی ڈگریوں سے پانچ سال تک لیڈر نما چوروں نے بڑے مزے

بھی کر لئے۔

احساس ملکیت یا مردانگی اور خواتین کے حقوق

یہ احساس ملکیت ہے یا مردانگی جسے ہم لوگ اپنے گھروں میں بازاروں میں آنیوالی دفاتر میں کام کرنے والی خواتین پر سب سے زیادہ ہی جتاتے ہیں اور اس کی آڑ میں ہم اپنے مائوں بہنوں اور بیٹیوں کی زندگیوں کو جہنم بنادیتے ہیں ہم مرداپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں شائد یہی وجہ ہے کہ ہم اپنا زور کا رخ اپنی خواتین پر ہی کرتے ہیں۔ یہ سوچ راقم کی افغانستان کی عائشہ محمد زئی کی کہانی پڑھنے کے بعد پیدا ہوئی جو برطانوی اخبار دی میل نے شائع کی ہے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عائشہ محمد زئی جس کی عمر اس وقت انیس سال ہے کو دو سال قبل اس وقت بین الاقوامی شہرت ملی جب اس کی تصویر امریکی میگزین ٹائم میں چھپی تھی اگست 2010 ء کے شمارے کے سرورق میں دکھایا گیا تھا کہ عائشہ محمد زئی کی ناک اس کے شوہر نے کاٹ دی تھی اور اس کی سرورق پر لگی تصویر نے پوری دنیا کو چونکا دیا بین الاقوامی تنظیموں نے ٹائم میگزین کو ہدف تنقید بھی بنادیا کہ اس طرح کی خوفناک تصویر لگا کر نہ صرف عام لوگوں کو ذہنی تنائو کا شکار کردیا گیا بلکہ اس خاتون کی عزت نفس بھی مجروح کی گئی لیکن اس میگزین کی وجہ سے مختلف اداروں نے اس کے علاج کیلئے کوششیں شروع کی اور تقریبا دو سال بعد آج ناک کٹی عائشہ کا آپریشن ہوگیا ہے جس میں اس کی کٹی ناک کو لگایا گیا ہے

اور اب مزید تین آپریشن کرکے اسے بہتر کیا جائیگا۔افغانستان میں رہائش پذیر عائشہ محمد زئی کا قصور اتنا تھا کہ اس کے والدین نے کم عمری میں اس کی شادی کی بقول عائشہ محمد زئی کے اس کے سسرال والے اسے روزانہ مارتے پیٹتے تھے اس نے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی گرفتار ہونے پر اسے پانچ ماہ کیلئے جیل بھیج دیا گیا جہاں سے رہائی کے بعد اس کا شوہر اسے پہاڑوں کی طرف لے گئے ہاتھ اور پاؤں سے اسے باندھ لیا اور پھر اس نے اپنی عزت کا بدلہ کچھ اس طرح لیا کہ سترہ سالہ عائشہ محمد زئی کی ناک اور کان کاٹ دیئے اور اسے اس کے والدین کی طرف بھیج دیا والدین اسے ہسپتال لے گئے جہاں پر امریکی ڈاکٹروں نے اس کا ابتدائی علاج کروا دیا لیکن اس کی بہتری کیلئے اسے پھر امریکہ منتقل کردیا میگزین میں تصویر آئی اور پھر آج عائشہ محمد زئی کے ناک اور کان کو ٹھیک کرنے کیلئے علاج ہو رہے ہیں۔

عائشہ محمد زئی کی شادی کم عمری میں والد نے اپنے قرضے کو ختم کرنے کیلئے کی تھی جس کا انجام ایسا ہوا اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان میں 90 فیصد خواتین پر گھروں میں تشدد کے اس طرح کے واقعات ہو رہے ہیں جن میں بہت کم رپورٹ ہو رہے ہیں ۔ عائشہ محمد زئی کے مطابق جب اس کے کان اور ناک کو کاٹ دیا گیا تو درد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا اور خصوصا رات کے وقت جب میں سانس لیتی تو لگتا کہ میری ناک کسی ٹھنڈے پانی میں ڈال دی گئی

ہو اور یہ انتہائی سخت دن تھے لیکن یہ دن بھی گزر گئے۔ آج امریکہ میں عائشہ محمد زئی ایک امریکی خاندان کے ہمراہ زندگی گزار رہی ہیں۔ اس کا ذمہ دار کون ہے اور مرد ایسا ہی کیوں کرتے ہیں یہ ایک ایسا سوال تھا جو اس کہانی کو پڑھنے کے بعد راقم کے ذہن میں پیدا ہوا لیکن میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کیلئے کہا کہ چھوڑ دو یار یہ افغانستان کی سٹوری ہے کیوں اپنے آپ کو ذہنی تناؤ کا شکار کر رہے ہو اور اپنے کام میں مصروف عمل ہوگیا لیکن ذہن کے کسی کونے میں عائشہ محمد زئی کی کہانی چل رہی تھی پھر بھی میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلئے سوچ رہا تھا کہ یار افغانستان ہم سے بہت پیچھے ہیں ٹھیک ہے وہاں پر ڈالر ہے لیکن ہم ان کے مقابلے میں تعلیم یافتہ ہیں اور ہمارے ہاں تشدد کے واقعات بھی نہیں ہوتے لیکن !

دھچکہ راقم کو اس وقت لگا جب ایک مقامی خیراتی ہسپتال میں اپنے ایک مسئلے کے سلسلے میں ڈاکٹر دوست سے ملنے گیا۔ راقم ڈاکٹر کیسا تھ محو گفتگو تھا کہ ایک خاتون جس نے برقعہ پہنا تھا اپنے ساتھ ایک پندرہ سالہ لڑکی کو لے آئی چونکہ میرا بھی کام اہم تھا اس لئے میں کوشش کر رہا تھا کہ جلدی سے نکل جاؤ لیکن اسی دوران وہ خاتون اپنے ساتھ لڑکی کو ڈاکٹر کے کمرے میں لے آئی مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں اور ڈاکٹر مریض سے بات کر رہا تھا اسی دوران خاتون نے ڈاکٹر کو کہا کہ لڑکی کا ہاتھ اوپر نہیں اٹھ رہا اس

کا ایکسرے کروادیں ڈاکٹر نے وجہ پوچھی تو برقعہ پوش خاتون نے جواب دیا کہ رات کو اس کے بھائی نے اسے مارا جس کے باعث اب اسے سینے میں بھی تکلیف ہے اور سانس نہیں لے رہی اور وہ اپنا ہاتھ بھی نہیں اٹھا پارہی۔ڈاکٹر نے اسے ایکسرے کیلئے بھیج دیا اور پھر راقم کی طرف متوجہ ہوگیا۔کچھ دیر بعد ڈاکٹر کا اسسٹنٹ اسی خاتون کی بیٹی کا ایکسرے لیکر آئے تو بتایا کہ اس معصوم لڑکی کو سینے میں زخم آئے ہیں۔ جس کی ادویات لکھ کر اسے دیدی گئی اور وہ خاتون اپنی بیٹی کو لیکر وہاں سے چلی گئیں۔مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کس طرح اپنا دکھ بیان کروں کیونکہ میں باپ بھی ہوں شوہر بھی ہوں بھائی بھی اور بیٹا بھی ہوں اور ان چاروں رشتوں کے حوالے سے سوچ کر مجھے وہ مرد انتہائی برا لگا جس نے اپنی بہن پر ہاتھ اٹھایا جس کے باعث وہ معصوم سی لڑکی ہسپتال پہنچ گئی ۔

کیا ہم حقیقی معنوں میں مسلمان ہیں اور کیا ہم پختون بھی ہیں کہ نہیں کیونکہ اسلام نے وہ تمام بنیادی حقوق جو کسی بھی شخص کو حاصل ہے خواتین کو بھی دیئے ہیں بلکہ کچھ معاملات میں خواتین کو مردوں پر فوقیت بھی دی ہیں یہی ماں ہے جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہیں یہی بیوی ہے جس کے ساتھ نکاح کے بعد مرد کا ایمان مکمل ہوتا ہے یہی وہ بہن کا رشتہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی رضاعی بہن کی آمد پر اسے تعظیم دی اور یہی وہ بیٹی کا رشتہ ہے جس کے بارے میں بتایا گیا کہ جس نے بیٹیوں کی اچھی تربیت کی تو

وہ قیامت کے دن اللہ کے محبوب کے ساتھ ہوگا۔اگر کسی کو اس کے بارے میں معلوم کرنا تو قرآن کے سورۃ البقرہ المائدہ النور الحزب التحریم سمیت سورۃ النساء اور سورۃ الطلاق کو ترجمے کے ساتھ پڑھ لے انہیں اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالی نے کونسے حقوق انہیں دیئے ہیں رہی پختون معاشرے کی بات تو کیا ہمارے پختون ولی میں خواتین پر ہاتھ اٹھانا ہے کوئی اگر اپنے آپ کو پختون کہتا ہے تو کیا اس کی پختون ولی میں یہ جائز ہے کہ خاتون خواہ وہ کسی بھی رشتے میں ہو پر ہاتھ اٹھائے نہیں کوئی بھی اس کا جواب ہاں میں نہیں دے گا تو پھر اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ وہ سوال ہے جو راقم سمیت ہر ایک کو اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے۔

بچوں کیساتھ ہمارے بے رحم رویے

سبزی منڈی میں کام کرنے والے دکاندار اور چھابڑی فروش اس 16 سال کے لڑکے کو بادشاہ آئی لو یو کہتے اور یہ سننے کے بعد وہ ان الفاظ کو کہنے والے کے پیچھے پڑتا یہ دیکھے بغیر کہ وہ یہ الفاظ بولنے والا اس کا ہم عمر ہے یا اس سے بڑا لیکن وہ لڑکا کوشش کرتا کہ کسی کو لات مارتا یا مکا مارنے کی کوشش کرتا یہ ایک معمول کی بات تھی جسے یں روزانہ سبزی مارکیٹ میں ہوتا ہوا دیکھتا۔ جب بھی میں اس لڑکے کو دیکھتا تو وہ کبھی گاجر پودینہ یا پھر ساگ کے ڈھیر کے پاس کھڑا ہتا اور وہ دکانداروں کی آواز میں چیخیں مارتا کہ سستی سبزی لو اس کی ناک بہہ رہی ہوتی دانتوں کی صفائی نہیں کرتا اس لئے سامنے کے دانت زرد رتھے اور اس حالت میں جب وہ مسکراتا تو وہ کچھ عجیب سا لگتا ۔تاہم جب بھی میں اسے دیکھتا تو اس نے بالوں میں کنگھی کی ہوتی لیکن اس کے بالوں کا سٹائل بھی کچھ عجیب سا تھا اور اسے ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد اسے بھلانا مشکل ہوتا۔ میرے لئے یہ ایک عام سی بات تھی روزانہ سبزی پر لائیو پروگرام کے دوران میں اسے دیکھتا دوسرے دکاندار اسے تنگ کرتے اور جواب میں وہ لوگوں کو کبھی کبھار گالیاں بھی دیتا حالانکہ وہ معقول سا لڑکا لگتا سب اسے دیکھ کر ہنسنے لگتے اور وہ سر جھکا کر اپنی سبزی بیچنے لگتا۔

آج بھی معمول کے مطابق میں سبزی پر لائیو پروگرام کرنے گیا لیکن آج اس لڑکے کی زمین پر لگے ڈھیر جس میں پودینہ پڑا تھا اور اسے وہ فروخت کر رہا تھا کے نزدیک لائیو پروگرام کیلئے کیمرہ لگ گیا۔ لوکیشن تبدیل ہونے کی وجہ سے میں اس کیساتھ کھڑا ہوگیا چونکہ پروگرام لیٹ تھا اسی وجہ سے میں اس کیساتھ گپ شپ شروع کردی۔ خدائی خدمتگار کے گاؤں اتمانزئی سے تعلق رکھنے والا ارشد روزانہ 4 بجے صبح گھر سے نکلتا اس کی والدہ اسے اٹھاتی اور وہ چارسدہ کے علاقے سے روزانہ فلائنگ کوچ میں ساڑھے پانچ بجے تک پشاور کے شاہی باغ روڈ پر واقع سبزی منڈی پہنچ جاتا۔ جہاں پر وہ سبزی منڈی میں گدھا گاڑیوں پر آنیوالی مختلف سبزیوں والوں سے سبزی تھوک میں خریدتا اور بعد میں وہ پرچون میں روڈ کنارے کھڑے ہو کر فروخت کرنے کی کوشش کرتا روزانہ چار بجے تک دکانداروں کی طرح چیخیں مار کر وہ سبزی فروخت کرنے کی کوشش کرتا شام چار بجے تک اس کی سبزی فروخت ہو جاتی اور اسے چار سو تک کی مزدوری ہو جاتی جس میں وہ پچاس پچاس روپے ٹریفک اہلکار اور میونسپل کمیٹی کے اہلکاروں کو بھتہ بھی دیتا ایک سو روپے میں ساٹھ روپے اس کے آنے جانے کا خرچہ تھا جبکہ چالیس روپے وہ کھانے پینے کیلئے استعمال کرتا اور دو سو روپے کے قریب اس کی مزدوری بچ جاتی جو ارشد گھر جا کر اپنی والدہ کو دیتا جس سے اس کی گھر کی دال روٹی چل رہی تھی۔

جب میں نے اس سے سوال کیا کہ تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ چوتھی جماعت تک میں نے تعلیم حاصل کی ہے اور میں تقریبا تین سال سے روزانہ چارسدہ سے پشاور آتا ہوں یہاں پر مزدوری کرتا ہوں اس سے قبل میرے والد یہاں پر مزدوری کرتے تھے لیکن انہیں کالا یرقان ہوگیا جسکی وجہ سے انہیں پشاور آنے میں مشکلات درپیش ہوتی تھی دو بڑے بھائیوں نے شادی کی ہے اور الگ رہتے ہیں اپنے گھر میں بڑا اب میں تھا اور والد کی بیماری کے باعث مجھے مزدوری کرنا پڑی پہلے حیات آباد میں کارخانو میں نوکری کرتا تھا بعد میں ہوٹل والے کیساتھ کام کرنا شروع کردیا لیکن وہاں وقت زیادہ تھا اور پیسے بھی کم دیتے اس لئے وہ کام چھوڑ دیا اور اب اپنے والد کی جگہ یہاں پر کام کرتا ہوں اس کے کپڑے انتہائی گندے تھے جب میں نے اس سے سوال کیا کہ تم کپڑے کب تبدیل کرتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ میرا تو دل کرتا ہے کہ روزانہ کپڑے تبدیل کرو لیکن یہاں پر سبزی کا کام گندا ہے چونکہ زمین پر بیٹھے رہتے ہیں اس لئے کپڑے سارے گندے ہو جاتے ہیں اور جب میں گھر جاتا ہوں تو اتنی ہمت نہیں ہوتی کھانا کھانے کے بعد سو جاتا ہوں اور پھر اگلے روز صبح اتمانزئی سے پشاور کیلئے علی الصبح نکلتا ہوں یہی میری روٹین ہے جب میں نے اس سے سوال کیا کہ تمھیں کیوں لوگ بادشاہ آئی لو یو کہتے ہیں تو اس کی زرد دانت نکل آئے اور وہ ہنسنے لگا ۔اس دوران ایک بزرگ چھابڑی فروش میرے نزدیک آکر

کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ بابو صاحب ! بادشاہ کی تصاویر لینی ہے پھر اس کو چھاپ دینا ہے میں نے اس سے سوال کیا کہ اس نے کونسا تیر مارا ہے جو اس کی تصویر لو تو.بزرگ چھاڑی فروش کا جواب تھا کہ یہ بہت خوبصورت ہے اس لئے جس پر ارشد نے.بزرگ چھاڑی فروش کو مکے مارنے شروع کردیئے اور وہ.بزرگ چھاڑی فروش ہنستا ہوا چلاگیا مقامی دکانداروں کے بقول یہی ایک لڑکا ہے جس کی وجہ سے سبزی مارکیٹ میں دکاندار- چھاڑی فروش اور زمین پر بیٹھ کر سبزی فروخت کرنے والے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اسے مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اور جواب میں کبھی کبھار وہ گالیاں بھی دیتا ہے جسے اس -بازار میں دکاندار اور چھاڑی فروش انجوائے کرتے ہیں

سولہ سالہ ارشد اس معاشرے میں اکیلا نہیں اس جیسے ہمارے ارد گرد کتنے ہیں جن کی عمریں تعلیم حاصل کرنے کی ہیں لیکن غم روزگار نے انہیں اس حال میں پہنچا دیا ہے ان معصوموں کے کھیلنے کے دن ہیں لیکن کھیلنے کے بجائے وہ بازاروں میں مزدوری کرنے میں جتے ہوئے ہیں انہیں ان کے مسائل نے وقت نے پہلے ہی شعوری طور پر جوان کردیا ہے-دوسری طرف ہم اور ہمارا معاشرہ ہے جو ان معصوموں کی حوصلہ افزائی کے بجائے انکی دل شکنی میں مصروف عمل ہیں،ارشد کیساتھ رکھا جانیوالا رویہ صرف اس لئے ہیں کہ وہ کم عمر ہے اس لئے اسے لوگ مذاق میں تنگ کرتے ہیں اور ان کیلئے ہنسنے ہنسانے کا ایک ذریعہ ہے حالانکہ

ان سے کام ہمارا معاشرے ایک مکمل انسان کا لیتے ہیں ان سے بھتے کی وصولی بھی ٹریفک اہلکار اور میونسپل کمیٹی کے اہلکار مکمل ہی کرتے ہیں لیکن اس جیسے کتنے ہی معصوم ہیں جن کے ساتھ ہمارا رویہ اتنا برا ہے کہ وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں-جب میں نے ارشد سے سوال کیا کہ کیا تمھاری خواہش نہیں کہ تمھاری اس طرح ایک بڑی دکان ہو اور اس میں تم بیٹھ کر دکانداری کرسکوں تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ خواہش تو میری ہے لیکن یہ لوگ مجھے تنگ کرتے ہیں اور میں یہاں پر اگر اپنی دکان میں بیٹھ گیا تو پھر بھی مجھے یہ لوگ تنگ کرینگے اب تو میں ادھر ادھر بھاگ جاتا ہوں لیکن پھر جب دکان ہوگی تو لوگوں کو میرا مذاق بنانے میں آسانی ہوگی اور وہ میری دکان پر آئیں گے اس لئے میں دکان کی خواہش ہی نہیں رکھتا- تعلیم روزگار اور صحت کی بنیادی سہولیات کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے جو وہ مملکت پاکستان میں کوئی پورا کرنے کو تیار نہیں اور نہ ہی ہم اس میں کوئی کردار ادا کرسکتے ہیں لیکن کیا ان بچوں کیساتھ رویہ رکھا جانیوالا برتاؤ ہمارے بس میں نہیں -

صحت مند اسسٹنٹ کمشنر اور قصائیوں کی بدمعاشی

پشاور کی انتظامیہ نے گوشت کی فی کلو سرکاری قیمت 220 روپے مقرر کردیے ہیں اسسٹنٹ کمشنر پشاور نے اس سلسلے میں قصائیوں کی دو مختلف ایسوسی ایشنز سے مذاکرات کے بعد اعلان کیا ساتھ میں یہ بھی کہا کہ قیمتوں کو کنٹرول میں لانے کیلئے قصائیوں کو انتظامیہ کیساتھ تعاون کرنا چاہیئے اس موقع پر اسسٹنٹ کمشنر نے مہنگائی ختم کرنے کا روایتی بیان بھی اپنے دفتر میں بیٹھ کر دیا ساتھ ہی میں یہ بھی کہا کہ کئی سالوں کے مسائل ایک دن میں ختم نہیں کئے جاسکتے انہی کے کمرے کے باہر انجمن القریش اور القریش بیف ایسوسی ایشن کے صدور نے یہ کہا کہ ہم نئے نرخ نہیں مانتے کیونکہ یہ نرخ تو تین سال پرانے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تین سال پرانے نرخ آج بھی پشاور میں کہیں بھی لاگو نہیں ڈھائی سو روپے کلو سمیت تین سو روپے کلو لیکر گوشت فروخت ہورہا ہے لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں مانیٹرنگ اور چیکنگ کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے شہر کے مختلف علاقوں میں غریب عوام کو قصائی دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں لیکن گذشتہ پانچ سالوں سے پختونوں کے اپنے حکمرانوں کو توفیق نہیں ہوئی کہ دہشت گردی سے متاثرہ غریب صوبے کے عوام کی حالت زار پر توجہ دیتے خصوصا قصائیوں کی الٹی چھری سے لوگوں کو لوٹنے کا نوٹس لیتے۔

ایک ماہ قبل اپنے گھر کیلئے گوشت لینے کیلئے میں اپنے محلے کی قصائی کی دکان پر گیا میں نے اس سے سوال کیا کہ بھائی گوشت کیا کلو قیمت بیچ رہے ہو چونکہ وہ مجھے جانتا تھا اس لئے مجھے جواب دیا کہ ڈھائی سو روپے کلو ہے اس نے میری طرف دیکھ کر چھری ہاتھ میں لی اور کہا کہ کہاں سے گوشت نکال کر دو میں نے اس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر انتہائی عاجزی سے کہہ دیا کہ بھائی جہاں سے مرضی گوشت لیکر دو لیکن یہ چھری دوسری طرف کرکے کام کرو اس نے گوشت کی بوٹیاں چھیچڑے ہڈیاں رکھ کر دینے شروع کردیئے میں اس کو گرشت تولتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس وقت ایک گاڑی رکی اور اس سے ایک شخص جس نے تھری پیس پہنا تھا آکر بڑے بارعب طریقے سے قصائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اوئے گوشت کس طرح بیچ رہے ہو قصائی اس کو دیکھ کر کہنے لگا کہ سر جی دو سو بیس روپے کلو ہے میں بھی حیران ہوا کہ لنڈے کی جینز تو میں نے بھی پہنی ہے لیکن میرے لئے اس کی قیمت الگ تھی اس وقت گاڑی سے ایک بچہ بھی اترا اور آکر اس شخص کے سامنے کہنے لگا کہ امی کہہ رہی ہے کہ گوشت کیساتھ قیمہ بھی لینا ہے قصائی نے گاڑی میں بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کو دیکھ کر کہا کہ دو سو بیس روپے تو سرکاری ہے لیکن چونکہ ہمیں نقصان ہوتا ہے اس لئے ڈھائی سو روپے ہے اور اس نے اس شخص کو جسے وہ پرائس کمیٹی کا اہلکار سمجھ کر قیمت بتا رہا تھا اسی ڈھائی سو روپے میں کلو گوشت دیا۔ یعنی اسے جیل جانے کا ڈر تھا اس

لئے سرکاری ریٹ بتا دیا یہی حال ہر جگہ پر ہے۔

سرکار کے نام پر ہمارا خون چوسنے والییعنی فوڈ کنٹرول کی ڈیپارٹمنٹ سے لیکر پرائس کنٹرول کرنے والے ملازمین نہ تو شہر کے مختلف مذبح خانوں سے لائے جانیوالے گوشت کی چیکنگ کرتے ہیں نہ ہی یہ دیکھتے ہیں کہ یہ صحت مند جانور کا گوشت بھی ہے کہ نہیں ہاں اس پر تصدیق کی مہر لگی ہوتی ہے لیکن یہ مہر بھی پانچ سو روپے سے لیکر پندرہ سو روپے میں ہر کوئی لگا سکتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو گاڑیوں میں لائے جانیوالے گوشت پر مختلف سڑکوں کا گرد و غبار دھول مچھر مکھیوں کے غول اپنی سرگرمیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اگر اس گاڑی کو چلانے والا ڈرائیور کنڈیکٹر اور قصائی نسوار استعمال کرتا ہو تو اس کی تھوک اور نسوار کی پچکاریاں گوشت کے مزے کو اور بھی دوبالا کرتی ہیں پھر جب یہی گوشت دکان پر پہنچا دیا جاتا ہے تو گوشت پر جالیاں نہ ہونے کی وجہ سے نالیوں کے مچھر اور مکھیاں گوشت کو اپنا وٹامن پہنچا دیتی ہیں یہ الگ بات کہ بحیثیت مسلمان ہمیں بتایا گیا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے لیکن ہم لوگوں کا ایمان کہاں ہے خیر یہ شریف قصائیوں کا حال ہے ورنہ مخصوص مذبح خانوں میں بڑے اور چھوٹے گوشت یعنی بکری اور دنبے کا گوشت فروخت کرنے والے قصائی گوشت کے وزن کو زیادہ کرنے کیلئے اس میں پانی بھرتے ہیں کچھ مخصوص علاقوں بشمول شہر و کینٹ میں کم عمر بچھڑوں کا گوشت بھی چھوٹے گوشت کے نرخ پر فروخت کیا

-جاتا ہے اور پوچھنے والوں کی آنکھیں ماہانہ بھتہ خوری نے بند کر رکھی ہیں
گوشت کی قیمتوں میں اضافے پر صرف پشاور کے تقریبا دو ہزار کے قریب قصائی رونا رو رہے ہیں حالانکہ پنجاب سے آنیوالے جانور صوبے بھر میں پہنچائے جاتے ہیں وہاں پر قیمتوں کا کوئی مسئلہ نہیں سرکاری لیڈروں کی طرح اب قصائی بھی بیان دینے شروع ہوگئے ہیں کہ افغانستان گوشت اور جانوروں کی سمگلنگ ہو رہی ہیں جس کے باعث قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی کہہ کر آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جاتی ہیں ویسے دھول اسی سمگلنگ کی آڑ میں پشاور میں انتظامی عہدے پر تعینات ایک شخص نے بھی جھونکی جس کے پاس جب افغانستان سمگلنگ کے حوالے سے ثبوت آئے کہ کس طرح خیبر پختونخواہ کے دو بڑی اہم شخصیات سمگلنگ کے اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے جو اکثر ٹی وی سکرینوں پر آکر سمگلنگ کے خلاف بڑی تقریریں کرتے ہیں جب یہ ثبوت متعلقہ عہدیدار نے متعلقہ افراد کو دکھائے اور بارگیننگ کی تو اس چکر میں وہ عہدیدار ایک بڑے ضلع کا ذمہ دار بن گیا اور آج کل وہ اپنے بچوں کو سمگلنگ کے نام پر حاصل ہونیوالی ترقی کا مال کھلا رہا ہے اور برملا اعلان بھی کرتا ہے کہ اسے پروموشن اس کی قابلیت کی بنیاد پر ملی ہیں خیر دل کے پھپھولے کہاں سے کہاں لیکر پہنچا دیتے ہیں-

بحثیت صحافی زندگی میں دو ہڑتال ایسے میں پشاور میں ہوتے ہوئے دیکھے ہیں جسے آج بھی یاد کرتا ہوں تو حیرانگی ہوتی ہے کیونکہ ان دو ہڑتالوں کے دوران عوام نے سکھ کا سانس لیا تھا ان میں ایک رکشہ والوں کی ہڑتال اور دوسرے قصائیوں کی ہڑتال تھی رکشہ کی ٹرٹر اور انہیں چلانے والوں کی بدمعاشی سے تنگ عوام ان کی ہڑتال پر خوش تھے کہ چلو ان سے جان چھوٹی تو قصائیوں کی ہڑتال سے بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ مہنگائی نے انہیں دال خور بنا دیا تھا - بات گوشت کی قیمتوں کی ہو رہی ہیں انتظامیہ نے تین سال پہلے بھی دو سو بیس روپے کا ریٹ دیا تھا لیکن انہیں چیک کرنے والا کون تھا- کیونکہ ریٹس کو چیک کرنے والوں کے گھر میں گوشت تو باقاعدگی سے پہنچتا ہے بلکہ ان کے دفتر میں کام کرنے والے مخصوص لوگ ماہانہ کی بنیادوں پر مختلف علاقوں کی چیکنگ کرتے ہیں اور اپنے اوپر کی آمدنی کا بندوبست بھی کرتے ہیں جس سے قصائیوں کی پانچوں کڑاہی میں ہیں اور انہیں چیک کرنے والوں کی سر اور پاؤں بھی کڑاہی میں رہے غریب عوام جو پہلے بھی سیاستدانوں کے نعرے سن کر خوار ہو رہے ہیں اب بیورو کریسی کے نعرے بھی سننے پر مجبور ہیں حالانکہ ان لوگوں کا کام بیان دینا نہیں لیکن پوچھے کون ! ویسے ہمارا ذاتی مشورہ اسسٹنٹ کمشنر پشاور کیلئے ہے اگر وہ اپنا گوشت کم کرنا میرا مطلب ہے صحت بہت کرنا چاہتے ہیں تو مہینے میں چار دفعہ اپنے دفتر سے نکل کر شہر کے چار مختلف علاقوں کی قصائیوں کا حال پوچھے تو ان سے ان کا گوشت بھی مطلب

صحت بھی بہتر ہوگی اور قصائی لوگوں کو الٹی چھری سے ذبح بھی نہیں کرسکیں گے۔

امریکی گورے اور فریڈم آف انفارمیشن

کسی زمانے میں ایک امریکی سفارت کار نے پاکستانیوں کے بارے میں لکھا تھا کہ پاکستانیوں کی قیمت امریکہ کا ایک دورہ ہے جس کے بعد یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اس بات کو آئی ایس آئی کے ایک سابق چیف نے اپنی یاداشتوں میں بھی لکھا ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب امریکی ڈالر پاکستان میں چالیس روپے کا ملتا تھا اب چونکہ ڈالر پاکستان کے ایک سو روپے کے بالکل قریب ہے تو وقت کی مناسبت سے کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی چند ہزار ڈالر کیلئے بہت کچھ کر سکتے ہیں اتنی.بڑی لمبی تمہید یقیناً قارئین کیلئے بورنگ ہوگی لیکن گذشتہ دنوں پشاور یونیورسٹی کے سنٹرل لائبریری میں واقع لنکن ان ہال میں دو گھنٹوں پر مشتمل ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا. جس سے اندازہ ہوگیا کہ اور تو اور ہمارے تعلیمی ادارے بھی ڈالرز کیلئے بہت کچھ کرنے پر تیار ہوتے ہیں- 2006 ء میں پشاور یونیورسٹی کے حدود میں واقع سنٹرل لائبریری میں بننے والا لنکن ان ہال امریکی ڈالروں کی مدد سے بننے والا واحد ہال ہے جس کا افتتاح وقتاً فوقتاً کیا جاتا ہے امریکی قونصل خانے پشاور میں تعینات امریکی بھی پاکستانیوں کا مزاج سمجھ گئے ہیں کہ ان کے سامنے قینچی اور فیتہ کاٹنے والی تصاویر کی بڑی ڈیمانڈ ہے اس لئے ان کے یہاں پر تعینات پی آر او اس طرح کے ڈرامے مقامی

میڈیا کو لائن پر لانے کیلیۓ استعمال کرتی ہیں ویسے امریکی گوروں کو ہمارا مزاج سمجھانے والے ہمارے اپنے پاکستانی ہی ہیں اس طرح کی تقریبات میں آکر قونصلر حتی کہ سفارت کار بھی یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں یہاں آکر بڑی خوشی ہوئی کہ ہم یہاں پر آئے -اب اس میں صحافیوں کیلیۓ خبر کونسی ہے یہ صحافی ہی جانتے ہیں-
حال ہی میں لنکن ان ہال پشاور یونیورسٹی کیلیۓ سولہ ہزار کی فنڈ امریکی سفارت خانے نے ریلیز کردی جس میں پانچ ائیر کنڈیشنر سمیت وال ٹو وال کارپٹ اور رنگ و روغن کا کام کیا گیا کم و بیش سولہ لاکھ پاکستانی روپوں میں جتنا کام پشاور یونیورسٹی کی انتظامیہ نے کیا ہے اس میں خرچ کتنا ہوا اور کہاں پر ہوا یہ تو انتظامیہ ہی جانتی ہے لیکن پشاور یونیورسٹی کے ایک ملازم جو اس وقت سیمینار میں شریک تھے کے بقول امریکی ڈالروں سے خریدے گئے ان ائیر کنڈیشنر کی ٹھنڈک بہت زیادہ ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ امریکی خیرات یعنی امداد سے یونیورسٹی کے کن کن لوگوں کا حال بہتر ہوا ہے لیکن اس سیمینار میں ایک ایسے پروفیسر کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جو حال ہی میں امریکہ کا دورہ کرکے آئے تھے اور گوروں کے سامنے بچھے جاتے تھے ان کے آگے پیچھے ہونے کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جب نئی دلہن کسی گھر میں آتی ہے تو کس طرح گھر والے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں خصوصا دلہا بس یہی حال ان صاحب کا بھی تھا

فریڈم آف انفارمیشن کے موضوع پر ہونیوالے دو گھنٹے کے اس سیمینار میں شعبہ صحافت کے طالب علموں کو لایا گیا تھا اس موقع پر موجود پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رسول جان نے بیان دیا کہ ہم ابھی امریکی ادارے سے وابستہ ہے اور مزید بین الاقوامی اداروں سے تعاون کی امید رکھتے ہیں-یقینا ان کا مقصد امریکی ڈالر یعنی امداد ہوگا اور ان کی خواہش ہوگی کہ فرانک پونڈ اور یورو کے ممالک بھی پشاور یونیورسٹی کی امداد کرے تو اس سے طالب علموں کی حالت بہتر ہو یا نہ وہاں یونیورسٹی کے مخصوص لوگوں کا جن کا کام جی حضوری کرنا ہے کام چلتا رہے گا-

ہمارے لئے بحیثیت صحافی دکھ کی بات یہ ہے کہ امریکی گورے شائد اتنے برے بھی نہیں جتنا ہمارے ہاں کے دیسی گورے یعنی ہماری طرح کے لوگ جو آج کل ڈالروں کے عوض ملازم بنے ہیں وہ بھی سب کچھ چھپا کر کرنے کے عادی ہیں اور تو اور وقت کی پابندی جو ہم پاکستانیوں میں بھی نہیں اسی وجہ سے اب دیسی گورے ان گوروں کے سامنے ہمیں بھی ذلیل کرواتے ہیں یعنی وقت سوا گیارہ بجے دیا جاتا ہے اور پھر ان کی آمد بھی پونے گیارہ بجے ہوتی ہیں پوچھنے پر بتایا گیا کہ گورے تو وقت پر آتے ہیں لیکن پاکستانیوں کو پہلے لانے کی ہدایت بھی دیسی گوری نے ہی دیا ہے-کچھ دن قبل امریکی سفارت کار نے پشاور عجائب گھر کا دورہ کیا بعد میں وہاں پر موجود صحافیوں نے ان سے بات چیت کی کوشش کی تو

قونصل خانے میں تعینات دیسی گوری یعنی اصلی گوروں کے سامنے جارو لگانے والے دیسی گوروں نے صحافیوں کو کہہ دیا کہ بات کرنی ہے تو صرف عجائب گھر پر کرلو ورنہ کسی اور بات کی ضرورت نہیں سفارت کار نے اس موقع پر آکر کہا کہ ہمیں یہاں پر خوشی ہوئی بحیثیت صحافی ہم ان کی خوشی کو چاٹتے سے رہے کیونکہ کوئی خبر یت تو نہیں تھی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ چند مخصوص صحافیوں کو جو شائد ان کے دیسی گوروں کے گڈ لسٹ میں شامل تھے کو بلا کر انہیں بریفنگ دی گئی یعنی کچھ چھپا کر کام کرنے کی ان کی بھی عادت ہے۔

ایسے میں گذشتہ روز لنکن ان ہال میں فریڈم آف انفارمیشن پر تقریر تو امریکی گورے نے بہت زبردست کرلی موصوف سمیت ہمارے چند صحافی جو اس ورکشاپ میں تقریریں اچھی کررہے تھے کا کہنا تھا کہ ہمیں معلومات کی فراہمی کو یقینی بنانا ہوگا لیکن جب ہم نے امریکی قونصلر جنرل سے بات کی کوشش کی تو دیسی گوری نے جواب دیا کہ نہیں جناب اس سے زیادہ بات چیت نہیں ہوگی" یعنی ہمارے لئے فریڈم آف" انفارمیشن کا لیکچر اور ان کے اپنے اوپر یہ قانون لاگو نہیں۔ خیر ہم تو گلہ کرنے سے رہے کیونکہ مے و نوش کرنے والے صحافی ہی ان کے گڈبک میں شامل ہیں اللہ کا شکر ہے کہ ابھی بھی بہت سارے سرپھرے ان چیزوں سے دور ہیں اور انکی طرح ہمیں گوروں کے گڈبک میں شامل ہونے کا بھی کوئی شوق نہیں ہاں ان کیلئے یہی مشورہ ہے کہ فریڈم آف انفارمیشن کا قانون اگر یہ گورے

-اپنے اوپر بھی لاگو کرے تو اس سے بہت کچھ سامنے آ جائیگا

پولیس قبضہ مافیا اور ہمارے رہنما

اگر آپ کے پاس روزگار نہ ہوں اور آپ دوسروں کی گریبانوں پر ہاتھ ڈالنا بھی چاہتے ہیں تو آپ کو قبضہ مافیا بننا ہوگا یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں حقیقی معنوں میں بہت سارے لوگ راتوں رات کروڑ پتی بن گئے ہیں اور آج کل ان کے بڑے بڑے بنگلوں پر " ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" اور "تعز من تشاء و تعزل من تشائ" لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے اور تو اور بہت سارے ہمارے لیڈر بھی بن گئے ہیں اور اب جلسے جلسوں میں عوام کو بتاتے ہیں کہ ہم آپ کے حق کیلئے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اس کیلئے آواز بھی اٹھائیں گے۔ اللہ مغفرت نصیب کرے پختونوں کے علمبرداروں اور ان سے پہلے مولویوں کی اتحادی حکومت میں شامل لوگوں کو اتنی توفیق تو نہیں ہوئی کہ قبضہ گروپوں کے خلاف اقدامات اٹھاتے ہماری بدقسمتی کہ کچھ عوامی نمائندے اس مرض میں خود بھی شامل ہوگئے اور انہوں نے باقاعدہ سرپرستی بھی کی اس عمل میں کتاب کو آسمانی کتاب بنانے والے بھی شامل تھے جن کی باقیات ابھی بھی مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قبضہ مافیا جو کسی زمانے میں سرکاری زمینوں کو مال مفت سمجھ کر قبضہ کرتا تھا بعد ازاں غریب غرباء کی زمینوں پر قابض ہونے لگے اور یہ ایک ایسا کاروبار ہے کہ اب مخصوص علاقوں میں تھانوں کے بل بوتے پر قابض گروپ راتوں رات زمینوں پر

دیواریں کھڑی کردیتے ہیں اور پھر قبضہ ختم کرنے کیلئے متعلقہ لوگوں سے پیسے وصول کئے جاتے ہیں آج سے دس سال قبل اس طرح کے واقعات صرف دیہی علاقوں میں زیادہ ہوتے تھے لیکن اب یہ گروہ نڈر اور بے باک ہوگیا ہے کہ شہری علاقوں ہیں اس طرح کے واقعات عام ہونے لگے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں

آج سے تقریباڈیڑھ سال قبل دالگراں بازار میں ایک دکاندار نے روتے ہوئے راقم کو بتایا تھا کہ اس شہر کے ایک اہم عہدے پر تعینات جو بعد میں کروڑوں روپے دیگر اور مخصوص جماعت سے تعلق کی بناء پر ایواں تک پہنچ گیاکے بارے میں انکشاف کیا کہ اس موصوف نے پٹواری کیساتھ ملکر کاغذات میں اس کے آباؤ واجداد کی دکان کو اپنے کھاتے میں ڈال دیا اور اب وہ دکاندار اس پوزیشن میں تھا کہ وہ روتے ہوئے راقم کو بتارہا تھا کہ میں خودکشی کروں کیونکہ بقول اس کے ایک بھائی دھماکے میں شہید ہوا تھا اور اس کے گھر والوں کی ذمہ داری بھی اس کی تھی اور یہ دکان اس کی روزگار کا واحد ذریعہ تھا لیکن قبضہ مافیا نے اس کے ساتھ یہ ڈرامہ کیا وقت کی مناسبت سے راقم نے اسے مشورے دیئے اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ بھائی میرے اب ہماری میڈیا اتنی آزاد بھی نہیں کہ مخصوص لوگوں کے خلاف آواز اٹھائے اور تم بھی راقم کی طرح نتھو خیرے قسم کے بندے ہو اس لئے رونا ہی تمھاری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔
دکاندار کی آہ و فغان سے پتہ چلا کہ کیسے کیسے منافقین قبضہ مافیاکے اس مکروہ دھندے میں

اپنے گھر کا راشن چلاتے ہیں جس کا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ اب تو شہر میں قبرستانوں پر بھی قبضہ ہونے لگے ہیں جس سے بچاؤ کیلئے پشاور ہائیکورٹ نے احکامات بھی جاری کئے لیکن اللہ ہی جانے کہ اس پر عمل کس طرح ہوگا کیونکہ مخصوص لوگ ہی اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

ہمارے دفتر کے ایک ساتھی کے رشتہ دار نے کسی شخص سے شہر میں گھر خرید لیا مگر اس گھر میں رہائش پذیر کرایہ دار نے اسے خالی کرنے سے انکار کر دیا اس پر نئے خریدار نے پشاور کے ایک اہم تھانے میں تعینات ایس ایچ او سے رابطہ کیا ایس ایچ او نے ایک لاکھ روپے میں قبضہ ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے یقین دہانی کرادی کہ قبضہ ختم ہوگا جب پیسے ادا کئے گئے تو متعلقہ ایس ایچ او نے کرایہ دار سے پیسے بھی لئے اور اسے خالی کرنے سے انکار کر دیا جب خریدار نے ایس ایچ او سے رابطہ کیا تو اسے بتایا جاتا کہ یہ پولیس کے ایک بڑے افسر کا رشتہ دار ہے میں کچھ نہیں کر سکتا ہمارے دوست کے رشتہ دار نے قبضہ نہ ملنے پر اپنے ایک لاکھ روپے واپس لینے کا مطالبہ کیا جس پر ایس ایچ او کو غصہ آیا اور پھر اس نے متعلقہ شخص کو تھانے میں بند کر دیا اس کے رشتہ دار اسے ڈھونڈتے رہے اور ایس ایچ او نے غریب آدمی کو اپنے کمرے میں بند کر دیا ایس ایچ او سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس شخص کی گاڑی تھانے میں رہ گئی تھی اسی وجہ سے غائب ہونیوالے شخص کے رشتہ داروں نے پتہ کروایا تو پتہ چلا کہ ایس

ایچ او جو کہ خود قبضہ مافیا سے تعلق رکھتا ہے کو پیسے واپس مانگنے پر غصہ آیا تھا اس وجہ سے اب وہ شخص کو نہیں چھوڑا جارہا خیر منت سماجت کے بعد اور ایک لاکھ روپے کو بھولنے کی یقین دہانی کروانے کے بعد اس شخص کی جان چھوٹ گئی یہ پوری کہانی اس شخص نے اپنے رشتہ دار کو جو کہ ہمارے دفتر کا ساتھی ہے بتائی جب راقم نے اس سے کہا کہ متعلقہ ایس ایچ او کے اس اقدام کے خلاف اگر وہ میڈیا کے سامنے بات کرے تو اسے انصاف مل سکتا ہے لیکن وہ شخص ڈر کر کہنے لگا کہ خود تو مروگے ہمیں بھی قبضہ مافیا سے مرواؤگے اور یوں یہ سلسلہ بے نتیجہ ہی ختم ہوگیا۔

صادق اور امین کی تشریح کا مطالبہ کرنے والے لیڈر

اعوان برادری سے تعلق رکھنے والے رحمان ملک نے گذشتہ دنوں لاہور میں پریس کانفرنس کرکے خود اقرار کیا کہ مجھ سمیت کئی پاکستانی رہنماء آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 پر پورا نہیں اترتے دمادم مست قلندر کی دھمکی دیتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگوں کو ہمارے رہنمائوں کی شکل وصورت پسند نہیں اس لئے وہ سکروٹنی اور الٹی سیدھی نئی نئی شقوں کے ذریعے ہمارے امیدواروں کو نااہل قرار دے رہے ہیں موصوف جو گذشتہ پانچ سالوں سے جمہوری دور میں پاکستانی عوام پر مسلط رہے کے سر سے ابھی تک نشہ نہیں اترا اس لئے ایسی باتیں کررہے ہیں ۔ پشتو میں ایک مثل مشہور ہے جس کے معنی کچھ یوں ہیں کہ " بھرا پیٹ فارسی بولتا ہے" یعنی جب بنیادی ضروریات پوری ہو تو ہرا ہرا سوجھنے لگتا ہے۔ اپنے ملک صاحب یقینا ابھی تک اس سرکاری بنگلے میں رہائش پذیر ہیں جہاں پر کچھ عرصہ قبل رہائش پذیر تھے ان کے آگے پیچھے "پوں پوں" کرنے والی گاڑیاں آگے پیچھے پھرتی تھی۔اسی وجہ سے وہ شائد سمجھ رہے ہیں کہ وہ اب بھی بھوکے ننگے عوام پر مسلط ہیں حالانکہ ان کا جمہوری دور ختم ہو چکا ہے۔گذشتہ پانچ سالوں سے جمہوریت کے نام پر غریب عوام کیساتھ ڈرامے کرنے والے حکمران آنیوالے انتخابات کیلئے پھر سے جال بن رہے ہیں اور عوام کو ایک مرتبہ پھر پھنسانے کی کوششوں میں

مصروف عمل ہیں عوامی خدمت کا دعوی کرنے والے یہ مہربان کرسی سے محروم ہوجانے کے بعد شہریوں پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگئے ہیں کروڑوں کی آمدن رکھنے والے ان لی ڈروں کا ٹون کرسی سے محروم ہونے کے بعد ہی کچھ تبدیل ہوا ہے - پانچ سال کا وقت گزارنے کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ قرار دینے والوں کا کہنا ہے کہ ساٹھ سالوں کے مسائل پانچ سالوں میں ختم نہیں کئے جاسکتے - غریب عوام کو روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر دھوکہ دینے والے ایک سابق وزیر جن کے بارے میں ان کے علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک موصوف الیکشن نہیں جیتے تھے لوگوں کے مسائل اور غمی خوشی میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے لیکن گذشتہ پانچ سال حکومت میں رہنے کی وجہ سے اپنا علاقہ تک بھول گئے ابھی کاغذات نامزدگی جمع کرانے کیلئے پھر سے موصوف اپنے عوام کے پاس آئے تو عوام نے کسی حد اس کی آنکھیں کھول دی - ملک میں کرپشن رشتہ -داری کی سیاست کو فروغ دینا ہی انہی جمہوری حکمرانوں کا خاصہ رہا ہے

یہ بھی اسی عوامی حکومت کا کارنامہ ہے کہ لوڈشیڈنگ جو اس سے قبل چوبیس گھنٹوں میں صرف چھ گھنٹے ہوتی تھی انہی کے دور میں بارہ اور چودہ گھنٹے تک پہنچ گئی انہی کے دور میں راجے بھی کرائے کے بن گئے اشیائے خوردنوش کی قیمتیں بشمول پٹرول کی قیمتیں اس حال تک پہنچ گئیں کہ پہیہ جام ہوگیا انہی لی ڈروں کے دور میں خودکشیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا زر مبادلہ

کے ذخائر کہاں تک آئے یہ الگ داستان ہے امن و امان کی صورتحال یہاں تک پہنچ گئی کہ ملک کا کوئی حصہ دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہا بلوچستان سے لیکر خیبر پختونخواہ فاٹا پنجاب سندھ اور کراچی میں ابتر صورتحال نے نہ صرف عام لوگوں کا جینا حرام کردیا بلکہ تاجر طبقہ بھی سر پکڑے بیٹھ گیا اسی باعث بہت سارے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے اور انہی کے دور حکومت میں مشہور ہوا کہ "پاکستان سے زندہ بھاگ" - غریب عوام دعائیں مانگ رہے تھے کہ یا اللہ ان کے پانچ سال پورے ہوں اور ان پر مسلط عذاب ختم ہوں تاکہ ان کی زندگیوں میں کچھ سکون تو آئے شکر ہے کہ ان سے اور ان کے اتحادیوں سے شہریوں کی جان چھوٹی جو جونک کی طرح خون چوسنے میں لگے ہوئے تھے اخباری بیانات میں ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے والے یہ نام نہاد لیڈر اب الیکشن کمیشن کے صادق اور امین کی تشریح مانگ رہے ہیں۔ان لوگوں کو اعتراض ہے کہ ریٹرننگ افسران ان سے اسلام کے بنیادی اصول کلمے دعائے قنوت پوچھ رہے ہیں حالانکہ اگر یہ اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے ہیں تو پھر انہیں اس بات پر غصہ کرنے اور شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ ان سے ریٹرننگ افسران کیوں اسلام کے بنیادی نکات پوچھتے ہیں۔

اپنے آپ کو لیڈر قرار دینے والے ان نام نہاد لوگوں سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی ان سے سوالات کرے کوئی ان کے کردار کے حوالے سے پوچھے اور کوئی ان کے اخلاقی پستی یا نظریہ پاکستان کے حوالے سے سوال کرے --صادق اور امین پر اعتراض کرنے والے اور اس کی تشریح کا مطالبہ کرنے والوں کیلئے حضرت محمد صلی

اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات بابرکت ہی کافی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو صادق اور امین نہیں کہا بلکہ یہ ابلکہ پنے کردار سے ثابت کردیا کہ اور ان کے دشمن اور مخالف بھی انہیں صادق اورامین کہلوانے پر مجبور ہو گئے تھے -

اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں کتنے ہی لوگ ہیں جو اس وقت کاغذات نامزدگی اٹھائے اپنے آپ کو صادق اور امین کہلواتے ہیں پلاٹوں کی سیاست سے لیکر کمیشن کھانے والے قبضہ مافیا کی سرپرستی کرنے والے بہت سارے حرام خور لیڈر بھی اپنے آپ کو صادق اور امین کہلواتے ہیں ان میں ذرہ برابر بھی شرم حیا غیرت یا ایمان نام کی کوئی چیز نہیں جنہیں یہ محسوس کرتے ہوئے انتخابی عمل سے دور رہیں انہیں پتہ ہے کہ ان میں صادق اور امین والی کوئی خوبی موجود ہی نہیں یہی لوگ نظریہ پاکستان کی مخالفت کرتے آئے تھے اس لئے اسی وجہ سے اب اس کی ایسی تشریح چاہتے ہیں جس سے ان جیسوں کو آگے آنے کا موقع ملے نسل در نسل مگر مچھوں کی طرح سیاست کے میدان میں چپکے رہنے والے عام لوگوں کو آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیتے - پانچ سالوں سے عوام پر مسلط ٹولے کو نظر آنا چاہیے کہ کچھ لوگ نہیں بلکہ اس ملک کی اکثریت انہیں ناپسند کرتی ہیں اگرانہیں اس بات کا یقین نہیں تو اپنے قلعہ نما گھروں سے باہر نکل کر عوام میں آجائیں یقینا بہت سارے لوگ ان نام نہاد لیڈروں کو سالم نگلنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں اور اس کی وجہ بھی انہی کے کرتوت ہیں عوام کی لی ڈری کا دعوی کرنے والوں کو

اپنی اوقات کا پتہ ہے اسی وجہ سے انھوں نے کورنگ امیدوار پیدا کر لئے ہیں جوان علاقوں میں جہاں سے ان کا تعلق ہے کی جگہ عوام سے مل رہے ہیں اور ان کے غمی خوشی میں پانچ سال بعد نظر آرہے ہیں۔ یہ غریب عوام کا حق ہے کہ انہیں لیڈروں کا دعوی کرنے والوں کا ماضی حال سمیت ان کا کردار بھی پتہ ہو کیونکہ انھوں نے اگلے انتخابات نئے لوگوں کو منتخب کرنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس ملک میں کوئی فرشتہ نہیں لیکن پھر بھی ایک اچھی کوشش تو کی جاسکتی ہے کہ بدتر سے بد لوگ آجائیں نہ کہ بدتر سے بدترین ہمارے لیڈر بنیں۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ نئے عام انتخابات میں اس مرتبہ نہ صرف نوجوان طبقہ سب سے زیادہ پرجوش ہیں بلکہ خواتین اور خصوصا قبائلی علاقوں کی خواتین بھی اس میں حصہ لے رہی ہیں،اور پارٹیوں کیساتھ ساتھ عام لوگ بھی بہت زیادہ سامنے آئے ہیں اور بنیادی مسائل سے آگاہ یہ لوگ انہی مسائل کے حل کی بات کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ عام لوگ کس طرح اپنے ووٹ کا استعمال کرتے ہیں،امید تو یہی ہے کہ صادق اور امین کی تشریح اور اسے ہٹانے والوں سے آنیوالے انتخابات میں جان چھوٹ جائیگی۔

پاکستان میں رہنماء کیلئے بنیادی خصوصیات

اگر کسی کے پاس گز بھر کی زبان ہے دوسروں کی پگڑی اچھال سکتا ہے اور منٹوں میں کسی مسلمان کو کافر قرار دے سکتا ہے یا پھر اپنے مقصد براری کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہو تو وہ اس مملکت میں رہنما ہے اس ملک میں لی ڈر بننے کیلئے بنیادی شرائط میں جھوٹا ہونا شرابی ہونا جعل سازی کرنا اور قرضہ لیکر معاف کروانا شامل ہیں ساتھ میں ان تمام خامیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کرنا بھی لیڈر کا خاصہ ہے منافقت کی سیاست کرنے والے ہی اس ملک کے اہم عہدوں پر پہنچتے ہیں ۔بہت سارے لوگوں کیلئے یہ باتیں انتہائی سخت ہونگی لیکن اسلام کے نام پر وجود میں آنیوالے اس ملک میں جھوٹا ہی لیڈر ہے جو جتنا زیادہ جھوٹ بولے گا اتنے ہی اس کی پذیرائی ہوگی۔پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس میں کلرک سے لیکر سپاہی افسر اور کسی بھی شعبے میں داخلے کیلئے بنیادی ضروریات میں تعلیم کمپیوٹر سے آگاہی ضروری ہے سکیل سات میں بھرتی ہونیوالے کلرک کیلئے تعلیمی قابلیت بھی ایف اے اور میٹرک پاس ہے لیکن اس ملک میں قانون سازی کرنے والے لی ڈر کیلئے کسی قابلیت کی ضرورت ہی نہیں جو ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہو جو ملکی کاروبار کو چلانے والوں میں شامل ہو اس کیلئے کوئی تعلیمی قابلیت ضروری نہیں کیا یہ حیرت کی بات نہیں ۔یقینا باعث حیرت ہی نہیں باعث شرم بھی ہے کہ ملک کی

تقدیر کا فیصلہ کرنے والے جعل ساز ہو ان کی سب سے بڑی خوبی بینک بیلنس لمبی گاڑیاں ہو ایسے میں اس ملک کی کسی بھی شعبے سے ترقی کی توقع رکھنا ہی عبث ہے ہاں ان مخصوص لوگوں کی ترقی ہو سکتی ہے جو کسی نہ کسی طرح پارلیمنٹ تک پہنچ گئے ہوں-اس ملک میں جس کے سیاسی رہنما اپنے آپ کو مہا سیاستدان اور ریاست کو اسلام کا قلعہ قرار دیتے ہوئے تھکتے نہیں اور سارے جہاں کا درد دل میں سمونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں یہ الگ بات کہ اس ملک کے کونے کونے میں رہائش پذیر لوگوں کی دکھ و درد کو نہیں سمجھ سکتے-

گذشتہ دنوں ایک سوشل سائٹ پر برطانوی ادارے کی سروے رپورٹ شائع ہوئی جس میں بتایا گیا کہ پاکستان کے 70 فیصد لوگ اسلام کے حق میں ہیں اور اتنی ہی تعداد میں لوگ فوجی حکمرانی کے حق میں ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ میری طرح کے لولے لنگڑے مسلمان بھی ہر مسئلے کا حل اسلام کو ہی سمجھتے ہیں یہ حقیقت بھی ہے لیکن اگر اس ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی انقلاب ممکن ہوا نہ کہ مخصوص لوگوں کا اسلام جنہیں نماز کے اوقات میں جلسے تو یاد رہتے ہیں لیکن اللہ کا حکم یاد نہیں رہتا ہاں اسلام کی یہ بات یاد رہتی ہے کہ اسلام نے چار بیویوں کا حق دیا ہے یہی صورتحال فوجی حکمرانوں کا بھی ہے جمہوریت کی آڑ میں عوام کے گردنوں پر پاؤں رکھ کر عیاشی کرنے والے حکمرانوں کی عوام سے کوئی دلچسپی نہیں اس ملک میں لیاقت علی خان کے بعد کوئی لیڈر ہی نہیں آیا حکمران-

بن کر حکومت میں جو بھی آیا تو مہرے ہی ثابت ہوئے اس میں فوجی و سیاسی سارے حکمران شامل ہیں لیکن ایک بات جس پر اس ملک کا ہر شہری متفق ہے کہ جمہوریت کے نام پر لوٹ مار کرنے والوں سے غیر سیاسی اور فوجی حکمران بہتر نکلے کہ انہوں نے لوٹ مار اور غلطیاں کم کی غیر سیاسی اور فوجی حکمران فرشتے نہیں تھے لیکن ان کے کارہائے نمایاں عوام کے ساتھ دکھ و درد کا ڈرامہ کرنے والے کم تھیں۔سابق صدر جنرل مشرف نے اس ملک کیساتھ کیا کیا وہ الگ داستان ہے لیکن یہ اسی ہی کا کارنامہ ہے کہ اس نے ملک میں سیاسی لیڈری کا دعوی کرنے والوں کیلئے تعلیمی قابلیت مقرر کی یہ الگ بات کہ اس پر وہ بہت حد تک عملدرآمد نہ کرواسکے لیکن یہ بھی کمال ہی تھا کہ کئی عشروں سے عوام پر مسلط مخصوص خاندانوں کے لوگ میدان سیاست سے آؤٹ ہوگئے تاہم بعد میں انہوں نے جعل سازیوں اور روپے پیسے کی زور پر ڈگریاں حاصل کیں اور اس کی مدد سے قانون ساز اداروں تک پہنچے لیکن پھر جمہوری دور آیا اور مخصوص لوگوں نے اپنی شغل یعنی سیاست کا شعبہ سنبھالنے کیلئے تعلیمی قابلیت کی شرط ختم کروادی۔ سیاسی رہنمائوں کیلئے تعلیمی قابلیت ضروری نہیں اس بارے میں کچھ لوگوں کا موقف ہے کہ جو کوئی بھی ان کے مسائل حل کرسکتا ہو وہی رہنما ہے اور اس کیلئے تعلیمی قابلیت کی ضرورت ہی نہیں جبکہ زیادہ تر لوگوں کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہی کسی بھی مسئلے کے ہر رخ کو دیکھتا ہے اس

کو پرکھ سکتا ہے اور اس کے حل کیلیئے سوچتا ہے سو اگر رہنمائی کا دعوی کرنے والے شخص کو خود ہی نہیں پتہ کہ مسئلے کا حل کیا ہے تو قوم کو کسطرح آگے لا سکتا ہے۔اس سلسلے میں بعض لوگوں کا موقف ہے کہ سیاسی رہنماء ایسے ہونے چاہیئے جو مختلف شعبوں میں ماہر ہو ہو خواہ وہ صنعت کا شعبہ ہو تعلیم کا شعبہ ہو یا کوئی بھی شعبہ ہو اگر ماہر شخصیات ملک کے عام لوگوں کی رہنمائی کرینگے تو پھر کچھ بہتری کی امید کی جا سکتی ہے ورنہ دوسری صورت یوں عمر گزر جاتی ہیں اور قومیں ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں جب ہر کوئی شخص رہنمائی کا دعوی کرنے والوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے کہ کس نے کس طرح حرام کا مال کمایا کس طرح جعل سازی کرکے ڈگریاں حاصل کیں اور کس طرح جھوٹے وعدے کئے لیکن پھر بھی لوگ انہی لوگوں کے آگے پیچھے " آوے ہی آوے" کا نعرے لگاتے دکھائی دیتے ہیں کیا ان جعل سازوں اور جعلی ڈگری والوں کو سپورٹ کرکے ہم اپنی آنیوالی نسلوں کو تباہ نہیں کر رہے۔یہ وہ سوال ہے جو ہم سب کو اس انتخابی عمل میں ووٹ ڈالنے سے قبل اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے۔اگر ہم اس مرتبہ بھی ان دو نمبر رہنمائوں کے دعوئوں اور وعدوں میں آئے تو پھر ترقی کی امید تو بہت بڑی بات ہمیں اپنی بقاء کیلیئے بھی سوچنا ہوگا کیونکہ رہنمائی کے دعوے کرنے والے صرف اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو دیکھتے ہیں اور اندھوں کی طرح قوم کو چلا رہے ہیں۔

امریکی مداخلت اور ان کے پالتو ملازم

وقت کا فرعون امریکہ کس طرح دوسرے ممالک میں مداخلت کرکے اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے اس کا اندازہ امریکی ایجنٹ ریمنڈ ڈیوس کی پاکستان میں تعیناتی سے متعلق شائع رپورٹ سے کیا جاسکتا ہے جس پر ایک امریکی اخبار نے لکھا ہے کہ اسے سی آئی اے نے لشکر طیبہ کی جاسوسی کیلئے مامور کیا تھا اور لاہور میں ہونیوالے واقعے کے بعد ریمنڈ ڈیوس کی گرفتاری کے بعد سی آئی اے کے حکام اس بات پر زور دیتے رہے کہ ریمنڈ ڈیوس سفارت کار ہے اور اسے باقاعدہ استثنیٰ حاصل ہے اور اس کی رہائی کیلئے امریکی صدر اوباما نے باقاعدہ پریس کانفرنس کردی تھی جس میں اسے سفارتکار قرار دیا تھا اور حکومت پاکستان پر زور دیا تھا کہ ریمنڈ ڈیوس کو رہا کیا جائے۔ کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ اگر ان کے جاسوس کو پھینٹی لگے گی تو وہ پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے امریکی ایجنٹوں کی کہانی سامنے لائے گا اور یوں اس جذباتی قوم کو اندازہ ہو جائیگا کہ دوستی کی آڑ میں یہ امریکی کس طرح چھپ کر وار کرتی ہیں ۔ پینگوئن پریس سے چھپنے والی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ سی آئی اے کو ریمانڈ ڈیوس سے صرف یہ مقصد تھا کہ ان کا مشن حکومت پاکستان کی نظر میں نہ آئے کہ کتنے امریکی اور مقامی لوگ پاکستانی میں جاسوسی کررہے ہیں ۔ 2008 ء ہیں سی آئی اے میں بھرتی ہونیوالے

ریمنڈ ڈیوس نے پشاور میں بھی کام کیا تھا اور اسے اس مقصد کیلئے سالانہ 200000 ڈالر تنخواہ کی مد میں ملتے تھے امریکی ریاست ورجینیا سے تعلق رکھنے والا ریمنڈ ڈیوس ہائی سکول میں دوران طالب علمی فٹ بال کا کھلاڑی اور بہترین ریسلر تھا۔ لاہور میں پیش آنیوالے واقعے کے بعد جب اسے مقامی پولیس نے گرفتار کیا اور تھانے لے گئے تھے دوران تفتیش اس نے پانی طلب کیا تھا جس پر وہاں پر تفتیش میں تعینات پولیس اہلکار نے کہا تھا کہ "اگر ڈالر نہیں دوگے تو پھر پانی بھی نہیں ملے گا" اس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اس وقت کے امریکی سفیر منٹر کی سی آئی اے کے سربراہ سے جھگڑا بھی ہوا تھا تاہم بعد میں امریکی حکام نے اس وقت کے امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا تھا اور ان سے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کیلئے اپنا کردار ادا کرنے پر زور دیا تھا 21 فروری کو ہونیوالے اس ملاقات میں امریکی ادارے سی آئی اے کے اعلی حکام موجود تھے اس موقع پر حسین حقانی نے سی آئی کے سربراہ کو کہا تھا کہ اگر امریکہ جیسن بورن جیسے کردار پاکستان بھیجے تو ان میں اتنی اہلیت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اس صورتحال سے نکال سکے۔

دی وار آف نائف دی سی آئی اے سیکرٹ آرمی اور وار دی اینڈ آف دی ارتھ سے لئے گئے اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ ریمنڈ ڈیوس کو سفارت کار کے روپے میں بھجوانے میں حسین حقانی کا کردار تھا اسی بناء پر بارک اوباما نے تکنیکی

بنیاد پر بات صحیح کی تھی کہ ریمنڈ ڈیوس سفارت کار ہے کیونکہ وہ سفارت کار کے ویزے پر آیا تھا حالانکہ وہ سفارتکار نہیں تھا اور جاسوسی کیلئے آیا تھا امریکی اخبار میں چھپنے والی اس رپورٹ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کس طرح بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اس رپورٹ میں امریکہ کی سرگرمیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے وہیں پر ہماری پولیس اور مقتدر لوگوں کی امریکی ڈالروں کیلئے کی جانیوالی کاوشیں بھی نظر آتی ہیں ۔ ابھی بھی اس وقت صحافی کے روپ میں ایک امریکی شخصیت کا نام لیا جارہا ہے جو ایک وقت میں دو افراد کو لاہور میں قتل کرنے والے ریمنڈ ڈیوس کا ساتھی تھا، اور اب وہ اپنی ایک نئی ٹیم کے ساتھ کام کر رہاھے اور اس وقت اسلام آباد میں تعینات ہے اس جاسوس کو بھی خیبر پختونخواہ اور قبائیلی علاقوں کی جاسوسی اور حافظ سعید سمیت گنج مدرسہ پشاور کے امام شیخ امین اللہ عرف پشاوری کی جاسوسی کاٹاسک سونپا گیا ھے، جس نے پشاور سمیت کے پی کے اور اسلام آباد میں اپنے کئی کارخاص جاسوسی کے لیئے چھوڑ رکھے ہیں، اور اکثر اوقات پشاور اور قبائیلی علاقوں میں بھی خفیہ طور پر اس کا آنا جانا لگا رہتا ھے

یہ آخری واقعہ نہیں بلکہ یہ سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا اور پتہ نہیں کب تک جاری رہیگا بلکہ اب تو پاکستان میں امریکی اداروں سے وابستہ پاکستانی بھی

اپنے آپ کو "پوتر" قسم کی شے سمجھتے ہیں اور انہی امریکنوں کے بل بوتے پر ان اداروں میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی بدمعاشی بھی بڑھ گئی ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ ان کے پشت پر امریکہ بہادر ہے امریکی اداروں سے وابستہ پاکستانیوں کی بدمعاشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ دنوں پشاور میں امریکی ادارے سے وابستہ ایک خاتون اہلکار نے پریس فریڈم آف انفارمیشن اور امریکی گوروں کے حوالے سے چھپنے والے ایک بلاگ / کالم پر مقامی صحافی کو دھمکیاں دی اور اسے مزہ چکھانے کا کہا اس بارے میں صحافی نے پشاور کے تھانہ شرقی میں درخواست دی پہلے تو تھانہ شرقی اور غربی کے اہلکار ایک دوسرے کے کھاتے میں اسے ڈالتے رہے تاہم بعد ازاں تھانہ شرقی کے اہلکار نے صحافی سے درخواست لی اور ابھی تک مقامی پولیس اس حوالے سے کوئی اقدام نہیں اٹھا رہی مقامی پولیس کا کہنا ہے کہ ایف آئی آر درج کرلی گئی ہے لیکن ابھی تک اس ایف آئی آر کی کاپی شکایت کرنے والے صحافی کو فراہم نہیں کی گئی متعلقہ تھانے کے افسران اور دیگر افسران کن سے ڈرتے ہیں یا پھر کس کے کہنے پر متعلقہ اہلکار جو کہ پاکستانی ہے اور صرف امریکی ادارے سے وابستگی کی بناء پر کارروائی کرنے سے گریزاں ہیں یہ وہ سوال ہے جو صحافی اس ملک کی میدان سیاست میں لیڈری کا دعوی کرنے والوں سے کرنا چاہتا ہے کہ آخر کب تک گورے اور ان کے پالتو اس ملک کے شہریوں کو اپنی بدمعاشی جتلاتے رہیں گے یہ سب کچھ جمہوری دور میں ہورہا ہے اور مختلف سیاسی پارٹیاں اپنے منشور

سامنے لا رہی ہیں لیکن اس خطے میں امریکی گوروں کے سامنے ان کی گھگی بندھ جاتی ہیں

-

صحافی اور اس کی بے وقعت زندگی

یکہ توت واقعے میں شہید ہونیوالے صحافی طارق اسلم سے چار سال قبل راقم کا تعارف اس وقت ہوا جب طارق اسلم نے خیبر یونین آف جرنلسٹس کی ممبر شپ کیلئے اپلائی کیا تھا اس وقت مرحوم کسی ادارے سے وابستہ تھے راقم کو اس بارے میں پتہ نہیں تھا لیکن نئے ممبرشپ پر راقم نے اعتراض کیا تھا جس پر جنرل باڈی اجلاس کے بعد خیبر یونین آف جرنلسٹس کی اس وقت کی انتظامیہ نے بھی اسے ممبرشپ کینسل کروادی جس کا پتہ اطلاع چلنے پر مرحوم طارق نے پریس کلب پشاور میں راقم سے ملاقات کی اور شکوہ کیا کہ آپ نے مجھ پر اعتراض کیا تھا جس کی وجہ سے میری ممبرشپ نہیں ہوئی راقم نے اس سے معذرت کی اور کہا کہ خاص طور پر اس کا نام نہیں لیا تھا تاہم نئے ممبرشپ پر اعتراض کیا تھا جس کی زد میں وہ بھی آیا اس لئے اگر وہ اس سے متاثر ہوا ہے تو اس پر معذرت خواہ ہوں یہ مرحوم کیساتھ راقم کی پہلی ملاقات تھی۔ بھاری بھر کم شخصیت کے مالک طارق اسلم خاموش طبعیت کے مالک تھے چند مخصوص دوستوں کیساتھ بہت کلوز تھے ورنہ دوسری صورت میں ریزرو رہتے تھے پشاور پریس کلب اور ان کے دفتر میں کئی مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی اسی طرح مختلف کوریج کے دوران چلتے چلتے رابطے ہوئے تاہم کبھی بھی اپنا دکھ کسی کو نہ بتانے والے صحافی دوست نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ راقم کی وجہ سے اس کی

ممبرشپ ابتداء میں ختم ہو گئی تھی اور مرحوم اچھے طریقے سے ملتا تھا۔ گذشتہ رات گھر بیٹھے اطلاع ملی کہ وہ صحافی دوست خودکش بم دھماکے کا نشانہ بنا ہے اور سولہ دیگر افراد ۔کیساتھ وہ بھی شہداء کی فہرست میں اپنا نام شامل کرگیا

ان کی شہادت کے بعد جب ان کے شہادت کے حوالے سے نگران وزیر اطلاعات سے بات ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ " ہم صحافیوں کی خدمات کو سراہتے ہیں" سات لفظوں میں انہوں نے سب کچھ ختم کردیا جس کے بعد مقامی اخبار سے وابستہ صحافی کی شہادت کے بعد مختلف سوشل سائٹس پر ان کے بارے میں سٹوریاں چلنی شروع ہوگئیں کہ مرحوم کو تنخواہ نہیں مل رہی تھیں اور بچوں کی سکول کی فیسیں ادا نہ کرنے کے باعث انہیں مشکلات کا سامنا تھا۔ شہادت کے روز اس نے کئی دوستوں سے قرض پیسوں کیلئے رابطے کئے لیکن کسی نے انہیں مثبت جواب نہیں دیا اس طرح کی سٹوریاں انٹرنیٹ پر آن لائن ہونے کے بعد ہمارے بہت سارے صحافیوں نے اپنے کمنٹس دینے شروع کردیئے کہ یہ زیادتی ہے اور اس طرح نہیں کرنا چاہیئے یہ سلسلہ خودکش حملے کے دوسرے روز شروع ہوا اور پتہ نہیں کب تک جاری رہیگا جس میں ملک بھر سے ہمارے صحافی دوست اور عام لوگ بھی مذمتی بیان جاری کرکے " کار خیر" میں حصہ ڈال کر اپنا نام درج کرنے کی کوشش کرینگے۔کرائے کے مکان میں رہائش پذیر صحافی خودکش حملے میں شہید ہوگیا اور اب ہم سب لوگوں کی دکانداری شروع ہو گئی مقامی این جی او سے لیکر بین

الاقوامی این جی اوتک سب مذمتی بیان دو دن تک جاری کرینگے اور پھر اللہ اللہ خیر صلا کوئی پوچھ گچھ نہیں معذرت کیساتھ ہم صحافی بھی بڑے کمینی چیز ہیں اپنوں کی موت پر بھی دکانداری کرتے ہیں اپنے مرنے والے ساتھیوں کی جنازوں میں جا نہیں سکتے کیونکہ خبریں اہم ہوتی ہیں اپنے مریں تو مرتے رہیں مرنے کے بعد اب دو یا تین دن بعد بند کمروں میں اجلاس ہونگے جس کے پریس ریلیز اخبارات میں شائع ہونگی جس میں متعلقہ واقعے کی مذمتی بیانات شائع ہونگے یا پھر اگر بہت زیادہ ہوا تو چار دیواری کے اندر تصاویر نکالنے کیلئے احتجاجی مظاہرے والی پوز بنائیں گے جس میں ریاست کے خود ساختہ چوتھے ستون کی شان میں قصیدے پڑھے جائینگے اور آزادی اظہار کے نعرے لگیں گے - "اور پھر سب کچھ "اللہ حوالے

کیا وجہ ہے کہ دنیا جہاں کا غم اپنے اوپر لادنے والے اور دنیا بھر کو دکھانے والے صحافی اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے اپنی آواز کہیں تک نہیں پہنچا سکتے اس کی بڑی وجہ بھی ہم لوگوں میں چھپے کچھ آستین کے وہ سانپ ہیں جو نام تو صحافیوں کا لیتے ہیں اور ان کے نام پر آنیوالے بہت ساری مراعات تربیت دورے حکومتی فنڈز لے لیتے ہیں اور بڑی بڑی گاڑیوں میں پھرتے ہیں لیکن جب ان کے اپنے ساتھیوں پر اس طرح کے حالات آتے ہیں تو پھر انہیں اکیلا چھوڑا جاتا ہے کہ اگر بدحالی کا شکار اپنے کسی ساتھی کے حق میں آواز نکالی یا بات کی تو

پھر "ان کے تعلقات خراب ہوتے ہیں یا پھر انہیں ملنے والا ماہانہ بھتہ" متاثر ہوتا ہے اس لئے کون اپنے ماہانہ بھتے / بوتل / مراعات / سے ہاتھ دھونا پسند کرتا ہے - کوئی دس سال قبل پشاور کے ٹٹ پونجیے صحافیوں کیلئے سرکار نے رنگی میں میڈیا کالونی کا اعلان کیا تھا اس اعلان پر عملدرآمد بھی ست روی کا شکار ہے جس میں زیادہ تر ہاتھ ہمارا اپنوں ہی کا ہے اس باعث اب یہ حال ہوگیا ہے کہ ہماری طرح کے صحافیوں نے وہ زمینیں بیچنی شروع کردی کہ اور بھی غم ہے زمانے میں کیونکہ صحافی اگر سر چھپاتے ہیں تو پاؤں نظر آتا ہے اور پاؤں چھپانے کی کوشش میں سر نظر آتا ہے اسی باعث سفید پوشی کا شکار زیادہ تر صحافی اس چکر میں ہیں کہ میڈیا کالونی میں پلاٹ تو پتہ نہیں کب ملیں گے اس لئے جو سامنے کے مسائل ہیں ان کے حل کیلئے پلاٹ ہی فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مزے کی بات یہ کے بہت سارے ٹٹ پونجئے صحافیوں سے مخصوص صحافیوں نے پلاٹس لے لئے کہ انکی یہ سرمایہ کاری مستقبل میں انہیں بہت فائدہ دے سکتی ہیں -

بات یکہ توت واقعے میں شہید ہونیوالے صحافی طارق اسلم کی ہورہی تھی ان کے خاندان اور بچوں سمیت اس طرح کے دیگر صحافیوں کے بارے میں اگروہ بین الاقوامی اور قومی این جی اوز جو ان صحافیوں کے نام پر کروڑوں روپے لے رہی ہیں تو اس سے بہت سارے صحافی گھرانوں کے گھروں کا چولہا بھی جلتا رہے گا اور

ان کے بچے بھی تعلیم جیسی بنیادی حق سے بھی محروم نہیں رہینگے ۔لیکن ان میں یہ سوچ ہی نہیں اور اگر کبھی کسی نے سوچنے کی کوشش کی تو ان کا راستہ روکا گیا ایسے میں آزاد صحافت اظہار آزادی کی رائے عوام کو صحیح معلومات کی فراہمی جیسے نعرے تو بہت اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ گھسے پھٹے جملے سن سن کر بھی دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہمارے ٹیکسوں پر پلنے والے حکمرانوں کو صرف اپنے جیسے لی ڈر ہی نظر آتے ہیں اور ہٹ پونجیے صحافی بھی اس ملک کے فیدو گامے کی طرح ہیں جن سے کام تو بہت لیا جاتا ہے لیکن ان کیلئے کچھ نہیں کیا جاتا۔ہاں ٹیکس ادا کرنے والے غریب شہریوں کے خون پسینے کی کمائی " خفیہ فنڈز" کے نام پر مخصوص لوگوں کو دینے میں انہیں کوئی شرم نہیں جیسے یہ ان کے آباؤ اجداد کا مال ہو۔

انتخابی مہم؛ امن و امان اور ووٹرز کا ٹرن آوٹ

تبدیلی؛ لوڈشیڈنگ؛ بیروزگاری؛ اور امن کے حوالے سے مختلف سیاسی پارٹیوں نے خیبر پختونخواہ میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کردیا ہے لیکن امن و امان کی ابتر صورتحال نے تمام پارٹیوں کو سائیڈ پر کردیا ہے اور بہت سارے امیدواروں کے رشتہ دار اور ان کے مخصوص کارندے ہی ان کیلئے گھر گھر ووٹروں سے رابطے کی مہم چلا رہے ہیں اور کارنرز میٹنگ بھی سیکورٹی گارڈز کی نگرانی میں ہورہی ہیں زیادہ تر امیدواروں کے نعرے صرف پوسٹرز اور اخبارات کی حد تک محدود ہیں خصوصا لالٹین والی سرکار کے امیدوار تو ایک طرف ان کیساتھ سیکورٹی کیلئے رکھے جانیوالے پولیس اہلکار بھی ڈر ڈر کے گھروں سے نکلتے ہیں کہ کہیں وہ دہشت گردی کا شکار نہ ہوں ۔لالٹین والی سرکار کو نشانہ بنانے والے لوگ ان کی گذشتہ پانچ سال کی پالیسیوں کو بیان کرتے ہیں اپنے مخصوص پالیسی اور عوام سے دوری کی وجہ سے لالٹین والی سرکار الیکشن مہم میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

گذشتہ دنوں اسی پارٹی کے رہنماء نے گلہ شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں کھڈے لائن لگایا گیا ہے اور بقول ان کے وہ عسکریت پسندوں کے اکیلے نشانہ ہیں

دوسری پارٹیوں کو اپنے حق میں کرنے کیلئے انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مولانا فضل اللہ عرف ریڈیو ملا نے پنجاب میں کارروائیوں کیلئے ان سے راستہ مانگا اور اب انکار پر ان کے رہنماؤں کو نشانہ بنایا جارہا ہے ۔ پختونوں کے لیڈر نے یہ نہیں بتایا کہ ریڈیو ملا نے انہیں کب فون کیا تھا اس وقت جب وہ اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر اسلام آباد دبئی اور یورپ کے دوروں پر تھے یا موجودہ نگران دور میں ان سے رابطہ کیا گیا ۔ اندر کی بات اللہ ہی جانئے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا فضل اللہ عرف ریڈیو ملا اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ اب اجازت لیکر کارروائیاں کرتا ہے اور وہ بھی ان سے جن کے خلاف انہی کے دور حکومت میں سب سے زیادہ کارروائیاں دونوں اطراف سے ہوئی ۔ ویسے اگر ریڈیو ملا نے ان کے دور حکومت میں ان سے رابطہ کیا تھا تو کیا اس وقت انہوں نے خیبر پختونخواہ میں امن قائم کیا تھا جو ان سے رابطہ کیا تھا اور رابطے کے حوالے سے بات انہوں نے اس وقت کیوں نہیں کی ۔ کم از کم اگر ایسی بات ہوتی تو ان کے سپورٹر بھی بڑھ جاتی ۔ اور اگر ریڈیو ملا نے ان سے اب رابطہ کیا ہے تو نگران سیٹ اپ میں کیا ان کی چلتی ہے جو ان سے اجازت لی جارہی ہیں اور اگر ایسا تو پھر تو نگران سیٹ اپ صرف ڈرامہ ہے جو عوام کیساتھ رچایا جارہا ہے ۔ ویسے صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام اس بات کو ابھی بھی نہیں بھولے کہ کس طرح ایک خود کش حملے کے بعد پختونوں کے علمبردار انہیں کھلے میدان میں چھوڑ گئے اپنے رہنماؤں کی ہلاکتوں کا رونا رونے والے اس صوبے کے عوام کے بارے میں

کیا کہتے ہیں کہ انہی کے دور میں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور سینکڑوں خواتین بیوائیں بن گئیں ڈالر کماؤ کی اس پالیسی نے صوبے کو بارود کا ڈھیر بنا دیا یہ سلسلہ حکومت میں پختونوں کے علمبرداروں کے ہوتے ہوئے بھی جاری رہا اور اب بھی جاری ہے کسی کو یقین نہیں آتا تو جا کر ان معصوم بچوں سے پوچھیں جو دو ہفتے قبل یکہ توت میں ہونیوالے بم دھماکے اپنی جانوں سے گزر گئے اور کئی اپنے جسمانی اعضاء کھو بیٹھے ان معصوم بچوں کو کارنر میٹنگ میں یہ کہہ کر بلایا گیا تھا کہ پروگرام ختم ہونے کے بعد ان بچوں کو پتنگ مفت میں ملیں گے اور بسنت اور پتنگ کے شوقین معصوم بچے پتنگ کی خاطر جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

خیبر پختونخواہ کے عوام کو اس بات سے اب کوئی غرض نہیں کہ حکومت میں کون آتا ہے اور کون ان پر مسلط ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی بھی مخلص نہیں سب سے زیادہ بجلی پیدا کرنے والا صوبہ سب سے زیادہ لوڈشیڈنگ کا شکار ہیں سوئی گیس میں بھی یہی صورتحال جارہی ہے مال کماؤ اور لیزی لوڈ کے اس چکر میں تیر' لالٹین' کتاب سب کی پالیسی ایک سی ہے ہاں کتاب والوں کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ ان کے دور میں کسی حد تک صوبے کے لیڈروں میں شرم نام کی کوئی چیز تھی اور وہ ہر ایک کو بکاؤ مال نہیں سمجھتے تھے۔ رہی تبدیلی کا نعرہ لگانے والے تو ان کیلئے یہی بات ہی کافی ہے

کہ پارٹی کیلیئے زندگیاں وقف کرنے والے کارکن انٹرا پارٹی انتخابات اور پھر ٹکٹوں کی تقسیم میں پیسوں والے لیڈروں کے سامنے کچھ نہیں رہے اور سونامی کا شکار اپنے ہی حقیقی کارکن ہوئے اور یہ واحد پارٹی ہے جو اپنے آپ کو قومی پارٹی کہلاتی ہیں لیکن اس کی موجودگی کا سب سے زیادہ پتہ فیس بک پر چلتا ہے -دیگر پارٹیاں تو پھر بھی مختلف -- صوبوں کی حد تک موجود ہیں لیکن یہ سوشل سائٹس پر رہنے والی پارٹی ہے

بات کہاں سے کہاں تک چل نکل پڑی ہے جن حالات میں آج کل مختلف سیاسی پارٹیوں کی انتخابی مہم چل رہی ہے اس سے تو ظاہرہ ہو رہا ہے کہ الیکشن ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے-اور اگر الیکشن ہوں بھی تو پھر ووٹروں کا ٹرن آوٹ پہلے کے مقابلے میں مزید کم ہوگا کیونکہ اگر امیدوار لوگوں سے ڈور ٹو ڈور ملے گا نہیں اور عام لوگ ان سے شکوۂ جھگڑا نہیں کرینگے کہ کس طرح انہوں نے ان کا بیڑہ غرق کیا یا پھر شہری اپنے ساتھ ہونیوالے کسی زیادتیٔ بہتری کی بات کرے اگر امیدوار پانچ سال گزارنے کے بعد بھی سامنے نہ آسکے اور شہری کی دل کی بھڑاس نہ نکل سکے تو پھر کوئی پاگل ہے کہ ووٹ کاسٹ کرنے کیلیئے نکلے اور وہ بھی اپنے خرچے پرٔ ویسے جس طرح حالات ہمارے ہاں جا رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ امن و امان کی ابتر صورتحال کی وجہ سے گھروں سے بھی نہیں نکل سکیں گے- اس صورتحال کا اندازہ باجوڑ میں ہونیوالی خاتون خودکش حملہ

آور کے واقعے سے کیا جا سکتا ہے وہاں پر انتخابی مہم میں حصہ لینے والی ایک خاتون
امیدوار پر واہ واہ کی آوازیں تو بہت نکل رہی تھی جواب خاتون خودکش حملہ آور کے
واقعے کے بعد کم ہو گئی ہیں.

کیا ہم چور نہیں

مہینے کے آخری دن کس عذاب سے گزرتے ہیں یہ کوئی ان سے پوچھے جو صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے ہیں اور اگر ہماری طرح تنخواہ بھی مہینے کے تیسرے ہفتے میں آتی ہو تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کیا حال ہوتا ہے عجیب بات یہ ہے کہ تنخواہ کیلئے جب دن گننا شروع کرتے یں تو پھر مہینہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا لیکن جب مکان کا کرایہ دینے کی باری آتی ہے تو پھر لگتا ہے کہ دو ہفتے بعد ہی مہینہ ختم ہوگیا ہے ویسے بھی ایک صحافی دوست کی بات یہاں یاد آرہی ہے کہ جن کے بقول تن خواہ صرف ایک صرف تن کیلئے ہوتی ہیں اور ہم صحافی اس میں پورے کنبے کا خرچ چلاتے ہیں اسی لئے سمجھ نہیں آتا کہ کس طرح مہینہ پورا کریں خیر بات اپنے بچوں کیلئے فروٹ لینے کیلئے گذشتہ ماہ کے آخری دنوں میں ہشتنگری پھاٹک میں واقع روڈ کنارے کھڑے چھابڑی فروشوں کے پاس گیا سب سے کم قیمت کیلیے ہی تھے جس کی خریداری کیلئے میں نے چھابڑی فروش سے اس کی قیمت پوچھی وہ مجھ سے بات کررہا تھا کہ اس دوران ایک داڑھی والا شخص اس کی چھابڑی پر آیا اور چھابڑی فروش نے اسے دس روپے دیئے اس کے جانے کے بعد چھابڑی فروش نے حکمرانوں کو وہ گالیاں دی جسے سن کر میرا پسینہ بھی چھوٹ گیا ان میں سیاسی پارٹیوں کو دی جانیوالی گالیاں بھی شامل تھی

لیکن ساتھ وہ نئے پاکستان کی بات بھی کر رہا تھا مجھے مزا آیا اور میں نے اس سے کہا کہ تم سے کچھ باتیں پوچھنی ہے اس لئے خریداری بعد میں ہوگی پہلے میرے کچھ سوالوں کے جواب دو اس کے مثبت جواب پر میں نے اس سے سوال کیا کہ تم نے دس روپے دینے کے بعد گالیاں دینا کیوں شروع کی تو پہلے وہ مشکوک سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جب میں نے اسے بتایا کہ میں صحافی ہوں اور اپنی معلومات کیلئے یہ سوال پوچھ رہا ہوں تو اس نے بتایا کہ دس روپے لینے والا میری ہی طرح کا چھاتڑی فروش ہے جو روزانہ اس وقت آکر تقریبا ڈیڑھ سو کے قریب چھاتڑی فروشوں سے دس روپے بھتہ وصول کرتا ہے بقول اس کے ہشتنگری پھاٹک پر کھڑے چھاتڑی فروشوں سے چالیس روپے روزانہ ریلوے پھاٹک پر تعینات ریلوے کے ملازمین اور بیس روپے پولیس اہلکار بھتہ لیتے ہیں بھتہ خوری کے اس عمل میں ہمارے چھاتڑی فروش بھی ان کمینوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو ہم غریبوں کا خون چوستے ہیں۔بقول اس چھاتڑی فروش کے ہم مجبورا مہنگی چیزیں بیچنے پر مجبور ہیں جب میں نے اس سے سوال کیا کہ تم حکمرانوں کو کیوں گالیاں دے رہے تھے تو اس چھاتڑی فروش نے بتایا کہ یہ سارے حکمران کرپٹ ہیں اور ہم پر مسلط ہیں اسی وجہ سے ہم سڑکوں پر بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں جب میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ تم خود چھاتڑی سڑک کنارے لگا کر غیر قانونی کام کر رہے ہو اور تم اپنے آپ کو بچانے کیلئے رشوت دیتے ہو تو کیا تم کرپٹ نہیں ہو تو اس کے بعد اس چھاتڑی فروش کی بولتی بند ہوگئی۔

اس چھابڑی فروش سے گپ شپ کے بعد جب میں بھتہ وصول کرنے کیلئے شخص سے ملا اور اس سے سوال کیا کہ تم کیوں اپنے لوگوں سے بھتہ وصول کرتے ہو تو اس نے بتایا کہ اگر میں ایسا نہ کرو تو پھر مجھے یہاں روڈ پر مزدوری کرنے کون دیگا جب میں نے اس سے سے کہا کہ تم بھی کرپشن میں آگے ہو حالانکہ تم تو باشرع آدمی ہو تو اس آدمی نے جواب دیا کہ تمھیں دس روپے جو میں چھابڑی فروشوں سے کسی کے حکم پر جمع کر رہا ہوں وہ نظر آتے ہیں لیکن کروڑوں روپے نظر نہیں آتے جو حکمران کھاتے ہیں اس کے اس جواب نے مجھے کچھ دیر کیلئے خاموش کردیا لیکن میں نے اس سے سوال کیا کہ اس کا مطلب ہے کہ تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کرپشن کروگے تو اس نے جواب نہیں دیا- یہ ایک معمولی سی چھابڑی فروشوں کی بات ہے جو اپنی سطح پر کرپشن کر رہے ہیں اپنے ارد گرد جب بھی میں دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت کچھ کرتے ہیں اور اگر کہیں پر پھنس جائے تو انگلیاں دوسروں پر اٹھاتے ہیں حالانکہ اگر ہمیں دیکھ لیں تو ایک انگلی اگر مخالف کی طرف ہوتی ہے تو چار انگلیاں ہماری اپنی طرف ہوتی ہے لیکن ہم سب صرف اپنی ہی انگی کو دیکھتے ہیں باقی چار انگلیوں کو دیکھنے اور سوچنے کی ہمت نہیں کرتے.

انتخابات کے اس گہما گہمی میں ہر کوئی بہت کچھ کرنے اور کرانے کے دعوے

کر رہا ہے لیکن میرا سوال اپنے آپ سے اور سب لوگوں سے ہے کہ کیا ہم بحیثیت شہری اپنی حیثیت کے مطابق کرپشن نہیں کر رہے حکمرانوں کی بات تو بہت دور کی بات ہے کیا مزدور اپنی مزدوری حلال کر رہا ہے بہت کم مزدور میں نے دیکھے ہیں جو وقت کی پابندی کرتے ہیں ورنہ کسی مزدور کو اگر کسی کے گھر پر کام مل جائے اگر کام ٹھیکے کا ہے تو پھر تو جلدی ختم ہوگا ورنہ اگر روزانہ کی بنیاد پر مزدوری کر رہا ہے تو پھر ایک ہفتے کا کام مہینوں تک پھیل جاتا ہے یہی حال ہمارے دفتروں میں بیٹھے بابوؤں کا ہے جو بغیر شوڑہ لئے بغیر فائل آگے بھیجنا حرام سمجھتے ہیں پولیس اہلکار بغیر مٹی گرم کئے گاڑی آنے جانے ہی نہیں دیتے سرکاری دفاتر میں بغیر کمیشن کے کام چلانا مشکل ہے اور تو اور کیا ان حالات میں میڈیا اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہے یقینا نہیں کیونکہ جو اخبار میں اشتہار اور الیکٹرانک میڈیا پر کمپیئن چل رہی ہے کیا یہ پیسے کا کمال نہیں ایسے میں نیا پاکستان کہاں سے آیگا کیونکہ یہاں پر میں بھی چور ہوں آپ بھی چور ہو ہاں چوری کا فرق اتنا ہے کہ کوئی بڑا چور ہے اور کوئی چھوٹا چور کوئی دل کا چور اور کوئی وقت کا چور کوئی حسن کا چور اور کوئی پیسے کا چور ایسے میں اگر حکمران بھی چور ہوں تو اس میں کونسی برائی ہے ہاں ان میں ایک بات اچھی ہے کہ یہ سب کو نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے پر الزامات کی وجہ سے ہمیں ان کے بارے میں پتہ چلتا ہے لیکن ہم چوری کر کے چھپاتے ہیں ایسے میں تبدیلی نیا پاکستان مشکل تو کیا ناممکن ہے کیونکہ چوروں پر چوری

ہی مسلط ہوتے ہیں کربٹ لوگوں کیلئے کربٹ ہی آتے ہیں اور یہ اللہ تعالی کا فرمان بھی

ہے۔

پشاور کی شاہی باغ سبزی منڈی

پشاور کے شاہی باغ روڈ پر واقع سبزی منڈی نہ صرف ٹریفک پولیس کیلئے بلکہ اسی ایریا میں واقع میونسپل کارپوریشن کے اہلکاروں کیلئے اضافی کمائی کمانے کیلئے بہترین ذریعہ ہے۔ صبح تقریبا چار بجے سے پشاور کے مختلف مضافاتی علاقوں بشمول پھندو سردریاب پجگی رنگ روڈ سمیت بہنہ غلام خزانہ اور چمکنی کے علاقے سے تعلق رکھنے والے زمیندار گدھا گاڑیوں میں اپنی سبزی لیکر آتے ہیں اور یہاں پر فروخت کرتے ہیں جسے زیادہ تر شہر کے مختلف علاقوں میں کام کرنے والے دکاندار اور خصوصا حیات آباد اور پشاور صدر میں تجارت کرنے والے سبزی فروش ہی خریدتے ہیں۔ڈپٹی کمشنر پشاور کے باہر سڑک پر ہونیوالے اس کاروبار سے نہ صرف تقریبا تین سو کے قریب غریب چھاڑی فروشوں کا روزگار چل رہا ہے اور وہ اپنے بچوں کیلئے حلال کمائی کر رہے ہیں بلکہ اسی سبزی منڈی کے سبب ٹاؤن ون کے سپرنٹنڈنٹ سمیت ٹاؤن آفیسر ریگولیشن کے اہلکاروں کے گھروں میں سبزی اور بھتہ کے علاوہ اسی روڈ پر واقع ٹریفک ہیڈ کوارٹر کے اہلکاروں کیلئے بھی کمائی کا ذریعہ بن چکا ہے۔اس سلسلے میں کی جانیوالی ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق ٹاؤن ون کے چار اہلکار جن میں ایک سپرنٹنڈنٹ بھی شامل ہیں روزانہ صبح پانچ بجے یہاں پر آکر ہر دکاندار سے سو

روپے وصول کرتے ہیں اور تقریبا تین سو چھابڑی فروشوں کے علاوہ یہاں پر سبزی فروخت کیلئے گدھا گاڑی پر لانے والے افراد سے بھی یہی بھتہ وصولی کی جارہی ہیں۔کھلے عام ہونیوالے اس کاروبار ہیں ٹاون ون کے مختلف دفاتر کے ملازمین بھی اپنا حصہ وصول کررہے ہیں بلکہ اسی بازار سے ملنے والی مفت کی سبزی بھی ٹاؤن ون کے اہلکار دفاتر میں پکا کر کھاتے ہیں علی الصبح چار بجے سے نو بجے تک روڈ پر لگنے والی اس سبزی منڈی کے باعث لوگوں اور خصوصا طلباء وطالبات کو جو شہر سے پشاور کینٹ اور یونیورسٹی کی طرف جانا چاہتے ہیں انتہائی مشکلات درپیش ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس بازار میں جھگڑے بھی اسی باعث ہو جاتے ہیں۔

پشاور کے مختلف شہروں میں یہ واحد روڈ ہے جس پر ٹریفک پولیس کے چھ اہلکار ہر وقت موجود ہوتے ہیں حالانکہ صوبائی اسمبلی کے سامنے مصروف ترین روڈ پر بھی صرف دو ٹریفک اہلکار ڈیوٹی کیلئے کھڑے ہوتے ہیں شاہی باغ روڈ پر اتنے زیادہ اہلکاروں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی کمائی اسی علاقے سے ہیں۔اسی تحقیقاتی رپورٹ کے حوالے سے جب سڑک کنارے دکانداروں سے بات کی گئی تو زیادہ تر دکاندار ڈر کے مارے کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ غربت نے انہیں اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتی پر بھی کھل کر بات نہیں کرسکتے کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ اگر انہوں نے اس حوالے سے بات کی تو پھر

انہیں یہاں روزگار کے موقع نہیں ملے گا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں زیادہ تر چھابڑی فروش جو کہ زمین پر بھی سبزیاں فروخت کرتے ہیں کی عمریں چالیس سال سے زائد ہیں اور ان کی اسی روڈ پر سبزیاں فروخت کرتے ہوئے زندگی گزر گئی ہیں ان میں بعض چھابڑی فروشوں کے مطابق کئی مرتبہ ٹریفک اہلکار انہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں اور انہیں اس بات سے ڈراتے ہیں کہ عدالت میں جرمانہ بھی ہوگا اور قید بھی گزارنی پڑے گی اسی باعث وہ ہیڈ کوارٹر کے باہر ہی ایک ہزار سے پندرہ سو روپے تک لیتے ہیں اور اسکی رسید بھی نہیں دیتے۔ کئی ایک ایسے بچے بھی یہاں پر کام کر رہے ہیں جو کہ دوسرے اضلاع سے صبح سویرے آتے ہیں اور یہاں پر شام تک مزدوری کرتے ہیں بقول ان کم عمر افراد کہ ان کے والدین نے یہاں پر زندگی گزار دی اور بیمار ہوگئے اور اب مجبوری کے عالم میں یہاں پر مزدوری کیلئے آتے ہیں۔ شاہی باغ روڈ پر واقع سبزی منڈی میں تقریبا پندرہ سے بیس ایسے بچے اور بچیاں بھی روزانہ دیکھنے کو ملتی ہیں جن کی عمریں تعلیم حاصل کرنے کی ہیں لیکن غربت کی وجہ سے وہ شاپنگ بیگ لئے پھرتے ہیں کہ اگر کوئی اس بازار سے سبزی لے تو وہ انہیں شاپنگ بیگ فراہم کرتے ہیں ان بچوں کے بقول ان کی مزدوری سارا دن میں ستر اور سو روپے کے درمیان ہوتی ہیں
۔

شاہی باغ سبزی منڈی پر تحقیقات کے سلسلے میں جب وہاں دکانداروں سے بات

ہو رہی تھی تو اس وقت ایک آدمی سفید کپڑوں میں وہاں پر آیا جب اس نے راقم کو وہاں پر دیکھا تو وہاں سے فورا چلا گیا کچھ لمحوں بعد ایک چھابڑی فروش اسی جگہ پر آیا اور دکاندار کے ساتھ پڑے سبزی کے ایک بڑی بوری اٹھا کر لے گیا سفید کپڑوں میں آنیوالا اہلکار ایک پولیس آفیسر تھا جس کی لمبی داڑھی بھی تھی اور راقم نے اس کو شہر کے مختلف علاقوں میں ڈیوٹی کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔بوری لے کر جانیوالے چھابڑی فروش سے جب معلومات کی گئی تو بقول اس سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار نے اسے ہدایت کی کی کہ وہاں پڑی سبزی کے بوری کو لیکر آئے کیونکہ اس کی چھٹی ہوئی ہے اور اب وہ گھر جانا چاہتا ہے اور سبزی لیکر جارہا تھا یہی وہ سبزی کی بوری تھی جو اس نے اسی روڈ پر مختلف دکانداروں اور چھابڑی فروشوں سے اپنی وردی کے بل بوتے پر حاصل کی تھی ۔ایک حیرت انگیز اور دلچسپ بات کہ اسی روڈ پر بننے والا فلائی اوور بھی ٹریفک اہلکاروں کیلئے کمائی کا ذریعہ بن گیا ہے کیونکہ روڈ کنارے انہوں نے ون وے ٹریفک کا سائن بورڈ لگایا ہے تاہم جو لوگ /ڈرائیور بیس روپے دیتے ہیں تو تبھی انہیں اسی روڈ پر ون وے کی خلاف ورزی کی بھی اجازت ہے۔ جب راقم نے سائن بورڈ اور روڈ پر چلنے والے غیر قانونی ٹریفک کی تصاویر لی تو وہاں پر موجود ٹریفک اہلکار آیا اور اس نے راقم کو چائے پانی کی آفر کر دی جس پر راقم نے شکریہ کیساتھ معذرت کرلی۔

سڑک کنارے سبزی فروخت کرنے والے چھابڑی فروشوں نے اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں پر سی سی پی او پشاور کو باقاعدہ دستخطوں سے درخواس بھی لکھ کر دیدی ہے جس میں مختلف اہلکاروں کے بارے میں شکایت کی گئی ہیں کہ ان سے بھتہ خوری میں یہی ٹریفک اہلکار ملوث ہیں پشاور پولیس کے سی سی پی او نے اس درخواست کو ایس ایس پی انوسٹی گیشن کو مارک کردی کہ اس کی تحقیقات کی جائے لیکن ابھی تک تحقیقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ٹریفک اہلکار درخواست دینے والے چھابڑی فروشوں کو روزانہ تنگ کرتے ہیں کہ ان کے خلاف درخواست کیوں لکھ کر دیدی گئی ہیں سبزی منڈی میں مختلف سبزیوں کی قیمتوں میں اضافے پر دکانداروں کا موقف ہے کہ پھندو روڈ سے لیکر اس سبزی منڈی تک آنیوالے ڈاٹسن گھوڑا گاڑی اور گدھا گاڑی سے مختلف روڈوں پر سو روپے بھتہ وصول کیا جاتا ہے اسی باعث قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ مہنگی سبزیاں بیچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ راقم اس رپورٹ کے سلسلے میں جب سبزی منڈی میں گاڑی میں جارہا تھا اس وقت بذات خود ٹریفک اہلکار کو ٹیکسی ڈرائیور سے سو روپے لیتے ہوئے دیکھا جب راقم نے کوشش کی کہ متعلقہ ٹریفک اہلکار کی تصویر کھینچ لوں تو رخ تبدیل کرکے وہاں سے غائب ہوگیا اور راقم کے ڈیڑھ گھنٹے تک موجودگی کے باعث اپنی ڈیوٹی کیلئے روڈ پر نہیں آیا۔ راقم رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں روڈ پر موجود تھا کہ ایک ٹریفک اہلکار وہاں پر آیا بقول اس کے صحافیوں کے مزے ہیں۔ راقم نے بتایا کہ مزے کیسے ہیں چودہ سال صحافت میں گزارنے کے باوجود سائیکل

تک نہیں کرائے کے مکان میں زندگی گزار رہے ہیں یہ کیسے مزے ہیں جس پر متعلقہ ٹریفک اہلکار نے جواب دیا کہ ہم ہر خدمت کیلئے تیار ہیں راقم کی طرف سے شکریہ کے جواب میں ٹریفک اہلکار نے جواب دیا کہ کسی بھی قسم کی خدمت کیلئے ہم تیار ہیں بس ہمارا خیال رکھیں چاہے کسی بھی مروانا ہی کیوں نہ ہو ہم اپنے بندے بھیج کر کام نکلوالیں گے اور پھر بعد میں طالبان کے کھاتے ہیں ڈال لیں گے اور آپ کا دشمن بھی ختم ہو جائیگا یہ وہ الفاظ تھے جو ٹریفک انسپکٹر نے راقم کے سامنے ادا کئے اور راقم اس کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

سبزی منڈی پشاور پر ہونیوالے تحقیقات کے دوران یہ پتہ چلا کہ اس سبزی منڈی کی اپنی ایسوسی ایشن ہیں جس کا صدر اور جنرل سیکرٹری بھی موجود ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ٹریفک پولیس سے لیکر میونسپل کارپوریشن کے اہلکاروں کے درمیان بھتہ وصولی کیلئے پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ایک اہم عہدیدار کے بقول وہ ہر مہینے 20 ہزار روپے میونسپل کارپوریشن پشاور کے ٹاؤن ون میں تعینات ایک بڑے افسر کے دفتر تک پہنچاتا ہے اور یہ سلسلہ کئی سال سے جاری ہیں اس سے قبل دوسرا اہلکار مہینے میں اپنا حصہ وصولی کیلئے آتا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سبزی منڈی کی چھابڑی فروشوں کیلئے کام کرنے والی ایسوسی ایشن کے انتخابات گذشتہ پانچ سالوں سے نہیں ہوئے اور پانچ سال سے ایک ہی کابینہ کام کر رہی

ہیں ایک اہلکار جو خود بھی سرکاری ملازم ہے اس ایسو سی ایشن کا عہدیدار ہے بقول اس کے وہ اپنے خرچ کیلئے دو سو روپے روزانہ ان غریب چھاڑی فروشوں کیلئے نکالتا ہے ورنہ ان کا مہینے کا کھاتا چل رہا ہے وہ ان چھاڑی فروشوں سے پیسے وصول کرکے ٹریفک پولیس اورٹائون کے اہلکاروں کے پاس بھتہ پہنچاتا ہے اس کے باوجود بھی ان غریب چھاڑی فروشوں کو روزانہ تنگ کیا جاتا ہے ۔

اس تحقیقاتی رپورٹ کے دوران یہ بھی پتہ چلا کہ سڑک کنارے سبزیاں بیچنے والے یہ غریب چھاڑی فروش روزانہ تین سو سے پانچ سو روپے کے درمیان مزدوری کرلیتے ہیں-ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے اور کچھ ناخواندہ بھی ہے جن سے بعض محکموں خصوصا بے نظیر انکم سپورٹ کے امداد میں نام شامل کرنے کیلئے مختلف لوگوں نے ہزاروں روپے وصول کئے ہیں اور نہ تو ان کا نام بے نظیر انکم سپورٹ میں شامل ہوااور اب یہی چھاڑی فروش اپنے پیسوں کیلئے بھی مزدوری کیساتھ ساتھ مختلف دفاترکے چکر لگانے پر مجبور ہیں-اور کوئی ان کی آوازاور فریاد سننے کیلئے تیار نہیں- سب سے عجیب بات جو کہ اس سڑک پر تعینات صفائی کرنے والوں کی ہے کہ وہ صفائی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک ان کا جیب گرم نہ کیا جائے یا پھر ان پر چائے قہوہ نہ پلایا جائے- سڑک کنارے چلنے والے پشاور شہر کے اس غیر قانونی سبزی منڈی کی انتظامیہ کے کاغذات میں کوئی حقیقت نہیں لیکن آدھ کلومیٹر پر مشتمل اس سبزی

منڈی سے تقریبا تین سو روپے غریب چھابڑی فروشوں کا روزگار وابستہ ہیں اور وہ حلال کی کمائی اپنے بچوں کیلئے کر رہے ہیں جبکہ ٹریفک پولیس اور میونسپل کارپوریشن میں تعینات اہلکاروں کیلئے اوپر کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔بقول ان چھابڑی فروشوں کے اگر انہیں قانونی حیثیت میں کام کرنے دیا جائے اور جو بھتہ لوگ ذاتی حیثیت میں وصول کرتے ہیں اگر ان سے سرکار مد میں لیا جائے تو وہ بخوشی دینے کو تیار ہونگے کیونکہ اس سے جہاں انہیں باعزت روزگار ملے گا وہیں پر حکومت خیبر پختونخواہ کو اضافی آمدنی بھی حاصل ہوگی۔

نئی نسل سوشل سائٹس اور ان کی سرگرمیاں

سراہے جانا چاہے جانا یہ ایک فطری عمل ہے جو کہ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں مرد و خواتین کی کوئی تخصیص بھی نہیں لیکن اس عمل میں خواتین کچھ زیادہ ہی تیز ہوتی ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں اس معاملے میں زیادہ مواقع ملے لوگ انہیں سراہے ہم اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے میں اب یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی دیکھ رہے ہیں کہ سراہے جانے کی یہ خواہش ہمیں اور خصوصا نئی نسل اور خواتین کو کس طرف لے جا رہی ہیں اس کا اندازہ نہ تو نئی نسل اور خصوصا خواتین کو بالکل نہیں۔ کچھ عرصہ قبل پشاور کے ایک مارکیٹ سے ایسے دکانداروں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے گرفتار کیا جن کے کمپیوٹر سے لوگوں کے ذاتی تصاویر برآمد ہوئیں ان میں کچھ ایسی تصاویر بھی تھیں جو لوگوں نے موبائل فون کے ذریعے اپنے گھروں میں لی تھی جو غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گئیں اور بعد میں وہ تصاویر اور ویڈیوز انٹرنیٹ پر لوگوں نے لوڈ کر دی یہ تصاویر مارکیٹ میں آئیں اور اس کے بعد متعلقہ لوگوں کی بدنامی کا باعث بنی ۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس کی کچھ روایات تھی جو کہ اب دم توڑ رہی ہیں انہیں دم توڑتی روایات کے باعث ہم اس صورتحال پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم لوگ اپنے ہی ہاتھوں اپنا سب کچھ لٹا رہے ہیں۔

امریکہ میں گذشتہ دنوں کی جانیوالے ایک سروے رپورٹ کے مطابق ہائی سکولوں کی کم عمر طالبات انٹرنیٹ پر آن لائن خوبصورتی کے مختلف مقابلوں میں اپنی تصاویر بھجواتی ہیں جو مختلف افراد کے ہاتھوں لگ جاتی ہیں اور بعد میں ان طالبات اور ان کے والدین کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ سروے امریکہ میں کیا گیا جس کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ وہاں پر ان چیزوں کی پروانہیں ہوتی لیکن ووہاں بھی یہ مسائل پیدا کررہی ہیں لیکن آج اگر ہم اپنے ارد گرد دیکھ لیں تو یہی صورتحال ہمارے ہاں بھی موجود ہیں آن لائن دوستی سمیت سوشل سائٹس قحبہ خانے بن چکے ہیں کسی کو اندازہ ہی نہیں کہ ہم اپنے گھروں میں اپنے بچوں،اپنے نوجوان نسل کو کس طرح لاپرواہی سے تباہی کے گڑھے میں پھینک رہے ہیں ہم لوگ تو اس چکر میں خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے بچے کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں لیہ کام کونسا ہوتا ہے ناخواندہ والدین کو اس کا علم ہی نہیں وہ تو بچوں کی خوشی کیلئے انہیں کمپیوٹر/ انٹرنیٹ اور دیگر سہولیات فراہم کرتے ہیں جبکہ تعلیم یافتہ اور ماڈرن والدین کے پاس اول تو وقت ہی نہیں کہ اپنے بچوں کی سرگرمیوں کو دیکھ لیں کہ ان کے لاڈلے کن کرتوتوں میں لگے ہوئے ہیں دوسرے یہ لوگ شخصی آزادی کے نام پر بچوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور بعد میں ایسے مسائل میں پھنس جاتے ہیں کہ جن کا تدارک اگر آغاز میں کرے تو انہیں ان مسائل کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے۔

کچھ عرصہ قبل راقم کی پڑوس میں رہائش پذیر ایک پڑوسی سے ملاقات ہوئی وہ پڑوسی اپنے سکول جانے والے طالب علم بیٹے کی آوارہ گردیوں سے پریشان تھا بیٹے کی خواہش پر اس کیلئے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کی تو اس دن ملاقات میں پڑوسی بہت خوش تھا جب راقم نے اس سے سوال کیا کہ کیا صورتحال ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے گھر میں آن لائن کمپیوٹر پر داخلہ لیا ہے اور کسی جگہ پر ممبر شپ بھی کی ہیں جس کیلئے اس نے اضافی پیسے بھی مانگے والد خوش تھا کہ اس کے بیٹے کو ممبر شپ مل گئی ہم بھی خوش ہوگئے کہ چلو پڑوسی کا ذہنی تناؤ کم ہوگیا اسی شام گھر سے نکلنے والے پڑوسی کے بیٹے کی راقم کیساتھ ملاقات ہوئی جب اس سے آن لائن کمپیوٹر کورسز اور ممبر شپ کے بارے میں پتہ کیا تو وہ ہنسنے لگا اس نے بتایا کہ "داجی" تو سادہ آدمی ہے ان سے ممبر شپ کے نام پر پیسے بٹورے ہیں اور ممبر شپ تو اس نے ایک سوشل سائٹ پر مفت میں کی ہے جس میں ہر قسم کے دوست ان سے آن لائن ملاقات کرتے ہیں اور بقول اس کے اب گھر میں آن لائن بہت کچھ مل جاتا ہے اس لئے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں۔افسوس کیساتھ ساتھ غصہ بھی بہت آیا لیکن کر بھی کیا سکتے تھے سو ہم بھی خاموش رہ گئے۔ یہ ہماری نئی نسل ہے جس نے ملک کا مستقبل سنبھالنا ہے ۔بات سے بات نکلتی ہے کہ کسی زمانے میں ہمارے ایک استاد دوران طالب علمی ہمیں بتایا کرتے تھے کہ جب انہیں گھر سے پیسے نہیں ملتے تھے تو

وہ انکٹ پاٹ کے نام پر والدہ سے پیسے نکلواتے اور کبھی کبھار تو انکٹ اور پاٹ کو الگ الگ کرکے آٹھ آنے اورایک روپیہ نکال لیتے تھے لیکن یہ چوری بھی صرف کھانے پینے کی اشیاء تک محدود ہوتی تھی اب تو ماڈرن دور کے ماڈرن تقاضوں نے جہاں والدین کو بے حال کردیا وہیں نئی نسل کو بھی لاپرواہ بد تمیز اور فضول خرچ تک کردیا ہے -

دل کے پھپھولے توڑنے پر آتے ہیں تو بات دور تک چلی جاتی ہیں انٹرنیٹ پر آن لائن سوشل سائٹس نے نوجوان نسل کو کن برائیوں کا شکار کردیا ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہی سائٹس پر اب "گئے کلب" بن گئے ہیں جو باقاعدگی سے مختلف یوزر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششوں میں مصروف عمل ہوتے ہیں اسی طرح "ڈانس کلب" سمیت بہت ساری کلب بنے ہیں جس کے ذریعے نوجوان نسل کو مخصوص لوگوں سے ملایا جاتا ہے اور انہیں اخلاقی گراوٹوں میں دھکیلا جارہا ہے کچھ لوگوں کی ویڈیوز / تصاویر بنتی ہیں جنہیں مستقبل میں انہیں بلیک میل کرنے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے - کیا ہم نے اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے اپنے بچوں کو تیار کیا ہے کیا ہم خود ذہنی طور پر اس صورتحال کا مقابلہ کرسکتے ہیں یقینا نہیں جب ہم خود تیار ہیں تو پھر کیسے ہمارے آنیوالی نسل تیار ہوگی لیکن کیا انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہم اپنی نئی نسل کو کمپیوٹر / انٹرنیٹ اور آن لائن مختلف پروگراموں سے دور

کر سکتے ہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے آنیوالی نسل نے دنیا کا مقابلہ کرنا ہے تو پھر کیا انہی فضولیات سے بچنے کیلئے کہیں پر کسی تعلیمی ادارے یونیورسٹی میں کوئی کتاب کوئی کورس ٹریننگ متعارف ہی نہیں ہوئی جس کے ذریعے نئی نسل کو ان فضولیات سے آگاہ تو کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں عملی قدم کون اٹھاتا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سرکار کیساتھ ہمیں بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

دہشت گردی کا عفریت فائدہ کس کا

دہشت گردی کہئیے یا جہاد گریٹ گیم ہے یا پختونوں کو مارنے کا عالمی منصوبہ اپنوں کی کارستانی ہے یا عالمی طاقتوں کے خطے میں اپنے آپ کو ان کرنے اور رکھنے کی کوشش یہ جو کچھ بھی ہے اس بارے میں کوئی کھل کر بات کرنے کو تیار ہی نہیں نہ ہی سیاستدان نہ ہی ہمارے بہت کچھ سمجھنے کے دعویدار دانشور اور نہ ہی وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اس سے نمٹنے کیلئے ہتھیار بھی ہیں جو بھی کھیل جاری ہے اس میں فائدہ اور کسی کو ہو یا نہ ہو ہماری پولیس کو بہت زیادہ ہے تنخواہیں تین گنا بڑھ گئی ہیں اختیارات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ بھائی کس کھاتے میں کسی غریب کو اندر کرکے دہشت گردی کے الزام میں ڈال دیا جاتا ہے پولیس کے ٹارچر سیل چل رہے ہیں عدالت عالیہ پشاور چیخ رہی ہیں لیکن پھر بھی کسی پر اثر ہی نہیں ہوتا

-

سرکار کی طرف سے ملنے والے کالی وردی اور بیلٹ کی بدمعاشی اتنی ہے کہ انہیں دیکھ کر کہ شریف آدمی بھی سر جھکا کر چلتا ہے امن و امان کی صورتحال ابتر ہے کسی جیب کترے کو بھی پکڑ لیتے ہیں تو مک مکا کرنے کی کوشش میں ناکامی پر دہشت گری کا الزام لگا دینا آسان ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر غائب کروا دینا

سب سے آسان کام ہے کسی کو یقین نہیں آتا تو گذشتہ تین سال سے اخبارات اور ٹی وی پر چلنے والے خبریں دیکھ لیں کہیں پر یہ دیکھنے کو نہیں ملتا کہ مفروروں کیساتھ مقابلہ ہو رہا ہے ڈاکوئوں پکڑ لئے یا جیب کترا پکڑا ہے ہر جگہ یہی سننے کو ملتا ہے کہ دہشت گردوں کے گینگ کو گرفتار کرلیا مقابلے میں دہشت گرد مارے گئے سب سے آسان کام ان کا یہی ہے کہ کسی کو دہشت گرد قرار دینا اور پھر اسے مقابلے میں پار کر دینا-اسی محکمے میں بہت کم لوگ ہیں جو شریف ہیں اور واقعی انہیں اس محکمے میں کام کرنا چاہئیے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کی نظریں دوسروں کے جیبوں پر لگی ہوتی ہیں

الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں زیادہ تر صحافی ایک دوسرے کو خبروں کے بارے میں انفارم کرنے کیلئے موبائل میسج کا سہارا لیتے ہیں گذشتہ دنوں پولیس کی جانب سے ایک میسج آیا کہ ہماری جوان پولیس فورس نے جناح پارک میں مشتبہ دہشت گرد کو گرفتار کرلیا گیا تقریبا دس منٹ تک اس پیغام بھیجنے والے سے معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ مشتبہ دہشت گرد تو کوئی نہیں تھا البتہ ایک ہیر ئونچی کو پکڑ لیا گیا تھا جسے بعد میں یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ یہ ہیر ئونچی ہے -اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہماری بہادر پولیس فورس کیسے تیر مارتی ہیں .

دہشت گردی کے اس بڑے کھیل میں سب سے زیادہ فائدہ انہی پولیس والوں کا ہوا ہے ان کی تنخواہیں تین گنا بڑھ گئی ہیں لیکن پھر بھی ان کے آنکھیں اور دل

نہیں بھرے اگر کسی دل جلے نے رشوت مانگنے پر جھگڑا کر دیا تو پھر وہ اندر ورنہ ان کے جہنم کی طرح موٹی پیٹوں کو بھرتے رہو دو دن قبل اتوار کے روز نوتھیہ سٹاپ پر تھانہ گلبرگ کی دو پولیس موبائل اور ایک ٹریفک پولیس کی گاڑی سڑک کنارے کھڑی تھی اور ہر آنے جانیوالے گاڑی کو روک رہی تھی ایک بس سے ایک آدمی کو اتار دیا جو شکل سے ہیر ئونچی لگ رہا تھا گاڑی میں بیٹھے لمبی مونچھوں والے پولیس اہلکار نے اس غریب کی جیب کی تلاشی لی اور جیب سے سینکڑوں روپے نکال دیئے جیسے یہ اس کے باپ کی کمائی ہو راقم اسے دیکھ رہا تھا بھرے بازار میں ہونیوالے اس کھیل کو ہر کوئی دیکھ رہا تھا لیکن راقم سمیت کسی نے یہ ہمت نہیں کی کہ اس غریب آدمی کا قصور کیا ہے اس کے بعد راقم گھر جانے کیلئے مسافر گاڑی میں سوار ہوا تو ٹریفک پولیس اہلکار نے اس گاڑی والے کو روک دیا اور ڈیمانڈ کی کہ سو روپے خرچہ دو اس نے انکار کیا اور گاڑی یہ کہہ کر بھگا دی کہ اتنی مزدوری اتنی نہیں ہوئی کہ تمھیں بھی دو ایسے میں اگر کوئی حالات سے تنگ شہری ان کیساتھ جھگڑا کرتا ہے یا فائرنگ کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو پھر یہ شیر جوان اس طرح فائرنگ کرتے ہیں کہ راہ گیر اس کی زد میں آکر جاں بحق ہو جاتے ہیں اس کی واضح مثال چار دن قبل بڈھ بیر میں پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہونیوالا طالب علم ہے جو اپنے دوست سے ملنے گیا تھا اور پولیس کی فائرنگ کی زد میں آکر مر گیا اس کا غریب والد لاش لیکر گورنر ہائوس کے سامنے احتجاج کیلئے پہنچ گیا لیکن غریبوں کی کون سنتا ہے

اس مقابلے میں اگر کوئی پولیس ااہلکار مارا جاتا تو پھر قومی جھنڈے میں لپیٹ کر شہادت کے اعلی درجے پر اسے فائز کیا جاتا کہ اس نے قوم کی خاطر جان دیدی۔ پھر اس کو بعد از مرگ لاکھوں روپے بھی دیئے جاتے اور خاندانی نوکریوں کے سلسلے میں باپ کے بعد بیٹے کو نوکری ملتی۔

دوسری طرف ان کی کارکردگی کا حال یہ ہے کہ مختلف کیسز کو زبردستی لیٹ کرواتے ہیں کہ شکایت کرنے والا یا تو اپنی شکایت سے ہٹ جائے یا پھر تحقیقات میں اتنا وقت لیتے ہیں کہ تحقیقات کا وقت ہی ختم ہو جاتا ہے لوگوں کی حفاظت کے ذمہ دار گاڑیوں میں تو پھرتے ہیں لیکن سیکورٹی دینے میں مکمل طور پر ناکام ہیں بلکہ اب تو پشاور سمیت صوبہ خیبر پختونخواہ کے زیادہ تر تھانوں کے باہر بڑی بڑی دیواریں بنا دی گئی ہیں کہ ان پر حملوں کا خدشہ ہے دوسروں کو سیکورٹی فراہم کرنے کے دعویدار تھانوں میں چھپ کر زندگی گزارتے ہیں اوران کے مزے اس طرح بھی ہیں کہ شہری ڈر کے مارے ان دیواروں سے گزرنے کی ہمت ہی نہیں کرتے اور یہ چوری بھی کرتے ہیں خصوصا بجلی کی چوری کی کمین ہزارں میں بل دیتے ہیں لیکن انہیں بجلی میسر نہیں اور ہمارے ہاں خصوصا پشاور میں مختلف تھانے بجلی چوری میں ملوث ہیں میٹر ریڈنگ نام کی کوئی چیز نہیں ایسے ہیں اگر کوئی اس حوالے سے بات کرے تو پھر جواب ملتا ہے کہ ہم تو اس ملک کے کمی کمینوں کی خدمت کرتے ہیں۔ تبدیلی کے دعویدا تو آئے ہیں اب دیکھتے ہیں

کہ تھانہ کلچر اور پولیس سٹیٹ کو کس طرح تبدیل کرتے ہیں اس کا اندازہ تو اگلے تین مہینے میں ہی ہو جائیگا۔

کیا ہمارا معاشرہ رہنے کے قابل ہے

دکھ اور بے بسی کن کیفیات کا نام ہیں اور اگر ساتھ میں غربت بھی ہو تو اچھے خاصے انسان کو مفلوج کر دیتی ہیں ان کیفیات کا اندازہ گذشتہ دنوں ایک ساتھی کیمرہ مین کی طرف سے لائے جانیوالے ویڈیو) فوٹیج (دیکھنے کے بعد ہوا جس میں ایک خاتون اپنی دو بیٹیوں کی عزت اور اپنا شوہر گنوانے کے بعد رو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں پر مداوا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔انہی کیفیتیوں سے دوچار وہ خاتون مفلوج ہو چکی تھی اور اس کے بس میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کیساتھ ہونے والا ظلم کے جواب میں وہ کیا کرے۔ تقریبا دو ہفتے قبل وردی پہننے والے ایک جانور نما انسان نے اپنے رشتہ دار اسی خاتون کے دو معصوم بچیوں کو جن کی عمریں سات اور نو سال کے مابین تھی اور بیمار تھی یہ کہہ کر گھر سے لے گیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس علاج کیلئے لے کر جا رہا ہے علاج کے بہانے لے جانیوالے ان بچیوں کو اس منحوس نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر ان دونوں پھول جیسی بچیوں کو ان کے گھر چھوڑ دیا معصوم بچیوں نے اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتی کے بارے میں اپنے والدہ کو بتایا اور اس ظلم کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے پر ملزم نے پانچ معصوم بچوں کے والد کو دوسروں کے کھیتوں میں فا ئرنگ کرکے قتل کر دیا وہ مزدور شخص جو پانچ معصوم بچیوں کا والد اور اپنے

گھر کا واحد کفیل تھا اور دوسروں کے کھیتوں میں محنت مزدوری کرکے وقت گزارتا تھا اسے بھی قتل کردیا گیا اپنی عزت کی خاطر قتل ہونے والا یہ شخص چونکہ کمی کمینوں سے تعلق رکھتا تھا اس لئے نو تو اسے شہید بنا کر پیش کیا گیا نہ ہی ایک معصوم بچیوں کیساتھ ہونیوالی زیادتی پر کسی این جی او نے آواز اٹھائی نہ ہی میڈیا میں کوئی بات آئی کیونکہ ظلم کرنے والا وردی والا ہے ہاں ایک بات کی آسانی ہوگئی کہ وردی والے اب اسی شخص کی بیوہ خاتون کو تھانے لانے لے جاتے ہیں اور انہیں اس خاتون جس کی دو بیٹیاں ظلم کا شکار ہوئی اس کا شوہر اس سے چھین لیا گیا اسے خوار کرنے میں مزید آسانی ہوگئی کمی کمینوں کے ٹیکسوں پر پلنے والے حرام خور وردی والے اس خاندان کو انصاف فراہم کرنے کے بجائے اس خاندان کو مزید رگیدنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں اس بے کس خاندان پر کیا گزرتی ہیں اور ان کے احساسات کیا ہونگے یہ تو متاثرہ لوگ خاندان ہی بتا سکتی ہیں لیکن اس واقعے نے جہاں ہمارے ارد گرد انسانوں کے روپ میں پلنے والے سوروں اور انہیں سپورٹ کرنے والے گدھ نما انسانوں کی نشاندہی کردی ہے وہیں پر یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس معاشرے میں رہنا ایک شریف بے کس اور غریب آدمی کیلئے کتنا مشکل کام ہے۔

کون ہے اس پختون معاشرے میں اس ظلم کے بارے میں پوچھنے والا یہاں پر ہر کوئی اپنے آپ کو "بڑا پختون" کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے ہر کوئی ملا

بنا پھرتا ہے اور مذہب کے نام پر دوسروں کو انصاف کی تلقین کرتا ہے تبدیلی کے دعویدار کہاں پر ہیں اسلامی نظام لانے کے دعویدار کہاں غائب ہیں کیا انہیں پشاور کے نواحی علاقے میں ہونیوالا یہ ظلم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ۔لعنت ہے اس معاشرے پر ان کے نام نہاد ٹھیکیداروں پر جس میں وردی والے دوسرے وردی والے کو سپورٹ کرتے ہیں ان معصوم بچیوں کا جرم کیا ہے غریب خاندان سے تعلق رکھنا ایسا غریب جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہر کوئی اپنے ذہن میں اپنی بچیوں کو رکھے خدانخواستہ اس معاشرے میں اگر کوئی اس طرح ان کیساتھ ہوتا تو پھر ہر کوئی کیا کرتا کیا یہ معصوم غریب بچیاں اس معاشرے کا حصہ نہیں کیا ان کا درد ہمارا درد نہیں ایک ایسے معاشرے میں جہاں پر ہر وقت نئے قوانین بنتے ہوں آئین کی عملداری سمیت ہر ڈرامے میں .برابری کا درس دیا جاتا ہو لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہوتا کیا ایسے لوگ انسان کہلانے کے لائق ہیں جن کا ہوس انہیں اس بات کی ہوش ہی بھلا دے کہ معصوم پھول تو معصوم ہوتے ہیں -ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر کسی کو اپنا آپ نظر آتا ہے اپنی عزت نظر آتی ہے اور دوسروں کی عزت سے کھیلنا کھیل بن چکا ہو ایسے معاشرے میں رہنا بھی لعنت ہے- دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران یہ وردی والے رکھوالے جو بھی کریں، اس کو نام دیا جاتا ہے، کہ وہ جو بھی کریں ملک کی وسیع تر مفاد کی خاطر کیا جاتا ہے، اب معاشرے کے سامنے سب کچھ ہے، لیکن یہ کمینے شائد یہ انسانیت سوز واقعہ بھی ملک کے وسیع تر مفاد کے خاطر نام دیں، تو شائد ان کا گناہ بھی

معاف ہو جائے، لیکن اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ، قدرت ان کے ساتھ یہی کرینگے کب یہ معلوم نہیں، لیکن ان کے ضمیر تو اتنے گندے ہو چکے ہیں کہ شائد انہیں اپنی عزت بھی برا نہ لگے۔

قبایلیوں کے دل ودماغ میں پکتا ہوالاوا

پشتوزبان میں ایک مثل مشہور ہے "چہ تنگ شی نو پہ جنگ شی" جس کے معنی ہیں کہ اگر کسی کو بہت زیادہ تنگ کیا جاتا ہے تو پھر وہ جھگڑا شروع کردیتا ہے یہ محاورہ ہنگو میں ہونیوالے واقعے کے بعد پیدا شدہ صورتحال کے نتیجے میں راقم کے ذہن میں آیا جس میں آزاد حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے والے علاقے کے غریب اور شریف فرید اللہ خان کی المناک موت کے بعد شہریوں نے احتجاجا گھیراؤ جلاؤ کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے ایک طالبان کمانڈر کے گھرپر دھاوا بول دیا اور اس کے دو بھائی والد اور چچا کو گھر میں زندہ جلا ڈالا۔ اس اقدام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس معاشرے کے شریف شہری اگر غلط اقدام کے خلاف ڈٹ جائیں تو پھر وہ نہ وہ طالبان سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی سیکورٹی فورسز سے کیونکہ ان کے دل و دماغ سے ہر قسم کا خوف نکل جاتا ہے اور پھر بہت سے ایسے کام ہو جاتے ہیں جس کا تصور بھی عام زندگی میں نہیں کیاجاسکتا۔

یہی صورتحال اس وقت باڑہ خیبر ایجنسی کے رہائشی لوگوں کی بھی ہے گذشتہ چار سالوں سے اس علاقے میں سیکورٹی فورسز کا آپریشن جاری ہے لیکن یہ ایسا آپریشن ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا نہ ہی اس علاقے میں صورتحال پرامن بنائی جا سکی ہے لاکھوں کی تعداد میں مختلف قبائل

سے تعلق رکھنے والے لوگ جلوزئی کیمپ سمیت مختلف علاقوں میں خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں خیبر ایجنسی کے مختلف علاقوں میں تعلیمی ادارے بند ہیں کاروباری مراکز ختم ہوچکے ہیں اور یہاں کے لوگ بد سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کی طرف کسی کا خیال نہیں قبائلی علاقے خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے قبائلی لوگ اتنے بدقسمت ہیں کہ ان کی بدحالی اور خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرنے کے باوجود نہ تو حکومت انہیں کچھ دینے کو تیار ہے نہ ہی امدادی ادارے اس طرح مدد کرنے کو تیار ہیں جس طرح باجوڑ ملاکنڈ اور مومند ایجنسی سے تعلق رکھنے والے قبائلیوں کی کی گئی تھی جو جو اپنا گھربار آپریشن کی وجہ سے چھوڑ کر جلوزئی اور دیگر علاقوں میں آئے تھے حالانکہ خیبر ایجنسی بھی اسی پاکستان کا حصہ ہے اور اس کے قبائل بھی پاکستان سے اتنی ہی محبت رکھتے ہیں جتنا کوئی بھی شخصکر سکتا ہے لیکن ان کیساتھ ہونیوالا یہ ناروا سلوک جہاں انہیں اپنے ساتھ زیادتیوں کا احساس دلاتا ہے وہیں پر نئی نسل میں اپنے ساتھ ہونیوالی ناانصافیوں پر نفرت بھی پیدا ہوتی جارہی ہے جو اس وقت تو کسی کو نظر نہیں آرہی لیکن خدانخواستہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو پھر بلوچستان جیسی صورتحال اس علاقے میں بھی پیدا ہوگی اور اسے کنٹرول کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔

قبائلی علاقوں میں حالات کو کنٹرول کرنے والی پولٹیکل انتظامیہ خاموش

تماشائی بنی بیٹھی ہے مال کماؤ پالیسی کی وجہ سے پولٹیکل ایجنٹ اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ تحصیلدار روزانہ لاکھوں روپے حرام کی مد میں کما رہے ہیں پولٹیکل انتظامیہ کے واقف حال ایک ذریعے کے مطابق صرف خیبر ایجنسی کی پولٹیکل انتظامیہ کو روزانہ لاکھوں روپے سرحد پار کرنے والی گاڑیوں سے مل رہے ہیں انتظامیہ وصول ہونیوالی ان رقوم کو کس طرح استعمال کررہی ہے اس کا حساب وہ کسی کو دینے کو تیار نہیں امن وامان کی بحالی انہی کی ذمہ دمہ داری ہے لیکن حال یہ ہے کہ ایک ہفتہ قبل کارخانو چیک پوسٹ سے آگے قبائلی علاقے میں سڑک کنارے نامعلوم مسلح افراد نے خاصہ دار کمانڈر پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوگئے دوسرے روز تحصیلدار نے پولٹیکل انتظامیہ خیبر ایجنسی کے حکم پر کارخانو چیک پوسٹ سے لیکر جمرود تک ایک ہزار کے قریب دکانیں سیل کردیں اور احکامات جاری کردیئے کہ جب تک قبائلی ذمہ داری کے تحت واقعہ میں ملوث افراد کو پولیٹکل انتظامیہ کے حوالے نہیں کیا جاتا اس وقت تک دکانیں بند رہیں گی اور جو ان احکامات کی خلاف ورزی کرے گا تو پانچ لاکھ روپے جرمانہ ہوگا۔ اپنے احکامات کو آسمانی احکامات سمجھنے والی پولٹیکل انتظامیہ کے اس اقدام کے بعد ایک ہزار کے قریب دکانیں گذشتہ ایک ہفتے سے بند پڑی ہیں اور چھوٹے تاجروں سے لیکر بڑے تاجر تک سب متاثر ہورہے ہیں کیونکہ کارخانے ان کے علاقے میں موجود نہیں رہ گیا تجارت کا ایک وسیلہ اسے بھی ڈکٹیٹرشپ کی طرز پر پولٹیکل انتظامیہ خیبر ایجنسی نے بند کردیا اب ان

ایک ہزار دکانوں کے مالکان کیا کریں گے یہ ایسا سوال ہے جو نہ تو پولیٹکل انتظامیہ دینے کو تیار ہے اور نہ ہی وفاق کی جانب سے ان کی محکوم بنائے گئے قبائلی کیا ان دکانداروں کے خاندان سانپ کی نسلیے ہیں کہ مٹی کھا کر زندگی گزاریں گے ان کی ضرورتیں کسی کو نظر نہیں آتیں ۔ اب اگر ان حالات میں یہ لوگ دہشت گردی کی طرف مائل نہیں ہونگے تو پھر وہ کیا کرینگے۔

ویسے اس صورتحال میں مقامی تاجروں کا یہ موقف بھی زبردست ہے کہ آخر کار پولٹیکل انتظامیہ خیبر ایجنسی کس مرض کی دوا ہے امن وامان کے قیام کی ذمہ داری حکومت کا کام ہے یا قبائل کا کیونکہ بقول ان قبائلیوں کے سرکار سے لاکھوں روپے تو یہ لوگ تنخواہوں کی مد میں وصول کرتے ہیں لیکن امن وامان کی بحالی کیلئےیا نہیں علاقائی ذمہ داری کے نام پر رگڑا دیا جاتا ہے۔سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ریاست کا چوتھا اہم ستون قرار دینے والے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندے جن کا تعلق قبائلی علاقے خیبر ایجنسی سے ہے اس صورتحال پر خاموش بیٹھے ہیں کیونکہ کچھ لوگوں کو ماہانہ بھتے پولٹیکل انتظامیہ کی جانب سے ملتے ہیں تو کئی نے پولٹیکل انتظامیہ کیساتھ مل کر خاصہ دار مختلف چیک پوسٹوں پر تعینات کر دیئے ہیں جن سے ان کی ہزاروں کی آمدنی ہو رہی ہے اور وہ حرام کی اس کمائی اور بھتے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے کچھ شریف قسم کے صحافی بھی ہیں لیکن انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ

پولٹیکل انتظامیہ انہیں خبر چلوانے کے بعد کسی کھاتے میں دھر نہ لیں کیونکہ چالیس ایف سی آر کا قانون تو پولٹیکل انتظامیہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے سو اس صورتحال میں وہ کچھ کر نہیں سکتے ہاں اب تبدیلی کا نعرہ لگا کر آنیوالوں سے امید ہی کی جا سکتی ہے کہ کچھ تبدیلی لیکر آئیں کہ پاکستان کا ہر شہری خواہ اس کا تعلق قبائلی علاقے سے ہو یا اسلام آباد سے اگر انہیں تبدیلی محسوس ہوئی تو پھر تو حالات ٹھیک ہونگے ورنہ دوسری صورت میں اگر آج ہنگو میں کرفیو نافذ کرکے امن لانے کی کوشش کی جارہی ہیں اسی طرح پورا ملک کرفیو زدہ ہوگا اور حالات پھر بھی کنٹرول نہیں ہونگے اور پھر نہ کوئی طالبان بچے گا نہ بیوروکریسی نہ ہی لیڈر سب کا ایک ہی حال ہوگا۔

عوام کا خون چوسنے والے ادارے

بجلی کی غیر اعلانیہ اور مسلسل چار چار گھنٹوں کی لوڈشیڈنگ نے شہریوں کو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے لوڈشیڈنگ کے اس جن سے جہاں دیہاتی علاقے متاثر ہیں وہیں پر شہری علاقوں میں لوڈشیڈنگ نے عام لوگوں کے کاروبار زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے دن کو کاروبار کیلئے بجلی نہیں ، گرمی سے متاثر ہونیوالے لوگ رات سکون سے گزارنا چاہتے ہیں لیکن ان اوقات میں بھی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ کے باعث ان کی زندگی سے آرام و سکون بالکل ہی چھن گیا ہے اور شہری چڑچڑے پن کا شکار ہو کر جھگڑوں پر اتر آئے ہیں جس کا مشاہدہ روزمرہ زندگی میں بھی کیا جاسکتا ہے۔صوبہ خیبر پختونخوا کے لوگ اس صورتحال سے سب سے زیادہ متاثر ہیں ایک تو ان کے صوبے میں کم قیمت پر بننے والی ہائیڈل پاور جو کہ دو روپے میں پیدا ہوتی ہے وہ اسی صوبے کے عوام کو دس روپے میں بیچی جارہی ہے دوسری طرف لوڈشیڈنگ نے نہ صرف یہاں کے لوگوں کو تباہ کردیا ہے بلکہ یہاں کی انڈسٹریز بھی گوناگوں مسائل سے دوچار ہے ایسے میں پیسکو والے یہ ڈرامے بھی کرتے ہیں کہ ہم آٹھ روپے میں انہیں فی یونٹ بجلی دے رہے ہیں اور دو روپے سب سڈی یہاں کے شہریوں کو دی جارہی ہے بیوروکریسی اور سیاستدانوں سے یہ کوئی پوچھنے کی ہمت نہیں رکھتا کہ کس کھاتے میں

سستی بجلی جو کہ اس صوبے کی اپنی پیداوار ہے کو مہنگا بیچ کر اس صوبے کے غریب اور تباہ حال عوام کو لوٹا جارہا ہے ۔ بجلی پیدا کرنیوالی کمپنیوں میں غیر ضروری بھرتیوں اور سیاسی بنیادوں پر آنیوالے افسران نے جہاں ان کمپنیوں کے اخراجات میں اضافہ کردیا ہے وہیں پر ان کے انوکھے قوانین بھی عوام کا خون چوسنے کا باعث بن رہے ہیں مختلف پاؤر کمپنیوں میں تعینات چپڑاسی سے لیکر افسران تک مفت بجلی کی سہولت سے مستفید ہو رہے ہیں اور تو اور بعض علاقوں میں پیسکو کے ملازمین اپنے کنکشن سے بجلی کو دیگر لوگوں کو بھی دیکر ان سے پیسے وصول کر رہے ہیں پیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق 3.9 ملین یونٹس مفت میں پیسکو کے ملازمین استعمال کر رہے ہیں جن کی رقم تقریبا بتیس کروڑ روپے بنتی ہے ۔حالانکہ ان پر واپڈا کا قانون لاگو ہی نہیں ہوتا کیونکہ اب تو بجلی پیدا کرنے والی مختلف کمپنیاں کام کر رہی ہیں ۔

کسی زمانے میں واپڈا ہی بجلی کی فراہمی کا ذمہ دار تھا حالات میں بہتری لانے کے نام پر مختلف کمپنیاں بنائی گئیں جن میں سرکاری بنیادوں پر بندے لائے گئے اور پھر یہ کمپنیاں بھی صورتحال کو مزید تباہ حالی کی طرف لے جانے کا باعث بن گئیں نیشنل گرڈ سٹیشن کے نام پر مخصوص لوگوں کو لانے کیلئے سسٹم بنایا گیا جن کا کام وی آئی پی علاقوں میں بجلی کی لوڈشیڈنگ نہ کرنا ہی رہ گیا ہے حالانکہ اگر بجلی خیبر پختونخوا میں پیدا ہوتی ہے اور پھر اسے اسلام

آباد نیشنل گرڈ سٹیشن منتقل کیا جاتا ہے تو بجلی کتنی ضائع ہوتی ہے اس کا حساب کسی کے پاس نہیں ان اداروں کا سسٹم فرسودہ ہے اور لائن لاسز کے نام پر وصولیاں ان کا مقصد رہ گیا ہے لائن لاسز کے نام پر ان لوگوں کی اپنی نااہلی کی وجہ سے بجلی غائب ہونے کا سلسلہ جاری ہے مختلف اقسام کے ٹیکس الگ ہیں اسی کے ساتھ ساتھ ڈویلپمنٹ کے نام پر عوام سے بھتہ خوری بھی کی جارہی ہے مختلف منصوبوں کیلئے عام شہریوں کیلئے اربوں روپے پتہ نہیں کب سے بلوں میں وصول کئے جارہے ہیں لیکن نہ توان منصوبوں پر کام ہوتا ہوا نظر آرہاہے اور نہ ہی بلوں میں وصول ہونیوالے اس بھتے کے بارے میں بتایا جارہاہے کہ آخرکار یہ رقم کہاں جارہی ہے اس کا حساب کوئی دینا بھی نہیں چاہتا اور نہ ہی کوئی پوچھتا ہے۔

خیبر پختونخوا میں پیسکو کا حال یہ ہے کہ اس ادارے پر سیاسی بنیادوں پر لوگ بڑی حیثیتوں میں لائے جارہے ہیں مزے کی بات کہ اس کھیل میں اسلام کے نام پر کمائی کرنے والے سیاستدان بھی شامل ہیں جن کے لاڈلے انہیں لوٹنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں عدالت عالیہ پشاور میں چیف ایگزیکٹوپیسکو کا یہ بیان بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ ان کے اپنے بندے بجلی چوری میں ملوث ہیں لیکن ان کے خلاف کارروائی کیلئے کوئی اقدام اٹھانے کو وہ تیار نہیں شہر کے مختلف الیکٹرک سٹورز پر اسی ادارے کے اہلکار شام کو دکھائی دیتے ہیں جو شہریوں کے میٹروں

کو ٹمپرڈ کرکے دیتے ہیں اور اس مد میں بھی کمائی کر رہے ہیں لیکن انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں کیونکہ یہ لوگ "حجرے میں رات گزارنے "والی پشتو مثل کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں نہ انہیں عوام کا خیال ہے نہ احتساب کا اور نہ ہی اللہ کے سامنے پیش ہونے کا اسی ادارے میں گذشتہ تیرہ سالوں سے ایک ہی سیٹ پر ایسے ترجمان بیٹھے ہیں جن کی موٹاپے اور صحت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کتنا کام کرتے ہیں صوبے میں پیدا ہونیوالی بجلی کا ڈیٹا تک ان کے پاس موجود نہیں بس آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اٹھائیس سو میگاواٹ ہماری ضرورت ہے اور چودہ سو میگاواٹ ہمیں مل رہی ہے یہ وہ جملہ ہے جو گذشتہ پانچ سالوں سے راقم بھی سن ہی رہا ہے حالانکہ اسی صوبے کے ایک صنعتکار کے مطابق تیرہ ہزار میگاواٹ بجلی اس صوبے میں پیدا کی جارہی ہے اور اس میں بھی صوبے کے عوام کا یہ حال ہے کہ یہاں کی بجلی سے پورے ملک کو روشن کیا جارہا ہے لیکن یہاں کے لوگوں کے گھروں میں اندھیرے ہیں۔ عدالت عالیہ پشاور میں ایکصنعت کار کی جانب سے دیئے جانیوالے بیان کے مطابق اس صوبے کے سرمایہ کار بجلی کی پروڈکشن کے منصوبے شروع کرنا چاہتے ہیں اور اس میں سرمایہ کاری کرنے کو بھی تیار ہیں لیکن یہاں پر تعینات اعلی افسران نے سیاسی بنیادوں پر مختلف سائٹس اپنے منظور نظر افراد کو دیدی ہیں جس کی وجہ سے سرمایہ کار نہیں آنا چاہتے ۔

سب سے افسوسناک امر تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے بجلی کا نظام بہتر کرنے اور مفت بجلی فراہم کرنے کے دعوے کئے تھے انہی کے دور میں ملاکنڈ تھری پراجیکٹ جسے ان سے قبل کی حکومت نے شروع کیا تھا نے سیاسی بنیادوں پر مرکز کو دیدیا اور اسے نیشنل گرڈ سٹیشن کے حوالے کردیا گیا ہے حالانکہ اپنی صوبے کی ضرورت تو پوری نہیں ہوتی اگر اس سے پیدا ہونیوالے بجلی اس صوبے میں استعمال ہوتی تو بھی صورتحال بہتر ہوتی لیکن پختونوں کی علمبرداری کا دعوی کرنے والوں کی عیاشیوں نے ہی صوبے کا بیڑہ غرق کردیا۔پہلے تو یہ سننے کو ملتا تھا کہ بجلی کی پیداوار وفاق کے ذمہ ہے اس لئے صوبہ اپنی حیثیت میں کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں اب تبدیلی کے دعویداروں کیلئے بھی چیلنج ہے کہ اٹھارھویں ترمیم نے وہ راستہ بھی کھول دیا جس سے اب انہیں یہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ہم کچھ کرنہیں سکتے خیر دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔

بس اب بہت ہوگیا

پشتو زبان کی ایک مثل ہے کہ اگر کوئی آپ کے گھر آتا ہے تو پہلے دن وہ مہمان ہوتا ہے اور اس کی مہمانداری صرف تین دن ہوتی ہیں تاہم اگر وہ اس کا قیام چوتھے روز میں شامل ہو جائے تو پھر وہ مہمان نہیں رہتا بلکہ وہ کور بہ یعنی میزبان بن جاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ میزبانوں والا سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ مثل آج پشاور یونیورسٹی میں بیس جون پر افغان مہاجرین کی عالمی دن کی مناسبت سے منعقد ہونیوالے پروگرام میں شرکت کے دوران یاد آئی۔ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے ان افغان مہاجرین کے نام پر کیا کھا رہے ہیں اور کتنا کھا رہے ہیں اس کا حساب تو دینے والا ہی جانتا ہے یا اللہ ہی جانتا ہے لیکن پاکستان اور خصوصا خیبر پختونخواہ کے دھماکوں ' بیروزگاری ' مہنگائی سے ابتر ہونیوالے کی کمین یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کب تک افغان بھائی بھائی کے چکر میں ہمارے منہ کا نوالہ انہیں دینے کا سلسلہ جاری رکھا جائیگا اور کب تک یہاں کے مقامی پختون خوار ہوتے رہیں گے ۔1979 ء میں افغانستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے افغان مہاجرین میں اس وقت 17 ملین رجسٹرڈ اور 10 ملین غیر رجسٹرڈ پورے پاکستان میں رہائش پذیر ہیں جن میں اکثریت نے گھر خرید لئے ہیں اور باقاعدہ تجارت بھی شروع کر دی ہیں بلکہ بعض

علاقوں میں انہوں نے اپنے آپ کو قبائل ظاہر کرکے قومی کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ بھی بنا دیئے ہیں لیکن ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں-

80 فیصد سے زائد افغان مہاجرین اس وقت خیبر پختونخواہ میں رہائش پذیر ہیں کچھ لوگ اسے ضیاء الحق کا کیا دھرا کہتے ہیں غلطی جس کی بھی ہو اس سزا بہر حال پختون قوم اور ان کے معصوم بچے بھگت رہے ہیں 80 کی دہائی میں انہوں نے کلاشنکوف کلچر' ہیروئن اور چرس کلچر بھی متعارف کروادیا- یہاں کے پختون ویسے تو اتنے معصوم بھی نہیں لیکن ان افغان مہاجرین کی آمد کی وجہ سے یہاں اخلاقی بداعمالی کی انتہا دیکھئے کہ اب بھی پشاور کے مختلف علاقوں میں قحبہ خانے انہی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ صوبہ بھر خصوصا پشاور میں ہونیوالے جرائم میں 75 فیصد افغان مہاجرین ہی ملوث ہیں اور اس بارے میں عدالت عالیہ پشاور کے چیف جسٹس دوست محمد خان بھی بارہا کہہ چکے ہیں لیکن جن کے ہاتھوں میں کچھ کرنے کی طاقت ہے ہے انہی افغان مہاجرین کی بدولت ڈالر' بوتل اور زن کی چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور کوئی ان سے غیر قانونی کاروبار کے بارے میں پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا کہ بھائی کس کھاتے میں یہاں پر بس گئے ہو' اب یہاں پر کیا رہ گیا ہے جاکر اپنے ملک کو آباد کرو لیکن نہ تو یہاں پر لاکھوں کے کاروبار کرنے والے افغان مہاجرین واپس جانا چاہتے ہیں حالانکہ اس بدحال اور ٹوٹے پھوٹے پاکستان سے تو

افغانستان کی معاشی حالت بہت بہتر ہے اور تو اور موجودہ دور میں لوڈشیڈنگ بھی نہیں ہوتی لیکن جس طرح انہیں پیسے کا مزہ پڑ گیا ہے اسی طرح ان کے نام پر کام کرنے والے غیر سرکاری و سماجی ادارے بھی فنڈز کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اور انکی خواہش ہے کہ افغان مہاجرین یہاں پر رہیں تاکہ ان افغان مہاجرین کے نام پر یورپ ' امریکہ اور دیگر ممالک سے خیرات ' زکواۃ آنے کا سلسلہ جاری رہے اور ان کی سیونگ اکاؤنٹس بھی چلتی رہی اور برائے نام کام بھی چلتا رہے حرام کی اس کمائی میں ایلیٹ کلاس کے بیگمات تو ایک طرف اب ہماری بیوروکریسی بھی ان کی مددگار ہے۔ کیونکہ ان کیلئے سرکار کی طرف سے بننے والی اداروں میں مخصوص سیاستدانوں کے رشتہ دار بھی بھرتی ہوتے ہیں اور انکی پیداگیری کا سلسلہ بھی جاری ہے سو انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ افغان مہاجرین کی بوجھ تلے مقامی افراد کتنے دبے ہوئے ہیں اور کتنا خوار ہو رہے ہیں بس اتنا ان کیلئے ضروری ہے کہ ان کے نام پر آنیوالے فنڈز میں انہیں ان کا حصہ مل رہا ہے -

پشاور میں کئے جانیوالے ایک سروے رپورٹ کے مطابق صرف خیبر پختونخواہ کے صوبائی دارالحکومت میں پندرہ ہزار سے زائد افغان مہاجرین ایسے ہیں جن کا اپنا بڑا کاروبار ہے ان میں قالین سازی ' بیکری ' جنرل سٹور ' چھابڑی فروش ' سمیت امپورٹ ایکسپورٹ اور طب کے شعبے سے وابستگی بھی ہے غیر قانونی طور پر مقیم یہ افغان مہاجرین نہ تو کوئی سیلز ٹیکس ادا کرتے ہیں نہ ہی انکم ٹیکس ' لیکن مراعات عام پاکستانی شہریوں سے

بھی زیادہ لے رہے ہیں کسی کو اندازہ نہ ہو تو افغان مہاجرین کے بڑے علاقوں بشمول حیات آباد' فقیر آباد سمیت دیگر پوش علاقوں میں ان کی رہائش گاہوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس نوعیت کے یہ افغان مہاجرین ہیں ان کی حالت سے تو لگتا ہے کہ یہاں کے مقامی لوگ مہاجر ہیں اور افغانستان سے یہاں آکر کاروبار پر قابض ہونیوالے مقامی ہیں۔یعنی حالات زندگی نے مقامیوں کو مہاجر بنا کر رکھ دیا ہے -

ایک ایسے وقت میں جب یہاں کے مقامی پختون مسائل کی جنگل میں پھنسے ہوئے ہیں" اور انہیں نکالنے والا کوئی نہیں' لر اور بر افغان کے نعرے لگانے والے تو اپنا پاپی پیٹ اور بہت کچھ بھروا کر چلے گئے ہیں اب تبدیلی والے آگئے ہیں لیکن تبدیلی کتنی آئی ہے اس کا اندازہ تو آنیوالے وقت میں پتہ چلے گا لیکن لر اور بر افغان کے نعرے لگانے والے لی ڈروں کو نہ تو افغانوں سے کوئی مقصد تھا اور نہی کوئی مطلب ہے ہاں انہیں اس کاروبار سے غرض ہے جو ان کے نام پر یہاں سے آٹے' چینی' گھی اور دیگر اشیائے ضروریہ کی چیزیں سمگل کرکے اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اس کا صرف ایک طورخم بارڈر پر ملنے والی رقم پینتالیس لاکھ روپے صرف ایک روز کی بیان کی جاتی ہیں باقی سرحدوں پر جانیوالا مال اور اس کی کمائی الگ ہے یعنی مزے کرے یہاں کے لی ڈر' بیوروکریسی اور کی کمینوں کے منہ کا نوالہ کاروبار اور سمگلنگ کی آڑ میں

افغانستان پہنچ جائے یہ کہاں کا انصاف اور بھائی چارہ ہے ' اس کی آسان مثال کچھ یوں ہے کہ ایک شخص کے خاندان کے لوگ بھوکے ہوں اور اسی خاندان سے تعلق رکھنے والا اس کا بھائی اس کے حصے کا رزق باہر بیچ کر کمائی کرتا ہو ' ایسے میں اس بھوکے خاندان کے دل پر کیا گزرتی ہیں یہ کوئی اپنے خاندان کو ذہن میں رکھ کر سوچے تو شائد ہمیں پاکستان اور خصوصا صوبہ خیبر پختونخواہ کی عوام کی بدحالی کا اندازہ ہو جائے-

اقوام متحدہ کے نمائندے موجودہ دور میں اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ 1.6 ملین افغان مہاجرین کو پاکستان واپس زبردستی نہیں بھجوا سکتا اور تیس جون تک نئے لائحہ عمل کا اعلان کیا جانا چاہئیے لیکن اقوام متحدہ کی بڑی گاڑیوں ' سیکورٹی والی گاڑیوں میں عیاشی کرنے والے ایلیٹ کلاس کے لوگوں سے یہاں کے مقامی یہ سوال کرنا چاہ رہے ہیں کہ آخر ہمیں کس چیز کی سزا دی جارہی ہیں آخر کب تک ہم بھائی چارے کے چکر میں اپنے بچوں کو بھوکا مارتے رہینگے اقوام متحدہ کے فنڈز پر عیاشی کرنے والوں آپ کو ڈالرز میں بہت کچھ مل رہا ہے اور ان کے نام پر آپ لوگ عیاشیوں میں مصروف ہوں لیکن یہاں کے لوگ امن وامان کی ابتر صورتحال سمیت تجارت نہ ہونے ' سرمایہ ہونے اور بیروزگاری جیسے مسائل سے دوچار ہیں خدا کیلئے ان افغان مہاجرین سے ہماری جان چھڑاؤ نہیں تو یہ افغان مہاجرین ہمیں مہاجر بنا دینگے-

تبدیلی آوے ہی آوے

صحافیوں پر خیبر ٹیچنگ ہسپتال پشاور میں ڈاکٹروں کی تشدد انہیں حبس بے جا میں رکھنے کے دوران اس واقعے کی مذمت کرنے کے بجائے اسے یکطرفہ قرار دینے کے صوبائی حکومت کے ترجمان کے بیان نے بزرگوں سے سننے والی اس مثل کی تصدیق کردی ہے جس کے پشتو زبان میں معنی تو بہت ہیں لیکن آسان ترجمہ یہی ہے کہ بھوکے ننگے کو اگر مال و دولت یا کوئی عہدہ مقام مل جائے تو پھر اس کی دیدوں کا پانی مر جاتا ہے اور وہ بھوکا ہی رہتا ہے کیونکہ اس کی حرص مکمل بڑھتی رہتی ہے اور اگر کوئی مالدار آدمی وقت کے تھپیڑوں کی وجہ سے بھوکا بھی بن جائے تو اس میں انا خودداری اور شرم ہوتی ہے عقلمند کیلئے اشارہ ہی کافی ہے۔ صحافیوں پر تشدد کے واقعے کے بعد صوبائی حکومت نے کوئی ایکشن تو نہیں لیا البتہ بہت سارے سیاسی پارٹیوں کے رہنمائوں نے کھلے اور دبے لہجے میں کہا کہ تبدیلی کے دعویداروں کو انتخابات میں ایک سیٹ ملنا بھی مشکل تھا لیکن یہ میڈیا کی وجہ سے عوام پر مسلط ہوئے اور جس بیٹ کی سپورٹ میڈیا کرتی رہی ہے اگر اسی بیٹ سے اب صحافیوں کی پٹائی بھی ہو جائے تو صحافیوں کو آواز نہیں نکالنا چاہئیے۔ ان کی بات میں حقیقت بھی ہے لیکن اشتہار اور پیسے کیساتھ ڈنڈا ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے بہت سارے تیس مار خان آنکھیں بند کرلیتے ہیں اب اس میں غریب

صحافی کرے تو کیا کرے یہ ٹھیک ہے کہ پاشا کے زیر سایہ پلنے والی پارٹی نے خیبر پختونخوار میں حکومت تو حاصل کرلی ہے اوبقول ان کی تبدیلی آوے ہی آوے لیکن یہ تبدیلی جو ان لوگوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شروع کی ہے کچھ اس طرح ہے کہ سابقہ دور میں اگر صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا تو صرف ایک روڈ سیکورٹی کے نام پر بند کیا جاتا اور صوبے کے کی کمینوں جو کہ مسافر گاڑیوں رکشوں یا موٹر سائیکلوں پر جاتے تو انہیں کچھ سہولت ہوتی لیکن تبدیلی کے دعویداروں نے اب تو دو روڈ بند کرنا شروع کردیئے ہیں کیونکہ انہیں بھی موت سے ڈر لگتا ہے اور یہ بقول ایک وزیر کے کہ سیکورٹی رسک ہے۔

یہی موت کا ڈر ہی ہے کہ اب تبدیلی کے دعویدار اپنے دفاتر سے نکلنے کو بھی تیار ہی نہیں پہلے اگر خیبر پختونخوار میں کہیں پر دھماکہ ہوتا تو کم از کم شرم رکھنے والے میاں افتخار اور مرحوم بشیر احمد بلور جوانمردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھماکے والی جگہ پر پہنچ جاتے یا پھر ہسپتال جانے کی فوری کوشش ہوتی زخمیوں کی عیادت کرے ڈاکٹروں کو مریضوں کو سہولیات دینے کے احکامات جاری کرتے اور واقعے کی مذمت بھی کرتے کبھی کبھار انکی کوریج کرتے ہوئے صحافیوں کو ڈر بھی لگا رہتا کہ خدانخواستہ ان کی وجہ سے وہ دھماکے یا خودکش حملے کی زد میں نہ آجائے کیونکہ انہیں متعدد مرتبہ یہ کہا گیا کہ ہسپتال یا دھماکے والی جگہ پر جانا سیکورٹی رسک ہے لیکن ان دونوں کی آمد سے کم از

کم دھماکے میں متاثر ہونے والوں کو دلی سکون تو مل جاتا کہ کوئی ان کا پوچھنے تو آیا ہے ایک بات جو کہ پختون معاشرے میں خاص طور پر یاد رکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی کسی کے خوشی میں شامل نہیں ہوتا تو اتنا برا نہیں سمجھا جاتا لیکن اگر کوئی کسی کے غم میں شریک نہ ہو تو اسے انتہائی درجے کا برا سمجھا جاتا ہے اپنی زمین پر اپنے اختیار والے بھی اتنے اچھے نہیں تھے لیکن ان میں شرم نام کی کوئی چیز تھی اب ان کے جانے کے بعد تبدیلی اتنی آئی ہے کہ اب اگر دھماکہ ہوتا ہے تو پہلے اسمبلی میں یہ بیان سننے کو ملتا ہے کہ کہ دھماکہ ہوا تو کونسی قیامت آ گئی یعنی جن کے پیارے دھماکے میں متاثر ہو جائے ان کیلئے تو قیامت ہے لیکن ان ممبران کیلئے قیامت اس لئے نہیں کہ ان کے اپنے تو کوئی نشانہ نہیں بنا - یہ تبدیلی کے دعویداروں کے اوقات ہے اب تو نیا سلسلہ شروع ہوگیا کہ دھماک کے فوری بعد صوبائی حکومت کے کسی وزیر کے ہسپتال آنے اور مریضوں کی عیادت کے بجائے خاتون ہسپتال آتی ہے اور پھر صحافیوں کو برملا یہ کہتی ہے کہ انہیں صوبائی وزیر نے ہدایت کردی ہے کہ جو کہ شائد اسلام آباد میں کسی کام کیلئے گئے ہیں اسی وجہ سے وہ زخمیوں کی عیادت کیلئے آئی ہے جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا صرف ایک وزیر ہے کوئی اور نہیں جو مریضوں کی عیادت کیلئے آئے تو پھر اس خاتون کا جواب آتا ہے کہ صوبائی حکومت کے لوگوں کے اور بھی کام ہیں اور چونکہ یہ حادثہ ہوا ہے اس لئے وہ نہیں آسکتے یعنی صوبائی حکومت کے ترجمان کے بھی ترجمان ہیں اور یہ سب

- کچھ آن ریکارڈ ہے

ہمیں تو تبدیلی کے خواب دکھانے والوں سے اتنی امید نہیں تھی لیکن پھر بھی مزے کی بات کہ اتنے دھماکوں کے بعد بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ ان واقعات کی کم از کم مذمت تو کرے ڈرون کیلئے وزیرستان تک ڈرامہ کرنے والے اب اسے وفاق کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں اور اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے رہے ہیں یعنی ان کے بس میں کچھ بھی نہیں-حال تو یہ ہے کہ اتنی جوانمردی تبدیلی کے دعویداروں میں نہیں کہ پولیس اہلکاروں کی میتوں پر جنازوں میں شرکت کیلئے کوئی جائے ہمیں پولیس کی کارکردگی ان کے عوام دشمن رویے پر لاکھ تحفظات ہیں لیکن اگر کوئی پولیس اہلکار دوران ڈیوٹی فائرنگ کانشانہ بن کر جاں بحق ہو جائے تو کیا ان کا مورال بنانے کیلئے ان پولیس اہلکاروں کے پیچھے کھڑے ہونا حکومتی عہدیداروں کی ذمہ داری نہیں کم از کم اس معاملے میں سابقہ حکومت میں شرم وحیا رکھنے والے کچھ تو لوگ موجود تھے پہلے بھی اتنے شریف نہیں تھے لیکن بقول ہمارے ایک ساتھی کے کہ ان لوگوں کے دیدوں کا پانی ختم نہیں ہوا تھا جبکہ نئے آنیوالے تبدیلی تو پتہ نہیں کب لائے -ہاں یہ تبدیلی یہ اپنے ساتھ لیکر آئے ہیں کہ اٹھارھویں ترمیم کے بعد صوبے میں صوبائی کابینہ پندرہ وزراء پر مشتمل ہونی چاہیئے تاہم تبدیلی والے اتنی تبدیلی لیکر آگئے ہیں کہ اپنے بندوں کو خوش کرنے کیلئے دس اضافی مشیر بھی

بھرتی کردیئے گئے ہیں جن کا خرچہ عوام سے نکالا جائے گا یعنی صوبے کے کی مکین اپنے بچوں کیلئے کچھ کمائے یا نہ کمائے تبدیلی کے دعویداروں کیلئے اتنا کچھ ٹیکس کی مد میں دیں کہ مشیر بھی وزراء کی طرح گاڑیوں میں پھریں آئین کی رٹ لگانے والے خود ہی آئین کا مذاق اڑائیں تو پھر کیا رہ جاتا ہے لیکن اب ہم کریں تو کیا کرے کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے دفتر کے چپڑاسی کو اس بات پر ذلیل کرے کہ دفتر میں آنیوالے ہر شخص کیلئے چائے لیکر نہ آئے اور اگر چپڑاسی نے دوبارہ ایسا کیا تو اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹے جائینگے اگر ایسے لوگ وزارت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو پھر ایسی ہی تبدیلی آسکتی ہے جو آج کل ہم خیبر پختونخوار میں دیکھ رہے ہیں ہم یہاں پر خیبر پختونخوار کے عوام سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہی کہہ سکتے ہیں کہ صبر کرو ابھی تو آغاز ہے تبدیلی آوے ہی آوے

-

کوئی ہے مسیحائی کی آڑ میں ظلم کرنے والوں کو روکنے والا

ماں بننا کتنا تکلیف دہ عمل ہے لیکن یہ ماں کی محبت کی معراج ہے کہ اللہ تعالی نے اس کے پاؤں کے نیچے جنت رکھ دی اور پھر ماں کی محبت کو مثال بنا کر اللہ تعالی نے فرمایا کہ وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے لیکن اگر اسی ماں کو فطری تکلیف ہو اور اپنے آپ کو مسیحا کہلوانے والے بے حس افراد اسے دھکے دے کر ہسپتال سے نکال دیں، پھر بے سر و سامانی کی حالت میں زچہ خاتون پر فالج کا حملہ ہو جائے اور سب سے بڑا ستم یہ کہ اس کے جڑواں بچے راستے یں ہی پیدا ہو کر مر جائیں تو اس ماں کی حالت کیا ہو گی اس کا اندازہ تحصیل تنگی کی رہائشی بائیس سالہ مریم بی بی جیسی خاتون کو ہی ہو سکتا ہے۔ مریم بی بی کو اس کے والد 10 جولائی کو تنگی کے علاقے سے رات تین بجے بیماری کی حالت میں حیات آباد میڈیکل کمپلیکس میں علاج کیلئے لائے لیکن چھ بجے صبح تک نرسوں نے اسے ٹالے رکھا بعد ازاں مریضہ کی حالت غیر ہونے پر خاتون ڈاکٹر نہ ہونے کا بہانہ بنا کر اسے ہسپتال سے باہر نکال دیا گیا۔ اسکے خاندان والے اسے حیات شیرپاؤ ٹیچنگ ہسپتال لا رہے تھے کہ راستے میں گاڑی میں ہی جڑواں بچوں کی پیدائش ہو گئی جسے بعد ازاں حیات شیرپاؤ ہسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں رکھا گیا تاہم بروقت علاج نہ.

ہونے کے باعث دونوں بچے انتقال کر گئے۔ مریضہ اس وقت اپنے گاؤں میں بیمار پڑی ہے اوراس کے بوڑھے والد انصاف کے حصول کیلئے مختلف دفاتر کے چکر لگا رہے ہیں مریضہ کے والد محمود الدین نے واقعے کے بارے میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ حیات آباد میڈیکل کمپلیکس کو باقاعدہ درخواست بھی لکھ کر دی تاہم میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اس واقعے کو دبانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور مریضہ کے والد سے صلح صفائی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ ایک عام سی بات ہے روزانہ سینکڑوں بچے مرتے ہیں ایسے میں اگر دو چار ایسے واقعات ہوں تو کسی کو فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ ایک مخصوص طبقے کا پاکستان ہے جن کے ہاتھ میں پیسہ اور ڈنڈا دونوں ہیں اور یہ پاکستان انہی جیسے لوگوں کیلئے بنایا گیا ہے۔ تبدیلی کے دعویدار کہاں ہیں جنہوں نے خیبر پختونخوا میں شہد اور دودھ کی نہریں بہانے کے دعوے کئے تھے اس صوبے کے کمی کمین دودھ اور شہد کی نہروں کے شوقین نہیں لیکن یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ دوسروں کو برا کہنے والے اور تبدیلی کے دعویدار کیا تبدیلی لیکر آئے ہیں-

تبدیلی کے دعوئوں کے بارے میں یہی سوال اس وقت راقم کے سامنے موجود محمود الدین کر رہا ہے بقول اس کے وہ گائوں سے علاج کی خاطر اپنی بیٹی کو لے کر آیا تھا اور اسے امید تھی کہ اب تبدیلی والے آئے ہیں ہسپتال کی حالت بہتر ہو گی لیکن بقول محمود الدین کے رات تین بجے سے چھ بجے صبح تک حیات آباد میڈیکل

کمپلیکس میں جس عذاب سے میں گزرا ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں اور پھر اسی ہسپتال کی ظالم نرسوں نے یہ کہہ کر ہسپتال سے نکال دیا کہ رات کے وقت ڈاکٹر نہیں ہوتی اس لئے اپنی مریضہ بیٹی کو یہاں سے لیکر چلے جائو اور پھر حیات شیرپائو ہسپتال لاتے ہوئے جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی لیکن وہ بھی فوت ہوگئے اب اس واقعے کی تحقیقات کیلئے میں نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو درخواست لکھ کر دیدی ہے لیکن اس پر عملدرآمد نہیں ہورہااور مجھے کہا جارہاہے کہ جو ہوگیا ہے اسے بھول جائو بقول مریضہ کے والد محمود الدین کے میں اپنی تکلیف تو بھول جائوں لیکن اپنی بیٹی کا دکھ کیسے بھول جائوں۔ اب جب بھی اس کے سامنے جاتا ہوں وہ اپنے بچوں کا مجھ سے پوچھتی ہے اور یوں شرمندہ ہو کر واپس آجاتا ہوں میری خواہش ہے کہ جو میری بیٹی کیساتھ ہوا وہ کسی اور کیساتھ نہ ہو اسی لئے میں اپنی شکایت میڈیا کے سامنے لا رہا ہوں یہ وہ حالات ہیں جو ہسپتال میں خوار ہونے والے مریضہ کے والد نے راقم کو بتائے۔ صوبے کے سرکاری ہسپتالوں کی حالت زار کا اندازہ راقم کو گذشتہ دنوں اسسٹنٹ کمشنر پشاور کیساتھ کئے گئے دورے کے دوران ہوا۔ پتہ چلا کہ شہر میں واقع ایک سرکاری ہسپتال کے انچارج کے رشتہ داروں نے میڈیسن کی دکان ہسپتال کے سامنے کھول رکھی ہے اور صرف اسی شخص کو فائدہ پہنچانے اور مخصوص دکانداروں سے خریداری کا موقع دینے کیلئے سرکاری ہسپتال کا گیٹ بند کروادیا گیا حالانکہ گیٹ کی بندش کے باعث وارڈ میں آنیوالے سینکڑوں مریض خوار ہورہے ہیں لیکن چونکہ

روزانہ کی بنیاد پر ہسپتال کے عملے کو حرام کا" شوٹرا" مل رہا ہے اسی لئے انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور مریضوں کیساتھ ساتھ ان کے لواحقین بھی خوار ہو رہے ہیں لیکن یہ کسی کو نظر ہی نہیں آتا۔

تبدیلی کے نام پر آنیوالوں نے رمضان میں اپنے کو بخشوانے کیلئے 9 کروڑ 40 لاکھ روپے جو اس غریب قوم کا مال تھا کو ہسپتال میں مریضوں کی افطاری کے نام پر لٹانے کا سلسلہ شروع کردیا ہے مزے کی بات تو ہے کہ ابتداء میں مریضوں کو جو کھانا دیا گیا وہ الگ قسم کا تھا کیونکہ ان دنوں سرکاری افسران نے ہسپتال کا وزٹ کرنا تھا اور اب جو افطاری کے نام پر مریضوں کو دیا جارہا ہے وہ الگ قسم کا ہے سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ہسپتالوں میں مریض تو بہت ہی کم فائدہ اٹھارہے ہیں البتہ ہسپتالوں میں تعینات طبی عملے سمیت نچلے طبقے کے کلاس فور ملازمین کی بھی چاندی ہو گئی ہے سب سے حیران کن بات کہ تبدیلی کے دعویداروں نے اسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے رہنماء کے رشتہ دار کو ہسپتالوں میں مریضوں کو افطاری کے نام پر دیئے جانیوالے کھانے کا ٹھیکہ دیا ہے جس میں بہت سارے لوگ فیض یاب ہوگئے ہیں اب تبدیلی والے یہ ڈرامہ کرینگے کہ ہم نے ہسپتالوں میں مریضوں کو افطاری دی لیکن کوئی یہ تو پوچھے کہ ٹھیکہ کس کو دیا کس طرح کی افطاری دی جارہی ہے کن بنیادوں پر دی جارہی ہے لیکن پوچھنے والا تبدیلی کے دعویداروں سے کون ہوگا۔افطاری کے بجائے اگر یہی رقم

ہسپتالوں کی حالت زار بہتر کرانے پر استعمال کی جاتی اور مسیحائوں کے نام پر لوگوں کو
قصائیوں کی طرح ذبح کرنے والے ڈاکٹروں کے منہ بند کئے جاتے تو کم از کم حیات آباد
میڈیکل کمپلیکس میں ہونیوالے واقعات تو رونما نہ ہوتے لیکن اے کاش تبدیلی والے!

تبدیلی والی سرکار اور سیلاب زدگان کیساتھ کے ڈرامے

اسے بے حسی کہیے بے غیرتی لاپرواہی حکمرانوں کا طریق یا پھر کرسی کا نشہ کہ جو بھی اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھ گیا اس کی اوقات حتی کہ سوچنے کا انداز ہی ہی بدل جاتا ہے اور زمین پر چلنے والے انہیں رینگنے والے کیڑے نظر آتے ہیں اور پھر ان کی ترجیحات بھی بدل جاتی ہیں اقتدار کے کرسی پر آنے کے بعد ہر ایک اپنے آپ کو " قلقلا خان " سمجھنا شروع کردیتا ہے یہ الگ بات کہ اقتدار میں آنے سے قبل ان جیسوں کی اوقات اتنی ہوتی ہے کہ بقول پشتو مثل کہ " کوئی ان پر پرائے لنگڑے گدھے کو تھانے لے جانا بھی پسند نہیں کرتا " کیونکہ یہ ناقابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن کرسی ملنے کے بعد ان کی اوقات بھی تبدیل ہوجاتی ہیں۔ گزشتہ روز پشاور کے سول سیکرٹریٹ میں پنجاب کے وزیراعظم کی ہدایت پر پختونخوار میں غریبوں کا حال دکھانے کی حد تک دیکھنے کیلئے آنیوالے ایک وفاقی وزیر کی پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جن میں صحافی تو بہت کم تھے البتہ اپنے آپ کو بیوروکریٹ قرار دینے والے اور اس ملک کے غریب عوام کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے زیادہ بیٹھے تھے پریس کانفرنس کے دوران تبدیلی والی سرکار نے جی حضوری کرتے ہوئے پنجاب کے وزیراعظم کے نمائندہ وفاقی وزیر کو بتایا کہ ہم نے سیلاب میں تباہ ہونیوالے اس صوبے کے کمی کمینوں کو عیاشیاں کروادی ہیں

اس سے قبل اسی وزیر نے بڈھنی پل کا دورہ بھی کروایا گیا جہاں پر انہیں سیلابی ریلے کے بارے میں بتایا گیا تاہم یہ نہیں بتایا گیا کہ اس نالے کی صفائی پر سابقہ حکمرانوں یعنی خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے والے نے کروڑوں روپے لگائے لیکن صفائی نہیں کی گئی ہر ایک سابقہ کو برا بھلا کہتا ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتا رہا کہ آج بھی اسی روڈ کنارے ڈنڈا اور بیلٹ والی سرکار کے ایک بڑے افسر نے غیر قانونی قبضہ جمایا ہوا ہے اور اس پر موجودہ حکمران بھی خاموش ہیں -

اجلاس میں کمشنر بہادر نے صحافیوں کو بتایا کہ سیلاب سے متاثر ہونیوالے لوگوں کو good well کے طور پر دی گئی افطاری اور سحری بھی دی گئی لیکن یہ بھی بقول انکے ورنہ یہ ہمارا کام نہیں تھا اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہم ان کی مدد کر سکتے تھے -کمشنر بہادر شائد سمجھ رہے ہیں کہ انگریزوں کا شاہی دور ہے اور جو وہ کہیں گے وہی ہوگا حالانکہ انہیں یاددہانی کرانے کی ضرورت ہے کہ بھائی جس کرسی پر تم اتنے اتراتے ہوں اور جو مال تم خود اور اپنے بچوں کو کھلاتے ہو انہیں سیلاب زدگان کے خون پسینے کی کمائی ہے جسے بڑی گاڑیوں ایئر کنڈیشنر دفاتر میں بیٹھے بیوروکریٹ قانون کے ٹیکوں سے عوام سے نکال کر وصول کرتے ہیں اور اسی رقم سے ان جیسے بیوروکریٹوں کی عیاشیاں چلتی ہیں -اسی اجلاس میں بیٹھے ایک اور صاحب راقم کے اس سوال پر

اپنی کرسی میں تلملا گئے تھے کہ ڈیڑھ سو خاندان جو کہ چار سو افراد پر مشتمل ہیں اور ان میں بچے خواتین بھی شامل ہیں سیلاب کے تین دن گزرنے کے باوجود بھی خوار ہیں کیونکہ اس سے قبل موصوف وفاقی وزیر کو ائیر کنڈیشنر ہال میں یہ بتا گئے تھے کہ اس صوبے کی تبدیلی والی سرکار اور ان کے بیورو کریٹوں نے تو بڑا کام کیا ہے نشاط ملز کوارٹرز میں ایک ہزار روپے کی کرائے دینے کی استطاعت رکھنے والے یہ غریب چونکہ دیہاڑی دار مزدور ہیں اور ان کے علاقے میں بدبو بھی بہت ہوتی ہیں اور جاتے ہوئے ہمارے تبدیلی والی سرکار کے کپڑے بھی گندے بھی ہوتے ہیں اس لئے تبدیلی والی سرکار سمیت کسی این جی او اور کئی ملین امداد ہڑپ کرنے والے پی ڈی ایم اے کے اندھے افسران کو یہ نظر نہیں آئے اسی بناء پر یہ لوگ انہیں بھول گئے تھے -سیلاب کے بعد چھتوں پر بیٹھی یہ خواتین اور جلدی بیاری سمیت خارش کی بیماریوں کا شکار ہونیوالے معصوم بچے تین دن سے کسی مسیحا کے انتظار میں بیٹھے ہیں لیکن نہ تو کوئی انہیں افطاری یا سحری دے گیا نہ ہی ان کے علاج کیلئے کوئی میڈیکل ٹیم آئی شائد اس لئے بھی کہ ان غریبوں کی اوقات ہی اتنی ہی ہے کہ انہیں انتخابات کے دنوں میں ہی یاد کیا جاتا ہے پھر پانچ سال عیاشیاں ہوتی ہیں - پختونخوار کے شہریوں کو امید تھی کہ خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے والوں سے جان چھوٹ گئی شائد تبدیلی آجائیگی تین ماہ میں تبدیلی کا نعرہ لگانے والے اتنی تبدیلی لا سکے ہیں کہ پہلے والے پختونخواروں کے نام نہاد لیڈر بغیر صحافیوں

کے جگہوں کا دورہ کرتے تھے جبکہ اب تبدیلی والی سرکار کے لوگ اپنے ساتھ پوری میڈیا کی ٹیم لیکر جاتے ہیں کہ بتا سکیں کہ ہم یہ تبدیلی لائے ہیں یہ الگ کہ پورے چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد سیلاب سے متاثرہ لوگوں کا دورہ کیا اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ٹیموں کے سامنے خوب اداکاری کی-

سول سیکرٹریٹ پشاور میں منعقدہ اجلاس میں پنجاب کے وزیراعظم کے نمائندے کے سامنے ایف ڈی ایم اے نے فنڈز کی کمی کا رونا رویا اور 300 ملین کی ڈیمانڈ کردی جبکہ صوبے کے حکمرانوں نے راڈار بنانے کیلئے 750 ملین روپے کے فنڈز کا مطالبہ کردیا جسے مستقبل میں دینے کی یقین دہانی تو کرادی گئی لیکن ان صاحب نے ان دو اداروں کے سربراہوں سے یہ نہیں پوچھا کہ قدرتی آفات کے سامنے تو تم لوگ ویسے بھی فیل ہو لیکن بحالی کے کام میں بھی تمھاری نالائقی کی انتہا ہے کیونکہ فنڈز تو پہلے بھی تم لوگوں کو ملتے رہے ہیں ان سے کونسی تم لوگوں نے پختونخوار کے لوگوں کی زندگیاں بہتر کی ہیں لیکن اجلاس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ائیر کنڈیشنر ہالوں میں بیٹھ کر بڑے بڑے فیصلے کرنے والے بڑے بڑے بیوروکریٹس اور نام نہاد لیڈر اندر سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور عوام کے خون پسینے کی کمائی پر پلنے والے سرکاری حرام خور یا تبدیلی کی آڑ میں کرسی تک پہنچنے والے نام نہاد لیڈر یہ سارے ایک دوسرے کیساتھ ملے ہوئے ہیں اوران کا مقصد بھی وہی تھا جو اس سے پہلے خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی دکھانے

والے لی ڈروں کا تھا وہ بھی پختونخوار کے غریب عوام کو اپنا کمی کمین سمجھتے اور موجودہ تبدیلی والی سرکار بھی یہی ڈرامہ کر رہی ہیں۔ سو پختون خوار کے "خواروں" تم لوگوں کیساتھ قسط وار ڈراموں کا سلسلہ چلتا رہے گا خواہ وہ اپنے ہو یا پرائے تم لوگوں کی قسمتوں میں ڈرامے ہی لکھے ہیں صرف اداکار تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ہندو بنیے کے ہمنوا

کوئی آپ کی ماں کو گالی دے یا آپ کے گھر کی چار دیواری کو پھلانگ کرکے آئے یا پھر گھر کی دہلیز پار کرکے ایسی حرکات کرے جس سے آپ کے گھر کے حالات خراب ہوں تو ایسے شخص کیلئے ہمارے تاثرات اور ان کیساتھ ہمارا رویہ کیسا ہوگا یقینا کسی غیرت مند شخص کیلئے یہ قابل قبول ہی نہیں کہ کوئی اس کی ماں کو گالی دے کجا کہ وہ چار دیواری پھلانگے۔اگر ان حالات میں کوئی شخص ماں کو گالی دینے والے کیساتھ جھپی ڈالے تو اس کا یقینا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اسے اپنی ماں عزیز ہی نہیں نہ ہی اسے اپنے خاندان کی عزت سے غرض ہے تقریبا یہی صورتحال اس وقت ہمارے ملک خداداد کی ہے جس پر ہندو بنیا مختلف محاذوں سے وار کررہا ہے لیکن کوئی اس کا ہاتھ روکنے کیلئے تیار نہیں ملک کیلئے ماں کی مثال میں نے اس لئے دی کہ ملک سے محبت ایمان کا بھی جزو ہے لیکن کہاں ہے وہ محبت کہاں ہے وہ ایمان کا جزو۔گذشتہ دو ہفتوں سے لائن آف کنٹرول سمیت مختلف علاقوں میں بھارتی افواج بلااشتعال کارروائیاں کررہی ہے کبھی آزاد کشمیر سے مزدوروں کو اغواء کرکے قتل کیا جاتا ہے کبھی ان کے طیارے پاکستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور کبھی دونوں ممالک کے مابین مسافروں کو لے جانیوالی دوستی بس پر حملے کئے جاتے ہیں اور بھارت کی سیاسی پارٹی

جس میں سکھ بھی شامل ہوتے ہیں پاکستانی پرچم جلاتے ہیں پاکستانی ہائی کمیشن کے اہلکاروں پر حملے ہوتے ہیں کبھی دریاؤں میں پانی چھوڑ کر سیلاب کی صورتحال پیدا کی جاتی ہے اور کبھی بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی کرکے پاکستان کو بنجر کرنے کیلئے ڈیم بنائے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف تجارت اور خصوصا چینی کے سوداگر جو کہ بدقسمتی سے اس مملکت خداداکے حکمران بن بیٹھے ہیں اپنی تجارت کیلئے ہندو بنیے سے تعلقات بہتر بنانے اور جھپیاں مارنے کیلئے مرے جارہے ہیں۔

اتنی خلاف ورزیوں پر سوداگری کرنے والے حکمران خاموش بیٹھے ہیں اور مذاکرات اور ہندو بنئے سے ملاقاتوں کیلئے مرے جارہے ہیں کیونکہ انہیں اپنی تجارت کا غم ہوتا ہے بیک ڈور چینل پالیسی پر زور دینے والے یہ لوگ خواہ وہ جو کوئی بھی ہوں نہ تو اس ملک سے اور نہ ہی اس قوم کیساتھ مخلص ہیں اور اس عمل میں حکمرانوں کیساتھ ساتھ ملک کے سیاسی اور مذہبی نام نہاد رہنما بھی ملوث ہیں جنہیں صرف اپنی سیاست سے غرض ہے ان کیلئے ملک اہم نہیں انہیں اپنی سیاست اور کرسی عزیز ہے اسی وجہ سے دو ہفتے سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی بھی سیاسی پارٹی کا کم از کم مذمتی بیان تک نہیں آیا نہ ہی ہمارے ہاں امن کا بھاشن دینے والے غیر ملکی امدادی اداروں کی امداد پر پلنے والے خواتین و مرد احتجاج کیلئے نکلے ہیں کہ یہ کس طرح کا کھیل پاکستان کیساتھ

کھیلا جارہا ہے نہ ہی ہندو بنیے کے مال پر پلنے والے پالتو دانشور جنہیں صرف مخصوص مقاصد کیلئے فنڈ دیئے جاتے ہیں اور یہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشاروں پر اپنی حیثیتوں سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کیلئے راستے صاف کرتے ہیں اور لوگوں کے ذہنوں کو اس حد تک تبدیل کر رہے ہیں کہ ان سے مذاکرات میں پہل کرنی چاہیئے اور ہندئو بنیے سے تجارت میں ہماری بھلائی ہے اور ہمیں یہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بھاشن دیتے نظر آتے ہیں کہ ان سے تعلقات رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ اس خطے کا مائی باپ ہے۔ اپنے غیر ملکی آقاؤں کیلئے راستہ صاف کرنے اور تلوے چاٹنے والے نام نہاد صحافی و دانشور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ آج تک ہندو بنیا پاکستان کے قیام کو ہضم نہیں کر سکا ہے کئی جنگیں لڑنے اور اس میں مار کھانے کے بعد انہوں نے پاکستان کو بنجر کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ڈیموں کی تعمیر شروع کر دی ہے ساتھ ہی ساتھ بلوچستان قبائلی علاقوں اور افغانستان میں پاکستان کو زک پہنچانے کیلئے وہاں پر مخصوص گروپوں کی مدد کی جارہی ہے اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے جس کے ثبوت بھی موجود ہیں بعض قبائلی علاقوں میں آپریشنز میں سیکورٹی فورسز کو وہی مواد ملا جو ہندئو بنیے کی فورسز استعمال کرتی ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ حکمران ان معاملات میں خاموش ہیں۔ یہی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہر معاملے میں بہت پیچھے ہیں بھارتی پارلیمنٹ

پر حملے سمیت اجمل قصاب کے واقعے پر بھارتی سیکورٹی ادارے کے اہلکار کا بیان ریکارڈ پر ہے جس میں بتایا گیا کہ مخصوص قانون سازی کیلئے یہ سارا ڈرامہ بھارتی ایجنسیوں نے رچایا لیکن نہ تو ہماری میڈیا نے اس معاملے کو اتنی اہمیت دی نہ ہی حکمرانوں نے بس ایک خط لکھ کر اس کی وضاحت مانگی گئی جسے ہندو بنیے نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اس معاملے کی اہمیت نہیں اور وہ غلط ہے اور ہمارے ہندو بنئے کے دوست اور شوگر مافیا والے بنئے بھی خاموش ہو گئے کیونکہ پھر کاروباری مراسم خراب ہوتے ہیں۔ مملکت خداداد اس وقت دہشت گردی کی جس جنگ کا شکار ہے ایسے میں لائن آف کنٹرول پر مسلسل خلاف ورزیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندو بنیا اس کی آڑ میں نہ صرف سیکورٹی فورسز کو مصروف رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ افغانستان اور قبائلی علاقوں میں اپنی حیثیت قائم اور مضبوط کرے کیونکہ افغانستان سے امریکی افواج کے کسی حد تک انخلاء کے بعد وہاں پر کاروبار اور وسطی ایشائی ریاستوں تک رسائی بھی چاہتا ہے اور دوسرا انہی خلاف ورزیوں کی آڑ میں پاک فوج اور ہندو بنیے سے جھپیاں مارنے کے شوقین حکمرانوں کے مابین غلط فہمیاں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ خطے میں بالادستی اور مائی باپ بننے کا ان کا خواب پورا بھی ہو اور پاک فوج کو انڈر پریشر بھی رکھا جا سکے۔ اس صورتحال میں ہندو بنیا اپنا گند ہمارے سر پر ڈال کر امریکہ اور اپنے اتحادیوں کو یہ دکھانے کا بھی خواہشمند ہے کہ پاکستان اندرونی طور پر خلفشار کا شکار ہے اسی لئے اسے خطے میں مائی باپ

بننے کا پورا پورا موقع دیا جائے خواہ وہ افغانستان کا معاملہ ہو یا پھر گوادر و بلوچستان کا معاملہ ہو۔

کچھ لوگ لائن آف کنٹرول پر ہونیوالی مسلسل خلاف ورزیوں کو بھارت میں آنیوالے انتخابات کیلئے ایک پروپیگنڈہ اور سیاسی چال قرار دے رہے ہیں لیکن صورتحال جو بھی ہے کیا بحیثیت شہری ہمارا یہ فرض نہیں کہ اپنی دھرتی ماں کی طرف اٹھنے والی ہر آواز کو بلند ہونے سے پہلے ہی بند ہی کردیں اور اس کے ساتھ امن کی آشا کا نعرہ لگانے والے ان نام نہاد دانشوروں و صحافیوں کی بولتی بھی بند کی جائے جومذاکرات مذاکرات کی رٹ لگا کر پاکستان کو کمزورثابت کرنا چاہتے ہیں اگرانہیں مذاکرات کا شوق نہیں تو پھر اس ملک کے عوام کسی مذاکرات کے حق میں نہیں ۔اور مذاکرات ہوں بھی تو وہ برابری کی بنیاد پر اسی کے ساتھ ساتھ کیا ہمارے حکمران صرف اپنے کاروبار کیلئے حکومت میں لائے گئے ہیں مملکت خداداد کے غریب عوام کے ٹیکسوں پر عیاشی کرنے والے سیاسی رہنماوں اور حکمرانوں کی ذمہ داری نہیں کہ وہ مملکت خداداد کی حفاظت کیلئے ایسے اقدامات اٹھائیں تاکہ کوئی بھی ملک پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے لیکن اس معاملے میں خاموشی اس بات کی واضح مثال ہے کہ یہ سارے ہندو بنیا کے ہی ہمنوا ہیں۔

تبدیلی والی سرکار

90 دن میں خیبر پختونخواہ میں دودھ اور شہد کی نہریں بہانے کے دعویدار حکمران گذشتہ 55 دنوں میں تو کوئی کمال نہ دکھا سکے آگے جتنے بھی دن رہتے ہیں یہ بھی ختم ہو جائینگے حکومت میں آنے کے بعد ان کئے جانیوالے کاموں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تبدیلی والی سرکار کچھ بھی نہیں کرپائے گی حکومت کی تین ماہ کی کارکردگی دیکھ کر سوشل میڈیا پر دوسروں کو گالیاں دینے والے.برگر فیملی سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو بھی یہ بات سمجھ آگئی ہے کہ تبدیلی کم سے کم اس حکومت کے بس کی بات نہیں اسی وجہ سے اب خیبر پختونخواہ میں نئے ووٹرز جو گیارہ مئی کے انتخابات میں نکلے تھے اور انہوں نے صرف انتخابی نشان بلے کو ووٹ دیا تھا یہ دیکھے بغیر کہ اس بلے کے پیچھے کون کھڑا ہے اور اسی بنیاد پر قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ون پر ریکارڈ ووٹ بھی پڑا تھا اب ضمنی انتخابات سے قبل تبدیلی والی سرکار کی اپنی پارٹی میں دھڑے بندی اور رشتہ داروں میں ٹکٹ باٹنے کی سیاست نے ان کو بھی کچھ عقل دیدی ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ آنیوالا نہیں کیونکہ سوٹے کے شوقین حکمران سمیت متعدد بھگوڑے سیاستدان جو اس سے پہلے کسی اور پارٹی کے جیالے کہلاتے تھے اب میز کے اس طرف بیٹھ کر سیاست کر رہے ہیں اور انہوں نے صوبے کے

عوام کیلئے کچھ نہیں کرنا ان وزراء کی کارکردگی صرف میڈیا پر بیان بازی تک ہی رہ گئی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قومی اسمبلی کے حلقے این اے ون انہی کی پارٹی کا سب سے پرانا کارکن نظریاتی گروپ بنا کر حصہ لے رہا ہے کیونکہ اس کو اپنی پارٹی میں سپورٹ کرنے والا کوئی نہیں یہ ہے تبدیلی کے دعویدار حکمران جنہوں نے پارٹی کیلئے خون دیا تھا آج انہیں سچ بولنے پر نوٹس مل رہا ہے جبکہ ایک امیدوار جو تبدیلی والی سرکار کی طرف سے الیکشن لڑ رہا ہے اس پر خود کارکن افغانی ہونے کا الزام لگا رہے ہیں واللہ اعلم بالصواب صورتحال یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی تبدیلی والی سرکار کے امیدوار کے حق میں انتخابی مہم میں حصہ لینے کیلئے تیار نہیں نہ ہی کارکن نہ ہی صوبائی اسمبلی کے حلقوں کے ممبران جنہوں نے گورنر ہاؤس میں پارٹی رہنماء کو یہاں تک کہہ دیا کہ جس نے انہیں پارٹی ٹکٹ دیا ہے وہی ان کیلئے انتخابی مہم بھی چلائے اور اب جذباتی نعرے لگانے والے رہنماء سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ یہ کس عذاب میں پھنس گئے ہیں۔

آئین کا سبق دوسروں کو پڑھانے والے اٹھارھویں ترمیم کے بعد خود بھی کابینہ کا حجم مقررہ سائز کے برابر نہ رکھ سکے خیبر پختونخوا حکومت کی کابینہ کا حجم بھی آپے سے باہر ہوگیا ہے مشیروں کی بھرتی کا عمل اب بھی جاری ہے اور کچھ تو ایسے رہنماء بھی ہیں جنہوں نے سرکاری رہائش گاہیں بھی حاصل کرلی ہیں اور ممبران صوبائی اسمبلی کیلئے بنے ہاسٹلز میں اپنے چہیتوں کے ساتھ

.براجمان ہیں ساتھ ہی تعلیم صحت کیلئے پالیسی اور تبدیلی لانے کے دعویدار اتنی تبدیلی لا چکے ہیں کہ تعلیم کے شعبے میں بین الاقوامی امدادی ادارے کو شامل کرلیا گیا ہے آکسفورڈ سطح کا تعلیمی نظام لانے کے دعویداروں نے گورنر ہائوس و وزیراعلی ہائوس میں تعلیمی اداروں کے قیام کا بھی اعلان کیا تھا لیکن وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے البتہ صحت کے شعبے پر مسلط ہونیوالوں کے رشتہ داروں نے صرف ایک ماہ میں لاکھوں روپے کی گاڑیاں ضرور خرید لی ہیں یہ وہ واضح تبدیلی ہے یہ ایک ایسی واضح تبدیلی ہے جو ہرایک کو نظر آرہی ہے لیکن اس پر بول کوئی نہیں رہا۔ تبدیلی والی سرکار کی ایک خوبی کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ اسی پارٹی نے ایک ایسی خاتون کو قبائلی خاتون کے طور پر متعارف کروایا ہے جس کا تعلق خیبر پختونخواہ کے علاقے بنوں سے ہے لیکن چونکہ قبائل کو دھوکہ میں رکھنا بھی تھا اسی لئے ان کا تعلق بنوں کے بجائے وزیرستان سے ظاہر کیا گیا ہییہاں وہ پشتو مثل یاد آتی ہے کہ "سہاگن وہی جو پیا من کو بھائے" سو ہم کون ہوتے ہیں تبدیلی والی سرکار کے ان کارناموں پر کچھ کہنے والے اگر انہوں نے بنوں کی خاتون کو قبائلی بنا دیا تو یہ شائد انکی تبدیلی ہو گی۔ تبدیلی لانے کے دعویداروں نے خیبر پختونخواہ میں جہاں اور بہت سارے کارنامے حکومت میں آنے کے بعد انجام دیئے ہیں وہیں یہ غیر آئینی کارنامہ بھی انہی کے سر جاتا ہے کہ ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ جس کا صوبے کی حکومت میں کوئی کردار ہی نہیں ہوتا سرکاری اجلاسوں میں بیورو کریٹس

کو احکامات دیتا نظر آ رہا ہے اور اجلاسوں کی سربراہی بھی کرتا دکھائی دیتا ہے شکر ہے کہ کچھ سر پھرے موجود ہیں جنہوں نے اس معاملے پر بات کی ورنہ تو معاملہ اس سے بھی آگے چلے جاتا -دوسری پارٹیوں کے سربراہوں پر تنقید کرنے والے اپنی پارٹی کے حکمرانوں کے دو عہدوں پر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں شائد یہ بھی رشتہ داروں کی سیاست ہے جس پر انہوں نے آنکھیں بند کرلی ہیں-

یہ بھی تبدیلی ہی ہے کہ چودہ اگست کے پروگرام جو کہ پولیس لائن پشاور میں ہوتا آ رہا ہے میں صوبے کا سربراہ تک موجود نہیں تھا شائد انہیں قوم کی آزادی سے زیادہ کوئی اہم کا تھا اس لئے پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت تک گوارا کرنا نہ سمجھا حالانکہ راقم نے اس دن ایسے جج کو پشاور ہائیکورٹ کے تقریب پرچم کشائی میں دیکھا جنہوں نے سینیارٹی بنیادوں پر اختلاف ہونے پر اپنا عہدہ چھوڑ دیا تھا لیکن چونکہ پروگرام قوم کی آزادی کا دن کا تھا تو اسی دن کی وجہ سے وہی جج اختلاف رائے کے باوجود پرچم کشائی کی تقریب میں شریک ہوا جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کو ملک سے محبت ہوتی ہے وہ اپنا اختلاف بھی اسی دن کی مناسبت سے چھوڑ جاتے ہیں - خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی کرنے والے سابق حکمرانوں سے لاکھ اختلاف سہی لیکن انکے رہنماء تو جشن آزادی کی ہر تقریب میں پہنچ جاتے تھے ان پر غداری کے الزامات تو بہت لگتے ہیں لیکن ان کا کردار تو کم از کم ایسا نہیں تھا جو آج کی تبدیلی والی

سرکار کا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے عوام ایسی تبدیلی نہیں چاہتے تھے اگر ایسی ہی تبدیلی آنی تھی تو اس سے پہلے والے کون سے .برے تھے ۔ان حالات میں جب عوام کی قسمت میں تبدیلی ہی نہیں اور جذباتی نعرے لگانے والے رہنماء بھی اپنی زبان کی وجہ سے عدالت عظمی تک پہنچ گئے ہیں اگر صوبائی حکمران ایسی ہی کارکردگیاں دکھاتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب تبدیلی کے خواہشمند عوام ہی انہیں بھی جلد ہی تبدیل کرینگے۔

ای پی آئی ورکرز کیساتھ محکمے کی زیادتی

ایسے حالات میں جب ان کے پیچھے عسکریت پسند لگے ہو اور موقع ملنے پر انہیں ہلاک کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے وہ اپنے ساتھیوں سمیت روزانہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل آتا ہے اور تین بجے تک وہ روزانہ اپنے مخصوص سٹاپ پر ڈیوٹی انجام دیتا ہے بغیر اس خوف اور ڈر کے اسے کوئی فائرنگ کرکے قتل کردے گا یہی صورتحال اس کے دیگر ساتھیوں کی بھی ہے وہ اپنے مخصوص علاقے میں کھڑے رہتے ہیں اور مسافروں کو دیکھ کر ان کے پاس جاکر اپنی ڈیوٹی پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی مجبوریاں ہیں کچھ گھریلو ذمہ داریوں کا شکار ہیں اور کچھ پیٹ کی خاطر یہ سخت ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں سرکار کے کھاتے میں ان کی جتنی ڈیوٹی لگی ہوئی ہیں اس سے کبھی کبھار وہ دو گھنٹے زیادہ بھی کرلیتے ہیں لیکن بدقسمتی ان کی یہی ہے کہ گذشتہ تین ماہ سے انہیں تنخواہ بھی نہیں ملی اس کے ساتھ ان کے ڈیپارٹمنٹ میں کچھ ایسے حرام خور بھی شامل ہیں جو ان کی تنخواہیں کمیشن کی مد میں کاٹ لیتے ہیں اور ان غریب مزدوروں کو آدھی تنخواہ دیتے ہیں حالانکہ یہی حرام خور جب میڈیا کی ٹیموں کی سامنے اپنی بکواس شروع کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان سے صاف و شفاف اور ولی اللہ کوئی اور نہیں اور ان کے دامن نمازوں کیلئے صاف ہیں۔

گدھوں کی طرح کام کرنے والے یہ مزدور ای پی آئی کے فیلڈ میں کام کرنے والے اہلکار ہیں جنہیں ڈیپارٹمنٹ نے مختلف جگہوں پر تعینات کیا ہے اور ان سے آٹھ سے دس گھنٹے روزانہ ڈیوٹی سمیت اتوار کے روز بھی ڈیوٹی لی جاتی ہیں ان غریب ملازمین کی مہینے بھر کی تنخواہ ساڑھے سات ہزار روپے ہیں لیکن مجال ہے کہ یہ غریب لوگ کبھی ساڑھے تین ہزار اور چار ہزار سے زائد کبھی گھرلیکر گئے ہوں کیونکہ دفاتر میں بیٹھ کر ان غریبوں پر بدمعاشی کرنے والے حرام خور افسران سمجھتے ہیں کہ فیلڈ میں کام کرنا آسان ہے اور ان سے آدھی تنخواہ کاٹ لینا ان کا فرض عین ہے مزے کی بات تو یہ ہے کہ ان سے گیارہ مئی کے دن کی تنخواہ بھی کاٹ لی گئی کیونکہ بقول ان کے افسران کے تم لوگ ڈیوٹی پر نہیں آئے تھے حالانکہ اس دن مملکت خداداد میں " جمہوریت جمہوریت "کا ڈرامہ چل رہا تھا اور اس دن سرکار کی چھٹی تھی لیکن خیبر پختونخوار میں کام کرنے والے ای پی آئی فیلڈ سٹاف سے اس روز کی تنخواہیں کاٹ لی گئیں-ان حالات میں اگر کوئی غریب فیلڈ ورکر معاشی بدحالی کا شکار ہو کر ڈیوٹی انجام دنہ دے یا کوئی حرام خوری کی طرف جائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا- یہاں پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ علیہ کی معاشی بدحالی کے حوالے سے ایک بات یاد آرہی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسانی اعمال کے دو بڑے محرک ہوتے ہیں ایک آدمی کے دل میں پیدا ہونیوالے مختلف خیالات جو مختلف مراحل پر انسان کے نفس و قلب میں اٹھتے

ہیں اور ان خیالات کے پیدا ہونے کا سبب ہے جبکہ دوسرا محرک انسانوں کے تباہ شدہ معاشی حالات ہیں جو انسانوں کو اپنے گھیراؤ میں لے لیتے ہیں بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ علیہ کے " اخلاق علوم کے ذریعے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں جن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے " یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اتنے بلند اور پختہ اخلاق کے مالک ہوں کہ وہ معاشی بدحالی سے متاثر نہ ہوں لیکن ان کے اخلاق پر معاشی بدحالی کا اثر ضرور پڑتا ہے یہی سبب ہے کہ قرآن بھی انسانی اصلاح و فلاح کیلئے ریاست کے معاشی نظام بہتر بنانے کو ضروری قرار دیتا ہے-

بین الاقوامی امدادی اداروں سے اربوں روپے ڈکارنے کیلئے خیبر پختونخواہ میں پولیو کیلئے علیحدہ ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے جس میں کام تو ہوتا نظر نہیں آتا لیکن پیداگیری کی یہاں تک صورتحال تک پہنچ گئی ہیں کہ کاغذوں میں ای پی آئی ورکرز کوہاٹ اڈہ پر دس بتائے جاتے ہیں لیکن فیلڈ میں کام کرنے والے صرف پانچ اہلکار دکھائی دیتے ہیں اور بقایا پانچ اہلکاروں کی تنخواہیں چچا بھتیجے کی جیب میں جاتی ہیں- یہ صرف ایک کوہاٹ روڈ اڈے میں کام کرنے والے ای پی آئی اہلکاروں کا حال ہے ایسے کتنے سائٹس ہونگے جہاں پر ای پی آئی ورکرز ہونگے ہی نہیں لیکن محکمے کے کاغذات میں اہلکار ڈیوٹی انجام دیتے ہونگے اور انکی تنخواہیں بھی ریلیز ہوتی ہونگی اور یہ تنخواہیں مخصوص لوگوں کے جیبوں

- میں جاتی ہونگی

کہتے ہیں کہ پختون کمینہ نہیں ہوتا لیکن اگر ایک مرتبہ کمینگی پر اتر آئے تو اس سے بڑا کمینہ پھر کوئی ہو نہیں سکتا -ایک مخصوص قبیلے سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اسی محکمے پر مسلط ہیں اسی ڈیپارٹمنٹ اور قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی جاسوسی کی جس کی تصدیق امریکی میڈیا بھی کر چکا ہے کہ اس نے پیسوں کی عوض جعلی پولیو مہم چلائی اسی ایک شخص کی وجہ سے صوبے میں پولیو مہم کو اب اتنا نقصان پہنچ رہا ہے کہ کوئی اپنے بچوں کو پولیو پلانے پر تیار ہی نہیں ان حالات میں اگر پولیو پلانے کی ڈیوٹی انجام دے اور انہیں تنخواہیں نہ ملے اور متاثر ہونیوالے افراد اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتی پر آواز اٹھائے تو پھر انہیں بغیر کسی چارج شیٹ کے چچا بھتیجا نوکری سے برخاست کرے اور تین سال سے ڈیوٹی انجام دینے والے اہلکاروں کو یہ کہہ دیا جائے کہ میڈیا سے بات کرنے کی سزا یہ ہے کہ اب ڈیوٹی پر آنے کی ضرورت نہیں یہ متاثر ہونیوالے افراد کیساتھ کیسا اور کہاں کا انصاف ہے اور یہ اس صوبے میں تبدیلی کے دعویداروں کیلئے بھی بڑا چیلنج ہے کہ ایک عام آدمی جس کی روزی روٹی کا ذریعہ بھی ایک سرکاری نوکری ہو اور اسے اس بات پر لات مار کر نکال دیا جائے کہ اس نے اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتی پر میڈیا سے بات کیوں کی -کیا اس غریب آدمی کیلئے کوئی

آواز اٹھائے گا۔ دوسری طرف اس ڈیپارٹمنٹ کی کارکردگی کا یہ حال ہے کہ رواں سال پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد 24 تک پہنچ گئی ہیں اسی ادارے کی جانب سے جاری رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ تعداپولیو کے متاثرہ فاٹا کی ہے جہاں پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد 14 ہے، دوسرے نمبر پر خیبر پختونخوا میں ہیں جس میں پولیو سے متاثرہ بچوں کی تعداد 5 تک پہنچ گئی ہیں۔

!کیا حکمران اپنا جواب دے سکیں گے

مصنوعی بالوں اور سعودی شیخوں کیساتھ روابط کے حوالے سے مشہور پاکستانی وزیراعظم نے قوم سے اپنے خطاب میں انتظامی اداروں ایجنسیوں اور عدالتی نظام کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے خود کو دہشتگردی کا مقابلہ کرنے کا اہل ثابت نہیں کیا اور ان کے بقول حالات اندازوں سے بھی زیادہ خراب ہیں پانچ سال میں لوڈشیڈنگ خاتمے کی نوید سناتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ قرضے چودہ ہزار پانچ سو ارب ہوگئے ہیں اور اگر مزید قرضہ نہ لیا تو ملک دیوالیہ ہوسکتا ہے ڈھائی ماہ سے وزیراعظم کی حیثیت سے بیرون ملک دورے کرنے والے لیڈر کو آخرکار قوم سے خطاب کا خیال آ ہی گیا اپنے پہلے ہی خطاب میں انھوں نے سابق حکمرانوں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ یہ حال ان کی وجہ سے ہوا ہے انھوں نے اپنی تقریر میں غریبوں اور بیروزگاروں کو روزگار کے بجائے لاکھوں افراد کو گھروں کا مالک بنانے کا بھی اعلان کیا ہے جس کیلئے قوم کو اکتوبر تک انتظار کرنا پڑے گا۔یہ ہے خادم پاکستان کی پہلی تقریر جس نے دہشت گردی مہنگائی بیروزگاری سیلاب زدہ قوم کو ناامیدی کی اس کھڈے میں پھینک دیا ہے جہاں سے نکلنا شائد ممکن ہی نہ ہو سابق دور حکومت میں فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے والے لیڈر اور موجودہ وزیراعظم نے

قوم سے مزید قربانی کی اپیل بھی کی ہے حالانکہ انہیں پتہ ہے کہ یہ بھوکی ننگی قوم جس رفتار سے قرضوں کا شکار ہو رہی ہیں اگر رفتار اسی طرح رہی تو آج جو پاکستانی 81 ہزار روپے کا قرضدار ہے وہ ان کی حکومت کے جانے تک 81 لاکھ روپے تک پہنچ جائیگی کیونکہ عیاشیوں کیلئے قرضے تو عوام کے نام پر لئے جاتے ہیں لیکن اس پر خرمستیاں ان کے بچے کرتے ہیں۔ بیرون ملک دوروں پر یہ لوگ اپنے خاندانوں کو لے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے انہیں اپنی ریاست اور اس کے عوام سے کتنی محبت ہے اگر پہلے والے چور تھے تو چوروں کیساتھ آپ نے کیا کیا کسی کو سرعام پھانسی دی یا اب مک مکا والا سلسلہ چل رہا ہے۔ اداروں کو ہدف تنقید بنانے والے لیڈر شائد سیاستدانوں اور ان میں شامل اپنے آپ کو بھول گئے ہیں جن کی وجہ سے آج قوم کو یہ سنایا جارہا ہے کہ اگر قرضے نہیں لئے تو ہم دیوالیہ ہونے کو قریب ہیں۔ رائے ونڈ میں 20 کنال کے مالک خادم پاکستان کی گیارہ شوگر ملیں 2900 ملین روپے کی پندرہ انڈسٹریل سٹیٹ لندن میں فلیٹس جن کی مالیت 30 بلین روپے بتائی جاتی ہیں پانچ بلٹ پروف گاڑیوں کے مالک سعودی عرب دبئی اور استنبول میں سٹیل ملز کے مالک 1766 ملازمین رکھنے والے غریب وزیراعظم کا یہ حال ہے کہ قوم سے مزید قربانی مانگ رہے ہیں کسی زمانے میں قرض اتارو ملک سنوارو کے نام پر اربوں روپے ھضم کرنے والے حکمرانوں نے حکومت میں آتے ہی سرکلر ڈیڈ کی مد میں اربوں روپے آئی پی پیز کو ادا تو کردیئے لیکن اس کا بوجھ بھوکی ننگی عوام سے کس طرح نکالا

جارہا ہے یہ تو اگلے چند ماہ میں بجلی اور گیس کی قیمتوں میں ہونیوالے اضافے اور ساتھ میں مارکیٹ میں مخصوص اشیاء کے مصنوعی بحران سے مکمل کرلیا جائیگا۔ لیکن اس ملک کے غریب عوام یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اپنے چہیتوں کو نوازنے کیلئے کیا اس ملک کے ہمارا خون نچوڑنا بہت ضروری ہے۔

سرکاری مشینری کو اپنے رشتہ داروں کیلئے استعمال کرنے والے وزیراعظم کو یہ توفیق نہیں کہ آغاز اپنے آپ سے کریں اور اربوں روپے جو اس ملک کے غریب عوام سے نکالے گئے ہیں حکومتی خزانہ میں جمع کروا کر پھر قوم سے قربانی کی امید رکھے۔ کسی زمانے میں اپنے آپ کو زبانی کلامی امیر المومنین قرار دینے والے حکمران کو خلافت راشدہ کی مثال ذہن میں رکھنی چاہیے جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ جیسی شخصیت کو خلیفہ بننے کے بعد اخراجات کیلئے بیت المال سے صرف دو وقت کا کھانا ہی ملتا ہے یہ وہی امیر المومنین ہے جنہوں نے بلوچستان تک اپنی حکومت کو توسیع دی اور اپنے بعد خلافت کیلئے اپنے بیٹے کا نام دینے سے انکار کیا کہ جو بوجھ میں اٹھا چکا ہوں نہیں چاہتا کہ میرا خاندان بھی اسی بوجھ کا شکار ہو کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان سے ان کے اعمال کی پوچھ گچھ ہوگی یا پھر انہیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کی مثال لینی چاہیے جو اپنے دور میں مالدار ترین شخص تھا اور مختلف اوقات میں جنگوں کیلئے گھوڑے اور جنگی سامان فراہم کیا کرتا تھا لیکن جب خلیفہ بن گیا تو اس

کے پاس سواری کیلئے دو جانور رہ گئے ۔ جو وہ مکہ سے مدینہ حج کرنے کیلئے استعمال کرتے تھے ۔

دوستیاں نبھانے والے سابق حکمرانوں کیساتھ موجودہ والے بھی نوازنے میں کسی سے کم نہیں پاکستان میں بے انتہا دولت کے حوالے سے مشہور ایک بینکر جو آئی پی پیز میں بھی اپنی کمپنی کے حوالے سے زبان زد عام ہے صرف انہی کو خوش کرنے اور نوازنے کیلئے ہائبرڈ گاڑیوں پر ٹیکس ختم کردیا گیا ساٹھ ہزار گاڑیاں پاکستان لانے والے شخص کی خاطر اٹھارہ کروڑ عوام کیساتھ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے سرکلر ڈیڈ کی ادائیگی کو اپنی کامیابی قرار دینے والے کیا اتنے اندھے ہیں کہ آئی پی پیز کیساتھ ہونیوالے معاہدوں پر نظر ثانی کرے کہ اگر کوئی ادارہ بجلی پیدا نہیں کرسکتا تو پھر حکومت کس کھاتے میں عوام کے خون پسینے کی کمائی انہیں ادا کرے لیکن چونکہ یہ کمی کمین قرار دینے والے غریب شہریوں کے ٹیکسوں کا پیسہ ہے جن کی اکثریت غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور صرف دو ڈالر آمدنی رکھنے والے لوگ ہے جنہیں اپنے حقوق کا پتہ ہی نہیں اس لئے اب بھی ایسے معاہدے کئے جارہے ہیں جس کا تیل انہی غریبوں سے نکالا جائیگا کمیشن کی خاطر ایسے ایسے سودے کئے جارہے ہیں کہ انہیں لیڈر تو کیا انسان سمجھنے کیلئے بھی دماغ کیساتھ لڑنا پڑتا ہے کیونکہ انہیں صرف اپنے آپ اور اپنے دوست نظر آتے ہیں جنہیں یہ نوازنے کی

کوششوں میں مصروف ہیں--ابھی شیر والے حکومت کو آئے ہوئے تقریبا 80 دن ہوگئے ہیں لیکن مالی سکینڈلز کا آغاز ہوگیا ہے قطر سے ایل این جی کی درآمد یں کمیشن کی خاطر سودے کئے جارہے ہیں کیا ملک میں گیس کے ذخائر ختم ہوگئے ہیں قطر کے نام پر کی جانیوالی ڈیل ایک ملٹی نیشنل کمپنی کیساتھ کی جارہی ہیں جسے پاکستان میں بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی ہی ڈیل کریگی میڈیا رپورٹس کے مطابق پاکستان نے یومیہ پانچ سو ملین کیوبک گیس خریدنے کا بیس برس کا معاہدہ کیا ہے اب پاکستانی حکومت یہ گیس لے یا نالے اس کی ادائیگی روزانہ پاکستان کو کرنے پڑیگی جبکہ معاہدے کی روسے حکومت یہ گیس کسی اور کو فروخت بھی نہیں کرسکتی۔

یہاں پر مولانا رومی کا ایک قول یاد آرہا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ ایک ہزار قابل انسان مرجانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک احمق کے صاحب اختیار ہونے سے ہوتا ہے زمین پر کروڑوں روپے کی گاڑیوں اوراربوں کے گھروں میں رہنے والے تکبر پسند حکمرانوں کیلئے صرف ایک ہی سوال ہے کیا وہ اپنے اعمال کا جواب دے سکیں گے اس ارب العزت کے سامنے جس کے سامنے زمین پر کیڑوں کی طرح زندگی گزارنے والے اور محلوں میں عیاشی کرنے والے سب برابر ہونگے اور اعمال پر فیصلے سنائے جائینگے۔

گندگی اور) فول (پھولوں کا شہر

کسی زمانے میں پھولوں کا شہر کہلانے والے پشاور کے مختلف علاقوں میں پڑے گندگی کے ڈھیروں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں کہ اس شہر کو کبھی پھولوں کا شہر کہا جاتا ہوگا شائد لکھنے والوں سے غلطی ہوئی ہوگی جو وہ فول کے بجائے پھول لکھ بیٹھے اسی شہر کا باسی ہونے کے ناطے مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم صبح سویرے نماز کیلئے جاتے تو صفائی کرنے والے افراد گھروں کے سامنے جھاڑو لگاتے دکھائی دیتے اور پھر ان کے جانے کے بعد ماشکی) پانی ڈالنے والے (گھروں کے سامنے پانی ڈالتے اور گلیاں اور محلے صاف کرتے دکھائی دیتے یہ کوئی پرانا قصہ نہیں صرف پندرہ بیس سال پرانی بات ہے لیکن پتہ نہیں ان بیس سالوں میں کیا سے کیا ہوگیا کہ ہر چیز تبدیل ہو کر رہ گئی وہ شہر جو تجارت اور امن کیلئے مشہور تھا جس کی شہریوں کی مہمان نوازی مشہور تھی آج اس حال کو پہنچ گیا کہ لوگ امن کیلئے ترس رہے ہیں کاروباری حضرات یہاں سے بھاگ رہے ہیں اور گندگی کے ڈھیر ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں دیوار شہر کے اندر کے رہائشی ہوں یا پھر بیرون شہر کے لوگ گندگی کے ڈھیروں کیساتھ یوں زندگی گزار رہے ہیں جیسے یہی ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہو۔گندگی کے ان ڈھیروں کو ختم کرنے کیلئے خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی جتلانے والے لالٹین والی سرکار نے

اپنے دور حکومتمیں پنجاب سے آنیوالے ایک سرمایہ کار کو ری سائیکلنگ کے ایک منصوبے پر آمادہ کیا اور اس کیلئے پھندو روڈ پر انہیں جگہ بھی فراہم کردی گئی جس کا باقاعدہ افتتاح بھی ہوا تصاویر بھی چھپ گئیں اور ٹی وی چینلوں پر پروگرام بھی دکھائیگئے بڑے بڑے دعوئے جس میں کہا گیا کہ دو سال میں یہ منصوبہ مکمل ہوگا اور گندگی کے ڈھیروں کو ختم کیا جائیگا اور ساتھ میں اس سے بجلی بھی پیدا ہوگی لیکن اللہ کی شان ہے کہ دو سال تو کیا ان کی حکومت بھی انا اللہ وانا الیہ راجعون ہو گئی لیکن منصوبہ مکمل نہ ہوسکا اور نہ ہی شہر سے گندگی کے ڈھیر ختم ہوگئے بلکہ اب تو یہ حال ہے کہ شہر کیساتھ ساتھ جی ٹی روڈ پر سڑک کنارے بھی گندگی کے ڈھیر نظر آنے لگ گئے ہیں جسے آگ لگا کر ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس عمل سے گندگی ختم کیا ہوگی الٹا فضائی آلودگی بڑھ رہی ہے جو یہاں کے شہریوں کو بیمار کررہی ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تقریبا یہی صورتحال اس وقت پورے صوبہ خیبر پختونخواہ کی ہیں۔ خیبر پختونخواہ میں چار ترجمانوں پر چلنے والی تبدیلی والی سرکار کے آنے کے بعد یہاں کے باسیوں کو یقین تھا کہ تبدیلی آجائیگی تین ماہ میں تبدیلی لانے کے دعویدار ابھی تک کچھ تو نہیں لا سکے ہیں کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ گند مختلف محکموں میں بہت سارا پڑا ہے جس کی صفائی میں سالوں لگیں گے اور یہ ہر کوئی جانتا ہے لیکن تبدیلی والی سرکار تین ماہ میں تبدیلی کی دعویدار تھی اس لئے ہم جیسے لوگ بھی پرامید تھے کہ کچھ نہ کچھ تو آہی جائیگا اور کم از کم

گندگی کی صورتحال پر تبدیلی تو آ ہی جائیگی لیکن شہر سے گندگی ہٹانا بھی ان کیلئے پانچ سالہ منصوبہ بن گیا ہے کبھی پورے شہر کی صفائی کے ٹھیکے کو ترکش کمپنی کو دینے کی بات ہوتی ہے تو کبھی شہر کو سرف سے دھونے کی اطلاعات ملتی ہیں۔حالانکہ اگر سیاسی بنیادوں پر بھرتی ہونیوالے میونسپل کارپوریشن کے اہلکاروں سے اگر صحیح معنوں میں کام لیا جائے تو کوئی مشکل نہیں کہ شہر سے گندگی ختم ہو۔

گذشتہ دنوں صوبائی وزارت اطلاعات نے ایک عجیب خبر چلادی خبر سے اندازہ ہوا کہ تبدیلی والی سرکار کی تبدیلی بھی ہوائی ہے صوبائی وزارت اطلاعات سے 18 اگست کو چلائے جانیوالے ہینڈ آئوٹ نمبر 4 کے مطابق شہر سے گندگی کو ختم کرنے اور گرین اور کلین پشاور پروگرام اور تبدیلی کے مشن میں وزیر اعلی کے ترجمان نے بائیسیکل کا استعمال شروع کردیا بقول ان کے سرکاری گاڑی کے کم سے کم استعمال اور گاڑیوں کے پٹرول مرمت اور ڈرائیور کی تنخواہوں میں سرکاری خزانے سے کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں اور اگر سائیکل کا استعمال اس طرح جاری رہا تو پھر فضائی آلودگی بھی کم ہوگی اور گندگی کے ڈھیر بھی سرکار کی مدح سرائی کرنا یقینا صوبائی وزارت اطلاعات کا کام ہے لیکن صحافت کے شعبے سے وابستہ افراد بھی شائد بینا ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے کہ منصوبہ بندی کیساتھ کئے جانیوالے اس پروگرام کے خالق کو صوبائی حکومت کی طرف سے ترجمان

قرار دینے والی شخصیت نے وزیراعلی سیکرٹریٹ میں دفتر اور گاڑی دینے سے انکار کیا اور مسلسل شکایات کے باوجود کچھ نہ ہونے پر وزیراعلی کے ترجمان نے نوشہرہ سے گاڑی میں پشاور تک کا سفر کیا اور بعد ازاں ایک مقامی اخبار کے دفتر سے سائیکل پر بیٹھ گئے تاکہ ان کی تصویر چھپنے کے بعد وہ وزیراعلی کو شکایت کر سکیں کہ یہ آپ کے ترجمان کا حال ہے کہ اسے دفتر اور گاڑی مہیا نہیں کی جارہی پروگرام تخلیق کرنے والے کو امید تھی کہ اس طرح اسے وزیراعلی سیکرٹریٹ میں دفتر اور سائیکل بھی مل جائیگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تو انہوں نے فوری طور پر سکرپٹ میں تبدیلی کرتے ہوئے تبدیلی کا نعرہ لگایااور پھر کلین اور گرین پشاور سامنے آیا یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے کیا ہوا اگر گاڑی اور دفتر نہیں ملا کم از کم اخبار میں خبریں تو چھپ گئیں اور فول میرا مطلب ہے پھولوں کے شہر کے باسیوں نے زندہ باد کے نعرے تو لگا ہی لئے کہ ایسے کہتے ہیں تبدیلی - تبدیلی والی سرکار کے صوبائی ترجمان کیلئے بھی مشکل ہے کیونکہ اگراس طرح وہ گاڑیاں اور دفتر تقسیم کرتے رہے تو پھر ان کے پاس کیا بچے گا کیونکہ انہوں نے اپنے بھائی کو جو گاڑیاں دی ہیں ان کے پٹرول کا خرچہ بھی یہاں کے فول میرا مطلب ہے پھولوں والے شہر کے باسیوں سے نکالنا ہے - یہ الگ بات کہ ان کے بھائی سرکاری گاڑیوں کو گلبہار میں رات کے وقت ریس لگانے کیلئے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں-

زبان ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں پشتو زبان کی ایک مثل مشہور ہے کہ "کہ اپنی زبان قلعہ بھی ہے اور بلا بھی " یعنی اسی زبان کے استعمال میں احتیاط برتیں تو ہمارے لئے قلعہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اگر اس کا استعمال غلط ہو تو پھر یہ بلا کی حیثیت رکھتی ہے۔زباان کی لغرش سے برباد ہونیوالے اگر سابقہ حکمران تھے تو موجود بھی کسی سے کم نہیں بہت سارے دعووں کیساتھ شہر میں گندگی ہٹانے کے دعوے تو انہوں نے بہت کئے لیکن ان دعوئوں کو عملی جامہ پہنانے میں یہ لوگ کتنے سچے ہیں اس کا اندازہ تو ان کی تاریخی اقدامات سے کیا جاسکتا ہے گندگی کے ان ڈھیروں کی صفائی اگر حکومتی اداروں کی ذمہ داری ہے تو اس کے ساتھ اس شہر کے باسیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ شہر کو صاف رکھیں لیکن یہ لوگ ہے جو گندگی کا شاپنگ بیگ گھر سے نکال کر گلی میں پھینک دیتے ہیں کہ جیسے گلی ان کی نہیں کسی اور کی ملکیت ہے عوام کیساتھ زبانی جمع خرچ کرنے والے سیاستدانوں کیلئے ہم جامع ترمذی کی ایک حدیث شیئر کررہے ہیں جو کہ ۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ نے روایت کی ہے جس میں معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے سوال کیا اور اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ والہ وسلم اپنی زبان مبارک پکڑی اور فرمایا اسے اپنے اوپر روک لو معاذ بن جبل نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا گفتگو کے بارے میں بھی ہمارا مواخذا ہوگا جس پر حضرت محمد صلی اللہ والہ وسلم نے فرمایا کہ تمھاری ماں تم پر روئے اے معاذ کیا لوگوں کو دوزخ میں منہ یا

نتھنوں کے بل زبان کے علاوہ بھی کوئی چیز گراتی ہے۔ سو ہمارے اوپر مسلط حکمرانوں اگر آپ کی زبان اس طرح لڑھکتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب آپ بھی لڑھک جائینگے اور پھر آپ سے آپ کے اعمال اور زبان لڑھکنے کا بھی حساب ہوگا۔

منافق حکمران اور دال میں کچھ زیادہ ہی کالا

خیبر پختونخواہ حکومت نے ڈیرہ اسماعیل خان جیل سے فرار ہونیوالے قیدیوں کیلئے مراعاتی پیکج کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر فرار ہونیوالے قیدی واپس آجائیں توان مفرور قیدیوں کو کوئی اضافی سزا نہیں سنائی جائیگی اور پرانے مقدمات میں انہیں سزا دی جائیگی ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ جو لوگ اس پیکج سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی - خبر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صوبے میں تبدیلی والی سرکار کیسی تبدیلی لائی ہے - اللہ کی شان ہے کہ بھوکے ننگے صوبے میں ایسی تبدیلی والی سرکار آئی ہے جن کیساتھ ایسے نابغہ روزگار اور ذہین لوگ بیٹھے ہیں جو اپنی ڈیوٹی بھی انجام نہیں دے سکتے اس لئے اب انہوں نے بھی سیاسی مولویوں والا کام شروع کردیا ہے کہ اگر ووٹ ان کے حق میں دیا تو جنت اور نہیں دیا تو پھر دوزخ بھئی اگر کسی قیدی نے 302 کا کیس کیا ہو اور وہ جیل میں قید تھا اسے پتہ ہے کہ یا تو پھانسی یا پھر عمر قید میری سزا ہے اب ان سزائوں کے بعد مفرور ہونے کی چھ ماہ ایک سال حتی کہ دس سال قید کی سزا کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہاں اگر کوئی جیب کترا جیل میں پھنس گیا ہو تو شائد اس کیلئے یہ مراعاتی پیکج بہتر ہے -صوبائی حکومت قیدیوں کو پکڑ تو نہ سکی اور نہ ہی اپنی جیل کو بچا سکی -بڑی بات یہ ہے کہ حکومت قیدیوں کو

ڈھونڈ بھی نہ سکی ہر قدم ناکام ہونے کے بعد مفرور قیدیوں سے بھیک مانگ رہی ہے کہ خدارا واپس جیلوں میں آجاو ہم آپ کے اوپر کوئی دفعہ نہیں لگائیں گے - اب اس طرح کے پیکیج کا اعلان کرکے کیا ثابت کیا جا رہا ہے؟ اپنی ناکامی یا خیبر پختونخواہ کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے-

عجیب بات ہے کہ ایک طرف پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی پیکجز ختم کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں مختلف ٹیلی کام کمپنیوں کو ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں کہ "لگے رہو رات بھر" جیسے پیکجز جو کہ خصوصا سٹوڈنٹس کیلئے شروع کئے گئے کو ختم کیا جائے اور دوسری طرف ہمارے ہاں تبدیلی اتنی آگئی ہے کہ غریب عوام کے پیسوں پر پلنے والی حکمران قیدیوں کیلئے مراعات پیکج کا اعلان کرکے بھیک مانگ رہی ہیں کہ کہ کم از کم قیدی واپس آجائے اور تبدیلی کے دعویداروں پر جو کالک ملی ہوئی ہے اسے صاف کیا جائے -حالانکہ جو کالک صوبائی حکومت اس وقت اپنے چہرے پر خود لگا رہی ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تبدیلی لانے والوں کو دھماکوں معاشی بدحالی اور بیروزگاری کے بحران سے تباہ حال صوبے کے غریب عوام سے کتنی محبت ہیں گذشتہ روز صوبائی حکومت نے وزیراعلی کے دو مزید معاونین خصوصی مقرر کردیے جن کا درجہ صوبائی وزیر کے برابر ہوگا جبکہ بیک وقت 32 پارلیمانی سیکرٹری مقرر کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا ہے جس کے بعد حکومتی اتحاد میں شامل بیشتر ارکان اکاموڈیٹ ہوگئے ہیں تبدیلی

والی سرکار کے اس اقدام سے حکومتی ٹیم کے ارکان کی تعداد 59 تک پہنچ گئی جنہوں نے لالٹین والی سرکار کے بھی ریکارڈ توڑ دیئے واقفان حال اسے فارورڈ بلاک کے خطرے کے پیش نظر اقدام قرار دے رہے ہیں تبدیلی والی سرکار کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ پارلیمانی سیکرٹری قواعد کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں اور وزراء کی عدم موجودگی میں اسمبلی میں جواب دینگے اور انہیں مراعات بھی دی جائینگی ایک ایسے صوبے میں جہاں پر بیروزگاری بدامنی معاشی بدحالی کی صورتحال ملک کے دیگر صوبوں کے مقابلے میں ابتر ہو وہاں پر اس طرح کا اقدام کونسی تبدیلی ہے یہ سمجھ میں نہ آنیوالی والی بات ہے ویسے یہ بھی سوالیہ نشان ہے کہ وزراء کہاں جائینگے اگر قیہ اسمبلی میں نہیں آئینگے تو پھر کہاں ہونگے ۔ تبدیلی والی سرکار نے ڈیزل کے پرمٹوں کے حوالے سے مشہور ایک سیاسی شخصیت کی دھمکی کے یہ اقدام اٹھایا ہے تیر اور اب شیر کی دوستی یوں بھی خوشحال شخصیت کے اپنے مفادات ہیں اس لئے ان سمیت کسی کو بھی پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں ہونیوالا حالیہ اضافہ نظر نہیں آرہا حالانکہ اس اقدام نے شہریوں کو ذہنی تناؤ کا شکار کردیا ہے کہ پہلے تیر والے لالٹین کی روشنی میں زخم لگاتے تھے اور اب شیر کے پنجوں سے بے حال عوام کو بیٹ سے مار مار کر چھکے اور چوکے مارے جارہے ہیں۔

چوکے اور چھکے پر یاد آیا گذشتہ دنوں امریکی سیکورٹی ایجنسی کیلئے کام کرنے

والے ایک قبائلی ڈاکٹر جنہیں سزا سنائی گئی تھی یہ سزا تو معطل کردی گئی اب اس کیس کی دوبارہ سماعت ہوگی جو فیصلہ سنایا گیا ہے اس میں کمشنر ایف سی آر نے کہا ہے کہ جو سزا سنائی گئی اس کا اختیار متعلقہ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس نہیں تھا کیس چونکہ عدالت میں ہے اس لئے اس پر بات نہیں کی جاسکتی لیکن بھولنے کی بیماری رکھنے والی پاکستانی قوم کو یاد دلانے کیلئے یہی کافی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی بھی بھائی بھائی کی حکومت کے دور میں ہوئی تھی یہ الگ بات کہ اسلامی سزاؤں پر عملدرآمد نہ کرنے والے حکمرانوں کو اس کیس میں دیت یاد آگئی تھی کیونکہ ان کے اپنے مفادات متاثر ہورہے تھے اس لئے اس وقت کے فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے والی اپوزیشن اور حکمرانوں کی کاوشوں سے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی عمل میں لائی گئی-اس سے قبل کا ایک واقعہ جب جنگل کے شیر کی حکمرانی تھی اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایمل کانسی کو جس پر الزام تھا کہ اس نے سی آئی اے کے دو ایجنٹوں کو فائرنگ کرکے قتل کیا تھا انہی کے دور حکومت میں ڈیرہ غازی خان کے ایک ہوٹل سے اٹھا کرلے گئے اور بعد میں زہریلی انجکشن دیکر ایمل کانسی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس وقت بھی ہمارے ایک نامور صحافی جو آج کل سیاستدان ہے اوراس وقت شیر والی سرکار کے اطلاعات و کلچر کے معاون خصوصی تھے نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حساس معاملہ ہے اور کسی کو اس پر سیاست کرنے کی ضرورت نہیں،اور پاکستانی حکومت نے ایمل کونسی کو کوئی حفاظت فراہم نہیں کی تھی ان کے مطابق

ایمل کانسی دوست ملک کو وہ مطلوب تھا سو ہم اس معاملے پر کچھ نہیں کر سکتے صحافیوں سے بات چیت میں متعلقہ صحافی کم سیاستدان کے بقول کئی بار کانسی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا لیکن بعد میں اسے شالیمار ہوٹل ڈیرہ غازی خان سے اٹھا لیا گیا بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایمل کانسی کے بدلے 3.5 ملین ڈالر کی رقم بھی افغانستان اور پاکستان میں کچھ لوگوں کو ادا کردی گئی تھی لیکن یہ کن لوگوں کو ادا کی گئی اس بارے میں امریکی ادارے بھی خاموش ہے ایمل کانسی کو سزا تو ہو گئی وہ شہید تھا یا مجرم اس کا فیصلہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ یہ اس رب العزت کا کام ہے جس نے اسے پیدا کیا لیکن اس کی موت نے جہاں ہمارے شیر والی سرکار کی بہادری اور ملک اور غریب عوام سے محبت ظاہر کردی تھی کہ کیسے کیسے منافق ہمارے اوپر مسلط تھے اور اب ہیں ۔ایمل کانسی کی موت کے بعد اب بلوچستان میں ایمل کانسی کے نام سے ایسا گروپ بھی سامنے آیا ہے جو حکومتی اداروں و اہلکاروں کو نشانہ بنا رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے اس کا فیصلہ بھولنے والی قوم ہی کرے تو اچھا ہے کیونکہ امریکی ایجنٹ ہمارے ملک میں آکر ہمیں نشانہ بنائے اور پھر انہیں سپورٹ کرنے والے حرام خور حکمران آئے لیکن جب ایسا معاملہ ہمارے اپنے بندوں کیساتھ ہو تو پھر انہیں بین الاقوامی تعلقات خارجہ پالیسی اور پتہ نہیں کیا کچھ یاد آتا ہے شائد اب کی بار بھی کچھ ایسا ہو کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن ایک مذہبی جماعت کے پشاور میں ہونیوالے مظاہرے سے اندازہ کیا جاسکتا

ہے کہ دال میں کچھ زیادہ ہی کالا ہے کیونکہ واشنگٹن پوسٹ نے رپورٹ دی ہے کہ امریکہ نے پاکستان میں جاسوسی کا مہنگاترین نظام نصب کردیا ہے اور اس کے ذریعے نہ صرف پاکستان جیسے اتحادی کے کیمیائی اور بائیولوجیکل ہتھیاروں کی نگرانی کی کوشش کررہا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں سی آئی اے کی جانب سے بھرتی کردہ انٹیلی جینس کی وفاداری کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کررہا ہے۔ اللہ تعالی ہمیں منافق حکمرانوں کے منافقانہ رویوں کو سمجھنے کی توفیق دے۔

شام کی صورتحال اور مسلمان ممالک خصوصا سعودی عرب کا کردار

اگر آپ کے اپنے بھائی کیساتھ اختلافات ہوں تو اس کے ہر گز یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اپنے بھائی کی عزت و ناموس کو نیلام کرنے کا کسی کو موقع دیا جائے اور اپنے بھائی کو نشانہ بنانے میں کسی بیرونی شخص کی مدد کی جائے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ والہ وسلم کے اس فرمان کے کے مطابق مومن نہیں ہوسکتا اس وقت تک جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کیلئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اسے اپنے لئے پسند ہو - لیکن اگر اس کے برخلاف اقدام اٹھاتا ہے تو اسے اپنے اعمال ایمان پر غور کرنا چاہیئے کیونکہ ساری دنیا غلط ہوسکتی ہے لیکن فرمان مصطفیٰ غلط نہیں ہوسکتا - اپنے مسلمان بھائی کو دوسروں کے آگے لانے اور اسے عبرت کا نشانہ بنانے والے کوئی بھی ہوں وہ مومن نہیں ہوسکتے - گذشتہ روز راقم نے اپنے ایک صحافی دوست کو شام کی صورتحال پر بات کی اور سعودی عرب کے کردار کے حوالے سے پوچھا تو اس دوست نے سوشل میڈیا پر چلنے والی ایک ویڈیو راقم کیساتھ شیئر کی جس میں کیمیائی ہتھیاروں سے متاثر ہونیوالے لوگوں کی ہلاکتیں دکھائی گئیں افسوسناک مناظر تھے بقول اس پڑھے لکھے آدمی کہ شام میں سنی لوگوں پر کیمیکل ہتھیار استعمال ہوئے ہیں اس لئے اس کے خلاف ایسا کرنا ضروری ہے جب راقم نے سوال کیا کہ اگر

ایسا ہے بھی تو کیا یہ کارروائی کوئی مسلمان ملک نہیں کر سکتا اور امریکہ اور اس کے اتحادی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے تو دوست کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ یہ ایک پڑھے لکھے شخص کا موقف ہے راقم کے دوست جیسا موقف بہت سارے لوگ رکھتے ہیں تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمانوں کو آپس کی نااتفاقیوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان مسلمانوں کو کسی بیرونی دشمن نے نہیں پہنچایا۔ ایران اور عراق کی آٹھ سالہ جنگ کے دوران اسرائیلی وزیراعظم کا یہ جملہ ہم سب مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہے ۔ "کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے دو دشمن ملک آپس میں لڑ رہے ہیں"

ہمیں فرقوں میں تقسیم کرکے خوش ہونیوالے اس خطے کے تیرہ ممالک کو آپس میں لڑا کر کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ شام میں اگر 74 فیصد سنی ہے تو 16 فیصد اہل تشیع لبنان میں 23 فیصد سنی اور 38 فیصد اہل تشیع اور اس طرح کی صورتحال ترکی عراق ایران آذربائیجان سعودب عرب کویت بحرین یمن یو اے ای افغانستان اور پاکستان میں ہیں میں عراقی تیل کی خاطر ڈرامہ سٹیج کرنے والے امریکہ اور اس کے اتحادی آج 2003 شام کو نشانہ بنا رہا ہے اور ہم مسلمان ممالک خوش ہو رہے ہیں اور اپنے دشمنوں کے ہاتھوں اپنے مسلمان بھائی کو تباہ کرنے کے درپے ہیں اس عمل میں بڑا کردار سعودی عرب کا ہے ۔شام میں جاری جنگ میں سعودی عرب کا کردار پہلے کی نسبت زیادہ کھل کر دنیا کے سامنے آیا ہے ہے

گناہ معصوم بچوں اور خواتین کی کیمیائی حملے کی سازش میں ملوث ہونے کے بعد یہ بات کھل کے سامنے آگئی ہے کہ سعودی حکمران اپنے اور اپنے آقا اسرائیل کے مفادات کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ روسی صدر پوٹن نے ایک روسی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ جب انکی سعودی شہزادے بندر سے آخری ملاقات ہوئی تھی تو سعودی عرب نے روس کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر روس شام کے معاملے میں یو این او میں اپنا منہ بند نہیں رکھتا اور شام کی جنگ میں بشار الاسد کی حمایت بند نہیں کرتا تو دو ہزار چودہ میں روسی شہر سوچی میں ہونے والی سرمائی اولمپک میں جہاں دنیا کے کوئی اٹھانوے ممالک کے سیاح اور کھلاڑی آنے کی تیاری کر رہے ہیں، سعودی عرب چیچن جنگجوں اور ازبک اسلامی انتہا پسندوں کی مدد سے دہشت گردانہ حملے کروا کے سارا کھیل مٹی میں ملا دیں گے۔ بین الاقوامی اطلاعاتی ادارے اے پی کے ایک صحافی DALE GAVLAK نے شام میں کچھ باغیوں کا انٹرویو کیا ہے جس میں باغیوں نے اعتراف کیا ہے کہ سعودی انٹیلی جینس چیف پرنس بندر بن سلطان نے کیمیائی ہتھیار انہیں فراہم کئے اور انہیں تنخواہیں بھی سعودب عرب سے ملتی ہے بقول ان باغیوں کے ہم کیمیائی ہتھیار کے استعمال کے حوالے سے تربیت یافتہ نہیں تھے اور ایک حادثے میں باغی بھی اسی کیمیکل کا نشانہ بنے۔ طبّی عملے کی بین الاقوامی تنظیم ڈاکٹرز ود آؤٹ 12 بارڈر نے بھی ایک رپورٹ دی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ 3600 افراد میں ایسی علامات پائی گئی جیسے ان پر کیمیائی ہتھیار استعمال

-- کیا گیا ہو

شام پر کانگریس کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد 11 ستمبر کو امریکہ کی طرف سے باقاعدہ حملوں کا آغاز متوقع ہے کیونکہ پیر یا منگل یعنی 9 یا 10 ستمبر کو امریکی کانگریس کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کی اطلاع پر امریکی حکومت کو شام پر حملے کی اجازت دے گی اور پھر وہی کھیل شروع ہو جائیگا جو کہ 5 فروری 2003 میں اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل میں امریکی سٹیٹ سیکرٹری کولن پاؤل نے یہ بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ صدام حسین دنیا کیلیئے خطرہ ہے اور اس کے پاس مہلک کیمیائی ہتھیار ہے بقول ان کے عراق کے پاس 100 سے 500 ٹن تک کیمیائی ہتھیار موجود ہے کولن پاؤل کے بقول عراقی انٹیلی جینس نے انہیں یہ رپورٹ دی ہے کہ بائیولوجیکل فیکٹریاں بھی عراق میں موجود ہیں جس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں پھر عراق پر جنگ مسلط کردی گئی اور دسمبر کو عید کے روز عراقی صدر صدام حسین کو کیمیائی ہتھیاروں سے کردوں کو 30 ہلاک کرنے اور اہل تشیع کے قتل کے الزام میں پھانسی دیدی گئی بعد میں امریکی صدر جارج بش نے اعتراف کیا کہ امریکہ کو وسیع پیمانے پر تباہ کن ہتھیار نہیں ملے عراق پر حملے میں بھی غداروں کا ہاتھ تھا جس طرح ہلاکو خان کے دور میں بھی دو وزراء نے غداری کی اسی طرح عراق پر حملوں میں عراقی نیشنل اکارڈ بنانے والے الجبوری نے بھی بڑا کردار ادا کیا جس سے امریکی ادارے سی آئی اے کے ایجنٹوں

نے اردن میں ملاقات کی تھی اور 22 نومبر 2022 کو 3000 ڈالر کے عوض وہ امریکی ایجنٹ بن گیا اور بعد میں اس کے گروپ کے 13 افراد کو واشنگٹن میں لے جا کر جاسوسی تخریبی مواد بنانے سمیت مختلف تربیت فراہم کردی گئی اسی شخص کی مدد سے امریکہ صدام انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر قابض ہونے میں کامیاب رہا لیکن بعد میں امریکہ اپنے مفادات حاصل کر چکا تو اسی الجبوری کے بقول "جب تک امریکہ کا مفاد ہے وہ آپ سے دل وجان سے پیار کرتا ہے اور جونہی اس کا مطلب نکلتا ہے تو وہ آپ کو دیکھتا بھی نہیں "۔امریکہ اور اس کے چند مخصوص اتحادی موجودہ صورتحال میں امریکی حکومت کی جانب سے شام پر چڑھائی سے جہاں امریکہ اپنے مخالفوں کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کے احکامات نہ ماننے والوں کا حشر کیسا ہوتا ہے دوسرے حزب اللہ کو بھی کمزور کرسکے گا جبکہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جس ناکامی سے دوچار ہے اس میں ایک مرتبہ پھر تیزی لاسکے گا اور دنیا بھر میں یہ تاثر پھیلایا جائیگا کہ القائدہ کے خلاف مہم کیلئے تمام مغربی ممالک کو ایکساتھ کام کرنا چاہیئے۔تیل کی خاطر سٹیج کئے جانیوالے اس ڈرامے میں مسلمان ممالک خصوصا سعودی عرب کا کردار انتہائی افسوسناک ہے۔

منافق حکمران اور دال میں کچھ زیادہ ہی کالا

خیبر پختونخواہ حکومت نے ڈیرہ اسماعیل خان جیل سے فرار ہونیوالے قیدیوں کیلئے مراعاتی پیکج کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر فرار ہونیوالے قیدی واپس آ جائیں تو ان مفرور قیدیوں کو کوئی اضافی سزا نہیں سنائی جائیگی اور پرانے مقدمات میں انہیں سزا دی جائیگی ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ جو لوگ اس پیکج سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی - خبر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صوبے میں تبدیلی والی سرکار کیسی تبدیلی لائی ہے - اللہ کی شان ہے کہ بھوکے ننگے صوبے میں ایسی تبدیلی والی سرکار آئی ہے جن کیساتھ ایسے نابغہ روزگار اور ذہین لوگ بیٹھے ہیں جو اپنی ڈیوٹی بھی انجام نہیں دے سکتے اس لئے اب انہوں نے بھی سیاسی مولویوں والا کام شروع کردیا ہے کہ اگر ووٹ ان کے حق میں دیا تو جنت اور نہیں دیا تو پھر دوزخ بھئی اگر کسی قیدی نے 302 کا کیس کیا ہو اور وہ جیل میں قید تھا اسے پتہ ہے کہ یا تو پھانسی یا پھر عمر قید میری سزا ہے اب ان سزاؤں کے بعد مفرور ہونے کی چھ ماہ ایک سال حتی کہ دس سال قید کی سزا کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہاں اگر کوئی جیب کترا جیل میں پھنس گیا ہو تو شائد اس کیلئے یہ مراعاتی پیکج بہتر ہے - صوبائی حکومت قیدیوں کو پکڑ تو نہ سکی اور نہ ہی اپنی

جیل کو بچا سکی ۔بڑی بات یہ ہے کہ حکومت قیدیوں کو ڈھونڈ بھی نہ سکی ہر قدم ناکام ہونے کے بعد مفرور قیدیوں سے بھیک مانگ رہی ہے کہ خدا را واپس جیلوں میں آجاو ہم آپ کے اوپر کوئی دفعہ نہیں لگائیں گے ۔ اب اس طرح کے پیکیج کا اعلان کرکے کیا ۔ثابت کیا جارہا ہے؟ اپنی ناکامی یا خیبر پختونخواہ کو بے وقوف بنایا جارہا ہے

عجیب بات ہے کہ ایک طرف پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی پیکجز ختم کررہی ہیں اور اس سلسلے میں مختلف ٹیلی کام کمپنیوں کو ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں کہ "لگے رہو رات بھر" جیسے پیکجز جو کہ خصوصا سٹوڈنٹس کیلئے شروع کئے گئے کو ختم کیا جائے اور دوسری طرف ہمارے ہاں تبدیلی اتنی آگئی ہے کہ غریب عوام کے پیسوں پر پلنے والی حکمران قیدیوں کیلئے مراعات پیکج کا اعلان کرکے بھیک مانگ رہی ہیں کہ کم از کم قیدی واپس آجائے اور تبدیلی کے دعویداروں پر جو کالک ملی ہوئی ہے اسے صاف کیا جائے ۔حالانکہ جو کالک صوبائی حکومت اس وقت اپنے چہرے پر خود لگا رہی ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تبدیلی لانے والوں کو دھماکوں معاشی بدحالی اور بیروزگاری کے بحران سے تباہ حال صوبے کے غریب عوام سے کتنی محبت ہیں گذشتہ روز صوبائی حکومت نے وزیراعلی کے دو مزید معاونین خصوصی مقرر کردیئے جن کا درجہ صوبائی وزیر کے برابر ہوگا جبکہ بیک وقت 32 پارلیمانی سیکرٹری مقرر کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا ہے

جس کے بعد حکومتی اتحاد میں شامل بیشتر ارکان اکاموڈیٹ ہوگئے ہیں تبدیلی والی سرکار کے اس اقدام سے حکومتی ٹیم کے ارکان کی تعداد 59 تک پہنچ گئی جنہوں نے لالٹین والی سرکار کے بھی ریکارڈ توڑ دیئے واقفان حال اسے فارورڈ بلاک کے خطرے کے پیش نظر اقدام قرار دے رہے ہیں تبدیلی والی سرکار کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ پارلیمانی سیکرٹری قواعد کے مطابق مقرر کئے گئے ہیں اور وزراء کی عدم موجودگی میں اسمبلی میں جواب دینگے اور انہیں مراعات بھی دی جائینگی ایک ایسے صوبے میں جہاں پر بیروزگاری بدامنی معاشی بدحالی کی صورتحال ملک کے دیگر صوبوں کے مقابلے میں ابتر ہو وہاں پر اس طرح کا اقدام کونسی تبدیلی ہے یہ سمجھ میں نہ آنیوالی والی بات ہے ویسے یہ بھی سوالیہ نشان ہے کہ وزراء کہاں جائینگے اگر قیہ اسمبلی میں نہیں آئینگے تو پھر کہاں ہونگے ۔ تبدیلی والی سرکار نے ڈیزل کے پرمٹوں کے حوالے سے مشہور ایک سیاسی شخصیت کی دھمکی کے یہ اقدام اٹھایا ہے تیر اور اب شیر کی دوستی ہیں خوشحال شخصیت کے اپنے مفادات ہیں اس لئے ان سمیت کسی کو بھی پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں ہونیوالا حالیہ اضافہ نظر نہیں آرہا حالانکہ اس اقدام نے شہریوں کو ذہنی تناؤ کا شکار کردیا ہے کہ پہلے تیر والے لالٹین کی روشنی میں زخم لگاتے تھے اور اب شیر کے پنجوں سے بے حال عوام کو بیٹ سے مار مار کر چھکے اور چوکے مارے جارہے ہیں ۔

چوکے اور چھکے پر یاد آیا گذشتہ دنوں امریکی سیکورٹی ایجنسی کیلئے کام کرنے والے ایک قبائلی ڈاکٹر جنہیں سزا سنائی گئی تھی یہ سزا تو معطل کردی گئی اب اس کیس کی دوبارہ سماعت ہوگی جو فیصلہ سنایا گیا ہے اس میں کمشنر ایف سی آر نے کہا ہے کہ جو سزا سنائی گئی اس کا اختیار متعلقہ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس نہیں تھا کیس چونکہ عدالت میں ہے اس لئے اس پر بات نہیں کی جاسکتی لیکن بھولنے کی بیماری رکھنے والی پاکستانی قوم کو یاد دلانے کیلئے یہی کافی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی بھی بھائی بھائی کی حکومت کے دور میں ہوئی تھی یہ الگ بات کہ اسلامی سزاؤں پر عملدرآمد نہ کرنے والے حکمرانوں کو اس کیس میں بہت یاد آ گئی تھی کیونکہ ان کے اپنے مفادات متاثر ہورہے تھے اس لئے اس وقت کے فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے والی اپوزیشن اور حکمرانوں کی کاوشوں سے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی عمل میں لائی گئی۔اس سے قبل کا ایک واقعہ جب جنگل کے شیر کی حکمرانی تھی اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایمل کانسی کو جس پر الزام تھا کہ اس نے سی آئی اے کے دو ایجنٹوں کو فائرنگ کرکے قتل کیا تھا انہی کے دور حکومت میں ڈیرہ غازی خان کے ایک ہوٹل سے اٹھا کر لے گئے اور بعد میں زہریلی انجکشن دیکر ایمل کانسی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس وقت بھی ہمارے ایک نامور صحافی جو آج کل سیاستدان ہے اوراس وقت شیر والی سرکار کے اطلاعات و کلچر کے معاون خصوصی تھے نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حساس معاملہ ہے اور کسی کو اس پر سیاست کرنے کی ضرورت نہیں اور

پاکستانی حکومت نے ایمل کونسی کو کوئی حفاظت فراہم نہیں کی تھی ان کے مطابق ایمل کانسی دوست ملک کو وہ مطلوب تھا سو ہم اس معاملے پر کچھ نہیں کر سکتے صحافیوں سے بات چیت میں متعلقہ صحافی کم سیاستدان کے بقول کئی بار کانسی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا لیکن بعد میں اسے شالیمار ہوٹل ڈیرہ غازی خان سے اٹھا لیا گیا بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایمل کانسی کے بدلے 3.5 ملین ڈالر کی رقم بھی افغانستان اور پاکستان میں کچھ لوگوں کو ادا کر دی گئی تھی لیکن یہ کن لوگوں کو ادا کی گئی اس بارے میں امریکی ادارے بھی خاموش ہے ایمل کانسی کو سزا تو ہو گئی وہ شہید تھا یا مجرم اس کا فیصلہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ یہ اس رب العزت کا کام ہے جس نے اسے پیدا کیا لیکن اس کی موت نے جہاں ہمارے شیر والی سرکار کی بہادری اور ملک اور غریب عوام سے محبت ظاہر کر دی تھی کہ کیسے کیسے منافق ہمارے اوپر مسلط تھے اور اب ہیں -ایمل کانسی کی موت کے بعد اب بلوچستان میں ایمل کانسی کے نام سے ایسا گروپ بھی سامنے آیا ہے جو حکومتی اداروں و اہلکاروں کو نشانہ بنا رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے اس کا فیصلہ بھولنے والی قوم ہی کرے تو اچھا ہے کیونکہ امریکی ایجنٹ ہمارے ملک میں آکر ہمیں نشانہ بنائے اور پھر انہیں سپورٹ کرنے والے حرام خور حکمران آئے لیکن جب ایسا معاملہ ہمارے اپنے بندوں کیساتھ ہو تو پھر انہیں بین الاقوامی تعلقات خارجہ پالیسی اور پتہ نہیں کیا کچھ یاد آتا ہے شائداب کی بار بھی کچھ ایسا ہو کچھ کہہ نہیں سکتے

لیکن ایک مذہبی جماعت کے پشاور میں ہونیوالے مظاہرے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دال میں کچھ زیادہ ہی کالا ہے کیونکہ واشنگٹن پوسٹ نے رپورٹ دی ہے کہ امریکہ نے پاکستان میں جاسوسی کا مہنگاترین نظام نصب کردیا ہے اور اس کے ذریعے نہ صرف پاکستان جیسے اتحادی کے کیمیائی اور بائیولوجیکل ہتھیاروں کی نگرانی کی کوشش کررہا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں سی آئی اے کی جانب سے بھرتی کردہ انٹیلی جینس کی وفاداری کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کررہا ہے۔ اللہ تعالی ہمیں منافق حکمرانوں کے منافقانہ رویوں کو سمجھنے کی توفیق دے۔

ٹھمکوں والی قوم نانبائی اور تبدیلی

خیبر پختونخواکے ایک مخصوص علاقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ "ڈھول" کی آواز سن کر اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتے اور اگر کہیں پر ڈھول کی آواز سن لیں تو انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے اور یہ بالکل صحیح بات ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ڈھول کی آواز سن کر ناچنے والوں میں ہر عمر ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ اب تو خیر ڈھول کی آواز سن کر ہم بھی دل تھام لیتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر ہم نے کہیں غلطی سے ٹھمکا لگادیا تو پھر ساری عمر ہمارے لئے ایک طعنہ بن کر رہے گا کیونکہ ایک دفعہ یہ غلطی کر چکے ہیں اس لئے دوبارہ غلطی کی گنجائش نشتہ یہ الگ بات کہ اس غلطی میں ساتھ دینے والا ہمارا دوست عرفان خٹک آج کل بیرون ملک ملازمت کر رہا ہے لیکن ہماری بدقسمتی کہ کسی نے ہمارے ٹھمکے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کردیئے اور اب ہمیں لوگوں کی طعنوں کیلئے چھوڑ دیا ہے طعنوں کیساتھ لوگ ہمیں کبھی فنکار کہہ دیتے ہیں اور کوئی دل جلا تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اگر کہیں شادی میں پروگرام ہو تو آپ کو بلائیں گے۔ خیر بات ڈھول کی ہو رہی ہیں گذشتہ روز ایک ٹی وی چینل پر نئے بننے والے صدر کی خوشی میں ان کے محلے والوں نے وہ ٹھمکے لگائے اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کیا جس سے اندازہ لگایا کہ نئے صدر ایسے علاقے میں رہتے تھے جہاں

پر " ٹھمکے " لگانے والے زیادہ تھے لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ کچھ لوگ نئے آنیوالے کی خوشی میں ٹھمکے لگا رہے تھے اور کچھ لوگ جانے والے کی خوشی میں ٹھمکا لگا رہے تھے - کہ یہ جمہوریت ہے اور جمہوری نظام کو بچانے کیلئے جانے والے نے بڑا کردار ادا کیا اور نیا آنیوالا جمہوری نظام کو بچانے کیلئے ساری عمر ممنون رہے گا۔ بچپن سے ہمیں ٹھمکے دیکھنے کی عادت ہے ٹھمکوں سے ہمارا واسطہ تقریبا ضیاء الحق کے دور سے ہے ان کی ناگہانی موت پر جہاں بڑے بڑے ٹی وی اینکروں کو روتے ہوئے دیکھا تو کچھ ایسے لوگوں کو بھی روڈوں پر ٹھمکے لگاتے دیکھا کہ جن کے بقول ملک سے آمریت کا خاتمہ ہوا اور پھر ٹھمکوں کا سلسلہ شروع ہوا بے نظیر کی حکومت آئی یا پھر نواز شریف کی معین قریشی کی حکومت آئی کہ پرویز مشرف کی یا اس کے بعد آنیوالے ہم نے ہر دفعہ روڈوں پر لوگوں کو جانیوالے کی خوشی میں ٹھمکے لگاتے ڈھول کی تاپ پر ناچتے اور فائرنگ کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک سے جان چھوٹی اور نیا آنیوالا فرشتہ ان کی زندگی میں بہاریں لیکر آئیگا لیکن یہی صورتحال کچھ عرصہ بعد نئی آنیوالی حکومت کیلئے لوگوں کی دیکھی جس سے اندازہ ہوگیا کہ پاکستانی قوم میں عقل و شعور نام کی کوئی چیز نہیں نہ ہی اس قوم نے ماضی سے کچھ سیکھا اور نہ ہی آئندہ سیکھنا چاہتی ہے ہاں انہیں ٹھمکے لگانے کا بہت شوق ہے کہ کوئی آئے یا جائے بس انہیں موقع اور ڈھول کی تھاپ چاہئیے اور ٹھمکے لگانے کیلئے میدان -

میدان تو تبدیلی والی سرکار نے پشاور شہر کے نانبائیوں کیلئے بھی کھلا چھوڑ دیا ہے اور ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں 90 دن میں کرپشن کے دعویدار شہر کے نانبائیوں کو ٹھیک ہی نہیں کرسکے - پشاور میں نانبائیوں نے بالآخر حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا، ہمارے ہاں نانبائیوں کی زیادہ شہروں میں سنی جاتی ہیں جہاں پر بقول ہمارے ایک صحافی دوست کے شہر کی زیادہ تر خواتین روٹی اور پراٹھے نہیں پکا سکتی اس لئے شہری لوگ مجبورا نانبائیوں سے روٹی لانے پر مجبور ہوتے ہیں-اسی وجہ سے ہمارے صحافی دوست نے پینڈو مطلب گائوں کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کی ہے کہ کم از کم گھر میں تندور پر روٹی تو تازہ پکی ہوئی ملے گی - ہمارے ایک ساتھی صحافی عمران یوسف زئی نے رپورٹ بنائی ہے کہ پشاور میں نانبائیوں نے بالآخر تبدیلی والی سرکار کو گھٹنوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کردیا ہے۔روٹی کے وزن میں صرف پچاس گرام اور قیمت میں چار روپے اضافہ کرواکے ہی دم لیا آٹے کی گرانی اور نایابی نانبائیوں کے لئے اپنے مطالبات منوانے کا بہانہ بن گئی، چند روز تندور بند کئے گئے اور انتظامیہ نے بالآخر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، اب چھ روپے میں ملنے والی 120 گرام کی روٹی 170 گرام کی ہوگی جبکہ قیمت ہوگی دس روپے، نانبائی حضرات اب بھی اسے اپنے مطالبات کی کامیابی قرار نہیں دیتے۔ انتظامیہ کی جانب سے ڈبل روٹی کی فروخت پر پابندی اور خلاف ورزی کرنے والوں کو 3 ماہ کی جیل کی نوید سنائی گئی ہے، جبکہ نرخنامہ کی خلاف ورزی پر 25 ہزار روپے جرمانہ سمیت

ایک ماہ کی جیل کی سزا بھی رکھی گئی ہے، لیکن ان سزائوں پر عمل درآمد کب اور کیسے ہوگا اس کے لئے کوئی طریقہ کار نہیں رکھا گیا۔انتظامیہ کے لئے یقینی طور پر سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ روٹی ڈبل ہو یا سنگل نانبائیوں کو مقررہ وزن کے مطابق روٹی بیچنے کا پابند بنایا جائے۔ تبدیلی کے نعرے کے ساتھ اقتدار میں آنے والی پی ٹی آئی کی حکومت کے ابتدائی تین ماہ تو بغیر کسی تبدیلی کے گزر گئے ہیں، تاہم مہنگائی میں مسلسل اضافے نے عوام کی امیدیں ماند کردی ہیں اس لئے بعض علاقوں میں تو شہریوں نے یہاں تک بینر لگا دیئے ہیں کہ "ہمیں نیا پاکستان نہیں چاہیے پرانا والا ہی ٹھیک ہے لیکن ہمارے مسائل حل کرو" اس طرح کے بینرز شہر کے مختلف علاقوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بینرز پر یاد آیا کہ مختلف سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج کے بڑے بڑے بینرز تو لگا دیئے گئے ہیں لیکن علاج کیسے ہورہا ہے اور کیسے کیسے قصائی ڈاکٹروں کے روپ میں ہسپتال میں بھرتی کئے گئے ہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور کے ڈاکٹروں کی غفلت سے پشاور کا تیرہ سالہ طالبعلم اور کرکٹ کا شیدائی ایک آنکھ سے محروم ہوگیا۔۔۔ڈاکٹروں نے پہلے آنکھ میں عدسہ لگایا پھر پوری آنکھ ہی نکال دی پشاور کے نواحی علاقہ خٹر کی کا رہائشی شہزادآنکھ میں پردے کی شکایت پر لیڈی ریڈنگ ہسپتال علاج کیلئے گیا اسے کیا پتا تھا کہ وہ مسیحاوں کے علاج سے صحت یاب ہونے کے بجائے

ایک آنکھ سے ہی محروم ہو جائے گا ای این ٹی وارڈ میں ڈاکٹروں نے پہلے شہزاد کی آنکھ میں لینز لگایا جس سے آنکھ سوج گئی اسے دوبارہ ہسپتال لے جایا گیا جہاں اس بار ڈاکٹروں نے اسے آنکھ سے ہی محروم کر دیا پانچویں جماعت کا طالبعلم اور کرکٹ کا شیدائی شہزاد اب حسرت بھری نظر سے اپنے دوستوں کو دیکھتا رہے گا۔ شہزاد کے والد شہریار سے اپنے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جاتی دکھیارا باپ اپنے بیٹے کی حالت کا ذمہ دار ہسپتال انتظامیہ کو ٹھہراتا ہے بقول اس کے شہزاد آپریشن سے قبل ٹھیک تھا لیکن ہاؤس جاب ڈاکٹروں نے میری بیٹے کی زندگی اندھیروں میں ڈال دی اب اس کا میں کیا کروں ں شہزاد کی ایک آنکھ سے محرومی نے جہاں اس کے گھر والوں کو سوگوار کر دیا ہے وہیں اس کے کرکٹ کے ساتھی بھی انتہائی مغموم نظر آتے ہیں۔ خیبر پختونخواہ ہیں تبدیلی والی سرکار کتنی تبدیلی لیکر آئی ہے کہ گذشتہ دنوں ہسپتال ہیں اسی بچے کے حوالے سے ڈاکٹروں سے موقف لینے کیلئے چکر لگایا تو پتہ چلا کہ شکایات سننے والے اہلکار ڈیوٹی پر موجود نہیں تھے کچھ دیر بعد ایک بارلیش شخص کیساتھ وہاں پر نظر آئے شکایت پر متعلقہ اہلکار کا موقف تھا کہ اس بارے میں وہ انکوائری کرلیں گے تاہم اس دوران بارلیش شخصیت نے جواب دیا کہ میرا بیٹا بیمار تھا اور وہ تبدیلی والی سرکار کی طرف سے صحت کے محکمے پر نازل ہونیوالے وزیر کے بھائی ہے اس لئے کمپلینٹ سیل کے متعلقہ شخصیت کو اپنے ساتھ لیکر گئے تھے یہ الفاظ موصوف نے بڑے فخر سے ادا کئے تھے تاہم راقم نے جب سوال کیا کہ اگر

ایسا ہے بھی تو کیا ہوا کیا ہسپتال میں آنیوالے عام مریضوں کی کوئی حیثیت نہیں! جواب ندارد خیر اگر یہی تبدیلی خیبر پختونخواہ کی لوگوں کی قسمت میں لکھی تھی تو اللہ ہمارے حال پر رحم کرے-

آئینہ اور تبدیلی والے پاڑ

آئینہ ان لوگوں کو دکھانا جو اپنی شکل دیکھنا ہی پسند نہیں کرتے یا انہیں اپنے چہرے پر پڑی گندگی سے اتنی محبت ہو گئی ہو کہ وہ کسی اور چیز کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے یا پھر اپنی پسند کے منظر دیکھنے کے خواہشمند ہوں ایسے لوگوں کو ان کے ارد گرد سے باخبر رکھنا یقینا دل گردے کی بات ہے راقم کے کچھ ساتھی ایک مخصوص پارٹی سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کی گالیوں دھمکیوں سے بچنے کیلئے اب انہیں آئینہ دکھانے کی کوشش ہی نہیں کرتے شائد یہ بھی خود فریبی کی ایک مثال ہو کہ جانتے بوجھتے سچ کو چھپا لیا جائے اور وہی کچھ لوگوں کو دکھایا جائے جو ان کو پسند ہو تو یقینا یہ اس قلم کیساتھ زیادتی ہو گی جسے اللہ نے بطور گواہ پیش کیا ہے قرآن کریم میں ، اللہ تعالی یقینا جس طرح ہر انسان سے اس کی زندگی کے ہر سیکنڈ کا حساب کریگا اسی طرح راقم جیسے حقیر انسان سے بھی پوچھے گا کہ اے میرے بندے اگر قلم تیرے ہاتھ میں دیا تھا تو اس قلم سے میرے بندے تو نے کیا کیا لوگوں کو خوش کرنے کا طریقہ سیکھا پیٹ کا دوزخ بھرا یا پھر حرام کمانے کیلئے استعمال کیا اور یہ سوال ہر صاحب قلم سے ہوگا سو جن لوگوں کو راقم کا سچ برا لگتا ہے تو لگتا رہے کیونکہ رازق اللہ تعالی ہے اور زندگی موت دولت عزت و ذلت سب کچھ

-اسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے راقم اللہ تعالی سے مددگار کا خواستگار ہے
ویسے بھی میری مثال اس بچے جیسے ہو گئی ہے جس کو سچ بولنے کی بیماری ہے اور اسی سچ کی وجہ سے ہر وقت اس کے اپنے گھر میں پٹائی ہوتی ہے ایک دن اسی بچے کی ایک دور کی رشتہ دار خاتون اس بچے کے گھر آئی جب گھر والوں کی طرف سے بچے کی پٹائی کا منظر دیکھا تو افسوس ہوا اور گھر والوں کو راضی کیا کہ اس بچے کو وہ اپنے گھر لے جائیگی گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ یہ بچہ بڑا منہ پھٹ ہے اس لئے اسے ادھر ہی چھوڑ دیں لیکن رشتہ دار خاتون بچے کو اپنے گھر لے آئی آتے ہی پوچھا کہ تمھارے ساتھ گھر والے کیوں اتنی سختی کرتے ہیں بچے نے جواب دیا کہ میں سچ بولتا ہوں جو کسی کو پسند نہیں آتا خاتون نے جواب دیا کہ بس بیٹا آج سے ڈرنے کی ضرورت نہیں سچ بولو یہاں کوئی تمھیں نہیں مارے گا - دوسرے دن وہی بچہ گھر میں دوسرے بچوں کیساتھ کھیل رہا تھا کہ وہی خاتون آئی اور بچے سے پوچھا کہ بیٹا کوئی مسئلہ تو نہیں سچ تو بول رہے ہو بچے نے خوفزدہ نظروں سے اس خاتون کو دیکھا اور جواب نفی میں دیا - خاتون نے کہا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں کہہ دیا کرو بچے نے جواب دیا کہ اگر ابھی سچ بول دیا تو آپ میری پٹائی کریگی -بچے نے خاتون رشتہ دار کی یقین دہانی پر آخر کار سچ بول ہی دیا اور کہ خالہ "آپ بوڑھی بھی ہیں مجھے یہ بتایئے گا کہ اس عمر میں آپ کو اپ سٹک اور مسکارا لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے اللہ اللہ کرنے

کی عمر ہے یہ لڑکیوں والے فیشن چھوڑ دیں اپنی عمر کا خیال کریں" یہ سننا تھا کہ اسی خاتون رشتہ دار نے جو بچے کو اپنے ساتھ لیکر آئی تھی جوتا اتارا اور بچے کی پٹائی شروع کردی۔ سو لالٹین اور تیر والی سرکار کے دور میں راقم پر الزام لگتا رہا کہ یہ تبدیلی والی سرکار کا پٹھو ہے کئی نزدیکی دوست اس معاملے پر ناراض بھی ہوگئے کیونکہ لالٹین اور تیر والی سرکار کے حق میں لکھنا ہی نہیں آتا اس وقت تبدیلی والی سرکار کے جذباتی کارکن .بڑے خوش ہوتے تھے اب تبدیلی والی سرکار کا دور ہے اور اسے ہم آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو لالٹین والے اور تیر والے .بڑے خوش ہوتے ہیں حالانکہ ہم اپنی عادت سے مجبور ہیں کیونکہ حکمرانوں سے عوام کا حساب ہوگا اور ہم اسی حساب کا سوچ کران کو آئینہ دکھاتے ہیں جس پر تبدیلی والی سرکار کے کارکن گالیاں بھی دیتے ہیں خیر ہم پہلے بھی دعا کرتے تھے اب بھی ان جیسوں کیلئے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالی انہیں اور عزت دے۔

عزت پر یاد آیا کہ چند دن قبل تبدیلی والی سرکار کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے طلباء تنظیم کا ایک گروپ صحت کے محکمے پر .براجمان وزیر کے دفتر گیا جہاں پر ان کی اپنی پارٹی کے لوگوں نے دیکھا کہ وزیر صحت کی سیٹ پر چھوٹا بھائی بیٹھا ہوا ہے اور وہاں پر تعینات اہلکاروں سے بدتمیزی سے پیش آرہا ہے،اس کا رویہ ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ خود وزیر ہو نظریاتی طلباء نے بھی یہ

صورتحال دیکھی اس دوران طلباء کیساتھ بھی بدتمیزی ہوئی اور پھر انہی طلباء نے وزیر کے بھائی کی خوب عزت افزائی کی صورتحال یہاں تک پہنچی کہ کلاشنکوف بردار پہنچ گئے لیکن حالات پھر بھی کنٹرول نہ ہوسکے بقول ان طلباء کے ہم نے تحریک تبدیلی کیلئے شروع کی تھی اور یہ تبدیلی عوام کیلئے لائی گئی تھی کسی ایک پارٹی یا شخصیت کیلئے نہیں تھی تبدیلی والی سرکار سے نظریاتی کارکن اتنے بددل ہوگئے ہیں کہ کہ پارٹی میں ہی تبدیلی والے فورم بن رہے ہیں جن کا موقف ہے کہ مفاد پرستوں نے تبدیلی کے نعرے لگانے والے نظریاتی کارکنوں کو کھڈے لائن لگا کر کاروبار شروع کردیا ہے اور انکی دکانداری شروع ہوگئی ہے -بات سے بات نکلی ہے تو یاد آیا کہ چند دن قبل اسی تبدیلی والی سرکار سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے یونیورسٹی ٹاؤن میں ایک میڈیکل سٹور کو بلیک میل کرتے ہوئے دھمکی دی کہ نقد "دو ورنہ پھر ہماری ٹیم چھاپہ مارے گی متعلقہ لوگوں نے اپنے آپ کو ماچس کی تیلی کی طرح دبلی پتلی ایک اہم شخصیت کا کارخاص بتایا - خیر قصہ مختصر کہ مال تو وہ بٹور نہ سکے البتہ انہیں بھاگتے ہی بنی یہ الگ قصہ ہے اب ایسے لوگ بھی تبدیلی لائیں گے ویسے اگر بلیک میلنگ اور بدمعاشی ہی کرنی ہے تو پھر خدا کی زمین پر اپنی بدمعاشی جتلانے والے لالٹین والی سرکار اور عوام کے حلق میں تیر گھسیٹر کر خون چوسنے والوں میں کیا فرق ہے ہاں فرق شاید اتنا ہی ہے کہ پہلے عام نسوار بازار میں ملتی تھی اور اب تبدیلی والی چیونگم سے لیکر تبدیلی والے پاپڑ تبدیلی والے

نسوار اور تبدیلی والے جوس ہر جگہ دستیاب ہیں۔ باقی تو وہی پرانا ڈرامہ ہے

کیا یہ سارے لوگ غدار ہیں

اگر کوئی شخص یا ادارہ آپ کو روزانہ مخصوص ایریا میں جانے سے روکے یا آپ کے پیشے کی وجہ سے آپ کیساتھ بد تمیزی سے پیش آئے ایسا لہجہ استعمال کرے جس سے آپ کو اپنا آپ دنیا کا گھٹیا ترین شخص محسوس ہو یا دوسرے لوگوں کیساتھ اس کا رویہ دوسرا ہو اور آپ کے ساتھ اس کا رویہ الگ ہو تو کیا یہ جانبداری نہیں - یہ وہ روز کا رونا ہے جو مجھ جیسے کئی سویلین اور صحافی ہر روز کرتے ہیں لیکن ان کا رونا کسی کو نظر نہیں آتا -جب کبھی کسی سویلین کو کینٹ کے ایریا میں جانا ہوتا ہے اور انہیں چیک پوسٹوں پر تعینات وردی والے انتہائی بد تمیزی سے روکتے ہیں اگر ان کی مرضی ہو تو آگے جانے دیتے ہیں ورنہ کسی کی اوقات نہیں کہ ان کے احکامات کی خلاف ورزی کرے کیونکہ یہ زمین پر بنے خدا ہیں اور ان کا لکھا ہوا پتھر پر لکیر ہوتا ہے کسی ٹٹ پونجیے سویلین کی اوقات نہیں کہ ان کے آفاقی قانون پر بات کرے -حالانکہ انہی چیک پوسٹوں پر بڑے بڑے بینرز میں لکھا ہوتا ہے کہ خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے لیکن وردی والوں کا سویلین اور خصوصا صحافیوں کیساتھ رکھا جانیوالا رویہ ایسا ہوتا ہے کہ شائد اخلاق کے بھاشن سویلین اور صحافیوں کیلئے ہیں ان لوگوں کیلئے نہیں - سیکورٹی کے نام پر اس شہر میں کیا ہو رہا ہے

کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ یہ جانبدارانہ رویہ کیا آئین پاکستان کی خلاف ورزی ہے جسے ہمارے ہاں ہر جگہ لایا جاتا ہے مولویوں سے لیکر مفاد پرست سیاسی عناصر ہر جگہ پر آئین کو لاتے ہیں ساتھ میں یہ اس محمد عربی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اس فرمان کے بھی خلاف ہے جو آپ صلی اللہ والہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ کسی کالے کو گورے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔لیکن یہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے جس میں ہر چیز نہ صرف اس محمد عربی جس کے ہم سب امتی ہیں کے احکامات کے خلاف ہو رہا ہے بلکہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے آئین کا بھی مذاق اڑایا جارہا ہے۔ کیونکہ اسی ملک اور اسی شہر میں غریب کو امیر پرٗ مولوی کو عام آدمی پر اور وردی والے کو سویلین پر فوقیت حاصل ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا اور پیسہ ہے پاکستان میں دنیا اسی کی ہے اور ی شائد واحد خطہ ہے جہاں پر وردی والے کے خلاف کچھ کہاٗ لکھا نہیں جاتا اور نہ ہی کوئی لکھنے کی جرات کرتا ہے کیونکہ سچائی لکھنے پر لکھنےٗ بولنے پر ڈر لگتا ہے کہ " لاپتہ افراد " کی فہرست میں شامل نہ ہو جائے۔

صحافی واحد لوگ ہیں جو ہر کسی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں اور لڑنے کی ہمت رکھتے ہیں لیکن جب وردی والے ہو تو ان کی بھی گھگھی بندھ جاتی ہیں اور بڑے بڑے صحافی بھی ہاتھ بندھے کھڑے نظر آتے ہیں اور ان کیساتھ رویہ بھی وردی والوں

کا ایسا ہوتا ہے جیسے صحافی ہونا شودر سے بھی بدتر ہوٗ ہر ایک کو جاسوسٗ دشمن سمجھنے کی اس سوچ نے صورتحال یہاں تک پہنچا دی ہیں کہ اب تو کبھی کبھار شک ہونے لگتا ہے کہ یقیناً صحافی تھرڈ کلاس کے شہریٗ جاسوس اور غدار ہےٗ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ غیر ملکی اداروں سے وابستہ صحافیوں پر ملک دشمن ہونے کا الزام تو لگتا ہے اور انہیں بے عزت بھی کیا جاتا ہے لیکن یہی وردی والے جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد غیر ملکی امدادی اداروں کیساتھ بھاری مشاہروں پر لگ جاتے ہیں اور انہیں سیکورٹی کے نام پر بہت کچھ بتاتے رہتے ہیں کیا وہ آسمان سے اترے فرشتے ہیں۔ کسی زمانے میں ہمارے معاشرے میں خواتین کیساتھ رویہ وردی والوں کا بہت اچھا ہوتا تھا لیکن اب تو یہ صورتحال بن گئی ہیں کہ جس طرح اس ملک میں ہر داڑھی والا مشکوک سمجھا جاتا ہے وہی پردے دار خواتین بھی مشتبہ بن گئی ہیں اور ان کیساتھ چیک پوسٹوں پر ایسا رویہ رکھا جاتا ہے کہ خدا ہی پوچھےٗ

اپنے آپ کو محب وطن اور دوسروں کو غدارٗ چور اور تھرڈ کلاس شہری سمجھنے کی اس سوچ نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ اب اداروں کے مابین نفرتیں بڑھ رہی ہیں اور یہ عمل کچھ نادانوں کی وجہ سے ہےٗ کیونکہ اگر وردی والیع بدنام ہوتے ہیں تو یہ بھی میری بدنامی ہے کیونکہ یہ لوگ میرے اپنے لوگ ہیںٗ لیکن اگر میرے اپنے مجھے غداریٗ چور اور تھرڈ کلاس شہری سمجھیں تو میں

کیا کروں کیونکہ ہر شخص کی طرح میں بھی محب وطن ہوں کوئی اگر ہتھیار سے گولی چلاتا ہے تو وہی کام میں قلم کے ذریعے کرتا ہوں کوئی اس سرزمین کو میلی نگاہ سے دیکھے یہ مجھے قبول ہی نہیں کیونکہ یہ دھرتی میری ماں جیسی ہے اور اس کیلئے میں جان کی قربانی دینے کیلئے بھی تیار ہوں لیکن یہ بھی مجھے قبول نہیں کہ اپنی دھرتی پر مجھے شودروں سے بدتر سمجھا جائے اور ان جیسا سلوک میرے ساتھ ہو خواہ میں صحافی ہوں یا عام شہری کیونکہ میں بھی کسی وردی والے بڑے افسر کسی بڑے سیاستدان کسی بڑے سرمایہ دار جیسی انا اور عزت رکھتا ہوں اور اگر یہی صورتحال رہی تو پھر جو سلسلہ قبائلی علاقوں میں چل نکلا ہے وہی سلسلہ یہاں شہروں میں بھی شروع ہوگا جس سے سب سے زیادہ نقصان انہی لوگوں کا ہوگا جن کی عیاشیاں چل رہی ہیں خواہ وہ وردی والے ہو یا بغیر وردی والے اس ملک میں غریب کا حال تو ویسے بھی بدتر ہے زیادہ سے زیادہ بدترین ہو جائیگا۔ لیکن عیاشیوں والے بدتر صورتحال برداشت نہیں کرسکیں گے۔

جمہوریت اور حکمران

مسٹر ٹین پرسنٹ کے نام سے پہچانے جانیوالے اور تیر کے ذریعے عوام کا 100 فیصد خون چوسنے والے حکمران جاتے جاتے بھی قوم کو ٹیکہ لگا گئے ہیں جمہوریت کے نام پر معاہدہ کرنے والے سابق حکمرانوں نے غیر ملکی حکمرانوں سے ملنے والے پندرہ کروڑ روپے سے زائد مالیت کے تحائف ایوان صدر سے منتقل کر دیئے پچھلے پانچ سالوں میں دنیا بھر سے ملنے والے پندرہ کروڑ روپے مالیت سے زیادہ کے مہنگے تحفے انہوں نے سرکاری خزانے میں جمع کرانے کے بجائے اپنے پاس رکھ لئے ان میں دبئ لیبیا سے ملنے والی تین گاڑیاں بی ایم ڈبلیو سونے کے سکے گولڈ پلیٹ انگوٹھیاں قالین خنجر آئی پیڈ کی بورڈ اور دیگر تحائف شامل ہیں فلپائن سے 42 ہزار کا سگار اوباما کی طرف سے صدر پاکستان کو دیا جانیوالا شیشے کا پیالہ صدر نے تحائف کم قیمت ادا کرکے رکھ لئے ۔ کسی زمانے کے مسٹر ٹین پرسنٹ اور سابق دور میں 100 پرسنٹ کے اس عمل سے اندازہ ہوا کہ مسلسل کئی بحرانوں کے شکار پاکستان میں حقیقی معنوں میں علم و عقل کا بحران بالکل نہیں نہ ہی مال و دولت کا بحران ہے تہذیب و تمدن کا بحران بھی نہیں ہاں بحران ہے اس زندہ ضمیر کا جو خریدا نہ جاسکے جو کسی قسم کی سودے بازی نہ کرے اور بحران ہے تو اس دل کا ہے جو ایمان و یقین کی

دولت سے مالا مال ہو۔یہ اس ملک کے صدر ہیں جس کے بیشتر عوام ٹائلٹ کی سہولت سے محروم ہیں اور اسی بناء پر پاکستان دنیا بھر میں ان 10 ممالک میں شامل ہے جہاں کے شہری رفع حاجت کیلئے بیت الخلاء کے بجائے غیر مناسب جگہوں کا استعمال کرتے ہیں جس سے معاشرے میں ہیضے جیسی متعدی بیماریاں پھیل رہی ہیں اور ماحول بھی آلودہ ہو رہا ہے 18 کروڑ کی آبادی والے ملک میں 4 کروڑ لوگوں کے پاس بیت الخلاء تک نہیں اور اسی بناء پر وہ کھلی جگہوں کھیتوں کا رخ کرتے ہیں یہ صورتحال پاکستان میں بدترین غربت اور عدم مساوات کو واضح کرتی ہے۔

جاتے جاتے بھی کرسی کی خاطر مرنے والوں کو شہید بنانے اور کہلانے والے اس بھوکی ننگی قوم کیساتھ مذاق کر گئے ہیں غریب عوام کے گھروں میں کھانے کو کچھ نہ ہو لیکن یہ جمہوریت کا پھل ہے کہ تاحیات پروٹوکول مفت رہائش بیس ہزار کار الائونس گھر یا کرایہ کیلئے پچاس ہزار روپے اور مراعات پر کسی قسم کی ٹیکس نہیں سالانہ 72 ہزار کی مفت ٹیلیفون کالیں اور دو ہزار بجلی یونٹ کی سہولت کی فراہمی سمیت کتابوں کی خریداری کیلئے بھی ایک لاکھ روپے دیئے جائینگے ڈپلومیٹک پاسپورٹ کیساتھ گریڈ سترہ کا سیکرٹری سیکورٹی گارڈ ڈرائیور اور باورچی بھی اس غریب ملک کے صدر کو دیا جائیگا سوئس بینکوں میں کھربوں روپے کے مالک اتنے غریب ہیں کہ بھوکے ننگے عوام کو مفت علاج کی سہولت ملے یا نہ ملے یہ اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں گے اور یہی عیاشیاں ان کے بچوں

کو حقیقی معنوں میں حاصل ہو گی ۔جم ہوریت کے نام پر جاری اس کھیل میں گذشتہ پانچ سال تک فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کرنے والے برادران کے اب مزے ہیں پیسے اور ڈنڈے کے زور پر ہر چیز کو برائے فروخت سمجھنے والے برادران جم ہوریت کا راگ الاپ رہے ہیں اور اب جانیوالوں نے بھی یقین دہانی کرادی ہے کہ اب جم ہوریت کے ڈرامے میں پانچ سال تم لوگ مزے کرو ہم کچھ نہیں کہیں گے فرینڈلی اپوزیشن کے دوران میڈیا پر عوام کیلئے آوازیں اٹھانے والے اب حکمران بنتے ہی خزانہ خالی ہے کی گردان شروع کرچکے ہیں اور اب ڈھول گلے میں لٹکا کر قرضوں خیراتوں کیلئے مختلف ممالک کے دورے کئے جارہےہیں عوام کیلئے کچھ کرنے کے دعویداران سرکاری دوروں میں پورے خاندان کو لے جارہے ہیں کہ یہ جیسے ان کا اس ملک کے غریب عوام پر حق ہے گذشتہ 100 دنوں میں مہنگائی کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیئے گئے ہیں پٹرول 98 سے 110 تک پہنچ گیا ہے سی این جی 74 سے 84 اور بجلی کے فی یونٹ نرخ 5 روپے سے بڑھ کر 12 روپے تک پہنچ گئے ہیں ان میں مزید اضافیکے اعلانات بھی کئے جارہے ہیں ڈالر 98 سے 105 روپے تک پہنچ گیا آٹا 37 سے 46 روپے جی ایس ٹی میں ایک فیصد اضافہ کرنے کیساتھ ساتھ ٹی وی لائسنس میں 2 روپے اضافہ کردیا گیا ہے موبائل فون پر ٹیکس 17 فیصد سے بڑھ کر 25 فیصد کر دیا گیا ہے مزے کی بات کہ اراکین قومی وصوبائی اسمبلی کی تنخواہوں میں 100 فیصد اضافہ ہوا ۔ اسی ملک میں لوگ پولیس کو تحقیقات میں مدد دینے کیلئے بیٹیوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

بیٹیاں جہیز نہ

ہونے کی بناء پر نہروں میں کود کر جان دینے پر مجبور ہیں لیکن جمہوریت کو قرآنی احکامات قرار دینے والے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں اور جمہوریت کی آڑ میں جانے والے چور آنیوالے چوروں کو یقین دہانی کرا رہے ہیں کہ اگلے پانچ سال تم بھی اس ملک میں عیاشی کرو لوٹو اس بے وقوف عوام کو ہم اس دوران خاموش رہینگے پانچ سال بعد دیکھیں گے کہ باری کس کی ہے لیکن اب لوٹنے کی باری تمھاری ہے ۔

اپنے آپ کو مہذب تعلیم یافتہ قرار دینے والے ہم سب خاموش ہیں اور ہمیں حکمران اپنی عیاشیوں کیلئے لوٹنے میں مصروف ہیں غریب کیلئے اس معاشرے میں الگ قانون ہے اور پیسہ اور ڈنڈے والوں کیلئے الگ قانون یہ الگ بات ہے کہ ہم لوگ دل کی تسلی کیلئے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے اور اس میں کسی کا لحاظ نہیں ہوتا لیکن یہ کتابی باتیں جو صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں اور عملی زندگی میں ہم سب کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لئے قانون میں کوئی رعایت دیکھیں وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ جس نے بلوچستان تک حکومت کی تھی جب انہیں خلیفہ بنایا گیا تو انہیں بیت المال سے دو وقت کا کھانا ملتا تھا اور اسی پر وہ اپنے آپ کو اتنا جوابدہ سمجھتے کہ ایک موقع پر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر فرات کے کنارے کتا بھی مر جائے تو مجھے خوف ہے کہ اللہ تعالی اس کا حساب مجھ سے کرے گا یہ ہے وہ طرز عمل جو ہم جیسے لوگوں کیلئے

مشعل راہ ہونا چاہئے لیکن ہم پیدائشی مسلمان صرف زبانی کلامی تو بہت کچھ کرتے ہیں لیکن ہم لوگ ان کی ایک عادت کی پیروی بھی نہیں کر رہے ۔اسی وجہ سے ایک چور چھٹی کرتا ہے تو دوسرا اسکی جگہ لیکر آجاتا ہے اور ہم انہیں کندھوں پر اٹھا کر جمہوریت کی نعرے لگاتے ہیں۔

تصویر کھنچوانے کی شوقین نوکرشاہی اور منفعت بخش کاروبار

ٹی وی سکرینوں پر آنایا اخبارات میں تصاویر شائع کرانا کسی زمانے میں سیاستدانوں کی ضرورت اور مجبوری ہوا کرتی تھی جس میں وہ کرینگے، یہ ہوجائے گااور وہ ہو جائیگا جیسے بیان دیکر لوگوں سے داد سمیٹی جاتی تھی لیکن جب سے خیبر پختونخواہ میں تبدیلی والی سرکار کی حکومت آئی ہے یہاں پر سسٹم الٹا چلنا شروع ہوگیا ہے سیاستدان اور نام نہاد لیڈر اب کیمروں کے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں جیسے یہ کوئی کھاجانے والی بلاہے اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس کہنے اور بولنے کیلئے کچھ نہیں ہوتا اسی لئے کیمروں سے دور بھاگتے ہیں، لیکن کیمروں سے دور بھاگنے والے بیوروکریٹس کو اب کیمرہوں کاچسکا لگ گیا ہے جہاں منسٹر صاحبات نہیں ہوتے وہاں ان کی جگہ بیوروکریٹس پہنچ جاتے ہیں اب انہوں نے اندازے گفتگو بھی سیاستدانوں جیسا اپنالیا ہے، کچھ پارٹیوں سے تعلق رکھنے والی خواتین جنہیں اپنے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا 1000 روپے دیکراپنی تصاویر کھنچوا کراخبارات میں شائع کروالیتی ہیں صرف یہ ثابت کرنے کیلئے کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں اور سماجی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں کچھ ایسی ہی صورتحال پشاور میں ہونے والے یکے بعد دیگرے دھماکوں کے بعد ہے جہاں پر ہسپتال میں ہر کوئی اپنی تصاویر چھپوانے کیلئے پہنچ رہا ہے نام نہاد لیڈروں کے آنے سے قبل ان کے

پبلک ریلیشن آفیسر فون کرکے اخبارات ٹی وی چینل کے نمائندوں کو بلواتے ہیں کہ ہمارے صاحب عیادت کرنے پہنچ رہے ہیں بھئی اس میں کونسی بڑی بات ہے عیادت کرنا اچھی بات ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ مریضوں کی حالت زار دیکھی جائے کہ انہیں سہولیات مل رہی ہیں یانہیں صرف مریض کے سرپر دست شفقت پھیر کر تصاویر نکلوانے سے کچھ نہیں ہوگا ایک ہفتے کے دوران غیر ملکی ملکی اور مقامی لیڈروں کی ایک بڑی تعداد ہسپتال میں تصاویر اتارنے پہنچی لیکن کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ پوچھ لیتا کہ ہسپتال میں مریضوں کی حالت کیسی ہے کیا انہیں مفت ادویات مل رہی ہیں کیا انہیں بیڈ میسر بھی ہیں کہ نہیں یا بازار سے بیڈ کرائے پر لاکر اپنے مریض ہسپتال میں داخل کروارہے ہیں یہ ایسی صورتحال ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے مریضوں کی موت کی دعا ہی مانگتے ہیں کہ انسان مرنے سے بہت سارے غموں سے نجات پالیتا ہے- انسان مرجائے تو قرار آہی جاتا ہے کہ چلو مٹی تلے دفن کردیا ہے اسی وجہ سے بڑے سے بڑا صدمہ بھی وقت کے تھپیڑوں میں انسان بھول ہی جاتا ہے لیکن اگر کوئی پیارا زندہ ہی غائب ہوجائے اور پھر پتہ نہیں چل رہا ہو اور لواحقین تڑپ رہے ہوں اور انہیں غائب کرنے والے آرام سے زندگی گزار رہے ہوں تو ایسے میں دل کیا چاہتا ہے یہ کوئی ان سے پوچھے جن کے پیارے زندہ ہی غائب ہوگئے ہیں ایسا ہی دکھ اٹھارہ سالہ طالب علم یونس کی والدہ اور ماموں کو بھی ہے

یونس کو دو اگست کو سیفن کے علاقے سے پولیس نے اٹھالیا فرسٹ ایئر کے طالب علم یونس کو اس کے والد حبیب نے جو کویت میں مزدوری کرتے ہیں موٹر سائیکل کی خریداری کیلئے پیسے دیئے تھے جس پر اس نے اپنے لئے موٹر سائیکل خریدی اور وہ نئی موٹر سائیکل خریدنے کی خوشی منا رہا تھا کہ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا بڑی آسامی سمجھ کر پولیس نے اس کے ماموں کو اس کی گرفتاری کی اطلاع دی اور بتایا کہ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد اسے گھر واپس بھیج دیا جائیگا، لیکن ان کا بھانجا گھر نہ پہنچا مقامی پولیس کے مطابق اس طالب علم کو ایجنسی والے اٹھا کرلے گئے اس کا بھی مہینہ گزر گیا لیکن اب وہ طالب علم غائب ہے اسکے گھر والوں کو روزانہ نت نئے ڈرامے سننے کو ملتے ہیں لیکن طالب علم یونس کا پتہ نہیں چل رہا یہ یہ کیسی ایجنسی ہے جو ایک ماہ سے طالب علم سے تحقیقات ہی نہیں کر سکی کہ اس پر کیا الزام ہے اور اس کا کریمنل ریکارڈ کیسا ہے گرفتار کرنے والوں نے آگے کسی اور کو دیدیا ان کیلئے تو شائد یہ معمول کی بات ہے لیکن اٹھارہ سال کا طالب علم ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا ہے اور پولیس کی حوالات سے غائب ہے -

یہ ہے نیا پاکستان جس کیلئے یونس جیسے طالب علموں نے گیارہ مئی کو ہونیوالے انتخابات میں بڑا زور لگایا تھا کہ نیا پاکستان بنے گا اور شائد نیا پاکستان بھی بن گیا لیکن ان کیلئے جن کی پہلے سے عیاشی تھی یہ ہے ہمارا نیا پاکستان

جس میں اغواء برائے تاوان بھتہ خوری بد معاشی پیداگیری کا ذریعہ تھا ہے اور رہے گا لیکن اب سرکار کے تعاون سے نیا کاروبار شروع ہوگیا جسے باقاعدہ وردی والوں کا تحفظ حاصل ہے اس کاروبار میں روڈ پر چلنے والے کسی بھی شخص کو بلاوجہ گرفتار کرکے رکھا جاتا ہے اور پھر اس کے گھروالوں رشتہ داروں سے پیسوں کی وصولی کی جاتی ہے اس کاروبار میں بڑے بڑے نامی گرامی لوگ شامل ہیں جنہیں باقاعدگی سے اپنا حصہ ملتا ہے پکڑا جانیوالا اس وقت تک مجرم ہے جب تک یا تو پیسے دے کر اپنی جان نہ چھڑالے یا پھر مسلسل گمشدگی کے باعث اس کے عزیز واقارب رودھو کر صبر کرلیں۔ عدالت بھی زیادہ سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہی جائیں گے جہاں وردی والے حلف اٹھا کر کہہ دینگے ۔ کہ ہمیں نہیں پتہ بس قصہ ختم

قصہ تو خیبر ایجنسی کی علاقہ جمرود کی رہائشی مسماۃ زیبا بیوہ محمود بھی نہیں بھولی بقول اس کے خیبر ایجنسی کی پولیٹیکل انتظامیہ نے جمرود ہسپتال کے پولیو آفس میں ہونیوالے بم دھماکے کے بعد دس سال سے محکمہ صحت میں ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنے والے اس کے ڈرائیور شوہر کو گرفتار کرکے پشاور منتقل کردیا اور بعد میں اسے قتل کرکے اس کی قتل کو خودکشی کا رنگ دیا گیا پولٹیکل انتظامیہ کی جان تو چھوٹ گئی کیونکہ واقعے کے بعد اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ تحصیلدار کو معطل کیا گیا تھا اسی طرح مسماۃ زیبا بیوہ کی شوہر کی جان

بھی چھٹ گئی کیونکہ منوں مٹی تلے دب کر ہر غم سے نجات پاگیا لیکن اپنے پیچھے چھ معصوم بچیاں ضعیف والدین کو چھوڑ گیا اور بیوہ اپنی معصوم بچیوں کے سر پر سوال کر رہی ہے کہ کہاں ہے کہ انصاف اسکے شوہر کو قتل کردیا گیا لیکن اسکی تحقیقات نہیں ہو رہی وہ اور ان کے معصوم بچے یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان جس میں ایک کے بعد دوسرا آکر انصاف کے بھاشن تو دے جاتا ہے اور انصاف کے نعرے بھی بہت لگتے ہیں لیکن جمرود کے رہائشی بیوہ زیبا کیلئے کوئی انصاف نہیں شائد اسکی وجہ اس کا غریب اور قبائلی ہونا ہے جس کی آواز کو اٹھانے کیلئے بہت زیادہ زور لگانا پڑتا ہے اس لئے ہمارے کچھ نام نہاد تاجر جو اپنے آپ کو صحافی لکھتے ہوئے بھی نہیں شرماتے نے معصوم لوگوں کے خبروں میں ڈنڈی ماردی کیونکہ پولٹیکل انتظامیہ سے نوٹ ملتے ہیں جبکہ غریب خاندان سے انہیں کچھ ملنے کی امید نہیں تھی سو مطلب کاروبار اور پیسے کی اس دنیا میں اس غریب خاتون کا کون پوچھے گا شائد کوئی بھی نہیں!

امن میچ اور بھوکے ننگے مزدور

پشاور کے شاہی باغ میں آٹھ سال بعد ہونیوالے امن میچ نے تبدیلی لانے والوں کی تبدیلی دکھا دی کہ یہ کس طرح کی تبدیلی لانے کے خواہشمند ہیں - لالٹین والی سرکار کی وجہ سے تباہ حال ارباب نیاز کرکٹ سٹیڈیم میں پشاور کے عوام اور خصوصا نوجوانوں کیساتھ جس طرح کا سلوک میچ کے دوران کیا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبدیلی اب اس صوبے کے عوام خود لائیں گے اور یہ بہت جلد ہوگا اس بیں لالٹین والوں سے لے کر، مولوی اور شیر والے بھی خوار ہونگے کیونکہ اس صوبے کے عوام نے دیکھ لیا کہ نظام وہی پرانا چل رہا ہے صرف چہرے نئے ہیں اور کمیشن کے نئے ریٹس بن گئے ہیں لالٹین والی سرکار کے دور میں "ایس ایم ایس "کے نام سے مشہور ایک اہم شخصیت جن کا ہر کام میں کمیشن ہوتا تھا انہی کے کاروباری ساتھی آج بھی کمیشن پر چل رہے ہیں عوام کو بے وقوف سمجھنے والے نام نہاد لیڈر لوگوں کے سامنے ہسپتال میں کروڑوں روپے کے عطیات دے جاتے ہیں تاہم پھر ان کی ریکوری کیلئے انہوں نے نیا سسٹم شروع کردیا ہے اور مختلف محکمہ جات میں اعلی عہدوں پر تعینات لوگوں سے ڈیمانڈ کی جارہی ہے کہ ہم نے تبدیلی والی سرکار کے ہسپتال میں اتنا بڑا عطیہ دیا ہے ماہانہ ہمیں اتنے روپے ہر حال میں ریکوری چاہیئے اور اس کیلئے

کچھ بھی کیا جائے لیکن اللہ کی شان ہے کہ خیبر پختونخوا میں کچھ سر پھرے سرکاری اہلکار اب بھی موجود ہیں جو غیر قانونی کاموں سے انکار کرنا جانتے ہیں اسی بنیاد پر انہیں افسر بکار خاص بھی بننا پڑتا ہے کیونکہ یہ نام نہاد لیڈروں کو خوش نہیں کرنا چاہتے۔ بات تعصب پر جائیگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوبہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی تبدیلی والی سرکار کی ایک اہم شخصیت کو ٹھیکہ دلانے کیلئے ایس ایم ایس کے حوالے سے مشہور نام نہاد لیڈر نے بڑا زور لگایا کہ یہ ٹھیکہ متعلقہ شخصیت کو دیا جائے تاکہ ان کی واہ واہ ہو لیکن انکار سننے پر افسران کو افسر بکار خاص بنادیا گیا۔ خیبر پختونخوا میں سرمایہ کاری کے نام پر آنیوالے مخصوص لوگ صرف اپنے کاروبار اور منافع سے مطلب رکھتے ہیں انہیں ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس صوبے کے عوام خوار ہو رہے ہیں

بات ارباب نیاز کرکٹ سٹیڈیم میں میچ کی ہو رہی تھی امن کے نام پر ہونیوالے میچ کیلئے شاہی باغ روڈ پر تقریبا ڈیڑھ سو کے قریب دکانوں کو بند کردیا گیا خار دار تاریں لگا کر شہریوں کیلئے راستے بند کردیئے گئے کیونکہ تبدیلی والی سرکار نے یہاں پر آنا تھا اور بھوکے ننگے مزدوروں کا وی آئی پیز کے سامنے آنا بری بات تھی سو ڈیڑھ سو دکاندار تو دکانیں بند کرگئے لیکن ان کے ساتھ کام کرنے والے دیہاڑی دار مزدور اس دن کیا کرتے، کیا وہ میچ دیکھ کر

اپنا پیٹ پالتے اس کا جواب نہیں مل سکا پشتو کی ایک مثل ہے کہ "مڑہ خیٹہ فارسی وائی" یعنی پیٹ بھرا ہو تو ہر چیز اچھی لگتی ہے ۔ اب ان مزدوروں سے کوئی پوچھے کہ تمھیں میچ سے کیا ملا انہیں تو میچ سے کچھ نہیں ملا ہاں ان کے گھر میں ان کے اہل و عیال ایک دن کیلئے بھوکے رہ گئے کیونکہ پولیس نے انہیں یہاں سے ہٹا دیا تھا ہاں دوسری طرف تبدیلی والی سرکار کیساتھ پولیس کلچر میں تبدیلی کا نعرہ لگانے والے پولیس نے اتنی تبدیلی کرلی کہ انھوں نے عیدالضحی کیلئے "عیدی" مہم بھی شروع کی اور میچ والے دن بڑا مال کما لیا ان میں سے بہت سارے انہی حرام کے مال سے اپنے لئے قربانی کے جانور بھی خریدیں گے اور پھر اللہ کی رضا بھی چاہیں گے کہ ہم نے قربانی دی ہے ہمیں جنت "میں اعلی مقام عطا کیا جائے۔امن میچ کے نام پر ہونیوالے ڈرامے کے منتظمین " سے کوئی یہ پوچھے کہ اس طرح سے کس طرح امن آیگا جب شیر کی حکومت میں مہنگائی سے پریشان شہری اپنے لئے کچھ خرید نہیں سکتے نہ ہی روزگار کر سکتے ہیں ایسے میں ان شہریوں کو بلے کی مار بھی پڑے گی تو کیا وہ امن لائیں گے بالکل نہیں کیونکہ ایک طرف مہنگائی ہے دوسری طرف روزگار کے مواقع ختم کئے جا رہے ہیں ایسے میں امن و امان کی حالت مزید ابتر ہوگی ہاں منتظمین جن کا تعلق بھی اسی صوبے سے نہیں کھیل کے نام پر ہی اس صوبے کے عوام کو لوٹیں گے۔کیونکہ یہ تو ایک آفاقی اصول ہے کہ انسان ہر چیز برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنے پیاروں اور خصوصا گھر والوں کیلئے مشکلات.برداشت نہیں کرسکتا لیکن لمبی گاڑیوں اور

سیکورٹی کے نام پر جانیوالے ہوٹروں والے قافلوں کو عوام کی صورتحال کا اندازہ ہی نہیں کیونکہ انہیں تو ہر چیز تیار مل جاتی ہیں شہریوں کے خون پسینے کی کمائی وہ ٹیکسوں کی مد میں ڈکار مارے بغیر ہی کھا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عوام کی خدمت کر رہے ہیں- خدمت کے دعویدار تو لالٹین والی سرکار بھی تھی جنہوں نے پانچ سال میں اور کچھ نہ کیا ہو " لیزی لوڈ" سروس کو بہت فروغ دیا اور اسی لیزی لوڈ سروس کو اب تبدیلی والی سرکار مزید فروغ دے رہی ہیں لالٹین والی سرکار کے دور میں جب انہیں سچی بات کہی جاتی تھی تو اس وقت ان کے وزیروں کے آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھی انہیں مخصوص لوگ ہی نظر آتے تھے جو انہیں سب اچھا کی رپورٹ دیتے تھے سب اچھا کی رپورٹ میں وہ اپنے لئے تو بہت کچھ کما گئے بہت سارے لوگوں نے پوش علاقوں میں بنگلے بنا لئے اب انہیں کرسی سے اترنے کے بعد عقل آئی ہے اس لئے ان کا رویہ بھی تبدیل ہوگیا ہے اس لئے یہاں پر رحمان بابا کا ایک شعر جس کے معنی ہے کہ " کبھی کبھار غموں کے انبار لگنا اچھی بات ہے کیونکہ ان غموں سے انسان کو اپنے چاہنے اور برے بھلے کا اندازہ ہو جاتا ہے" سو لالٹین والی سرکار کے کچھ لوگ آج کل اپنی غلطیوں کی تلافی تو کر رہے ہیں لیکن ان کا گند بھی اتنا ہے کہ صاف کرنے میں انہیں عمر لگ جائیگی اب تو تبدیلی والی سرکار سابقہ حکمرانوں کے روش پر چل پڑی ہیں اور جو گند وہ بو

رہی ہیں انہیں بھی صاف کرنے میں انہیں عمریں گزر جائیں لیکن ایک بات جو یاد رکھنے کی ہے کہ خیبر پختونخواہ کے پٹھان جو کہ اب پڑھے آن رہ گئے ہیں ایک ہی مرتبہ تجربہ کرتے ہیں اور تجربے کی ناکامی پر دوسری مرتبہ موقع کسی کو بھی نہیں دیتے سو تبدیلی والی سرکار بھی سن لیں کہ ان کا اس صوبے میں پہلا اور آخری تجربہ ہے اگر اسی طرح لکڑی کے سمگلروں کی سپورٹ جاری رہی تو پھر ان کی حکومت بھی پانچ سال ہی ہوگی زیادہ نہیں اور پھر یہ لوگ لالٹین والی سرکار کی طرح قصہ پارینہ بن جائیں گے۔

طالبان کے نام خط

محترم امیر حکیم اللہ محسود صاحب !

آپ کے صحافیوں کے بارے میں جاری کردہ فتوے کے جواب میں چند گزارشات عرض کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میرے ایک دیرینہ دوست نے مجھے مشورہ دیا کہ طالبان کو جواب دینا ایسا ہے کسی بھی وقت موت کا باعث بن سکتا ہے اس لئے صرف نوکری کرو لیکن محترم امیر صاحب ! آپ کے فتوی کے جواب میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن آپ کو صوبہ خیبر پختونخواہ کے 90 فیصد صحافیوں کے حالات زار سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں ۔ محترم ! دنیا بھر کا غم اور لوگوں کے مسائل بیان کرنے والے صحافیوں کے بارے میں بتادوں تو یقینا آپ کو صحافیوں پر ترس بھی آئے آزاد میڈیا کے اس دور میں ایسے اخبارات کے مالکان بھی ہیں جن کی تقریریں اور باتیں اگر آپ سنے تو آپ خود کہ اٹھیں گے کہ ان کے دامن تو نماز پڑھنے کیلئے ہیں لیکن ان کے کرتوت ایسے ہیں کہ انہی کی وجہ سے صحافی بدحالی کا شکار ہیں نہ صحافی کے حالات کار ایسے ہیں کہ اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتی پر آواز اٹھائے نہ ہی کوئی ایسا فورم موجود ہے مسلسل چودہ اور اٹھارہ گھنٹے کی ملازمت نے صحافی کو گدھا بنا دیا ہے ! امیر صاحب ! انڈسٹریلائزیشن کے اس دور

میں صحافت بھی ایک انڈسٹری ہے لیکن یہ ایسی انڈسٹری ہے جو صرف مالکان کیلئے ہے اس میں کام کرنے والے تمام افراد خواہ وہ فیلڈ میں ہیں یا دفتروں میں کام کرنے والے قلم کے مزدور ہیں اور مزدور وہ کرتا ہے جس کی اسے تنخواہ ملتی ہے اگر مزدور اس سے آگے پیچھے ہو اور ڈیوٹی سرانجام دے تو پھر اسے لات مار کر نکال دیا جاتا ہے۔

محترم امیر صاحب ! علماء کرام نے صحافیوں کے بارے میں فتوی تو دیدیا ہے لیکن ان مالکان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو مزدوری کرنیوالے صحافیوں کا خون نچوڑ رہے ہیں دس ہزار روپے کی تنخواہ وہ بھی تین سے چھ ماہ بعد ملتی ہے اخبارات کے مالکان تو اربوں میں کھیل رہے ہیں لیکن صحافی کی اوقات بس اتنی سی ہے کہ سالوں نوکری کرنے والے صحافیوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت اسے نوکری سے فارغ کردیا جائے اور فراغت کے بعد بھی اسے اپنے جرم کا پتہ نہیں ہوتا۔ محترم امیر صاحب !آپ نے صحافیوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ مغرب اور سیکولرازم کا ساتھ دیتے ہیں بحیثیت صحافی اور بارہ سالہ صحافتی تجربے کے بعد میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کے نام پر قائم اس مملکت میں کم از کم صحافی نہ تو سیکولرازم کے حامی ہے اور نہ ہی مغربی استعمار کے کیونکہ شکرالحمد اللہ ہمیں اللہ تعالی نے مکمل دین اسلام ہی دیا ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے امت کے کمزور ترین ایمان رکھنے

والوں میں صحافی بھی شامل ہیں لیکن کوئی بھی اس فانی دنیا کیلئے اپنی ابدی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا سو ہماری دعا ہے کہ اس مملکت پاکستان میں وہ اسلامی نظام قائم ہو جس کی بنیاد حضرت محمد صلی اللہ والہ وسلم نے رکھی تھی اور اس کی ترویج کیلئے چاروں خلفائے راشدین نے کام کیا جس میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا زانی کی سزا سنگسار کرنے کی تھی اور اس میں کسی کیساتھ رعایت نہیں ہوتی تھی محترم ! صحافی بھی ایسا ہی اسلام چاہتے ہیں نہ کہ نام نہاد مولویوں کی جانب سے اپنے مقاصد کیلئے استعمال ہونے والا اسلام جو صرف دنیا کی خاطر اسلام جیسے مذہب کو بدنام کرتے ہیں -

محترم امیر صاحب ! دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا ہے تو آپ کو بتادوں کہ کم از کم 80 فیصد صحافی ایسے نام نہاد جمہوریت کے حق میں نہیں جس میں کمزور کو مزید کمزور کیا جائے جمہوریت کی آڑ میں غریبوں کا خون چوسا جائے ایسی جمہوریت سے سب کو نفرت ہے جس میں قوانین جاگیردار وڈیرے چودھری اور خوانین اپنے مقاصد کیلئے بنائیں جمہوریت کی آڑ میں خدا کی قوانین کا مذاق اڑایا جائے ہاں کچھ لوگ جن میں ہماری ہی برادری کے افراد شامل ہیں ان کیلئے جمہوریت کا ڈرامہ اچھا ہے کیونکہ یہ مخصوص خاندانوں اور پارٹیوں کے آلہ کار بن کر عیاشی کررہے ہیں اور اس میں انہیں ہی فائدہ ہے اس لئے وہ جمہوریت جمہوریت کی رٹ ہر جگہ پر لگاتے ہیں- محترم محسود صاحب ! آپ نے صحافیوں پر

فحاشی اور بے حیائی پھیلانے اور اس کی فروغ میں کردار ادا کرنے کا بھی کہا ہے لیکن ایک بات میں واضح کردوں کہ جس طرح ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتی اس طرح سب صحافی فحاشی اور بے حیائی کو فروغ نہیں دے رہے ہاں ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بنیادی طور پر میراثی ہے اور جس طرح پشتو مثل کے مطابق خون کا اپنا ہی اثر ہوتا ہے اس طرح اس شعبے میں صحافیوں کی آڑ میں آنیوالے میراثی اپنا میراثی پن دکھاتے ہیں اس کیساتھ ساتھ ایک اور بات کہ صحافت آئینہ ہے معاشرے میں ہونیوالی گندگی کو صحافی دکھاتے ہیں اگر قوم کا مزاج ہی فحاشی کی جانب ہو تو پھر اس میں صحافیوں کا کوئی قصور نہیں۔

جس طرح اسلام کی اپنی مرضی اور مقصد کیلئے تشریح کرنے والے قابل مذمت ہے اسی طرح صحافی خواہ وہ کوئی بھی ہو قابل مذمت ہے کیونکہ دین محمدی صلی اللہ والہ وسلم کسی شخصیت کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک کیلئے اللہ تعالی نے مکمل بنا کر بھیجا ہے اس میں کسی للو پنجو نتھو خیرے خواہ وہ آکسفورڈ کا پڑھا لکھا ہو یا سوات کے کسی حصے کا ہو اسے کہنے کا کوئی حق حاصل ہی نہیں کیونکہ اسلام اور اس کے احکامات اس رب کائنات کے احکامات ہیں جس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے اور جہاں پر انسان سے لمحے اور لحظے کا حساب ہوگا۔ محترم محسود صاحب ! آپ نے فتوی میں صحافیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ کسی کو شہید اور کسی کو ہلاک لکھتے ہیں برا ماننے کی ضرورت نہیں لیکن یہ حقیقت اور

ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے اور یہ اللہ تعالی کا فرمان ہے سو صحافی اگر کسی کو ہلاک یا شہید لکھے یا کہے تو اس سے اس شخص کو فرق نہیں پڑتا جو اللہ کی راہ میں زندگی کی قربانی دے آیا ہو کیونکہ اس کا بدلہ اسے اللہ تعالی نے دینا ہے نہ کہ دنیاوی حکمرانوں صحافیوں یا معاشرے کے کسی شخص نے اور ہاں ایک اور بات کہ صحافی خواہ وہ اخبار کا ہو ٹی وی کا ہو یا ریڈیو کا اور خصوصا خیبر پختونخواہ کا صحافی پشتو مثل کے مصداق ایک طرف لاٹھی اور دوسری طرف شیر کا سامنا کر رہے ہیں اور ہاتھیوں کی جنگ میں چیونٹی کو نشانہ نہیں بنایا جاتا باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔

ایک اور آخری بات جو میں اس خط کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں آپ نے خود کہا ہے کہ بازاروں اور معصوم لوگوں کو آپ لوگ نشانہ نہیں بناتے اور کئی مرتبہ یہ بات سامنے آئی ہے کہ بہت ساری غیر ملکی ایجنسیاں اور جرائم پیشہ طالبان کے نام اور ان کی آڑ میں اپنا کام نکال لیتے ہیں تو کیا آپ کی یہ ذمہ داری نہیں کہ ایسے واقعات کی تحقیقات کرے کہ کون دہشت گردی کر رہا ہے اور اسلام کو بدنام کرنے کا باعث بن رہا ہے کیونکہ یہ ملک جتنا کسی عام شخص کسی صحافی کسی عالم کسی حکمران کا ہے اتنا ہی آپ کا بھی ہے اور ملک سے محبت اور اس کی حفاظت ایمان کا حصہ ہے۔ سو اس پر بھی سوچیئے!

والسلام ایک بے وقعت صحافی

آئیں اپنی آواز بلند کریں

میں تقریبا تیس منٹ تک سڑک کنارے سٹاپ پر دیگر لوگوں کیساتھ کھڑا گاڑی آنے کا انتظار کر رہا تھا دن کے اوقات میں گاڑی تو آسانی سے مل جاتی ہیں لیکن رات کے وقت دس بجے کے بعد گاڑیاں بہت کم ہی چلتی ہیں اسی وجہ سے پشاور جیسے شہر میں لوگ سٹاپوں پر انتظار کرتے رہتے ہیں اور جن کے جیب میں پیسے ہوں تو وہ رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل کو روانہ ہو جاتے ہیں تقریباپینتالیس منٹ بعد ایک گاڑی آکر رکی اس سے کنڈیکٹر اترااور پشاور صدر تک آواز لگائی ساتھ میں گاڑی میں بیٹھنے والوں کو کہہ دیا کہ کرایہ پندرہ روپے ہوگا حالانکہ کرایہ دس روپے تھامیں بھی سنی ان سنی کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیاگاڑی روانہ ہو گئی اور کنڈیکٹر نے کرایہ مانگا میں نے جیب سے سو روپے نکال کردیئے اس نے بقایا 80 روپے مجھے دیئے میں نے اس سے پوچھا بھائی میرے دس روپے اور بھی دو کیونکہ ہشتنگری سے صدر تک کرایہ دس روپے ہے کنڈیکٹر نے جواب دیا کہ صاحب یہ لیں پانچ روپے واپس کردیتا ہوں میں نے اسے کہا کہ دس روپے واپس دو اس نے جواب دیا کہ میں نے گاڑی میں بیٹھنے والے تمام مسافروں کو کہا تھا کہ کرایہ پندرہ روپے ہے میں نے اس سے پوچھا کیوں یہ تمھارا فیصلہ ہے اگر کرایہ نامہ ہے اور اس پر پندرہ لکھا ہے تو مجھ سے بیس روپے لو لیکن اگر کرایہ نامہ نہیں تو پھر

مجھے دس روپے واپس کردو کنڈیکٹر نے جواب دیا کہ بھائی میرے یہ گاڑی میری ہے اور آپ اپنے پیسے واپس لیکر اتر جائیں میں نے اسے جوابا کہا کہ گاڑی اگر تمھاری ذاتی ہے تو پھر مسافروں کو کیوں اٹھا رہے ہوں اور سڑک جس پر تمھاری گاڑی چل رہی ہیں یہ میرے جیسے لوگوں کی ٹیکسوں کی کمائی لگی ہے اگر خان ہونگے تو اپنے لئے مجھے تم اتار بھی نہیں سکتے کرایہ مجھے پورا لو اور مجھے اپنے سٹاپ پر پہنچاؤ گے اس پر کنڈیکٹر کو غصہ آیا لیکن مجھے کہنے لگا کہ خاموش ہو جائو تم سے دس روپے لیتا ہوں لیکن دوسرے مسافروں کے سامنے بحث مت کرو کیونکہ پھر یہ بھی نہیں دینگے میں نے اسے کہا کہ غلط بات مت کرو مجھے اپنے پیسے واپس کرو اس نے بادل نخواستہ مجھے دس روپے واپس کردیئے اسی دوران گاڑی میں مسافر بیٹھے ہوئے تھے لیکن سب نے میرے بعد اسے پندرہ روپے دیئے اور وہ کنڈیکٹر مسافروں پر یہ احسان کرتا رہا کہ اس وقت گاڑی نہیں تھی اگر میں نے آتا تو آپ لوگ کھڑے رہتے اس لئے میرا احسان مانو کہ میں پندرہ روپے میں تمھیں پہنچا رہا ہوں یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے آگے پیچھے چھوٹے۔بڑے کس طرح دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم بے حس لوگوں کی طرح خاموش بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ اگر میں نے کچھ کہہ دیا تو شائد مجھے کوئی نقصان ہو جائے ہم لوگ آواز نہیں اٹھاتے نہ ہی اپنا احتجاج ریکارڈ کرتے ہیں حالانکہ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہیں لیکن صرف اپنی بے عزتی چھوٹے سے نقصان ڈر

اور خوف کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا فائدہ ان کنڈیکٹر جیسے بے حس بے غیرت لوگ اٹھاتے ہیں اور شریف لوگ کڑھتے ہی رہتے ہیں کہ شائد ہماری آواز سے کچھ نہ ہو اور یہی ہماری سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے-

اب اسی چیز کو آپ بڑے کینوس پر دیکھ لیں کیا یہ ملک کل کے چوروں اور آج کے ڈاکوئوں کیلئے بنا ہے جو جمہوریت کی راگ الاپ رہے ہیں ملک میں جمہوریت کی مضبوطی جیسے نعرے بلند کرکے اس قوم کو بے وقوف بنا رہے ہیں ایک دوسرے کو باری آنے پر حکومت دینے والے میڈیا اور اپنے چند خوشامدی صحافیوں کو استعمال کرکے پوری قوم کا استحصال کر رہے ہیں لیکن اس ملک سے کوئی آواز ہی نہیں اٹھ رہی ہر شخص یہی سوچ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے کہ میرے آواز بلند کرنے سے کچھ نہیں ہوگا کیا یہ ملک مخصوص خاندانوں اور ان کے بچوں کیلئے کھیلنے کا میدان ہے کہ جب ان کا دل چاہا سیاست کے میدان میں آئے ایک دوسرے کے خلاف آواز بلند کی اور ہم جیسے بے وقوف صحافی ان کی آواز بن گئے اور پوری قوم کو چور اور ڈاکوئوں کے پیچھے لگا دیا اور آوے اور جاوے کے نعرے لگنے شروع ہوگئے- آوے جاوے کی سیاست کرنے والے اور بھاری مینڈیٹ لیکر آنیوالوں کا یہ حال ہے کہ دو ماہ میں بجلی کی قیمتیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دی ہیں کل تک عزت غیرت کے دکانداری کرنے والے آج قرضے مانگ کر اس قوم کو بیڑہ غرق کرنے پر تلے ہوئے ہیں سابق حکمرانوں کو اس صورتحال کا ذمہ دار ٹھہرا کر اب حالات

بہتر کرنے کے دعوے کئے جارہے ہیں اب کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ پانچ سال تک تو آپ
ہی ان کے اپوزیشن لیڈر بنے ہوئے تھے اور انکو سپورٹ کر رہے تھے خوشامدی چمچوں
اور مخصوص صحافیوں کی مدد سے اپنا کام نکالنے والے یہ لیڈر قوم کو بتانا پسند کرینگے کہ
آخر کیا وجہ ہے کہ جب بھی بیرون ملک دورہ ہوتا ہے اپنے خاندان کے بچوں کو سرکاری
خرچ پر دورے کیوں کرواتے ہیں کیا عوام کا ٹیکس ان کی اور ان کے خاندان کی عیاشیوں
کیلئے ہے کہ جب چاہا بیرون ملک دورے پر نکل گئے اور بعد میں ایجنڈا طے کر دیا کہ ہم
نے یہ کرنا اور یہ کردیا ۔

سرکار کے کھاتے میں امریکہ یاترا کرنے والے حکمرانوں سے کوئی یہ پوچھے کہ ڈو مور کا
مطالبہ کرنے والے امریکی کیسے آپ کی مرضی کے بغیر ڈرون حملے کر رہے ہیں اس سے
قبل بھی یہی ڈرامہ جاری تھا اور یہ ڈرامہ اب بھی جاری ہے ہاں کل اگر آپ چوروں
کیساتھ ملے ہوئے تھے تو وہ چور آج ڈاکوئوں کا ساتھ دے رہے ہیں خارجہ اور دفاع کے
وزارت رکھنے والے حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ انہیں امریکی سفیر رچرڈ اولسن نے
ائیرپورٹ پر ریسیو کیا کوئی اعلیٰ عہدیدار انہیں ریسیو کرنے ہی نہیں یا نہ ہی سٹیٹ گیسٹ
کے طور پر انہیں بلایا گیا تھا اسی وجہ سے ہوٹل میں رہائش اختیار کی جس کی ادائیگی بھی
پاکستان کے بھوکے ننگے عوام ہی کرینگے انہی کیساتھ مشیر کے طور پر کام کرنے والے ایک

صاحب نے کچھ دن قبل بیان دیا تھا کہ امریکہ بہادر پاکستانی حکمرانوں سے افغانستان سے نکلنے کے بعد تعاون سمیت غداری کے الزام میں گرفتار ہونیوالے ڈاکٹر شکیل کی رہائی چاہتے ہیں جس کا مطالبہ بھی کیا گیا لیکن یہ بات چھپا لی گئی اور صحافیوں کے سوال کرنے پر اس پر گول مول جواب دیدیا گیا پہلے سب کچھ غلط تھا اور اب ٹھیک کرنے جارہے کے نام پر کونسل آف یورپ کنونشن کے معاہدے کرنے والے حکمران کیا یہ بتانا پسند کرینگے کہ کیا یہ غداروں کو نکالنے کیلئے راستہ فراہم کرنا نہیں ہے۔باتیں تو بہت ساری ہیں لیکن کیا یہ آواز بلند کرنا صرف صحافیوں کا کام ہے کیا اس ملک کے عوام شعور نہیں رکھتے جو آئی ایم ایف کے غلام حکمرانوں سے یہ سوال کرے کہ آخر انہیں کس چیز کی سزا دی جارہی ہیں اور یہ حکمران کب تک عوام کیساتھ جھوٹ بولتے رہیں گے ۔ سو موجودہ حالات میں یہ اس ملک کے ہر شہری کا فرض ہے کہ اپنی آواز بلند کریں سوال کریں کب تک خاموش رہینگے صرف اس طرح کے پیغامات موبائل فون پر ایک دوسرے کو بھیجنے سے کچھ نہیں چلے گا کہ شیر کتے سے زیادہ کھاتا ہے -

لالٹین تلے اندھیرا

تین ہیروئنچی) ہیروئن پینے والے (نشے میں دھت گلی میں پڑے تھے کہ اس دوران وہاں سے پولیس اہلکاروں کا گزر ہوا ہیروئنچیوں نے انہیں دیکھتے ہی قریب پڑی بوریوں میں گھس گئےکہ پولیس سے جان چھٹ جائیگی پولیس والے بھی پاکستانی تھے انہوں نے بوریوں کو دیکھا تو ایک بوری کو لات ماردی کہ اس میں کیا ہے بوری میں بند ہیرئونچی نے اپنے آپ کو بچانے کیلئے میائوں کی آواز نکالی پولیس نے بلی سمجھ کراسے چھوڑ دیا پھر ساتھ پڑے ہوئے دوسری بوری کو لات ماردی جس پر اس میں پڑے ہیرئونچی نے بھونکنے کی آواز نکال دی اور پولیس اہلکار یہ سمجھ کر چھوڑ گیا کہ اس میں کتا ہے آخر میں تیسری بوری کو آکر لات ماردی لیکن اس سے کوئی آواز نہیں نکلی دوبارہ سہ بارہ لات ماردی لیکن کوئی آواز نہیں نکلی تو پولیس اہلکار کو غصہ آگیا اورس نے مسلسل لاتیں مارنی شروع کردیں جس پر آخرکار تیسری بوری سے آواز آئی ابے بیڑہ غرق اس میں آلو پڑے ہیں اتنی لمبی تمہید کا مقصد اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتانا ہے کہ ہم اس تیسری بوری میں پڑے ہیروئنچی سے بھی بدتر ہیں ہیرئونچی نے تو کم از کم مسلسل لاتیں کھانے کے بعد آواز تو نکالی لیکن اس قوم اور خصوصا خیبر پختونخواکے لوگوں میں اتنا دم خم نہیں کہ اپنے ساتھ ہونیوالی زیادتیوں پر

آواز نکالے وہ زیادتیاں جو پختونوں کے اپنے علمبرداروں نے ان کے ساتھ کیں جن کا اعتراف لالٹین والی سرکار سے تعلق رکھنے والے ایک بڑے رہنما نے بھی کیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ پخ تونوں کے قتل عام کا سودا خود انہی کے لیڈروں نے کیا اور اس میں انہیں پینتیس ارب روپے امریکی امداد ملی بقول ان کے اس رقم سے لالٹین والی سرکار نے مختلف ممالک میں جائیدادیں بنائیں یعنی دوران حکومت انہیں دھماکوں کا پتہ تھا اوران کی قیمت بھی وصول کی تھی جبکہ ساتھ میں مرنے والوں کے جنازوں میں شریک ہو کر ثواب دارین بھی حاصل کرتے رہے ٗیعنی خود ہی مجرم خود ہی وکیل اور خود ہی منصف کا کردار ادا کرتے رہے۔

لالٹین والی سرکار کی پانچ سال کی کارکردگی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اور کچھ ہو نہ ہو لنڑی لو ان کے دور میں باقاعدہ متعارف ہوا حالانکہ پہلے یہ رشوت اور بعد میں کمیشن کہلائے جانے لگی لیکن ان کے دور میں یہ چیز لنڑی لوڈ بن گئی جو بعض اوقات ہیوی لوڈ ہوتی تھی انہی کے دور میں بہت سی کرائے کی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر پھرنے والوں نے اپنی جائیدادیں اور گاڑیاں بھی خریدلیں یہ بھی انہی کا اعزاز ہے کہ انکا لیڈر خودکش حملے کے بعد اسلام آباد پہنچ گیا تحفظ کی خاطریا مرنے کے ڈر سے یہ الگ قصہ ہے لیکن پھر اسلام آباد سے پخ تونوں کے لی ڈر نظر آنے لگے اور وی آئی پی موومنٹ اور پولیس کی بھاری نفری کیساتھ انہی کے پارٹی کے کچھ لوگ میدان میں بھی رہے یہ الگ بات

کہ شائد انہیں پتہ ہوتا تھا کہ وہ ٹارگٹ پر نہیں خیر مخصوص لی ڈروں کا درشن پھر مخصوص جگھوں پر ہوتا تھا یہ وہ باتیں جو ہم جیسے نالائق صحافی بھی جانتے اور مانتے ہیں لیکن گھر کی ہنڈیا بیچ چوراہے میں ایک گھر کے بھیدی نے زمین پر دے ماری ہے اب اس پر لالٹین والی سرکار کا موقف بھی آیا ہے اور یہ اتنا فوری رد عمل ہے کہ حیرانگی ہوتی ہے لیکن ایک بات کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے جس کی پردہ داری ہے کیونکہ دھواں وہاں سے نکلتا ہے جہاں پر چنگاری ہو لالٹین والی سرکار کے ایک سابق رہنما کی طرف سے کی جانیوالی پریس کانفرنس چنگاری تو نہیں البتہ ایک جلتا الائو ہے جس نے صوبے کے پخ تونوں کو حیران و پریشان کردیا ہے اور کئی سوالیہ نشان بھی پیدا کردیئے ہیں اب تو وضاحتیں یہ آرہی ہیں کہ ذاتی مسائل کی وجہ سے ان باتوں کو سیاست کے میدان میں لایا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ذاتی مسائل جس کی طرف اشارہ بھی پارٹی رہنمائوں نے کیا کہ فیس بک اور نیٹ پر آن لائن بہت کچھ موجود ہے کیا یہ مسئلہ ابھی پیدا ہوا یہ مسئلہ بلکہ مسائل تو لالٹین والی سرکار کے پانچ سال کے دور میں بھی رہے ۔ ایک مزے کی بات جو یہاں پر شیئر کرنے کی ہے کہ ایک خاندان کی اہم شخصیت کے بینک میں اعلی عہدے پر تعیناتی کے دوران مسلسل ڈاکے ہوئے اور وہ بھی ایسے وقت جب بینک میں بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی خیر یہ ہمارا کام نہیں لیکن اگر یہ ذاتی مسئلہ ہے تو اس میں صوبے کے پخ تونوں کا کیا کام اور اگر ہے بھی تو کیا اس سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی

کہ پنج تونوں کے علمبرداروں کی پارٹی بھی خاندان تک محدود لمیٹڈ کمپنی ہے ماموں بھانجے تک محدود اس پارٹی میں باقی لوگ کہنے کو تو بہت کچھ لگتے اور دکھائی دیتے ہیں ۔لیکن حقیقت میں قوالوں کے پیچھے بیٹھ کر تالیاں بجانے والے ہی ہیں
اور وہاں مزے کی بات کہ بیچ چوراہے میں ہنڈیا توڑنے والے لالٹین والی سرکار کے سابق رہنما کے مطابق ان کا ضمیر اب جاگ گیا پتہ نہیں یہ ضمیر نامی چیز سیاست کے میدان میں کھیلنے والے کھلاڑیوں کے پاس ہوتی بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہے بھی تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ ضمیر کی کونسی قسم ہے کہ جو اس وقت جاگی جب ہزاروں پنج تونوں کو مروایا گیا اور کیا یہ ضمیر اتنا جاگ گیا کہ آدھی بات کرکے پھر سو گیا ہے کیا ان میں اتنی ہمت کہ اٹھ کر استعفی دیدیں اور عدالتوں میں پیش ہو کر ثبوت بھی پیش کریں کہ یہ وہ امریکی امداد ہے اور ساتھ میں استعفی بھی دیں کیونکہ جو عہدہ انہیں ملا ہے وہ بھی لالٹین والی سرکار کی وجہ سے ملا ہے لیکن ضمیر جیسے معاملات میں ہمارے پڑوسی ممالک اور بقول کافر ممالک کے وزیروں سینیٹروں میں شرم وحیا نام کی کوئی چیز ہوتی ہے کچھ خودکشی کرلیتے ہیں اور کچھ استعفے بھی دے دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا کوئی تصور دیکھنے میں نہیں آرہا۔ لیکن وہ یورپ ہے اور ہم مسلمان اور پھر پاکستانی سو خاندانوں تک محدود ان سیاستدانوں کو پتہ ہے کہ چند دن واہ

واہ تو قومیں میں ہوگی اور بھولنے والی یہ قوم سب کچھ بھول جائیگی اور ہمارا کام چلتا رہے گا لیکن کیا اس ملک میں قانون اندھا ہے کیونکہ اگر لالٹین والی سرکار اس پر عدالت نہیں جاتی تو اندھا انصاف فراہم کرنے والوں کو اس کا نوٹس لینا چاہئیے کیونکہ معاملہ نہ صرف پختونوں کے خون کا ہے بلکہ دو غیر ممالک سے فنڈز لینے کا بھی ہے جس کی تحقیقات اگر کی جائے تو شائد کچھ نہ کچھ نکل آہی جائے ویسے جن لوگوں کے رشتہ دار عزیز واقارب سابقہ دور میں بم دھماکوں اور خود کش حملوں کا شکار ہوئے ہیں ان میں اگر کوئی اس معاملے میں عدلیہ سے رجوع کرے تو پھر بھی کچھ ہو سکے گا لیکن حالات دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ پوری قوم ہی تیسری بوری میں بند ہیروئنچی سے بھی بدتر ہے جو آواز تک نہیں نکال رہی۔

انصاف کون فراہم کریگا

بارہ سال کی عمر کا طالب علم دو ہفتے بعد اپنے گھر آیا تھا اپنے چار معصوم بہنوں کیساتھ گھر کے آنگن میں کھیل رہا تھا چونکہ وہ اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا اس لئے وہ اپنی والدہ کیساتھ گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹا رہا تھا مدرسے میں اسے اپنی والد و والدہ اور بہنوں کی بہت یاد آتی تھی اپنے والد سے گلے مل کر سونا اور اپنی دوستوں کی باتیں کرنا کتنا مزے ہے یہ اس معصوم طالب علم کو ہی پتہ ہے مدرسے میں دوسروں کے گھروں سے آنیوالا کھانا اسے مجبورا کھانا پڑتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی کہ کاش وہ بھی روزانہ اپنی والدہ کے ہاتھ کا کھانا کھاتا مدرسے کی روٹین سے ہٹ کر اپنے گھر والوں میں رہتا اس کی ہر دفعہ خواہش ہوتی لیکن دو ہفتے بعد اسے ایک رات گھر آنے کا موقع ملتا اور اسی سے وہ انجوائے کرتا چھوٹی بہنوں کیساتھ کھیلنے کے دوران اس کی والدہ نے انہیں کھانا کیلئے روٹی دی اور ساتھ ہی اسے ہدایت کی کہ کھانا کھانے کے بعد جلدی سے سوجانا والدہ نے اسے یہ بھی کہا کہ والد کے آنے پر اسے زیادہ باتیں مت کرنا کیونکہ اسے دوسرے دن پھر کام پر جانا ہوتا ہے اس معصوم نے والدہ کی دلجوئی کیلئے اسے ہاں کہہ دیا لیکن اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ والد جلدی گھر آجائے یہی سوچ کر اسے

نیند آ گئی اور وہ نیند کی گہری وادی میں گم ہوگیا۔ معصوم طالب علم کا یہ خاندان دو کمروں پر مشتمل ایک گھر میں رہائش پذیر تھا جن میں ایک کمرہ باورچی خانہ تھی جبکہ دوسرے کمرے میں سب لوگ سوتے اس کا والدایک مقامی طور پر چلنے والی ایک بس کا ڈرائیور تھا بس ڈرائیور نے اپنے بڑے بیٹے کو مدرسے میں مذہبی تعلیم کیلئے داخل کروایا تھا ۔

نیند کی گہری وادی میں گم معصوم طالب علم والد کا انتظار کرتے کرتے سوگیا لیکن یکدم اسے اندھیرے کا احساس ہوا اور پھر سسکیوں آہوں اور منت بھری آواز سن کر اٹھ بیٹھا وہ سمجھا کہ شائد وہ کسی اور جگہ پر ہے لیکن وہ اپنے ہی گھر میں موجود تھا اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ چار افراد اندھیرے میں اس کی والدہ کو اٹھا رہے تھے اور ساتھ میں مار بھی رہے تھے اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور والدہ کو آواز دی اس معصوم طالب علم کی آواز سننے کے بعد ان چاروں میں ایک نے آواز لگائی کی کہ اسے بھی سبق سکھاتے ہیں اور پھر نہ صرف اس کے ساتھ وہ حیوانی کھیل کھیلا گیا بلکہ اس کی والدہ کیساتھ بھی جسے وہ آج بھی سوچتے ہوئے ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ کاش اس کے ہاتھ میں چھرا ہوتا اور ان تمام لوگوں کو جنہوں نے اسے اور اس کی والدہ کو زیادتی کا نشانہ بنایا ذبح کر ڈالے آج بھی وہ معصوم طالب علم اس بات کو یاد کرتے ہوئے رو پڑتا ہے کہ کس طرح ان

چاروں نے اسے اس کی والدہ کو زیادتی کا نشانہ بنایا کہ اس دوران اس کا والد گھر کے مین دروازے سے گھر میں داخل ہوا اور ان ظالموں نے پہلے اسے ہاتھ میں گولی مار دی اور جب اس کے والد نے مزاحمت کی تو پھر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور تین گولیاں اس کے والد کے سینے میں لگی جس سے وہ موقع پر جاں بحق ہوگیا اور وہ چار لوگ موقع سے فرار ہوگئے وہ اپنے والد کے مردہ جسم اور زیادتی کا شکار والدہ کو دیکھ رہا تھا اور اسکے آنکھوں میں جیسے خون آگیا لیکن وہ خود بھی زیادتی کا شکار ہوا تھا اور پھر غصے کی ایک لہر نے اسے ہوش سے بے گانہ کردیا-

یقیناپڑھنے والوں کیلئے یہ ایک افسانہ یا ڈرامہ ہی ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت ہے اسی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے شہر پشاور کے نواحی علاقہ تاروجبہ میں پیش آنیوالا واقعہ جو اسی سال کے آٹھویں مہینے میں پیش آیا تھا جس کی ایف آئی بھی تھانہ پبی میں درج کروائی گئی اور آج زیادتی کا نشانہ بننے والا طالب علم اپنی والدہ کے ہمراہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر انصاف کے حصول کیلئے عدالتوں کے چکر لگا رہا ہے لیکن انصاف کے بڑے دروازوں میں ان جیسے غریب لوگوں کیلئے کچھ بھی نہیں کیونکہ جن لوگوں نے جرم کیا ہے وہ پیسے کے بل بوتے پر بہت کچھ کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس اندوہناک واقعے کے فورا بعد متعلقہ پولیس کو پیسے کھلا دیئے اور انہوں نے صرف ڈکیتی

کا مقدمہ درج کروادیا اور اس معصوم طالب علم اس کی والدہ کیساتھ زیادتی اور والد کے قتل کا مقدمے کا اندراج ہی نہیں کروایا اور اس کے ساتھ ہی ضمانت قبل از گرفتاری بھی کروادی یہ ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان جہاں پر نام کی حد تک اسلام موجود ہے ۔ اپنے ساتھ ہونیوالے زیادتی کے مقدموں کا اندراج کیلئے آج معصوم طالب علم اپنی والدہ داد اور چار معصوم بہنوں کے ہمراہ عدالتوں کے چکر کاٹ رہا ہے کیونکہ اپنے علاقے کے تھانے میں انصاف ملنے کے بجائے اسے دھمکیاں ہی ملتی ہیں اور اب عدالتوں میں آنیکا سلسلہ جاری ہے جو پتہ نہیں کب تک جاری رہیگا لیکن ایک سوال جو میرے ذہن میں سے گونج رہی ہے جس کا جواب اس معاشرے کے ہر فرد سے میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وہ لوگ جو انصاف کے سنگھاسن پر بیٹھے انصاف کی فراہمی کا دعوی کرتے ہیں وہ اللہ تعالی کو جواب دے سکیں گے کہ انہیں اس کیس کا پتہ نہیں تھا کیا تھانے میں تعینات ہر وہ اہلکار جو ان جیسے معصوم طالب علموں کے خاندانوں کے تحفظ کیلئے بیٹھے ہیں اور ان کی ٹیکسوں پر پلتے ہیں کیا وہ اپنی طاقت ڈنڈا اللہ کے دربار میں بھی استعمال کرسکے گا جس پر بحیثیت مسلمان ہم سب کا ایمان ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئیگا جب ہر عمل کا حساب لیا جائیگا اور یہ دن یوم آخر ہوگا اور کیا اس علاقے میں جہاں پر یہ واقعہ پیش آیا اس علاقے کے لوگ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اللہ کے

دربار میں بری کرواسکیں گے کہ بحثیت پڑوسی ان کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی -کیا خیبر پختونخواہ میں تبدیلی کے نام پر آنیوالے حکمران اس بات کا جواب دے سکیں گے کیونکہ یہ تبدیلی والی سرکار کے ٹکٹ سے منتخب ہونیوالے وزیراعلی کا ہی حلقہ ہے کیا وہ اس معصوم طالب علم اس کی والدہ کیساتھ زیادتی والد کے قتل کا نوٹس لیکراسے انصاف فراہم کرسکیں گے اور پولیس گردی سے بھی اس معصوم لوگوں کو بچا سکیں گے اگر جواب مثبت میں ہے تو بھی یہ کوئی احسان نہیں ہوگا کیونکہ حکمران ہی عوام کی مائی باپ ہوتے ہیں اور اگر نہیں اور انہوں نے آنکھیں بند کرلیں تو پھر انصاف وہ کرے گا جس کا در بھی بہت بڑا ہے اور جس کے انصاف میں وقت ضرور لگتا ہے لیکن اس کے انصاف میں کوئی شک نہیں اور جو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے-

ستو کھانا اور سیٹی بجانا حکمرانوں کی انوکھی روش

صوبہ خیبر پختونخواہ میں تبدیلی کے نام پر آنیوالے حکمران بھی سابقہ حکمرانوں کی روش پر چل پڑے ہیں یعنی پشتو زبان کے مثل کے مصداق ستو بھی کھا رہے ہیں اور ساتھ میں سیٹی بھی بجا رہے ہیں حکومتی مزے بھی چل رہے ہیں اور ساتھ میں آوے ہی آوے اور جاوے ہی جاوے کے ڈرامے بھی سرکاری خرچے پر ہو رہے ہیں سابقہ والوں کے بارے میں اب ان کے اپنے ہی کہہ رہے ہیں کہ یہ چور اچکے ہیں خیر یہ الگ موضوع ہے لیکن ڈرون حملوں کے خلاف نیٹو سپلائی کی بندش کے ڈرامے سے واضح ہوگیا کہ حکمرانی کے کرسی پر بیٹھنے والے پہلے صرف ہوشیار تھے جبکہ نئے آنیوالے والے مکار بھی ہیں۔ نیٹو سپلائی کے نام پر ہونیوالے دھرنے سے ہمیں پتہ چلا کہ دھرنا کرسیوں پر دیا جاتا ہے اور اس عمل میں نام کی حد تک اسلامی پارٹی بھی شامل ہیں جنہوں نے پشاور کے کوہاٹ روڈ پر کرسیاں رکھ کر جلسہ کرکے کہہ دیا کہ یہ دھرنا ہے جس کے بعد تبدیلی والی سرکار بھی کرسیوں پر بیٹھ کر دھرنے دینے لگی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے تبدیلی والی سرکار کے دور میں آکر ہمیں پتہ چلا کہ دھرنے کرسیوں پر بیٹھ کر دیئے جاتے ہیں ۔ کسی زمانے میں ڈمہ ڈولا کی واقعے پر حکومت سے استعفی دینے والی ایک اہم شخصیت آج کل حکومت میں مزے بھی لے رہی

ہیں اور ساتھ میں احتجاج بھی کر رہی ہیں کیونکہ انہیں اس استعفے کے بعد احساس ہوا تھا کہ اس ملک ناپرسان میں تو صرف ڈنڈے، پیسے اور طاقت کا زور چلتا ہے اسی باعث اب کی بار ہنگو میں ہونیوالے ڈرون حملے پر صرف زبانی جمع خرچ کیا جارہا ہے کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ بے وقوف عوام ویسے بھی چیخیں مار کر خاموش ہو جاتی ہیں -

تبدیلی کے نام پر آنیوالے حکمران نے سابقہ حکومت کی طرح اپنی دھرتی اپنا اختیار کا نیا نعرہ لگانا شروع کردیا ہے یہ الگ بات کہ سابقہ حکمران اس وعدوں میں کامیاب نہ ہوسکی اور انہوں نے اپنی زمین پر اپنی بدمعاشی شروع کردی بہر حال سابقہ حکمرانوں نے جو حال اپنی دھرتی کا کیا وہ تو پانچ سالوں میں کرکے گئے اب کی بار آنیوالوں نے صرف چھ ماہ میں بے وقوف عوام کو ہر معاملے میں کفن چور اور اس کے بیٹے کا کہانی یاد دلادی ہے صوبے کے عوام کو امیدیں تھی کہ تبدیلی کے نام پر حکمرانی کرنے والے صوبے کے عوام کا حال بہتر کرینگے لیکن حال تو یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ حکمران غسل خانوں میں اپنے نشوں میں مصروف عمل ہیں اور ان کے پارٹی کے کارکن ڈنڈے ہاتھ میں لیکر سڑکوں پر نیٹو سپلائی کو روکنے کیلئے ڈنڈا ابردار فورس کی حیثیت سے کام کررہے ہیں صبح سے شام تک یہ ڈرامہ چل رہا ہے نہ کوئی قانونی حیثیت نہ کوئی اختیار لیکن پھر بھی یہ ڈرامہ چل رہا ہے بیروزگاری، مہنگائی اور ذہنی تناؤ کا شکار

نوجوان سارا دن سڑک کنارے کھڑے ہو کر لائیو پروگراموں کا حصہ بن رہے ہیں کوئی تعمیری کام نہیں ہورہا ہاں اخبارات اور ٹی وی چینل والوں کیلئے موضوع مل گیا ہے ان کا کاکام اچھا چل رہا ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ ڈرن کے خلاف ہونیوالے تاریخی ڈرامے کا حال یہ ہے کہ جس طرح حکمران منافقت کر رہے ہیں اس طرح ان کے کارکن بھی منافقت کی بام عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ قانون کی عملداری کے دعویداروں کا یہ حال ہے کہ روڈ کنارے گاڑیاں روکی جاتی ہیں ان کے کاغذات چیک کئے جاتے ہیں اس دوران تصاویر بنوائی جاتی ہیں اور پھر گاڑیوں کو آگے جانے دیا جاتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھار تصاویر بنوانے کے معاملے میں پر جھگڑے بھی ہو جاتے ہیں اور پھر فائرنگ کے واقعات ہو جاتے ہیں' مزدوری کرنے والوں ڈرائیوروں کو مارا جاتا ہے غنڈہ گردی کی جاتی ہے اس وقت تک خاموشی چھا جاتی ہیں لیکن پھر میڈیا پر خبریں آنے کے بعد قانون کا نفاذ کرنے والے خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں ایف آئی آر کا اندراج ہوتا ہے لیکن چونکہ سارا ڈرامہ سرکار کی مرضی سے ہورہا ہوتا ہے اس لئے قانون جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اندھا ہوتا ہے اتنا ہی اندھا ہو جاتا ہے کہ ایف آئی آر کے اندراج کے باوجود نہ تو کارکنوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی تحقیقات ہوتی ہیں کیونکہ اوپر سے آرڈر چل رہا ہے کہ \"سب چلتا ہے اور چلنے دو\" کی پالیسی اپناؤ اور یوں ہی کام چلاؤ۔ حالانکہ اگر فائرنگ کسی غریب آدمی سے ہو جاتی یا پھر جھگڑا ہو جاتا تو پھر

اس کے خاندان کے بچے بھی راتوں رات تھانوں میں سرکار کے مہمان بنتے اور پھر دہشت گردی کے مقدمات بن جاتے لیکن چونکہ فائرنگ کرنے والے اور مار پیٹ کرنے والے پیسے والے لوگ ہیں اس لئے ان کیلئے قانون بھی انوکھا اور اندھا ہی ہے۔

کرپشن کے خاتمے کے دعوے بھی بہت کئے جاتے تھے کل کے اتحادی آج میدان اپوزیشن میں بیٹھ کر سچ بولنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے ممبران کو لات مار کر اسمبلی سے نکال دیا گیا ہے ان پر الزام عائد کیا گیا کہ کہ ان کی وجہ سے تبدیلی والی سرکار بدنام ہو رہی ہیں کرپشن کی خاتمے کی باتیں کرنے والے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کہ کرپشن کرنے والوں کو نکال کر انہوں نے بڑا کام کر دیا ہے اگر ان کے خلاف ثبوت ہے تو ان کی بنیاد پر ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جائے عدالتوں میں اسے لایا جائے اور کرپشن کی بنیاد پر ان کے مقدمات کھولے جائیں لیکن اس معاملے میں بھی تبدیلی والی سرکار اتحاد ختم کرکے سمجھ بیٹھی ہے کہ انہوں نے کرپشن کا خاتمہ کر دیا ہے حالانکہ انہیں اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچا دیا نا چاہیئے ویسے آپس کی بات ہے تبدیلی والی سرکار اپنے ممبران اسمبلی کا احتساب کب کرے گی کیا بھائی کے نام پر بھرتیوں میں کمیشن لینے والے کسی کو نظر نہیں آرہے یا پھر ایسے ممبران جن کے پاس الیکشن سے قبل رکشہ کے کرائے کے پیسے نہیں تھے آج کل بیس لاکھ کی ذاتی گاڑیوں میں کیسے گھوم رہے ہیں کیا ان کے کارخانے لگ گئے ہیں یہ وہ سوال ہے جو تبدیلی

- والی سرکار کو خود سوچنا چاہیے

تبدیلی کس طرح ممکن

وہ بمشکل دس سال کی تھی اس کی گردن میں ٹوکری تھی جس میں وہ پلاسٹک کے مختلف چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں ٹافیاں ببل اور مختلف کھانے کی چیزیں پڑی ہوئی تھی وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا کہ ٹافیاں لو گے میں نے اس معصوم کو دیکھا ایک لحظے کیلئے میری اپنی بیٹی اپنی معصوم نگاہوں کو لیکر میرے سامنے آ گئی اور میں نے ہاں کر دی اس سے ٹافیوں کا پیکٹ لیا اور کچھ اضافی پیسے دیکر اسے کہا کہ ٹھیک ہے وہ تو خوش ہو کر روانہ ہو گئی لیکن ساتھ میں وہ دروازے کو دیکھ رہی تھی جہاں پر کھانا مہمانوں کو پیش کیا جا رہا تھا اس دوران میرے پیچھے کھڑے مہمان نے اسے کہا کہ چلی جاو اور دوبارہ یہاں مت آنا وہ وہ معصوم سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے چلی گئی جس شخص نے اسے غصے سے کہا تھا کہ چلی جاؤ اس نے اپنی بیٹی کو اٹھایا اور اندر چلا گیا۔ میں اپنے دوست کی بہن کی شادی میں شرکت کیلئے آیا تھا اور اس معصوم کو جاتے دیکھ کر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہوں وہ معصوم لڑکی بھوکی بھی لگ رہی تھی لیکن اس کی بھوک شائد کسی اور نظر نہیں آ رہی تھی اور اس فکر نے مجھے ذہنی تناؤ کا شکار کر دیا۔

چند ہی لمحے گزر گئے اور اسی دوران ایک آٹھ سال کا بچہ ہاتھ میں چپل اٹھائے آیا اور مجھے کہا کہ پالش کروانی ہے اسے دیکھ کر مجھے مزید ذہنی تناؤ ہونے لگا اتنے معصوم ہاتھوں میں پالش کی ڈبیاں اور برش دیکھ کر عجیب سے خیالات ذہن میں آرہے تھے یہ ہمارے کل کا مستقبل ہیں اس معصوم کو دیکھ کر بھی وہاں پر کھڑے لوگوں نے اسے ڈانٹا اور وہاں سے نکال دیا کہ یہ گندے کپڑوں میں پھرنے والا بچہ لمبی گاڑیوں قیمتی کپڑوں میں ملبوس لوگوں میں عجیب لگ رہا تھا وہ بچہ بھی اپنے بھوک یا اپنے گھر والوں کی بھوک مٹانے کیلئے گھر سے نکلا تھا یہ الگ بات کہ اس عمل میں شائد اس کے گھر والوں کی غلطی تھی کہ اتنے معصوم بچوں کو مزدوری کرنے کیلئے نکال دیا لیکن ان دونوں بچوں کیساتھ روا رکھے جانیوالے رویئے نے بتا دیا کہ ہم صرف نام کے مسلمان ہیں کلمہ ضرور پڑھتے ہیں پانچ مرتبہ سجدے بھی ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا اثر نہیں ہوتا ہمارے اپنے بچوں کیلئے رویہ الگ ہوتا ہے اور دوسروں کے بچوں کیلئے رویہ الگ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جیسے ہم وہیں ویسے ہی حکمران ہم پر مسلط ہیں۔

کیا اس ملک میں وسائل کی کمی ہے افرادی قوت کی کمی ہے تکنیکی ماہرین کی کمی ہے یا پھر صورتحال ایسی ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے خلوص دل سے لوگوں کے مسائل حل کرنے والے لیڈروں کی کمی ہے ہر کوئی یہی جواب دے گا کہ سب کچھ ہے لیکن خلوص نیت کی کمی ہے اور ایسے مخلص لیڈروں کی کمی ہے جو لوگوں کو

مواقع فراہم کرے لیکن اپنی حد تک ہر کوئی اس معاملے میں کتنا مخلص ہے کوئی بھی نہیں کیونکہ ہر ایک شخص ایک حد تک لیڈر رہے کوئی اپنے گھر میں کوئی دفتر میں کوئی کام میں ہماری کوشش ہے کہ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائیں چھوٹے دکاندار سے لیکر بڑے تاجر تک پولیس کے کانسٹیبل سے لیکر بڑے آفیسر تک کنڈیکٹر سے ڈرائیور تک صحافی سے اخبار یا ٹی وی کے مالک تک فوج سے لیکر طالبان تک الف سے لیکر ی تک زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ اپنی ڈفلی بجاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسئلے سے مسائل بن گئے ہیں لیکن صورتحال بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہوتی جارہی ہے حکمران بد سے بدتر مل رہے ہیں پہلے والے اگر چور تھے تو نئے والے ڈکیت ہیں ایسے میں بہتری کی امید کون رکھے۔

کیا ہم اپنی گریبان میں جھانکنے کی ہمت رکھتے ہیں کیا ہم میں قربانی کا جذبہ موجود ہے نہیں ہم اپنے ارد گرد چلنے والے معصوم بچوں کو کھانا نہیں کھلا سکتے ان کے ساتھ دو لفظ پیار کے نہیں بول سکتے انہیں حوصلہ نہیں دے سکتے تو پھر تبدیلی کس طرح ممکن ہے دوسروں سے تبدیلی کی توقع رکھنے والے اگر آج اپنے آپ سے تبدیلی کا آغاز کریں تو شائد کچھ ہو بھی جائے لیکن – یہ کب ہوگا خدا ہی جانے۔

پخوا خو پخوا دے کنہ

ہمارے بچپن میں پشاور شمال مغربی سرحدی صوبے کا دارالخلافہ تھا اب جبکہ ہم جوان ہیں تو یہ خیبر پختونخواہ کا دارالخلافہ بن چکا ہے پتہ نہیں ہمارے بڑھاپے میں کیا حال ہوگا لیکن ایک بات جو اتنے عرصے میں دیکھ چکا ہوں کہ پہلے یہاں پر مقامی یا پھر نواحی اضلاع سے لوگ آکر یہاں روزگار کیلئے آتے تھے اب یہاں کے مقامی لوگ تو پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئے اب تو افغانستان سے لوگ آکر یہاں پر آباد ہوگئے ہیں اور ان لوگوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ مقامی لوگ نادرا کی مہربانی) اللہ بخشے فلموں والی نادرا نہیں (سے شناختی کارڈ تو نہیں بنا سکتے اور اگر کسی کے خوش قسمتی سے بنے ہیں تو نامعلوم وجوہات کی بناء پر بلاک کردیئے گئے ہیں جبکہ لر او بر کے نام پر آنیوالے افغانیوں کے ماشاء اللہ شناختی کارڈ بھی ہیں زمینیں بھی کاروبار بھی اور پاسپورٹ بھی اور اسی پشاور میں یہ لوگ مزے سے زندگی گزار رہے ہیں کسی زمانے میں اس شہر کو پھولوں کا شہر کہا جاتا تھا اب پتہ نہیں پھول کہاں غائب ہیں اور آج کل تو یہ حال ہے کہ گوبھی والی پھول بھی کمیاب ہیں کیونکہ سبزی مہنگی جو ہو گئی ہیں شائد پھولوں والا شہر اس وقت کہا جاتا تھا جب یہ شمال مغربی سرحدی صوبے کا دارالخلافہ تھا اب تو اسے دھماکوں کا شہر بھتہ خوروں کا شہر ڈاکوئوں اور چوروں کا شہر کہا جائے تو غلط نہیں

ہوگا۔ساتھ میں گرد و غبار اور گندگی کا شہر بھی پشاور شہر کے چاروں اطراف میں وردی والوں کے ناکے لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی دھماکے ہوتے ہیں پھر بھی لوگوں کو بھتے کے خطوط ملتے ہیں اور پھر بھی روڈ کنارے کسی کو دن دیہاڑے لوٹ لیا جاتا ہے شائد یہ اس کے نام کا اثر ہے جس میں کہا جاتا تھا کہ پشاور پیشہ آوروں کا شہر ہے اور وردی والے خواہ وہ کالے وردی والے ہوں یا خاکی وردی والے ان پیشہ وروں جو کہ بارود لیکر آتے ہیں یا گاڑیاں بارود سے لیکر شہر میں دھماکے کراتے ہیں یا پھر ڈاکوئوں کو تنگ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ پیشہ وروں کا شہر ہے اور شائد ان کے نظر میں یہ بھی ۔ ایک پیشہ ہی ہے ۔ اس لئے وہ لوگ یہاں پر آکر کھلے عام اپنا کام کرجاتے ہیں

پیخور خو پیخور دے کنہ یعنی پشاور تو پشاور ہے کا گانا ہمارے ایک دوست گلوکار نے گایا تھا جس میں اس نے تانگے پر سواری دکھائی تھی اب اس شہر میں تانگوں کی سواری حال حال ہی ملتی ہے ہر سڑک پر ہر چھٹا شخص اگر افغان مہاجر ملتا ہے تو روڈ پر چلنے والی ٹریفک میں ہر تیسرا رکشہ ہی ہے جن کے چلانے والوں میں اتنا اتفاق ہے کہ ایک ہی پرمٹ پر تین اور بعض مقامات پر پانچ پانچ رکشے چلتے ہیں ۔ہمارے پیارے شہر پشاور کی سیکورٹی اتنی زبردست ہے کہ شہر میں ہر جگہ جہاں پر تھانہ واقع ہے وہاں پر کام کرنے والے پولیس اہلکار رات کو چین کی نیند سوتے ہیں کیونکہ تھانوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ان

کے تھانوں کے آگے پیچھے بڑی بڑی سیکورٹی وال لگا دیئے گئے ہیں تاکہ اس شہر کی شہریوں کی خدمت کرنے والے یہ پولیس اہلکار دن رات ذہنی تناؤ سے بچے رہیں یہ الگ بات کہ بعض اوقات یہ اپنے جیب خرچ کیلئے شریف شہریوں کو ذہنی تناؤ کا شکار کرتے ہیں کسی شریف آدمی کے جیب سے چرس نکالنا ان کے دو انگلیوں کا کمال ہوتا ہے - اور پھر شریف آدمی اپنی عزت کی ڈر کی وجہ سے نذرانہ دیکر جان چھڑاتا ہے

سڑکیں ہمارے صوبائی دارالحکومت پشاور کی ایسی ہیں کہ اگر کوئی کھانا ہضم کرنا چاہے تو صرف پشاور پریس کلب کے سامنے والی روڈ پر رکشے مزدایا اپنی گاڑی میں گزر کر صرف پانچ میں اپنا کھانا ہضم کرواسکتا ہے اور اگر کوئی ہماری طرح خشاکی) بے وقعت (ہو تو وہ سائیکل پر اس مفت کی سروس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور یہی حال پورے شہر کی سڑکوں کا ہے کچھ خرچہ پانی سی اینڈ ڈبلیو والے ان سڑکوں کی تعمیر سے نکال لیتے ہیں اورکچھ سڑکیں ٹاؤن کمیٹی کے اہلکاروں کیلئے روزانہ کی بنیاد پر خرچہ پانی نکالنے کا باعث بن رہی ہیں توکچھ سڑکیں روڈ کنارے پارکنگ کی سہولت بھی دے رہی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس بہتی گنگا میں کنٹونمنٹ بورڈ والے بھی ہاتھ تو نہیں البتہ خود نہا رہے ہیں شیر شاہ سوری کی زمانے میں بننے والی سڑک کے بعض حصوں پر وردی والوں کا قبضہ ہے انہیں موت سے زیادہ ڈر لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سڑکوں پر

بلاک اور پتہ نہیں کیا کیا انتظامات کردیئے ہیں کہ شائد موت کا فرشتہ بڑے بڑے بلاک کلاشنکوف اور وہاں پر کھڑے تندخو اور درشت لہجے میں بات کرنے والوں کو دیکھ کر ان کی طرف نہیں آئیگا - خیر کچھ سڑکیں ان لوگوں نے بلاک کردی ہے جس کے باعث ٹریفک کا حال یہ ہے کہ کسی زمانے میں باڑے کی بس اپنی تیزی اور کوہاٹ اڈے کی بس اپنی سستی کی وجہ سے مشہور تھی جبکہ اب تو یہ دونوں گاڑیاں یہ محمود و آیاز کی طرف ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتی ہیں -

یہ واحد شہر ہے جہاں پر پاپڑ بسکٹ اور روٹی میں تمیز کرنا موجودہ دور میں انتہائی مشکل ہے اس میں کچھ غلطی ہماری خواتین کی بھی ہے جنہوں نے گھروں میں روٹی پکانا چھوڑ دیا ہے اور اب ہم بھی اپنی خواتین کی طرح نکمے ہوگئے ہیں تیار روٹیاں بازار میں ملتی ہیں یہی وجہ ہے کہ لر اور بر کی آوازیں نکالنے والوں کے دور میں روٹی کا سائز پاپڑ تک آگیا - کسی زمانے میں کہا جاتا تھا کہ صرف بیس روپے میں اس مہمان دوست شہر میں ایک وقت کا کھانا کھا سکتا ہے اب یہ حال 70 روپے تک پہنچ گیا ہے قہوہ جس کے بارے میں کہاجاتا تھا کہ اسے پینے اور پلانے کیلئے شہری لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں اب تو حال یہ ہوگیا ہے کہ پینے کیلئے پانی بھی اس شہر کے باسیوں کو نہیں ملتا- قہوہ تو دور کی بات ہے- خدا جانے آگے کیا ہوگا اس شہر میں زمین اور پیسے کی قیمت بڑھ رہی ہیں لیکن انسان کی قیمت گھٹ رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار ایک

مرلے زمین پر سات جنازے اٹھتے ہیں تو کبھی دو روپے نہ دینے پر سکول جانے والے بچوں پر فائرنگ ہوتی ہیں ۔ کسی زمانے میں پخ تونوں کو نسوار کی وجہ سے جاہل سمجھنے والے اب جان لیں کہ اب یہ لوگ بڑے سٹائل سے شیشہ پیتے نظر آتے ہیں شائد پخ تونوں نے یہ بات سنی ہے " چہ خر داخرہ کم وی نو غوگ ئے داپریکولے دے" یعنی گدھا اگر گدھے سے کم ہو تو اس کے کان کاٹنے چاہیئے شائد اس لئے ماڈرن ازم کے اس دور میں پخ تونوں نے نسوار کیساتھ ساتھ شیشے کا استعمال شروع کر دیا ہے یہ اس شہر کا کمال ہے کہ ہر شخص خواہ وہ چوری میں پکڑا جائے کسی جھگڑے میں پھنس کر تھانے پہنچ جائے اس کیساتھ برتاؤ دہشت گردوں والا کیا جاتا ہے اور اگر خوش قسمت بھاگ جائے یا بد قسمتی سے فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن جائے تو پھر اسے دہشت گرد قرار دینا سب سے آسان کام ہے کیونکہ دہشت گردی کے نام پتہ فنڈز بھی آرہا ہے اور دہشت گردوں کو مارتے ہوئے کسی کا دل بھی نہیں دکھتا اس لئے ہر غریب آدمی جو ڈنڈے کی زد میں آجائے تو پھر وہ دہشت گرد ہے خواہ اس نے کسی کی مرغی ہی چوری کیوں نہ کی ہو اسے دہشت گرد ہی سمجھا اور مانا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب اس شہر میں لوگ بھی لاپتہ ہوتے ہیں اور انکی بوری میں بند لاشیں بھی مل جاتی ہیں ۔

بلاول کے نام کھلا خط

محترم لکھتے ہوئے بھی دکھ ہو رہا ہے کیونکہ اس لفظ کے قابل بھی نہیں ہو لیکن جس خواہش کا اظہار تم نے کیا ہے وہ تو انشاء اللہ نہ تمھاری اور نہ ہی تمھاے بعد آنیوالے نسلوں کی زندگی میں پورا ہوگا لیکن جو گالی تم نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عوام کو دیہے اس کا جواب دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں مجھے نہیں پتہ کہ تمھیں اسلام کے بنیادی نکات کا پتہ ہے کہ نہیں کیونکہ تمھارے جیسے لوگوں کیلئے مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ایک بات واضح کردوں کہ اس ملک کے تقریبا 19 کروڑ عوام بنیادی طور پر مسلمان ہیں اسلام کے بنیادی نکات اور عمل کے حوالے سے کمزور ترین ہی سہی لیکن شکر الحمد اللہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی توسط سے لائے گئے اسلام کو مکمل سمجھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی دنیاوی واخروی زندگی کی کامیابی ونجات اسی مذہب کے ذریعے ہوگی شائد تمھارے جیسے دس لاکھ لوگ جو اس ملک میں اقلیت ہیں لیکن حرام خوری کمیشن کرپشن سے پیدا کردہ حرام کے مال پر اس غریب عوام پر حکومت اور عیاشی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے تم نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کیلئے عیسائی وزیراعظم دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

بلاول ! تمھارا تعلق تو اس سرزمین سے ہے جہاں سے اس خطے میں اسلام کا آغاز ہوا سندھ کو باب الاسلام بھی کہا جاتا ہے اور اسلام کے اس دروازے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کی ایسی خواہش یقینا تمھاری ذاتی خواہش ہوگی نہ کہ سندھ کے غیور لوگوں کی لیکن میرا ان غیور لوگوں سے سوال ہے کہ وہ پیسے کے بل بوتے پر بننے والے اپنے اس نام نہاد رہنماء سے یہ سوال کریں کہ تمھارے لئے تو یقینا یہ دنیا ہی سب کچھ ہے کہ کس حثییت میں تم نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔

! مسٹر بلاول

میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے کتنے عیسائی ممالک ہیں جہاں پر وزیر اعظمٗ مسلمان ہیں میں مسیحی لوگوں کو برا نہیں سمجھتا کیونکہ ہر ایک اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے جس کا جواب اس نے اللہ تعالی کے سامنے دینا ہے اس دن جس دن انسان کی پوری زندگی ہر لمحے کا حساب ہوگا بلاؤل مجھے اندازہ ہے کہ آپ بڑے ادارے سے پڑھے ہو لیکن ان اداروں میں پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ کتاب اگر گدھے پر بھی رکھ دی جائے تو اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا گدھا گدھا ہی رہتا ہے اور اس کا کام فارغ وقت میں فضول ترین آوازیں ہی نکالنا ہے اس آواز کو دنیا کی بدترین آواز بھی کہا گیا ہے۔ مسٹر بلاول کیا آپ نے پاکستان کا آئین پڑھا ہے کبھی قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے شائد

نہیں کیونکہ جس طرح کی خواہشات کا اظہار تم کر رہے ہو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھاری تربیت کیساتھ ساتھ کردار میں بھی فرق ہے عقل مند کیلئے اشارہ ہی کافی ہے۔ بلاول ! تمھاری اس خواہش سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تمھیں پتہ ہے کہ تمھارے خاندان نے اس ملک کے عوام کو بے وقوف بنانے کا جو سلسلہ جاری کر رکھا ہے وہ شائد مزید برقرار نہ رہے کیونکہ کرپشن کمیشن چوری اور اس غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی لندن میں محل بنانے عیاشیاں کرنے پر تمھیں ڈر ہے کہ شائد اسلامی نظام آنے کی صورت میں تمھارے خاندان کے بیشتر لوگوں کے یا تو ہاتھ کاٹے جائیں گے یا پھر انہیں تختہ دار پر لٹکایا جائے گا تمھیں اسکا ڈر ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی سربراہ کی موجودگی میں تم لوگوں کی مزید حکومت نہ چل سکیں اور پاکستان کے بے وقوف عوام تمھیں مزید برداشت نہ کرسکیں اس لئے تم اس ملک میں عیسائی وزیراعظم دیکھنے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔ بلاول ! تمھارے نانا سے لیکر تمھارے والد نے اس مملکت اسلامیہ پر راج کیا ہے کبھی خدمت کے نام پر اس ملک کے عوام کو بے وقوف بنایا اور خدمت کے نام پر اپنی پیٹ بھرنے کیساتھ ساتھ اکاؤنٹس بھرے اور کبھی شہیدوں کی پارٹی کہہ کر اپنے آپ کو متعارف کروایا حالانکہ شہید وہی ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں قربان ہو جائے نہ کہ حکومت اور کرسی اقتدار کیلئے کوئی مارا جائے لیکن

پھر بھی اس ملک کے عوام کے صبر و استقلال کو سلام ہے کہ یہ لوگ اب بھی تمھیں برداشت کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پیدا ہونیوالے ہر بچے کو قرض دار بھی تم لوگوں نے بنایا ہے اور کچھ نہیں کہہ رہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اب ان لوگوں کی زندگیاں بھی اپنی فضول خواہشات کی نذر کرو !

زرداری کے بیٹے لکھنے کیلیئے بہت کچھ ہے لیکن تمھاری اس خواہش کے جواب میں صرف یہی لکھ سکتا ہو کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان لیکن کم نکلے ! سو یہ خواہش تمھارے دم ہی نکال دے گی-

والسلام

عیاش حکمران عوام اور پھسلتا وقت

مہنگائی معاشی بدحالی بجلی وگیس کی لوڈشیڈنگ سے تباہ حال اور نام کی حد تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تیسرے مرتبہ بننے والے وزیراعظم نے گذشتہ روز بیان دیا ہے کہ بار بار آئی ایم ایف کے نرغے میں آجاتے ہیں اور خدا کرے کہ اس سے جان چھوٹ جائے اور عوام کو سہولتیں فراہم ہوں ان کا یہ بیان بھی حکمرانوں کی روزمرہ کے بیانات کی طرح صرف خانہ پری ہے جسے ان کے ہم نوالوگ جو میڈیا میں بیٹھ کر ان کی پبلک ریلیشن کرتے ہیں نمایاں کرکے چھاپ دیتے ہیں اور پھر ان پر.بڑے.بڑے تبصرے اور خبریں بھی چھپتی ہیں کہ عوام کے غم میں خوار حکمران کتنی درد دل رکھتے ہیں حالانکہ ان حکمرانوں سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ آئی ایم ایف کے پاس جانے والے تو آپ خود ہیں جب آپ حکومت سے باہر تھے اور فرینڈلی اپوزیشن کا کردار ادا کررہے تھے اس وقت آپ آئی ایم ایف کے حوالے سے.بڑے دعوے کرتے تھے کہ قرضے نہیں لینگے بھوکے رہینگے اور کشکول اٹھا کر کہیں جائینگے لیکن حکومت میں آنے کے بعد تو آپ نے کشکول اٹھا خیرات زکواۃ قرضے لینے شروع کردیئے ہیں اور اس پر خود اپنے ساتھیوں کو عیاشی کروانا بھی شروع کردی ہیں جو کہ تاحال جاری ہے ۔ بھوکے ننگے ملک کے امیر حکمرانوں کی عیاشیوں کا یہ حال ہے کہ گذشتہ دورہ امریکہ میں پاکستانی وفد جو کہ وزیراعظم کی سربراہی میں امریکہ

گیا تھا وفد کے ممبران سمیت وزیر اعظم نے جس ہوٹل میں قیام کیا تھا اس کا ایک دن کا کرایہ سات ہزار پانچ سو ساٹھ ڈالر روزانہ تھا نیویارک کے پیلس ہوٹل میں سات لاکھ ہزار آٹھ سو روپے پر رات گزارنے والے وزیر اعظم ان کے وزیر خزانہ اسحاق ڈار 91 خواجہ آصف اور سرتاج عزیز نے اس ہوٹل میں قیام کیا تھا ایک رپورٹ کے مطابق ان افراد کے قیام و طعام اور ٹکٹس سمیت دیگر لوازمات پر ساڑھے دس کروڑ روپے اخراجات آئے تھے جو کہ قومی خزانہ کو خالی قرار دینے والے حکمرانوں نے ادا کئے بدترین معاشی بحران کے شکار پاکستانی عوام کیساتھ جمہوری حکمرانوں کا یہ رویہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس ملک کے حکمرانوں کو عوام سے کتنی محبت ہے ایک ایسے ملک میں جہاں پر پیدا ہونیوالا ہر بچہ تقریبا نوے ہزار روپے کا مقروض ہو وہاں پر حکمرانوں کی اس طرح کی عیاشیاں یہ ظاہر کرتی ہے کہ حکمرانوں کو صرف اپنا آپ اپنا خاندان اور اپنے دوست ہی نظر آتے ہیں انہیں صرف اپنے بچوں کی بہتری عزیز ہے جن کے بینک بیلنس بڑھتے رہے ان کے کارخانے ہر ملک میں بنتے رہے جس کیلئے دوروں پر دورے کئے جا رہے ہیں اور بیٹوں بیٹیوں کو اس ملک کے غریب اور بے وقوف عوام پر مسلط کرکے انہیں انداز سیاست بھی سکھائی جارہی ہیں تاکہ انہیں مستقبل میں لارالپہ کے ڈرامے دیکر بے وقوف عوام کو زندہ باد اور مردہ باد کیلئے تیار کیا جاسکے -

ایک طرف طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے حکمران ان کے شہزادے اور شہزادیاں اور دوستوں کا یہ حال ہے کہ عوام کے خون پسینے کی کمائی پر عیاشی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور دوسری طرف متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد جو کہ ممنونیت کی وجہ سے بڑے عہدے پر پہنچ گئے ہیں کہ چند ہی مہینوں میں اپنی اوقات تک بھول گئے ہیں تازہ مثال تو ممنون رہنے والی شخصیت کی ہے جو کراچی سے اسلام آباد تک پہنچ گئے اور پہلے ہی ملے میں سرکار کے مال پر اپنے خاندان کے لوگوں کو حج کروائی تاکہ لوگ انہیں حاجی بھی کہیں یہ الگ بات کہ ان کیلئے ادا کی جانیوالی رقم اس ملک کے غریب عوام کے ٹیکسوں سے پیدا ہونیوالی آمدنی سے ادا کی گئی جبکہ حال ہی میں موصوف نے اپنی تصاویر ایوان صدر میں لگانے کیلئے پندرہ لاکھ روپے فوٹو گرافر کو دے ڈالے اپنی فیملی خاندان پر حد سے زیادہ مہربان متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے صدر نے ڈیڑھ لاکھ روپے فی البم ادائیگی بھی کی ان کے اس عمل پر صدارتی ترجمان نے موقف اپنایا ہے کہ فوٹو گرافر کی خدمات پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے لی ہے اور انہیں قیمت کا اندازہ ہی نہیں یہ ہے قومی خزانے کو اللوتللو میں اڑانے والے والے ایلیٹ کلاس کے شہزادوں اور متوسط طبقے سے اوپر جانیوالے حکمرانوں کی عیاشیاں ان حالات میں کس طرح قرضوں کی ادائیگی کیلئے آئی ایم ایف کے پاس جانا نہیں پڑے گا یہ وہ سوال ہے کہ جو اس ملک کے حکمرانوں سے پوچھنے کی ضرورت ہے کیونکہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد تو انہیں اپنی اوقات بھی یاد نہیں

رہتی اور نہ ہی اپنا ارشادات) جو کہ حقیقت میں بکواس ہوتی ہے (جو وہ مختلف اوقات میں فرماتے ہیں -اس لئے اپنی کہی ہوئی باتیں بھول جاتے ہیں -یقیناً یہی وجہ ہے کہ حکمران یہ بھی بھول چکے ہیں کہ پاکستانی عوام کی قوت خرید اور سکت ختم ہو چکی ہیں پٹرول بجلی گیس کی لوڈشیڈنگ کیساتھ ان کی بڑھتی قیمتوں نے انہیں اس حال تک پہنچادیا ہے کہ اب لوگ چوری کی طرف راغب ہورہے ہیں اور حقیقت میں بجلی چوری کا بڑھتا ہونا عنصر اس بات کا ثبوت بھی ہے لیکن حکمرانوں کو اپنی عیاشیاں عزیز اور یاد ہیں اس لئے ایسے قوانین بنائے جارہے ہیں کہ عوام انہیں عیاشیوں کیلئے رقم فراہم کرے کوئی مرے یا جئے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں حال ہی میں بجلی چوری کے بڑھتے رجحان کو قابو کرنے کیلئے نیا آرڈیننس بھی جاری کردیا گیا ہے جو متوسط طبقے سے اسلام آباد ایوان صدر پہنچنے والے شخصیت نے کیا ہے جس میں دس لاکھ سے لیکر ایک کروڑ روپے تک جرمانہ کیساتھ ساتھ دو سے سات سال کی قید کی سزا بھی بجلی چوری پر شہریوں کو دی جائے گی انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ بجلی چوری کی وجوہات کیا ہے کون چوری کرکے بجلی استعمال کررہا ہے بس آرڈیننس ایک آسمانی صحیفہ ہے جو کہ حکمرانوں نے جاری کردیا ہے اور اس پر عملدرآمد اب اس بھوکے ننگی قوم پر فرض ہے
-

لیکن ان سب باتوں کو ایک لمحے کیلئے بھول جایئے یہ نیا سال 2014 ء ہے ہر

ایک شخص خواہ وہ حکمران ہو یا عام آدمی اپنی ذہن میں یہ بات لائے کہ صرف ایک ہندسہ اس میں تبدیل ہوگیا ہے یعنی یہ سال 2114 ء ہے اب ہر کوئی یہ سوچیں کہ وہ اس وقت کہاں ہونگے کہاں ہوگی آپ کی دولت کہاں ہوگا آپ کا خاندان آپکی نوکری آپ کا بڑا کاروبار اور سٹیٹس کیا اس وقت ہر چیز ختم نہیں ہوگی مٹی میں شامل ہوکر مٹی نہیں بنے ہوگی کیا ایسا نہیں ہوگا یقینا ایسا ہی ہوگا سب کچھ فنا ہوگا ہاں کچھ چیزیں ایسی ہوگی جو اس وقت بھی یاد رکھی جائینگی ہمارے اچھے اور برے اعمال جس طرح 1913 اور 1713ء کے لوگ کسی کو یاد نہیں کہاں ہیں وہ لوگ اسی طرح ہم میں ہر 1813 کوئی خواہ وہ حکمران ہو ایلیٹ کلاس سے ہو یا متوسط طبقے سے کیا اپنی ذمہ داری پوری کررہے ہیں جواب ہاں میں ہے تو پھر خوش قسمت ہے اور اگر نفی میں تو پھر ابھی سے آغاز کریں سچائی کی طرف جانے کیلئے ہمارے ذہنوں میں تو یہ بات ہے کہ ابھی بہت بڑا وقت پڑا ہے لیکن ہمیں اندازہ نہیں کہ ہاتھوں سے نکلنے اور پھسلنے والا وقت لوٹ کر نہیں آتا.

حب رسول عیاشیاں اور ہمارا کردار

اگر آپ کے اپنے گھر میں بچے بھوکے ہوں اور اس کا احساس بھی آپ کو ہو اور بحثیت والد اپنی غلطی کو بھی مانتے ہو لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود صرف اپنے نام کیلئے اور لوگوں کو دکھانے کیلئے آپ بڑی بڑی پارٹیاں منعقد کرتے ہوں تو اس طرح کے اقدام کو کرنے والے شخص کو کوئی بھی پاگل کہے گا کہ اپنے گھر میں بچے بھوکے ہیں لیکن صرف ستائش یا نمود و نمائش کیلئے آپ پارٹیاں منعقد کرتے ہو اور فضول خرچی کرتے ہوں تو یہ کسی کیلئے بھی قابل قبول نہیں ہوگا لیکن ہمیں اس صورتحال کا سامنا ہے ہمارے گھروں میں روزانہ دس سے بارہ گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کی جارہی ہیں ہر گھنٹے بعد ایک گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کا سلسلہ پشاور شہر اور مضافات میں جاری ہے اور اس سے بدتر صورتحال اس موسم سرما میں شہر کے مختلف دیہاتی علاقوں میں بھی ہے جہاں پر لوگ بجلی کو ترس گئے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عید میلاد النبی پر ہر سرکاری عمارت پر لاکھوں روپے کی برقی قمقمے لگائے گئے کرائے پر ان عمارات پر لگائے جانیوالے برقی قمقوں کو ادائیگی مختلف اداروں کو کرنی پڑے گی وہیں پر ان کے روشنی کیلئے استعمال ہونیوالی بجلی کی ادائیگی بھی صوبے کے مختلف اداروں کو کرنی پڑیگی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں پر مہنگائی کی صورتحال ایسی شرح پر پہنچ گئی ہو کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے

والے لوگ اپنے بچوں کیلئے ایک وقت کا خوراک پیدا کرنا عذاب بن گیا ہو اور لوڈشیڈنگ نے ان کی زندگی اجیرن بنادی ہو ان حالات میں حب رسول کے نام پر اس طرح کی عیاشی کس کھاتے میں جائیگی یہ وہ سوال ہے جو اس ملک کا ہر شہری عوام اپنے اوپر مسلط ہونیوالے حکمرانوں سے کرنا چاہتا ہے کہ آخر انہیں کس چیز کی سزا دی جارہی ہیں کیا حب رسول کا تقاضا صرف یہی رہ گیا ہے-

صرف ایک ہفتہ قبل پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک وفاقی وزیر جن کے اپنے حلقے میں بجلی چوروں کی تعداد کم نہیں اور صرف انہی کے حلقے کی فیکٹریوں کیلئے کرک سے نکلنے والے گیس کو سپلائی کیلئے صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام کو سولی پر اٹکایا جارہا ہے کیونکہ صوبائی حکومت اس گیس پلانٹ کو بجلی پیدا کرنے کیلئے استعمال کرنا چاہتی ہے تاہم وفاقی حکومت کو صرف صوبہ پنجاب ہی نظر آرہا ہے اسی وجہ سے انہوں نے صوبائی حکومت کو ہدایت کی ہے کہ اس منصوبے کے بجائے گیس کی سپلائی جاری رکھی جائے تاکہ وہاں پر کارخانے چلتے رہے اور یہاں کے شہری خوار ہوتے رہیں۔پنجاب سے تعلق رکھنے والے وزیر جن کی سب سے بڑی خوبی صرف وزیراعظم سے رشتہ داری ہے اور اسی قربت کی بناء پر وزیر مملکت بنادیئے گئے پیسکو ہیڈ کوارٹر میں آکر صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام کو بجلی چور کہہ گئے جواب میں یہاں سے تعلق رکھنے والے ایک سینئر وزیر ان کے حلقے میں جا کر جلسہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ساتھ ہی وہاں پر اسے بجلی چور

کہہ دیا۔ بجلی چوروں کا تعلق پنجاب سے ہو یا خیبر پختونخواہ سے اس کا سارا زور غریب عوام سے نکل رہا ہے خواہ وہ کسی بھی صوبے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن کیا ایک دوسرے کو چور قرار دینے والے دونوں وزیر حب رسول کے نام پر سرکاری عمارات پر اٹکائی جانیوالے غیر ضروری.برقی قمقموں اور اس کی آڑ میں ہونیوالی کرپشن کی روک تھام کیلئے اپنے طور پر کچھ کر سکیں گے یا نہیں۔ کیونکہ اس کے کنٹریکٹ بھی مخصوص لوگوں کو ملتے ہیں جس کیلئے باقاعدہ کمیشن مختلف اداروں کے سر.براہوں کو ملتے ہیں اور اس کا سارا زور اس ملک کے عوام سے نکلتا ہے خواہ وہ ٹیکس کی صورت میں ہو یا.ڑھتی ہوئی مہنگائی کی صورت میں۔

کیا اس ملک کے عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں کہ اپنے اور اپنے بچوں کیساتھ ہونیوالی اس زیادتی پر اٹھ نہ کھڑے ہوں لیکن حقیقت میں ہمارے ہاں یہ تاثر عام ہے کہ حکومتی اداروں پر لگنے والے اخراجات حکومت ہی ادا کرتی ہیں حالانکہ یہ عوام کے پیسے ہوتے ہیں جسے حکمران ٹیکس سمیت مختلف ڈراموں کی آڑ میں شہریوں سے وصول کرتی ہیں لیکن عوام کی لاپرواہی سے.برقی قمقموں سے دیواریں سجانے جیسے پروگراموں پر خرچ کئے جاتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔

کیا ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ والہ وسلم نے ہمیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ نہیں کیا اور اگر کیا تھا تو کیا یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ فضول خرچی اسلام میں نہیں کیا بحثیت امت محمدی کی ہر ایک شہری حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ والہ وسلم کے احکامات پر عملدرآمد کر رہا ہے کیا ہم میں برداشت کا مادہ ہے کیا ہم اپنے کاروبار جھوٹ منافقت پر نہیں چلا رہے کیا بحثیت شہری اور بحثیت ریاست کے ہمارے پڑوسی ہم سے مطمئن نہیں کیا ہم دوسروں کا حق مار کر خوش نہیں ہوتے ان حالات میں صرف برقی قمقمے لگا کر خوبصورت آواز میں نعت سنوا کر ہم منافقت نہیں کر رہے کہنے کو تو عید میلاد النبی کے موقع پر سب کچھ حب رسول میں کیا جاتا ہے لیکن یہ کیسا حب رسول ہے جس میں اللہ کے پیارے نبی کے کردار پر عمل کرنے کے بجائے صرف واہ واہ کی جائے اور اسی کو اپنے لئے راہ نجات سمجھا جائے -کیا یہ ظلم نہیں بالکل یہی ظلم ہے جو بحثیت شہری ہم اپنے ساتھ کر رہے ہیں اور ہمارے اوپر مسلط حکمران بھی کر رہے ہیں-

حکمرانوں کو خط

بخدمت جناب وزیراعظم پاکستان نواز شریف

بخدمت جناب پرویز خٹک وزیراعلی خیبر پختونخواہ

بخدمت جناب آئی جی پی خیبر پختونخواہ

بخدمت جناب آئی جی جیل خانہ جات

جناب عالی !

میں بحیثیت شہری اور صحافی کے آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں امید ہے آپ جواب دینا پسند فرمائیں گے۔

جناب والا ! کیا اس ملک میں غریب اور امیر کیلئے الگ قانون ہے کہ جو جتنا بڑے عہدے کا مالک ہوگا اس کیلئے قانون بھی الگ ہوگا اور اس کیلئے الگ راہیں نکالی جائینگی۔ کیونکہ خیبر پختونخواہ میں پولیس کو دیئے جانیوالے اسلحے کے میگا سکینڈل میں پولیس کو غلط اور بیکار اسلحہ دینے والے ایک سابق آئی جی کو احتساب عدالت میں پیش کرتے ہوئے ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئیں جبکہ اسی کیس میں گرفتار ہونیوالے دو دیگر افراد کو ہتھکڑیوں میں پیش کیا گیا اس کا مطلب

-یہی ہے کہ یہاں پر جو جتنے بڑے عہدے کا مالک ہوگا اس کیلئے قانون بھی الگ ہوگا

ایک اور سوال جو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں کہ خیبر پختونخواہ پولیس کے جو جوان مٹنی سمیت مختلف علاقوں میں ہیلمٹ اور جیکٹ پہنے دہشت گردی کے واقعات میں مارے گئے کیا ان کی موت کی تحقیقات ہونگی کہ بلٹ پروف کے ہوتے ہوئے کس طرح یہ لوگ مارے گئے اور گولیاں کی جسم کے اندر گزر گئی کیا اس کی سزا سزائے موت نہیں کیونکہ دانستہ یا نادانستہ کسی کیلئے موت کا سامان فراہم کرنا بھی قتل ہی ہے تو کیا آپ اپنے فورس کے جوانوں کا پوچھنا چاہیں گے اور ان واقعات کی تحقیقات کرینگے کہ کس کی -وجہ سے یہ واقعات پیش ہوئے اور اس شخصیت کے خلاف کارروائی کی جائیگی

اسی کے ساتھ بحیثیت شہری میں سوال کرنا چاہتا ہوں کہ پولیس کو دیئے جانیوالے اسلحہ ہمارے عوام کے ٹیکسوں کا پیسہ تھا جو کرپشن کی نذر ہوا اور پھر دھوکے میں مارے جانیوالے پولیس اہلکاروں کو 30 لاکھ روپے شہداء پیکج کے نام پر دیئے گئے وہ تو حکمرانوں کے جیبوں کے پیسہ نہیں تھا بلکہ اس ملک کے عوام کا پیسہ تھا - ٹھیک ہے کہ انہوں نے قوم کیلئے جانیں دیں لیکن جس نے انہیں غلط جیکٹ بلٹ پروف کے نام پر پہنائیں کیا یہ ریکوری اس کے جیب سے

-نہیں دینی چاہیئے-اور شہریوں کا پیسہ کیوں اس طرح بے دردی سے استعمال ہوا اور کیا متعلقہ کرپشن سکینڈل میں ملوث افراد سے ایک ارب 82 کروڑ روپے کی ریکوری کی گئی ہیں جو نیب کے قانون کے مطابق انھوں نے رقم واپس کردی اور ہر چیز سے بری الذمہ ہوگئے اگر کوئی شخص بینک میں دو کروڑ روپے رکھے اور اس پر سود (انٹرسٹ (ماہانہ لیتا رہے تو پھر ایک ارب 82 کروڑ روپے کے اس سکینڈل میں جتنے لوگوں نے جتنا پیسہ کمایا اس کا منافع ان لوگوں سے لیا گیا ہے کیونکہ یہاں پر) انٹرسٹ دیکھے جاتے ہیں- اور کیا اگر کوئی عام آدمی چوری کرے تو اس جیل میں رگڑ رگڑ کر) - مارا جاتا ہے لیکن امیر آدمی اگر چوری کرے تو اسے عزت سے بلایا جاتا ہے

سب سے آخری سوال کہ کیا جیل میں بیمار ہونیوالے ہر قیدی کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا جاتا ہے جس طرح اسلحہ سکینڈل میں ایک اہم شخصیت کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا جہاں پر وہ اس وقت دل کی بیماری کے نام پر پڑا ہے-کیا مولانا صوفی محمد جس کو پیشاب اور گردے میں مسئلہ ہے ان سمیت دیگر قیدیوں کو فوری طور پر جیل پہنچایا جاتا ہے -اگر نہیں تو پھر عام قیدیوں حکومتی عہدیداروں اور حکومتی مخالفین میں یہ -جانبداری کیوں ہے

امید ہے کہ ان سوالات کے جوابات آپ دینا پسند کرینگے۔

والسلام

ایک شہری

ایک اتوار کا دن اور وہ بھی ان کی نذر

اتوار کا دن نہ صرف سرکاری ملازمین اور عام لوگوں کیلئے آرام و اطمینان کا دن ہوتا ہے کیونکہ اس دن وہ اپنے گھریلو بکھیڑوں شادی غمی سمیت بچوں کو سیر کیلئے کہیں آسانی پر لے جاسکتے ہیں کیونکہ ایک تو رش نہیں ہوتی اور دوسری سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ بھی کم ہوتا ہے اور ہمارے جیسے پیدائشی ملازمین بھی اس دن خبروں کیلئے زیادہ ذہنی تناؤ کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ اس دن ایک تو سرکاری دفاتر کی چھٹی ہوتی ہیں تو دوسری طرف سیاسی پارٹیوں کے لوگ بھی گھر میں آرام سے رہتے ہیں تو صحافی بھی اتوار کے روز مٹر گشتی کرتے رہتے ہیں لیکن اتوار 26 جنوری کا دن نہ صرف ہمارے پشاور کے صحافیوں کیلئے ذہنی تناؤ کا دن رہا بلکہ اس دن پشاور کے شہریوں نے مولانا فضل الرحمان کی شان میں جتنی گستاخیاں کی اگر وہ مولانا کو من و عن پہنچ جائے تو شائد وہ میدان سیاست سے بھی توبہ کرے کیونکہ اسلام لانے کے دعویداروں نے پشاور شہر کے ٹریفک کا حلیہ ہی بگاڑ دیا یعنی جی ٹی روڈ کو ہر قسم کی ٹریفک کیلئے انتظامیہ نے بند کردیا اور ان کی پارٹی کو کھلی چھٹی دیدی کہ مہنگائی بدامنی ڈرون حملوں سمیت متعدد ایشوز پر آکر زندہ اور مردہ باد کریں انتظامیہ کی کھلی چھٹی کے باعث صبح دس بجے سے شام سات بجے تک جی

ٹی روڈ ہر قسم کی ٹریفک کیلئے بند رہا جبکہ سارا زور دلہ زاک روڈ سمیت رنگ روڈ پر رہا اور شہری سارا دن خوار ہوتے رہے کیونکہ پولیس نے بلاک رکھ کر شہریوں کر فیوزدہ ماحول میں بتنلا رکھا یعنی اسلام کے نام پر دکانداری کرنے والے ایک سیاسی پارٹی کا حال ہے۔ بھائی اگر مظاہرہ بھی کرنا ہے تو اس شہر کے گراؤنڈ بھی ہیں رنگ روڈ بھی ہیں جہاں پر لاکھوں لوگ آ سکتے ہیں بڑے شوق سے جلسے جلوس کریں لیکن اس شہر کے عوام کا ناطقہ تو بند نہ کریں مہنگائی کے خلاف ہونیوالے مظاہرے پر مولانا کو سلام پیش کرنے کی ضرورت ہے یعنی خود وفاق میں اتحادی بھی ہیں اور اپنے سمیت تین وزارتوں کے عیاشیاں بھی کر رہے ہیں اور پھر بھی مہنگائی کا رونا رو رہے ہیں کیا مہنگائی کنٹرول کرنا صوبائی حکومت کا کام ہے مزے کی بات کہ ایسے ایسے اجنبی اور عید کے نام رکھنے والے لوگوں نے بڑے بڑے بینرز اور ہولڈنگ سمیت اخبارات میں اسلام لانے کے دعویدار پارٹی کے جلسے کے حوالے سے لاکھوں روپے کے اشتہارات جاری کئے تھے جن کے بارے میں بہت ساری چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں ساتھ میں خواتین کے کپڑوں پر بھی اعتراض کیا کہ خواتین جینز پہنتی ہیں اللہ کی شان ہے اس شہر میں اتنی عمر گزر گئی جینز والی عورتیں ہم نے اپنے شہر میں بہت کم ہی دیکھی ہیں ہمارے ہاں تو شٹل کاک برقعہ ہی چلتا ہے لیکن مولانا نے خواتین کے جینز کو اپنی تقریر میں اتنا نشانہ بنایا جیسے اسلام میں جینز حرام ہو لیکن خیر پیسے کا اپنا ایک زور ہے جو ہر جگہ چلتا ہے۔ یعنی اتوار کے روز مولانا کی

پارٹی نے شہر کے وسط میں جلسہ کرکے اپنی دھاک تو بٹھادی لیکن اس کا زور عوام سے نکل گیا کیونکہ اس شہر میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جن کی دن کی دیہاڑی لگی رہتی ہیں اور اس دن انہیں روزگار بھی نہیں ملا اور نہ یہ ٹرانسپورٹ روڈوں پر آیا جس کی وجہ سے بہت سارے لوگ جن میں بزرگ خواتین اور بچے تک شامل تھے پیدل جاتے ہوئے خصوصی دعائیں مولانا اور ان کی پارٹی کی شان میں کرتے رہیں۔

حیرانگی ہمیں تبدیلی والی سرکار کے رویے پر بھی ہوئی جنھوں نے ایک سیاسی پارٹی کو روڈ جلسے کیلئے دیدیا کیا یہ جمہوریت اور آزادی و تبدیلی ہے کہ شہریوں کا جینا حرام کرنے کیلئے سیاسی پارٹیوں کو آزادی دی جائے حکمران خود تو آرام سے اپنے وی وی آئی پی بنگلوں میں رہے اور بعد میں انہی وی آئی پی گاڑیوں میں بیٹھ کر حیات آباد پہنچ گئے جہاں انہوں نے بھی آوے اور جاوے کی سیاست کی ہمارے ہاں اتنی تبدیلی آگئی ہے کہ پہلے جو حکمران تھے وہ دھرنے اور سیاست نہیں کرتے تھے دل پشوری کرتے تھے اب دل پشوری بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں دھرنے بھی دیتے ہیں سمجھ نہیں آتا کہ ان کے حکمران بن جانے سے صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام کیا فائدہ ملا۔ خیر سیاسی شعور سے بے بہرہ کچھ لوگ ان دونوں اطراف کے جلسوں میں شریک ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کے شان میں گستاخیاں بھی کیں جسے ہم جیسے صحافیوں نے مرچ مصالحہ ملا کر پیش کیا یعنی

کوئی اخبار کیلئے خبر بنا گیا اور کوئی ٹی وی چینل کیلئے سیاست کے میدان کے شہ سواروں کی باتیں تو بنا گیا جیسے اس ملک کے عوام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ لیڈر یا پھر سیاست کا میدان ہے کسی نے اس دن تباہ حال معیشت دھماکوں سے متاثرہ شہر کے شہریوں کے بارے میں نہ تو کچھ لکھا اور نہ ہی انہیں درپیش مسائل کے بارے میں بات کی ایک پارٹی گلبہار میں بیٹھ کر اسلام کے نام پر ڈفلی بجاتی رہی تو تبدیلی والی حیات آباد رنگ روڈ پر امریکہ مردہ باد کی ڈفلی بجاتی رہی اور مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں حکمرانی کے مزے بھی لے رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ افسوس کی بات یہ کہ ایک خاص حد تک لوگ جن کے پاس عقل و شعور کی کمی ہے دونوں اطراف کے جلسوں میں شریک ہوئے اور آوے اور جاوے زندہ اور مردہ باد کے نعرے لگاتے رہے اور ان دونوں سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کیلئے سینکڑوں پولیس اہلکار صبح سے شام تک ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔

حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ ضلعی انتظامیہ نے اتوار کے روز پشاور کے مختلف یونین کونسلوں میں پولیو مہم شروع کرنے کا اعلان کیا تھا جس کیلئے باقاعدہ سیکورٹی پلان بھی منظور کیا گیا تھا اور پولیس اہلکاروں کی چھٹیاں بھی منسوخ کی گئیں ساتھ میں سینکڑوں ٹریفک اہلکاروں کو پولیس لائن پشاور راتوں رات بلایا گیا تھا کہ صبح ڈیوٹی کیلئے جانا ہے پولیو کے بارے میں حال ہی میں اخبارات میں پتہ چلا ہے کہ پاکستان اور خصوصا ہمارا شہر و فاٹا اس مہلک

بیماری کا گڑھ ہے اسی وجہ سے اس کی روک تھام کیلئے کوششیں کی جارہی تھی اور اتوار کے روز چلائی جانیوالی مہم بھی اسی کا حصہ تھی لیکن صبح سویرے پتہ چلا کہ سیکورٹی وجوہات کی بناء پر یہ مہم ملتوی کردی گئی اور اگلے اتوار کو یہ مہم چلائی جائیگی میری طرح کے یار لوگوں نے بڑی بڑی بریکنگ چلا دی کہ سیکورٹی وجوہات کی بناء پر مہم ختم کردی گئی اور اگلے اتوار کو چلائی جائیگی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ انتظامیہ کو تبدیلی والی سرکار اور اسلام کے نام پر سیاست کرنے والے پارٹی کے لیڈروں کا خیال ہے جن کیلئے پولیس کی ڈیوٹیاں لگائی گئی ہیں جو کہ جلسوں کے دوران ڈیوٹی دینگے سو غریب غرباء کے بچے اگر پولیو کے قطروں کیلئے ایک ہفتے مزید انتظار کریں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ ایک ساتھ تو تین کام ہو نہیں سکتے پولیو اتنی اہم تو نہیں حکمرانی کے مزے کرنے والوں کی سیکورٹی بہت اہم ہے ویسے بھی طالبان بہت زیادہ سرگرم ہوگئے ہیں اور حکمرانی میں آنے کے بعد یہ لوگ کچھ زیادہ ہی نازک ہو جاتے ہیں اور زمین پر خدا بننے کی کوشش میں اوپر کے خدا کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن جانا تو سب کو اسی زمین کے اندر ہی ہے ۔ خیر اتوار کے روز یعنی 26 جنوری کو پشاور شہر کے دو مختلف روڈوں پر سیاسی مداری دکانداری کرتے رہے پولیس روٹین سے ہٹ کر زیادہ ڈیوٹی انجام دیتی رہی اور غریب شہری ناکوں پر خوار ہوتے رہے کیونکہ یہ ان کی ازلی قسمت ہے کہ اس سے پہلے بھی حکمران تھے اور آج بھی تبدیلی والے سے لیکر اسلام کے نام پر سیاست کرنے والے بھی

حکمران ہیں اور حکمرانوں کے کھیل اور نخرے نرالے ہوتے ہیں۔

جشن آزادی اور ہماری تقسیم در تقسیم کا عمل

صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام نے مئی 2013ء کے عام انتخابات میں تبدیلی کے نعرہ سے آنیوالی پارٹی کے لوگوں کو اپنے ووٹوں سے اس مقام تک پہنچا دیا کہ تبدیلی آوے ہی آوے کرپشن بدانتظامی اور امن امان کی ابتر صورتحال سے ستائے شہریوں نے یہ بہت بڑا اقدم اٹھایا یہی وجہ ہے کہ آج تبدیلی کا نعرہ لگانے والے صوبہ خیبر پختونخوا میں تبدیلی کا آغاز کر چکے ہیں لیکن ان کی تبدیلی کا عمل بہت زیادہ ست ہے انہوں نے صوبے کے لوگوں میں پاکستانیت کا جذبہ بیدار ہی نہیں کیا۔زندہ قومیں اپنی آزادی کے دن پر اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دنیا کو دکھایا جاتا ہے کہ ہم ہر حال میں ایک ہیں ہمارے آپس کے تعلقات کیسے ہی برے کیوں نہ ہوں ہم کتنی ہی درجہ بندی اور طبقاتی تقسیم رکھتے ہوں لیکن ہم دنیا کے سامنے ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے - بیانات کی حد تک تو بہت کچھ ہوتا ہے لیکن عملی طور پر ایسا کچھ دیکھنے میں نہیں آتا نہ ہی حکمران نہ ہی اپوزیشن اس معاملے میں کچھ کرتی ہے، رہی بات عوام کی تو ان کے بارے میں ہر کوئی دعوی کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہیں لیکن حقیقت میں عوام کس کے ساتھ ہیں اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔نہ ہی کسی نے ان سے پوچھنے کی ہمت و جرات کی ہے۔

68 ویں جشن آزادی کی سب سے بڑی تقریب ملک سعد پولیس لائن پشاور میں منعقد ہوئی جس میں وزیر اعلی خیبر پختونخوا مہمان خصوصی تھے صوبے کی سطح پر ہونیوالی اتنی بڑی تقریب ہر سال میونسپل کارپوریشن پشاور ہی منعقد کرتی ہے لیکن اس کے انتظامی معاملات ہر دفعہ بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں کسی زمانے میں عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت تھی تو عوام و خواص کی کرسیوں پر ایک مخصوص پارٹی کے لوگ ہی براجمان نظر آتے تھے یا پھر منظور نظر افسران اور ان کے اہل خانہ و بچے ہی دیکھنے کو ملتے یہی صورتحال نئے پاکستان کے دعویداروں کے دور میں بھی رہے یکجہتی کیلئے منعقد کی جانیوالی اس تقریب کیلئے باقاعدہ کارڈ جاری کئے جاتے ہیں لیکن یہ کارڈز کس کو جاری کئے جاتے ہیں اور کارڈ جاری ہونے کیلئے اہلیت کیا ہے اس کا اندازہ صحافی ہونے کے باوجود مجھے آج تک نہیں ہوسکا - لیکن ہاں ایک بات تو یقینی ہے کہ یہ کارڈ ان لوگوں کو جاری کئے جاتے ہیں جو جی حضوری اور لیس سر کہنے کے عادی ہوں-

تقریب میں عام لوگ دیکھنے کو نہیں ملے شائد اس کی وجہ سیکورٹی کی صورتحال بھی ہو لیکن جو چیز جو سب سے زیادہ دل دکھانے والی تھی وہ یہ تھی کہ جہاں تقریب منعقد ہوئی تھی وہاں پر کرسیوں میں بیٹھے لوگوں سے اندازہ ہوا کہ آج بھی ہم تین طبقات میں تقسیم ہیں جن کی درجہ بندی مالی طاقت اور معاشرے میں

پوزیشن /روزگار کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اسی پوزیشن کے حامل لوگ ان نشستوں پر بیٹھے ہوئے ملے ۔ جشن آزادی کے حوالے سے منعقدہ تقریب میں وزیراعلی پرویز خٹک نے ملی نغمہ پیش کرنے والے بچوں کو مکمل طور پر نظر انداز کردیا خوبصورت کپڑوں میں ملبوس سکول کے بچوں کو خصوصی طور پر ہر سال ملی نغموں اور ترانے کیلئے پولیس لائن ہیں منعقدہ تقریب میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے روایت یہ رہی ہے کہ ہر سال پروگرام میں تقریب کے مہمان خصوصی ان بچوں سے گھل مل جاتے ہیں اور ان کیلئے انعام کا اعلان بھی کرتے ہیں تاہم امسال پرویز خٹک نے پروگرام کے بعد بھی ان بچوں سے کوئی بات نہیں کی نہ ہی ان کی حوصلہ افزائی کیلئے ان سے گھلے ملے پروگرام کے دوران پولیس بینڈ کے اہلکار بھی وزیراعلی پرویز خٹک کا انتظار کرتے رہے تاکہ ان سے ملاقات ہو لیکن وزیراعلی پرویز خٹک جو کہ پارٹی رہنمائوں اور حکومتی ارکان کے ساتھ آزادی مارچ میں شرکت کے حوالے سے محو گفتگو تھے نے مکمل طور پر سکول کے بچوں اور پولیس بینڈ کو نظر انداز کردیا جس سے وہ کافی مایوس دکھائی دیئے ۔

پروگرام میں وزیراعلی خیبر پختونخواپرویز خٹک نے نئے پاکستان اور لوگوں کو حقوق دینے کی بات توکی جو خوش آئند بھی ہے لیکن یہ نیاپاکستان کہاں پر ہوگا اور کیسے ہوگا اس کی بات توانہوں نے کی ہی نہیں صوبہ خیبر پختونخواکے لوگوں نے جس جوش و جذبے کیساتھ نئے پاکستان کے دعویداروں کو ووٹ دیئے

تھے وہ جوش و جذبہ گذشتہ ایک سال یں سرد پڑگیا ہے یہ ٹھیک ہے کہ نئے پاکستان کا نعرہ لگانے والوں کی حکومت میں دھماکے تو کسی حد تک کم ہوئے ہیں لیکن یہ بھی انہی کا اعزاز ہے کہ انہی کے دور میں بھتہ خوری عروج پر پہنچ گئی ہے اور اب تو باقاعدہ پولیس افسران بھی ملوث پائے جارہے ہیں جن کو بر طرف کیا جارہا ہے لیکن کیا ان لوگوں کیلئے بر طرفی کی سزا کافی ہے۔ پورے پاکستان کو نیا پاکستان بنانے والے اگر معاملے میں سنجیدہ ہوں تو کم از کم طبقاتی نظام کے خاتمے کیلئے عملی اقدامات تو خیبر پختونخواہ میں کریں تاکہ یہاں کے لوگوں کو یقین ہو جائے کہ نئے پاکستان پر کام شروع ہو چکا ہے اور ان میں پائی جانیوالی بے چینی ختم ہوسکے اور صورتحال بہتر ہو۔ ورنہ دسری صورت میں صورتحال میں عام انتخاب اور پھر حلقہ این اے ون پر ضمنی انتخابات کے نتائج سے اندازہ کرلیں کہ ان کیساتھ کیا ہوگا۔

ایک یادگار ترجمان - مسرت اللہ جان

ایک روز قبل ٹیکسٹ میسج پیغام موبائل فون پر موصول ہوا کہ لشکر اسلام کے سابق ترجمان مار دیئے گئے ہیں اور ان کی لاش خیبر ایجنسی میں پھینک دی گئی ہیں جس کی تصدیق بعد میں اخبارات میں کردی گئی - مرنے والا تو چلا گیا لیکن اس کی موت نے عجیب سے کیفیت طاری کردی ہے - خیبر ایجنسی میں کچھ عرصہ سے سرگرم لشکر اسلام کے سابق ترجمان حاجی زر خان آفریدی سے میرا تعلق 2008 ء میں بن گیا تھا جب میں ٹی وی چینل پر ان کے انٹرویو کرنے کیلئے باڑہ کے علاقے میں واقع لشکر اسلام کے مرکز یں گیا تھا اس وقت ہمارے ایک دوست عامر علی شاہ بھی ساتھ تھے - ان دنوں لشکر اسلام کا خیبر ایجنسی میں بہت زور تھا اور ہر کسی ہدایت کی گئی تھی جو بھی شخص باڑہ خیبر ایجنسی آئیگا اس کو سفید ٹوپی پہن کر آنا پڑے گا پشاور سے روانگی کے بعد مجھ سمیت کیمرہ مین نے بھی سربند کے علاقے سے جو کہ باڑہ قدیم سے آگے ہے میں سفید ٹوپیاں پہنی اور لشکر اسلام کے مرکزی دفتر واقع باڑہ پہنچے تھے - ان دنوں ہمارے ساتھ ارشد نامی ایک ڈرائیور بھی ہوا کرتا تھا جو بنیادی طور پر باڑہ سے چلنے والی گاڑیوں کا ڈرائیور تھا - وہ لشکر اسلام کے امیر کے حوالے سے بات کرتا تھا کہ ہم نے ایک ساتھ کام کیا لیکن ہم نے کبھی اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا کہ لشکر اسلام کا امیر

منگل باغ اور کہاں پر باڑہ سے چلنے والے گاڑیوں کی ڈرائیونگ کرنے والا ایک ڈرائیور۔
جب ہم لشکر اسلام کے مرکزی دفتر میں پہنچ گئے تو وہاں پر ایک خود کش بمبار جس نے جیکٹ مکمل طور پر پہنی تھی انہوں نے ہم سے مصافحہ کیا ور ایک کمرے میں لے گئے اس کا کہنا تھا کہ ابھی امیر صاحب آنے والے ہیں پھر آپ انٹرویو کرلیں۔ اسی دوران ہمارے لئے کولڈ ڈرنکس بھی منگوائی گئی کچھ دیر بعد سفید کپڑوں اور نیلے جیکٹ پہنے حاجی زر خان آفریدی پہنچے اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی تنظیم کے امیر کا انٹرویو کررہا تھا اس وقت حکومت پاکستان نے لشکر اسلام کو کالعدم قرار نہیں دیا تھا اس لئے انٹرویو کرنا مسئلہ نہیں تھا۔ اس دن ہم حاجی زر خان آفریدی کے مہمان نوازی کے قائل ہوگئے
یہ زر خان آفریدی کا میرا پہلا انٹرویو تھا جس میں ایک حد تک بے تکلفی بھی ہوگئی لیکن زر خان آفریدی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھی اور پھر انٹرویو دینے کا سلسلہ شروع ہوا تقریبا دو ہفتے بعد ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی باڑہ کے علاقے میں واقع اس مرکز میں افغانستان سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ جو لشکر اسلام کے کمانڈر تھے سے بھی ملاقات ہوئی ان دنوں زر خان آفریدی کے دو بیٹوں سے بھی میری ملاقات ہوئی ان میں ایک بیٹا ڈبل کیبن ڈاٹسن چلایا کرتا تھا جس میں وہ اپنے والد کو لے کر جایا کرتا اس کے ہاتھ میں ہر وقت

تلوار ہوا کرتی تھی جبکہ دوسرا چھوٹا بیٹا تھا جو پچھلی سیٹوں پر والد کیساتھ بیٹھا کرتا اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہوا کرتی اور اس کے جیکٹ میں ہر وقت گرینیڈ رہتے تھے - اس دوران لشکر اسلام کے لیڈر منگل باغ نے صحافیوں کو ملاقات کیلئے بلایا اور رپورٹنگ کیلئے میں بھی چلا گیا جبکہ کیمرہ مین عامر علی شاہ جو کہ میرا اس اسائمنٹ کیلئے ساتھی تھا اس دن نہیں آیا اس دن ایک اور کیمرہ مین کی ڈیوٹی لگا دی گئی کیمرہ مین ڈر رہا تھا کہ میں نے جینز پہنی ہے کہیں لشکر اسلام والے غصہ نہ کریں لیکن میں نے اسے ساتھ لیا اور مقررہ وقت سے تھوڑی دیر لیٹ اس مقام پر پہنچا جہاں سے صحافیوں نے جانا تھا لیکن اس دن میں کیمرہ مین کی وجہ سے لیٹ ہوگیا تھا اسی باعث ہمارے آنے سے بیس منٹ قبل سارے صحافی جن میں ہمارے قبائلی دوست نصر اللہ جو بعد میں پشاور کینٹ میں اپنی گاڑی میں نامعلوم افراد کی طرف سے رکھے گئے بم کا نشانہ بن کر شہید ہوگئے تھے بھی میرا انتظار کررہے تھے چونکہ انتظام اس نے جانے کا کیا تھا جس وقت میں وہاں پہنچا تو حاجی زر خان اپنے بچوں کے ہمراہ ڈبل کیبن میں موجود تھا اس نے مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا دیا اور کہا کہ امیر منگل باغ کا انٹرویو کرنے جانا ہے تقریبا چھ گھنٹے کا سفر طے کیا دوران سفر بیٹھ کر گپ شپ بھی کی -

لشکر اسلام کے امیر منگل باغ کے انٹرویو کیلئے جانے کا یہ پہلا موقع تھا جب

حاجی زر خان آفریدی سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی اس دن میں نے حاجی زر خان سے لشکر اسلام کا ترجمان بننے کی وجہ پوچھی تھی جس پر مرحوم حاجی زر خان نے کہا تھا کہ کسی زمانے میں وہ جماعت اسلامی اور بعد میں جمعیت علماء اسلام کیساتھ وابستگی ہوا کرتی تھی لیکن پارٹی پالیسیوں کی وجہ سے اس نے وہ پارٹی بھی چھوڑ دی یہ پہلا موقع تھا جب اس نے کھل کر اپنے موقف کا اظہار کیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ ملک میں صحیح اسلامی نظام آئے جس میں چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں ۔ تقریبا چار گھنٹے بعد مخصوص مقام ہم صحافیوں نے منگل باغ کا انٹرویو کیا دوران انٹرویو میں نے منگل باغ سے سوال کیا تھا جو شائد اس وقت امیر منگل باغ کو برا لگا تھا جب انٹرویو ختم ہوگیا اور ہم رخصت لیکر آرہے تھے تو لشکر اسلام کے امیر منگل باغ نے سب ساتھی صحافیوں کو رخصت کیا اور مجھے روک دیا بعد میں میرے سوال کا حوالہ دیکر سوال کیا اور ساتھ ہی کہا کہ تمھارا سوال نامناسب تھا میں نے جواب دیا کہ امیر صاحب میں اپنے آپ کو کلیئر کروں تو میں لوگوں کو پیغام پہنچا سکوں گا اگر میں خود کنفیوژن میں ہوں گا تو پھر میں دوسروں کو کیا جواب دونگا جس پر لشکر اسلام کے امیر منگل باغ ہنس پڑے اور حاجی زر خان آفریدی کو بلا کر کہا کہ یہ میرا مہمان ہے اگلی دفعہ اس کو بھی ساتھ لیکر آ جانا اس سے ملاقات ہوگی-

پھر واپسی پر نامعلوم مقام پر رات نو بجے ایک جگہ پہنچے جہاں پر راستے میں

بچے کھڑے تھے جنھوں نے ہماری گاڑی کو روک دیا اور ہم کھانا کھانے ایک گھر میں چلے گئے لالٹین کی روشنی میں گوشت اور بھی تندوری روٹی کیساتھ کھانا الگ ہی مزہ ہے اور جب ساتھ حاجی زر خان آفریدی جیسا خوش خوراک بندہ بھی ہو اس رات کھانے کے دوران حاجی زر خان آفریدی نے میرا مذاق اڑایا تھا کہ تم شہری لوگ کچھ کھا بھی نہیں سکتے۔اتنے بڑے کٹے صحافی ہو اور کھانے میں تمھارا یہ حال ہے یہ حاجی زر خان آفریدی کے الفاظ تھے اور ہیں،اپنے ساتھی صحافیوں کو جن میں بیشتر مقامی تھے کی خوش خوراکی کا بھی قائل ہوگیا تھادنبے کا گوشت ہم جیسے بندے زیادہ مقدار میں کھا بھی نہیں سکتے ۔خیر رات کو دس بجے ہم باڑہ قدیم پہنچے اس وقت ٹیکسی سٹینڈ پر کچھ گاڑیاں کھڑی تھی میں نے جلدی میں حاجی زر خان آفریدی کو پیچھے چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی ڈرائیور تک جانے کے بابت پوچھا اس وقت اس نے پانچ سو روپے کہہ دیئے میں نے سوچا کہ رات یہاں پر گزارنے سے بہتر ہے کہ پانچ سو دیکر جان چھڑائی جائے حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ ایک سو بیس روپے کرایہ بنتا تھا لیکن چونکہ رات کا وقت تھا اس لئے میں نے جلدی میں ہاں کردی اور ہاتھ ملانے حاجی زر خان آفریدی سے گیا اس نے کہا کہ رات ہمارے ساتھ رات گزارو ہمارے مہمان ہو صبح چلے جانا لیکن میں نے کہا کہ ٹیکسی کرلی ہے میں جا رہا ہو اس پر اس نے کرایہ پوچھا تو میں نے بتا دیا تو وہ جلدی سے ڈبل کیبن گاڑی سے اتر کر اس ٹیکسی والے کے پاس آیا اور اس سے پوچھ لیا کہ ہاں بھئی ہمارے مہمان سے کتنے

پیسے لے رہے ہو جس پر وہ ٹیکسی ڈرائیور ڈر گیا اور کہنے لگا کہ مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ کا مہمان ہے میں مفت میں لے جائو نگا اس دوران حاجی زر خان آفریدی نے اپنے ایک بیٹے کو آواز دی کہ اس ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ دیکھ لو اگر یہ ہمارے مہمان کو لوٹتا ہے تو پھر ہمارا بھی اس کی مہمان داری کا حق بنتا ہے ۔ اور ٹیکسی ڈرائیور کیمرہ مین سے جلدی میں کیمرہ اور دیگر سامان لیکر گاڑی آگے کر دی اور کہا کہ حاجی صاحب بے غم شہ چہ ستا میلمانہ دی نو زمان هم میلمانہ دی (یعنی اگر آپ کے مہمان ہے تو ہمارے بھی ہیں اور پھر رات گئے ہم اپنے دفتر پہنچ گئے دوران سفر ٹیکسی ڈرائیور نے کئی مرتبہ مجھے) کہا کہ برائے مہربانی میرے بھائی میں حاجی صاحب کو غلط مت کہہ دینا پیسے بھی مت دو اس دن ٹیکسی ڈرائیور کرایہ بھی نہیں لے رہا تھا میں نے زبردستی دو سو روپے دیئے اور وہ لیکر چلا گیا یہ آخری موقع تھا جب حاجی زر خان آفریدی سے میری ملاقات ہوئی ۔اس کے بعد باڑہ میں آپریشن شروع ہوا اور سب کچھ تبدیل ہو کر رہ گیا

حاجی زر خان آفریدی سے میری ملاقاتیں بحیثیت صحافی ہوئی تھی اور تقریباپانچ ملاقاتوں میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جان گیا تھا کہ وہ مخلص آدمی اور جی دار آدمی تھا اس کی لشکر اسلام سے وابستگی اس کا اپنا فیصلہ تھا کچھ عرصہ تک ترجمان رہنے کے بعد اس نے لشکر اسلام کے ترجمانی بھی چھوڑ دی تھی

اور پھر پتہ چلا کہ اسے اغواء کرلیا گیا اور آج 23 اگست 2014 ء کو اس کی لاش مل گئی
میرے لئے یہ ایک خبر ہی ہے لیکن زر خان آفریدی کے ہنسنے کا سٹائل اور مہمان داری
اور لوگوں سے ملنے اور ذاتی تعلق بنانے کا عمل مجھے آج بھی یاد ہے اور شائد ہمیشہ یاد
رہے گا اللہ مغفرت نصیب کرے عجیب شخصیت کا مالک تھا۔

بے وقت نکاح - حوا کی بیٹی کیلئے رحمت یا زحمت

نکاح ایک ایسا لفظ جس کے نتیجے میں لوگوں کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں اور خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ کیسا لفظ ہے جس نے اسے گھر کے چار دیواری تک محدود کردیا یہ وہ سوال تھا جسے ہر ثریا سوچتی رہتی تھی آج صبح سے ہی ثریا کا دل اداس تھا اس کی امی اور بہن بھائی شادی پر گئے ہوئے تھے اسی باعث اسے گھر کے کام کاج سے فراغت مل گئی اور کپڑے استری کرتے ہوئے اس کا دھیان اپنی معمولات زندگی پر چلا گیا۔

ثریا کا دل آج بہت چاہ رہا تھا کہ اپنی سہیلی جو ان کے پرانے گھر کے ساتھ رہتی تھی کی شادی میں شرکت کیلئے جائے اس شادی میں سہیلی نے ثریا کو بھی مدعو کیا تھا اس کی امی نے ثریا کو ساتھ لے جانے کی حامی بھی بھری تھی کیونکہ اس کی سہیلی نے کہا تھا کہ میری شادی میں ضرور آنا ہے لیکن آج صبح ثریا کے منگیتر کا فون آگیا تو ثریا نے فون پر بتادیا کہ وہ اپنی سہیلی کے گھر شادی میں شرکت کیلئے جارہی ہیں جس پر اس کے منگیتر نے غصے کا اظہار کیا اور کہا کہ کہیں پر جانے کی ضرورت نہیں ۔ گھر ہی پر رہو جس کی وجہ سے اس کی ماں نے بھی ثریا کو ساتھ لے جانے سے منع کیا اور ثریا گھر میں اپنی قسمت کے اس عجیب و غریب کھیل کو سوچ رہی تھی ۔

دو سال قبل میٹرک کی طالبہ ثریا اپنی امی کیساتھ شادی میں شرکت کیلئے گئی تھی جہاں پر اس کے امی کے رشتہ دار بھی آئے ہوئے تھے جہاں پر حسن نے اسے دیکھا اور پھر اپنی والدہ کو ثریا کے گھر رشتے کیلئے بھیج دیا ۔ اس وقت وہ کالج میں ایڈمشن لے چکی تھی اور چھٹیوں کے بعد ثریا کی کلاسز شروع ہونا تھی لیکن اس دوران اس کی شادی کی بات چل گئی جس پر اس کی امی نے حسن کی والدہ سے کچھ وقت مانگا کہ وہ اس معاملے پر اپنے گھر والوں سے مشورہ کریگی ثریا کی امی تو رشتہ آنے پر خوش تھی کیونکہ حسن دبئی میں ملازمت کرتا تھا لیکن اسے یہ غم بھی تھا کہ ثریا کم عمر تھی اسی باعث ثریا کی امی نے اپنے شوہر سے بات کی جس پر ثریا کے والد نے سب کچھ اپنی بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ تم جانتی ہو میں مزدور پیشہ آدمی ہوں اگر اچھا رشتہ آتا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ لڑکا بھی ٹھیک ہے تو ہاں کردو ۔ جس پر ثریا کی امی تو خوش ہو گئی کیونکہ شوہر نے اسے اجازت دیدی لیکن پھر بھی اس نے ثریا کے نانی اور ماموں سے اس معاملے میں مشورہ مانگا جہاں پر ثریا کے نانی اور ماموں نے ثریا کے کم عمری میں شادی کی بات کو مسترد کردیا اور کہا کہ ابھی ثریا کی عمر شادی کی نہیں اور ثریا کی بات شادی نہیں کرنی لیکن نہ جانے کیوں ثریا کی امی اس بات کو نہیں سمجھی اور اس نے ثریا کے رشتے کی بات پر ہاں کردی۔اس وقت حسن کی والدہ نے ثریا کی امی کو کہا تھا کہ ابھی صرف بات طے کرتے ہیں شادی بعد میں ہی ہوگی جس وقت ثریا چاہے گی۔

ایک ہفتے بعد حسن کی امی بات طے کرنے آئی ثریا کے نانی اور ماموں اس رشتے پر ناراض تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ابھی ثریا کی عمر منگنی کی نہیں جس دن ثریا کی منگنی کی بات ہو رہی تھی اس وقت ثریا بہت خوش تھی منگنی والے دن حسن کے گھر والوں نے منگنی میں نکاح کا تقاضا کیا اور منگنی کے دن ہی ثریا کا نکاح بھی حسن کیساتھ ہوگیا۔ جس میں یہ بھی طے پایا گیا کہ چونکہ نکاح ہوگیا ہے اس لئے اب تین ماہ کے دوران ثریا کی رخصتی بھی ہوگی۔ لیکن

منگنی کے دوسرے ہفتے جب ثریا کالج جانے کیلئے تیار ہو رہی تھی اس دن حسن کے گھر والوں کا فون آیا کہ یہ ہماری بہو ہے اور ہمارے خاندان میں لڑکیاں کالج نہیں جاتی لہذا ثریا کالج نہیں جائیگی اس دن ثریا نے حسن سے فون پر بات کی کہ وہ کالج جانا چاہتی ہے لیکن حسن نے کہا کہ ابھی میری والدہ کی بات مانو شادی کے بعد کالج میں داخلہ لے لینا سو ثریا نے طے شدہ داخلہ کے باوجود کالج جانا چھوڑ دیا اور اس کی امی نے حسن کے گھر جانے سے پہلے اس کی کندھوں پر گھر کی ذمہ داری بھی ڈال دی تاکہ ثریا کو شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور پھر صبح سویرے سے رات تک گھر کے کام کاج نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا اور ثریا مشین کی طرح گھر میں کام کرتی رہی کیونکہ اس کی امی نے کہا تھا کہ حسن کے گھر جاکر ہماری ناک کٹوا مت دینا کہ اسے کچھ کھانا پکانا

نہیں آتا۔

کالج میں داخلے کے باوجود کلاسز نہ لینے پر ثریا کے سہیلیاں اسے کالج میں نہ آنے کا پوچھا کرتی تھی تو اس کا جواب بھی ثریا کے پاس نہیں ہوتا تھا نکاح کے تقریبا ایک ماہ بعد حسن کے دفتر میں کچھ مسئلہ ہوگیا جس کی وجہ سے اسے واپس فوری طور پر پہنچنے کا کہا گیا اور یوں حسن بھی ایک ماہ بعد دبئی اپنی ملازمت پر چلا گیا حسن نے فون پر ثریا کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ مقررہ تین ماہ میں واپس آئیگا جس کے بعد شادی ہوگی اور وہ کالج میں دوبارہ کلاسز لے سکیں گی اس دن ثریا بہت روئی تھی کہ اس کا منگیتر دبئی جارہا ہے نہ جانے کیوں وہ حسن کے دلاسوں پر یقین نہیں کررہی تھی لیکن مجبور تھی اور پھر وہ حسن کے تین ماہ ختم نہ ہوئے ہر ماہ حسن کا فون آتا کہ انشاء اللہ جلد وہ آئیگا اور پھر تین ماہ ڈیڑھ سال میں بدل گئے اور ثریا کی ماں اور گھر والے حسن کے دلاسوں کے انتظار میں رہ گئے۔ کہ وہ آئیگا اور پھر ثریا کی رخصتی ہوگی۔

ثریا کی امی بھی ثریا کے سامنے شرمندہ رہتی تھی کیونکہ ثریا کے معاملے میں اپنے خاندان کو بھی ناراض کیا تھا اور حسن کے گھر والے جو ہر مہینے آیا کرتے تھے حسن کی طرف سے بھیجے جانیوالے تحفے اور سامان بھی ثریا کیلئے لاتے لیکن

ثریا کیلیئے ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ نکاح کے بعد اس پر گھر کے دروازے سے نکلنا بند ہوگیا تھا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ جب شوہر چاہے تو اسے اجازت ہے وگرنہ نکاح کے بعد لڑکی کی اپنی مرضی نہیں ہوتی اور یوں ثریا ہر چیز سے کٹ ہو کر رہ گئی۔
اس کی سہیلیاں جو ہر وقت اس کے گھر آیا کرتی تھی اب انہوں نے بھی ثریا کے گھر آنا چھوڑ دیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ ثریا مغرور ہو گئی ہے اس لئے اپنے سہیلیوں کے گھر نہیں جاتی حالانکہ ثریا نکاح کی وجہ سے اپنے خاندان میں پائے جانیوالے اس روایت کی وجہ سے مجبور تھی اور پھر ثریا گھر ہی تک محدود رہ گئی اور اس کی زندگی اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود رہ گی ڈیڑھ سال میں کئی مرتبہ خوشی عید کے مواقع آئے لیکن وہ گھر پر ہی رہی اب ثریا کے زندگی گھر کے چار دیواری میں ٹی وی دیکھنے اور گھر داری تک محدود تھی۔
کپڑے جلنے کی بو نے ثریا کو چونکا دیا جس نے ثریا کو سوچوں کی دنیا سے نکال دیا اور جلدی سے استری ثریا نے اٹھالی کیونکہ سوچوں میں گم ہونے کے بعد ثریا استری کرنا بھول گئی تھی اسی وجہ سے اس کے اپنے کپڑے جل گئے تھے ثریا نے اپنے استری سائیڈ پر رکھتے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہی تھی نہ جانے کیوں شائد اسے کالج سے رہ جانے کا دکھ تھا شائد اسے اپنے ساتھ حسن کی بے حسی کا دکھ تھا یا اپنے گھر میں مقید

ہونے کا دکھ تھا یا کم عمری میں نکاح کے اس بندھن کا دکھ تھا جس نے اسے خوشی کے بجائے گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا ثریا نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی کیونکہ اس لفظ نے اور کچھ تو نہیں کیا تھا لیکن اسے پہلے سے ذمہ داریوں کا احساس دلایا تھا جس کیلیے وہ پوری طرح تیار بھی نہیں تھی-

کیا ہم تبدیلی نہیں لا سکتے

دس سال کا معصوم بچہ ہر آنے جانے والوں کو ایک آس و امید سے دیکھتا کہ کوئی اس کی طرف دیکھے اور اس سے خریداری کرے لیکن ہر کوئی اپنے خیالوں میں مگن ہوتا اور کوئی بھی شخص اس معصوم لڑکے کو نہیں دیکھتا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر مایوسی پھیل جاتی تین دن قبل شام کے وقت یونیورسٹی سے واپسی پر اپنے گھر جا رہا تھا کہ اسی بچے کو نہر کنارے بیٹھے دیکھا وہ پلاسٹک کے کارڈ جس میں لوگ شناختی کارڈ رکھتے ہیں اپنے سامنے زمین پر رکھے ہوئے تھے اور آوازیں لگا رہا تھا " شناختی کارڈ کیلئے پلاسٹک کارڈ لے لو" اور ہر آنے جانے والے شخص کو دیکھ رہا تھا لیکن جب کوئی اس کی طرف نہیں دیکھتا تو وہ مایوسی سے آنکھیں نیچے کرکے اپنے آپ کو اور اس بوری کو دیکھتا جس پر اس معصوم بچے نے یہ سب کارڈ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح سر نیچے کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر آگے چلا گیا کہ کون پرائے غم اپنے سر لے۔ لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ صرف دس روپے کا ہی تو ہے کارڈ لے لیتے تو اس بچے کی کمائی ہو جاتی لیکن پھر میں نے ضمیر کو یہ لوری دیکر سلانے کی کوشش کی کہ پلاسٹک کارڈ کا میں نے کرنا ہی کیا ہے۔

آج شام یونیورسٹی سے لیٹ فارغ ہوارات ساڑھے نو بجے کے قریب میں اسی راستے پر گزر رہا تھا جہاں پر تین دن قبل میں نے بچے کو دیکھا تھا آج اس بچے کی آنکھوں میں نیند تھی اور نیند کے جھونکے اپنی آنکھوں سے بھگانے کی کوشش میں کبھی ایک طرف گرتا اور کبھی دوسری طرف اس وقت راستے میں کوئی بھی نہیں تھا چونکہ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا اس لئے میں سائیڈ پر کچھ دیر کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔اس معصوم کی آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی اسلئے وہ شناختی کارڈ کے پلاسٹک فروخت کرنے کی آواز نہیں لگا رہا تھا۔ آخر کار میں اس بچے کے قریب گیا وہ خوش ہوگیا کہ کوئی گاہک آیا ہے اور شائد اس کا کچھ بکری ہو ۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ بیٹا گھر کیوں نہیں جاتے تو اس نے نیند بھری آنکھوں میں کہا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ رات ساڑھے دس بجے سے قبل گھر نہیں آنا میں نے اس سے دوسرا سوال کیا کہ کیا گھر میں کوئی اور نہیں جو تم اس عمر میں روزگار کر رہے ہو جس پر اس کا جواب تھا کہ ایک چھوٹا بھائی ہے وہ بھی اسی طرح مزدوری کرتا ہے جب میں نے بچے سے اس کے والد کے بارے میں پوچھا تو اس کا کہنا تھا کہ میرا والد آنکھوں سے معذور ہے اور وہ کچھ کام نہیں کرسکتا اسی بناء پر ہم دونوں بھائی کام کرتے ہیں معصوم بچے نے بتایا کہ صبح سات بجے سے ایک بجے تک وہ گھروں سے کباڑ وکچرا چن کر جمع کرتا ہے اور پھر اسے بیچ دیتا ہے جس میں اسے تیس سے چالیس روپے بچ جاتے ہیں اور پھر پلاسٹک کے کارڈ رکھ کر فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس سے روزانہ چالیس روپے بچ

جاتے ہیں اور یوں وہ ستر روپے گھر میں اپنی والدہ کو دیتا ہے اتنی ہی رقم چھوٹا بھائی بھی جمع کرتا ہے جس سے ہمارے گھر کا خرچہ پورا ہوتا ہے۔ اس معصوم بچے سے جب میں نے سوال کیا کہ بیٹا کھانا کب کھاتے ہو تو وہ کہنے لگا کہ صرف رات کا کھانا کھاتا ہوں کیونکہ دوپہر میں کھانے پر بیس روپے لگتے ہیں اور اگر دوپہر کو بھی میں کھانا کھاؤں تو پھر چالیس روپے خرچ ہوتے ہیں ۔کیونکہ پھر گھر میں والدہ کو کم پیسے ملتے ہیں جس سے ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔

اس معصوم سے جب میں نے سکول جانے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں مدرسے میں صبح پڑھتا ہوں سکول پڑھنے کی خواہش ہے لیکن کہاں سے پڑھوں اور اگر پڑھوں گا تو میرے گھر کے اخراجات کون پورے کرے گا۔حسن نامی اس بچے کے بقول ہم افغان مہاجر ہیں اس لئے ہماری کوئی مدد بھی کرنے کو تیار نہیں۔ اس بچے کے اس جواب نے میرے دل میں نشتر چبھو دیے اور میں منتشر ذہن ہو کر رہ گیا۔اور سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا ہو کر اس بچے سے روانہ ہوگیا۔

گھر میں اس بچے کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھی اور میں اپنے بچوں کو دیکھ رہا تھا کہ اگر یہ میرا اپنا بیٹا ہوتا تو کیا ہوتا اور میں جلدی سے سوچ کے دھارے کو تبدیل کرنے کی کوشش کی کہ میرا بیٹا ایسے کیسے ہو سکتا ہے

کہ میں اندھا تو نہیں میں مہاجر تو نہیں لیکن جتنا میں اس سوچ کو دبانے کی کوشش کرتا اتنی ہی تیزی سے جواب آتے کہ جس نے تمھیں آنکھیں دی ہیں تم اپنے ملک میں رہ رہے ہو لیکن حالات اور کل کا کوئی اندازہ نہیں.

حسن جیسے معصوم ہزاروں اس معاشرے میں ہر جگہ موجود ہیں اور ہمارے ارد گرد اپنے معصوم ہاتھوں سے کام کر رہے ہیں لیکن کوئی بھی ان کی طرف توجہ دینے کو تیار نہیں حکومت سے گلہ تو تب کیا جائے جب ہم اپنے فرائض پورے کر رہے ہوں - کیا ہم اپنے بچوں پر ہزاروں روپے خرچ نہیں کرتے اگر حسن جیسے بچوں پر ہم سینکڑوں خرچ کرے تو کیا تبدیلی نہیں آسکتی - یہ وہ سوال ہے جو مجھ سمیت اس معاشرے میں رہنے والے ہر شہری کو اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے -

ہمت مرداں مدد خدا

پشاور ہائیکورٹ کے احاطے میں جہاں انصاف بٹتا ہے وہاں محمد عدنان نامی نوجوان کرسیوں کی اتنی صفائی سے مرمت کرتا ہے کہ دیکھنے والے بھی حیران ہو جاتے ہیں محمد عدنان وکلاء کی خراب کرسیوں کو ٹھیک کرکے روزانہ آٹھ سو روپے مزدوری کرتا ہے جو اس کے گھر کے اخراجات پوری کرنے کیلئے ناکافی ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی بھرپور محنت کررہا ہے۔پچیس سالہ محمد عدنان گذشتہ دو ماہ سے پشاور ہائیکورٹ کے احاطے میں بیٹھ کر یہی کام کر رہا ہے۔ اس سے قبل وہ جوڈیشل کمپلیکس پشاور میں وکلاء کی خراب کرسیوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ تاہم اسے وہاں اس کی ادائیگی کم ملتی اسی بناء پر محمد عدنان نے پشاور ہائیکورٹ کا رخ کرلیا۔

لیکن یہ تصویر ایک رخ ہے۔ہاتھوں سے کرسیوں کی مرمت کرنے والا محمد عدنان آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے اور سفید چھڑی ہاتھ میں لیکر اپنے علاقے چونا بھٹی نشتر آباد پشاور سے روزانہ پشاور ہائیکورٹ کی بلڈنگ کا رخ کرتا ہے جہاں آنے کے بعد اسے عام لوگ ہاتھوں سے پکڑ کر پشاور ہائیکورٹ کے سبزہ زار میں پہنچا دیتے ہیں اور اسے آتا دیکھ کر وکلاء بھی اپنے خراب کرسیاں اسے ٹھیک کرنے کیلئے دے دیتے ہیں اور پھر عدنان اسے ٹھیک کرنے میں مصروف عمل ہو

جاتا ہے۔ موسموں کی شدت سے بے نیاز محمد عدنان اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں اس کے گھر میں کوئی بھی شخص بینائی سے محروم نہیں قدرت نے صرف بینائی سے محمد عدنان کو محروم رکھا ہے تاہم اس کے گھر والوں نے اسے نشتر آباد میں واقع بینائی سے محروم افراد کے سرکاری سکول میں داخل کروا دیا جہاں پر اسے .بریل کے ذریعے ابتدائی تعلیم دی گئی اس ادارے میں پچیس اور بھی بینائی سے محروم طالب علم تھے جنہیں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد باعزت روزگار کی خاطر ادارے میں کرسیوں کی مرمت کرنا سکھائی گئی اور یوں محمد عدنان اپنے اس ہنر کو لیکر زندگی کے میدان میں اتر گیا۔

بھوک پیاس اور موسموں کی شدت سے بے نیاز یہ نابینا نوجوان کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتا۔ محمد عدنان کے بقول وہ روزانہ گھر سے روزگار کیلئے نکلتا ہے پہلے پہل جوڈیشل کمپلیکس پشاور میں بیٹھا کرتا تھا جہاں پر وکلاء کی خراب کرسیوں کو ٹھیک کرنے کا کام کرتا لیکن اس کی ادائیگی کم ملتی جس سے گزارا مشکل سے ہوتا اب تقریبا دو ماہ سے پشاور ہائیکورٹ کے احاطے میں بیٹھ کر عدالت عالیہ کے وکلاء کے کرسیوں کی مرمت کرتا ہوں جس سے روزانہ سات سو اور آٹھ سو روپے کی مزدوری ہو جاتی ہے محمد عدنان نے مزید بتایا کہ مجھے پتہ ہے کہ آج کے دور میں سات سو روپے کی کوئی اہمیت نہیں مجھے کم اور زیادہ کی فکر نہیں مشکل سے گزارا ہوتا ہے لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں

اپنا رزق حلال کما رہا ہوں اور گھر کی ذمہ داریوں میں میرا بھی ایک حصہ ہے ۔ جس سے مجھے اپنی نابینا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔۔ محمد عدنان نے مزید بتایا کہ چونکہ شہر میں دوسرے علاقوں میں ایک مخصوص جگہ پر کرسیوں کی مرمت نہیں کی جاتی اس لئے کام میں مشکلات پیش آتی ہیں اسی بناء پر میں عدالت آتا ہوں چونکہ یہاں پر وکلاء کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور انہیں انکی مرمت کا وقت نہیں ملتا اسی بناء پر ان کی سہولت کیلئے کام یہاں کرتا ہوں اور کبھی کبھار خوشی سے یہ لوگ اضافی رقم بھی دیتے ہیں جو میرے آنے جانے کا خرچہ ہوتا ہے۔

پشاور ہائیکورٹ بار کے صدر محمد عیسی خان سے جب محمد عدنان کے حوالے سے سوال کیا گیا تو وہ اس باہمت نوجوان کو دیکھنے کیلئے ہائیکورٹ کے احاطہ میں پہنچ گئے اور اسے شاباش دی کہ اگر اسے کوئی مسئلہ ہو تو وہ براہ راست مجھ سے رابطہ کرکے اپنا مسئلہ حل کرسکتا ہے۔ جس پر محمد عدنان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پشاور ہائیکورٹ بار کے محمد عیسی خان نے محمد عدنان کی کاوش کو سراہتے ہوئے کہا کہ محمد عدنان کا حوصلہ دوسرے نابینا لوگوں بلکہ ہمارے معاشرے اور ہم جیسے وکلاء کیلئے بھی قابل تقلید ہے جو اپنی معذوری کے باوجود محنت مزدوری کررہا ہے اوران لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو ہر طرح سے ٹھیک ہوتے ہیں لیکن بھیک مانگتے ہیں۔

پشاور ہائیکورٹ میں محنت مزدوری کرنے والا محمد عدنان نہ صرف ان لوگوں کیلئے جو اپنی معذوری کو کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں کیلئے ایک مثال ہے بلکہ ان لوگوں کیلئے جو محنت کرنے سے جی چراتے ہیں ان کیلئے بھی قابل تقلید شخصیت ہے محمد عدنان جیسے جوانوں کو دیکھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان ہمت کرے تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا یقینا محمد عدنان جیسے جوانوں کیلئے کہا گیا ہے کہ "ہمت مرداں مدد خدا"

! ادھورے خواب

گل خان کیلئے یہ خبر دھماکے سے کم نہیں تھی کہ اس کی بیوی روزینہ کا انتقال ہوگیا۔ گھر سے آنیوالے فون نے اس کے دماغ کو ماؤف کردیا۔ جس میں گھر والوں نے اسے بتا دیا کہ \" تمھاری بیوی بیٹے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی \" یہ چھوٹا سا جملہ اس کیلئے جیسے بم تھا۔ گھر سے دور دبئی کے ایک شاپنگ مال میں سیکورٹی گارڈ کی حیثیت سے کام کرنے والا گل خان دس ماہ قبل پاکستان میں چھٹی گزارنے کے بعد آیا تھا اور اس کا پروگرام تھا کہ دو سال بعد وہ اپنے گھر جائیگا جہاں پر وہ اپنی بیوی روزینہ اپنی بیٹی آمنہ سے ملے گا اور اپنی خاندان کیلئے وہ بہت سارے خواب دیکھتا۔یہ خواب اسے ہر روز نئی زندگی دیتے اور وہ دلجمعی سے کام میں مصروف ہو جاتا۔ شاپنگ مال کے باہر ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے بھی اپنے گھر والی اور بیٹی آمنہ کو یاد کرتا تو اس کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ پھیل جاتی۔ کبھی کبھار لوگ اسے مسکراتا دیکھا کر حیران رہ جاتے کہ آخر \" خان صاحب کو کیا ہوگیا\" کہ ہنس رہا ہے لیکن گل خان اپنے خیالی دنیا میں گھر والی اور بیٹی آمنہ کو دیکھ کر اپنی زندگی جیتا۔

خیبر پختونخواہ کے دور دراز علاقے دیر سے تعلق رکھنے والے پینتیس سالہ گل

خان پانچ سال سے دبئ میں سیکورٹی گارڈ کی حیثیت سے ڈیوٹی انجام دے رہا تھا - اپنے علاقے میں روزگار نہ ملنے کی وجہ سے وہ دبئ میں ویزہ لیکر آیا - ایف اے پاس گل خان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھی اس بناء پر گل خان کو سیکورٹی اہلکار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا- جس کی ماہانہ تنخواہ چالیس ہزار روپے تھی تاہم اس کم تنخواہ میں وہ اپنے اخراجات بھی پورا کرتا اور گھر والوں کو بھی بھیجتا-جس سے گاؤں میں اس کے گھر والوں کی زندگی گزر رہی تھی -وہ اپنے گاؤں جسکی آبادی تین سو لوگوں پر مشتمل تھی کا پہلا شخص تھا جو دبئ میں کام کرنے آیا تھا - تین سال قبل جب وہ اپنی سالانہ چھٹی پر گاؤں گیا تو تین ماہ کی چھٹی میں اس کے گھر والوں نے اس کی شادی گاؤں ہی میں رہائش پذیر عبدل کاکا کی بیٹی روزینہ سے کردی جو اس وقت میٹرک کی طالبہ تھی -اسے منگنی کے موقع پر احساس ہوا کہ روزینہ کی عمر اتنی نہیں لیکن اپنی والدہ کے سامنے اس بارے میں بات بھی نہیں کرسکتا تھا البتہ اس حوالے سے اس نے اپنی بہن گل مینہ کو بتادیا تھا کہ روزینہ اور اس کی عمر میں پندرہ سال سے زائد کا فرق ہے اور شادی ہی کرنی ہے تو پھر اس کی عمر کی کوئی دوسری لڑکی سے شادی کرائی جائے لیکن بہن گل مینہ بھی اس معاملے میں اس کی مدد کرنے سے قاصر رہی اور یوں گل خان کی شادی روزینہ سے کردی گئ - شادی کے دوسرے مہینے وہ دبئ روزگار کی وجہ سے واپس آگیا اور اپنی نئ نویلی دلہن روزینہ کو روتے ہوئے چھوڑ دیا تھا گھر چھوڑتے ہوئے گل خان نے روزینہ کو

جھوٹا دلاسہ دیا تھا کہ میں تمھیں جلد بلا لونگا لیکن اسے پتہ تھا کہ اس کی اوقات اتنی نہیں نہ ہی وہ دبئ میں اپنی دلہن کو فلیٹ میں رکھ سکتا تھا جہاں پر اس جیسے پانچ اور افراد بھی زندگی گزارنے پر مجبور تھے کیونکہ مشترکہ اخراجات کی وجہ سے یہ سب افراد جن کا تعلق مختلف شہروں سے تھا ایک کمرے میں سوتے تھے.

گاؤں سے دبئ واپسی کے دسویں مہینے اسے اطلاع ملی کہ اس کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی یہ اطلاع اسے گاؤں سے فون پر ملی تھی اور یہ اطلاع اس کی زندگی کی بڑی خوشی ثابت ہوئی کیونکہ اطلاع کے تیسرے دن اسے ایک دوسرے کمپنی میں سیکورٹی سپروائزر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا جہاں پر اسے اچھی تنخواہ ملنے لگی گل خان نے فون پر اپنے گھر والوں کو اپنی بیٹی کے نام سے آگاہ کیا اور روزینہ کے مشورے سے اس نے اپنی بیٹی کا نام آمنہ رکھ دیا- اس کی بیوی بھی خوش تھی لیکن بیٹی کی پیدائش پر اس کے دل میں گل خان کے گھر والوں کا ڈر تھا جو روزینہ نے فون پر گل خان کو بتا دیا تھا لیکن گل خان نے اسے ہر قسم کا وسوسہ دور کرنے کو کہا اور کہا کہ \" بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں\" - چونکہ بیٹی کی پیدائش کے بعد اسے دوسری جگہ پر نوکری مل گئی اسی بناء پر اسے زیادہ وقت دفتر کو دینا پڑ گیا اور پھر ایک دن روزینہ نے اپنے میکے سے گل خان کو فون کیا کہ بیٹی کی پیدائش گل خان کے گھر والوں کیلیے

خوشی کا باعث تو ہے لیکن انہیں بیٹے کی خواہش تھی جبکہ بیٹی کی پیدائش نے گل خان کے گھر والوں کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا ہے اسی باعث اس کے گھر والوں کا رویہ بھی گل خان کے بیوی روزینہ سے ٹھیک نہیں۔ بیوی کی بات سن کر گل خان کو افسوس بھی ہوا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اس نے بیوی کو\" گزارہ کرو\" کی بات کی اور کہا کہ وہ وطن واپسی کیلئے چھٹی کی درخواست دیگا اور حالات جلد ٹھیک ہو جائینگے جیسے جملے کہہ کر اپنی بیوی کی شکایتوں کو کم کیا اور پھر فون بند کر دیا۔

گھر سے فون آنے کا سلسلہ جاری تھا جس میں وہ بیوی کو دلاسے دیتا کہ حالات بہتر ہوتے ہی وہ اسے بلالے گا اور پھر اس کی بیوی اس کی دلاسوں سے مطمئن ہو جاتی او رپھر آخر کار جس کمپنی میں وہ ملازم تھا اسے ایک ماہ کیلئے چھٹی دیدی جس کا اسے خوشی سے انتظار تھا وہ گھر والوں کو حیران کرنا چاہتا تھا اس لئے گھر والوں کو بتائے بغیر ہی پاکستان روانہ ہوگیا۔ اپنے گھر پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ اس کی بیوی کیساتھ اس کے گھر والوں کا رویہ ٹھیک نہیں تھا کیونکہ بیٹی کی پیدائش پر گھر والے اسکی بیوی روزینہ کو قصور وار گردانتے تھے اس کے والدہ کو اپنے بیٹے سے نسل چلانے کی خواہش تھی کہ اس کا پوتا اس کے ہاتھ میں ہو لیکن پوتی کی پیدائش نے اس کی خواہش کو مزید بڑھا دیا تھا۔

ایک مہینے کی چھٹی کے دوران اس کے گھر والے اس کے ذہن میں یہی بات ڈالتے کہ بیٹا لازمی ہے ۔ اور پھر انہی چھٹیوں میں گل خان سے غلطی ہو گئی جس کا اسے بعد میں احساس ہوا لیکن اپنی اس غلطی کو ختم کرنے کیلئے اس نے کوشش بھی نہیں کی ۔ گل خان کی بیوی نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ بچوں میں وقفہ ضروری ہے ۔ لیکن اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کے رویئے اور احساس نے گل خان کے دماغ میں آگ بھر دی تھی کیونکہ اسے طعنہ بھی ملا تھا کہ \" تمھاری بیگم بیٹی پیدا کر سکتی ہیں بیٹے نہیں اور ساتھ میں اسے \" مردانگی \" کا طعنہ بھی ملا تھا۔ انہی طعنوں نے گل خان سے "\ وہ غلطی کروادی جس کا احساس دبئ واپسی پر اسے ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی آمنہ کے بنیادی حقوق کی بھی پامالی کی کیونکہ دو ماہ تک دودھ پینا اس کیلئے ضروری تھا لیکن پھر غم روزگار نے غلطی کا یہ احساس بھی کسی حد تک کم کر دیا اور پھر اسے گھر والوں کی طرف سے فون آیا کہ تمھاری بیوی ایک مرتبہ پھر بیمار پڑ گئی ہیں جس کے علاج مقامی دائی کر رہی ہیں یہ اطلاع دیتے ہوئے اس کے گھر والے بہت زیادہ خوش تھے کیونکہ تیمر گرہ میں الٹرا ساؤنڈ کروانے پر پیدا ہونیوالے بچے کی جنس کا بھی پتہ چلا تھا اور یوں اس کی بیوی روزینہ کی بیماری گل خان کے گھر والوں کی خوشیوں کا پیغام لیکر آئی تھی لیکن ساتھ میں اسے بتا دیا گیا کہ اس کی بیوی ایک تو کم عمر ہے دوسری اس کی اپنی صحت کمزور ہے اس لئے ڈاکٹر نے اسے احتیاط کرنے کی ہدایت کی تھی ساتھ میں یہ بھی کہا تھا کہ \" ابھی تو

پہلی بیٹی کی عمر بھی اتنی نہیں کہ نئی بچے پیدا کرنے جارہی ہو\" اور ڈاکٹر نے اس کی بیوی روزینہ کو سخت وست کہا تھا کہ\" اپنی عمر اور حالت دیکھو اور اس حالت میں دوسرے بچے کی پیدائش \" -

گھر والوں سے فون پر بات کرنے کے بعد گل خان نے اپنی بیگم روزینہ سے بھی بات کی اور اسے ہدایات دی کہ اپنا خیال رکھے لیکن جب اسے بیگم نے ڈاکٹر کے بچوں میں وقفے سے متعلق بتایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس دفعہ بچے کی پیدائش خطرناک ہے۔ تو اس وقت گل خان کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا جس نے اس کے دل میں خلش پیدا کردی کہ\" کاش میں گھر والوں اور رشتہ داروں کے طعنوں میں نہ آیا ہوتا اور مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی\"اور پھر گل خان کو کام کے دوران جب بھی گھر والوں کی یاد آتی تو اپنی غلطی کا احساس ہوتا لیکن یہ صرف احساس کی حد تک رہا۔

اور آج جب وہ کمرے میں یونیفارم پہن کر دفتر جانے کیلئے نکل رہا تھا کہ اسے گھر والوں کا فون موصول ہوا اور گھر والوں نے اسے بتادیا کہ\" تمھاری بیوی بچے کو جنم دیتے ہوئے مر گئی جبکہ بیٹا بھی انتہائی کمزور ہے\" یہ جملہ اس احساس کو جس کا شکار گل خان تھا نے گل خان کو اس حال تک پہنچا دیا کہ وہ اپنے بیگم کی موت کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرانے لگا یہ احساس اسے

اپنا جرم لگا کہ اس کی بیوی کی موت میں اس کا اپنا ہاتھ ہے کیونکہ غلطی بھی اسی کی تھی جس کی تلافی بھی ممکن تھی لیکن اپنی مردانگی دکھانے اور طعنوں سے بچنے کیلئے گل خان نے اپنی غلطی کی تلافی بھی نہیں کی جس کا انجام اس کی بیوی کی موت کی صورت میں نکلا۔ اور فون کانوں کیساتھ لگائے گل خان کے دل و دماغ میں بیگم کی باتیں اور آنکھوں میں آنسوؤں اسے یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ نہ صرف اپنی بیوی بلکہ اپنے بچوں کا بھی مجرم ہے۔ جس کی سزا تو اسے اس دنیا میں نہیں مل سکتی لیکن \" اللہ کے ہاں\" اس سے ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔

سیکورٹی فورسز کا رویہ اور عوام

وی آئی پی کلچر کے خاتمے اور تبدیلی کا اعلان لانے والے عمران خان نے پشاور میں لاؤ لشکر کے ساتھ دورے کے بعد وزیراعلی ہائوس میں یہ اعلان کردیا کہ اگست میں انٹیلی جینس اداروں نے رپورٹ دی تھی کہ آرمی پبلک سکولوں کو خطرہ ہے اور یہ پورے پاکستان کو ہے تاہم اس میں زیادہ خطرہ خیبر پختونخواہ کو ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ خطرہ پشاور میں آرمی پبلک سکول کو ہے۔پھر ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کہ سکول میں کتنے فوجی تعینات کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی انٹیلی جینس ادارے حکومت کو یہ بتا دیا کریں کہ فلاں تاریخ کو فلاں سکول پر حملے کا خطرہ ہے اس لئے سیکورٹی سخت کی جائے ۔
موصوف نے یہ بتانے کی بھی کوشش نہیں کی کہ اگست کے بعد سیکورٹی اقدام کے طور پر کنٹونمنٹ بورڈ طبقہ اشرافیہ اور نچلے درجے کے شہریوں کے بچوں کی سیکورٹی کیلئے کیا اقدامات کئے گئے۔ یہ وہ سوال ہے جو ان سمیت اس ملک پر حکمرانی کرنے والے سیاسی و فوجی حکمرانوں سمیت پولیس حکام سے بھی کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر آپ کس مرض کی دوا ہے۔کیونکہ سیکورٹی کے نام پر پشاور شہر میں تو ہر جگہ ناکے لگے ہوئے ہیں اور کسی کی عزت تک محفوظ نہیں۔

ورسک روڈ پر ہونیوالے سانحے سے ایک ہفتے قبل میں دفتر کی گاڑی میں جس پر بڑے بڑے الفاظ میں ادارے کا نام لکھا ہوا تھا اور گاڑی کی مخصوص ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ یہ نشریاتی ادارے کی گاڑی ہے تاہم صدر میں سیکورٹی ناکے پر سیکورٹی فورسز کے ایک اہلکار نے گاڑی میں موجود تمام افراد سے شناختی کارڈ مانگے ۔یہ ناکہ بھی ہمارے دفتر کے باہر ہی ہے دس قدم کے فاصلے پر روڈ پر ہمارے ساتھیوں نے اپنے شناختی کارڈ دکھا دیئے کچھ کے پاس فوٹو کاپی تھی تاہم انہوں نے دفتر کے کارڈ دکھا دیئے جس پر متعلقہ آفیسر غصے میں آگئے اور کہا کہ کیونکہ شناختی کارڈ نہیں ہے تو لائن میں کھڑے ہو جائو اور اگر کسی نے گاڑی سے اترنے کی کوشش کی تو میں گولی ماردونگا اور ساتھ ہی کلاشنکوف بھی آگے کردی۔اور یوں تقریبا بیس منٹ ہم اپنی دفتر کے سامنے گاڑی میں محبوس بیٹھے رہے بعد میں آئی ایس پی آر سے رابطے پر جان چھوٹ گئی ۔ لیکن پھر بھی ڈیوٹی پر موجود اہلکار بری طرح دیکھتا رہا۔ان حالات میں کنٹونمنٹ کے ایریا میں داخل ہونے والے دہشت گردوں کی کارروائی ایک سوالیہ نشان ہے ۔

اس سانحے کے ساتویں روز میری بیگم اور بہنیں صدر میں خریداری کرنے کے بعد گھر واپس جارہی تھی کہ تھانہ شرقی کی حدود میں سیکورٹی اہلکاروں نے رکشے میں بیٹھی تینوں خواتین کو روک دیا۔بڑی بہن نے شناختی کارڈ دکھایا تاہم وہاں پر موجود سیکورٹی اہلکاروں نے خواتین کو رکشے سے اتار دیا اور کہہ دیا

کہ ہمیں اطلاع ہے کہ تین خواتین خودکش حملہ آور آرہی ہیں اس لئے گاڑی سے اتر جائیں - گھر والوں نے انکو بتادیا کہ جو خودکش حملہ آور ہوتی ہیں وہ شاپنگ کرکے نہیں جاتی ہمارے پاس شاپنگ ہے جو ابھی ہم صدر بازار سے کرکے آرہی ہیں اور اس میں سب بچوں کا سامان اور کپڑے پڑے ہوئے ہیں لیکن موقع پر تعینات سیکورٹی اہلکاروں نے انہیں کہا کہ خودکش حملہ آوروں کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا اور آپ سائیڈ پر کھڑے ہوجائیں ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ ہم شاپنگ بیگ کو چیک بھی نہیں کرینگے۔ پندرہ منٹ انتظار کروانے کے بعد میری بڑی بہن نے غصے میں آکر کہہ دیا کہ جو لوگ کرنے والے ہوتے ہیں وہ آکر چلے جاتے ہیں اور ہماری طرح لائنوں میں کھڑے نہیں ہوتے اور اگر شناخت ہی کروانی ہے تو پھر میں اپنے شوہر یا بھائی کو بلواتی ہوں جو آپ کو بتادینگے کہ ہم پاکستانی ہیں کوئی افغان مہاجر نہیں۔جس کے بعد سیکورٹی اہلکاروں نے انہیں جانے دیدیا-تاہم انہیں بیس منٹ بغیر کسی وجوہات کے سڑک کنارے کھڑا کرکے رکھا گیا - یہ ہے ہمارا نیا خیبر پختونخواہ- عمران خان کا نیا پاکستان دوسروں کے بیٹیوں / بیٹیوں کے ناچ گانے پر خوش ہونے والوں کیلئے پختون معاشرے میں کسی خاتون کو سڑک کنارے کھڑا کرنا کیسا لگتا ہے اس کا اندازہ اگر نام کے پٹھان عمران خان کو نہیں تو پرویز خٹک کو ضرور ہونا چاہئیے کہ یہ چیزیں نفرت پیدا کرتی ہیں-ایسی نفرت جسے قابو نہیں کیا جاسکتا اور پھر فوجی آپریشنوں کے ذریعے بھی حالات کنٹرول نہیں رہتے -

ہمارے کچھ ساتھی جن کا تعلق قبائلی علاقوں اور جنوبی اضلاع سے ہیں کبھی کبھار اپنے اور عام لوگوں کیساتھ ہونیوالے واقعات کے بارے میں بتاتے کہ ان کے ساتھ سیکورٹی فورسز کا رویہ ٹھیک نہیں ہوتا نہ ہی تمیز سے بات کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھار اتنی توہین محسوس ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو پاکستانی کہلوانے پر بھی غصہ آتا ہے لیکن ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایویں باتیں ہے لیکن پشاور کے کنٹونمنٹ بورڈ میں تعینات سیکورٹی اہلکاروں کی رویہ ایک سوال نشان ہے ۔۔ یہی سوچ ہی ہوتی ہے جو محبت اور نفرت پیدا کرتی ہیں۔ کسی کو اندازہ نہیں تو پھر حمود الرحمان کمیشن رپورٹ ہی پڑھ لیں جس میں بتایا گیا کہ ہماری سیکورٹی فورسز نے بہادری سے بنگلہ دیش میں جنگ لڑی لیکن ایک طرف تو انہیں مقامی لوگوں کا تعاون حاصل نہیں تھا اور دوسری طرف وہاں پر مکتی باہنی کام کررہی تھی ساتھ میں جنرل نیازی جیسا شخص مشرقی پاکستان میں تعینات فوج کی کمانڈ کررہا تھا جس کے کہے ہوئے الفاظ کی وجہ سے ایک حاضر سروس بنگالی آفیسر نے میٹنگ کے دوران واش روم میں جا کر اپنے آپ کو گولی مار دی تھی۔اور پھر بنگلہ دیش علیحدہ ہوگیا۔ غلطی سیاسی ہو یا فوجی تاریخ اور عوام کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

تمیں نکات اور ابتر تعلیمی صورتحال

پشاور میں آرمی پبلک سکول میں پیش آنیوالے واقعے نے جہاں ہماری سیکورٹی اداروں کے کھوکھلے دعوؤں کو ظاہر کردیا ہے جو سیکورٹی کے حوالے سے بڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہم سے \" بڑا تمیں مار خان\" کوئی نہیں۔وہیں پر اس سانحے کے بعد شہر کے بیشتر علاقوں میں شہریوں نے اپنے بچوں کو سکولوں سے اٹھانا شروع کردیا ہے۔
میرے ایک صحافی دوست نے گذشتہ روز بتایا کہ پشاور شہر کے علاقے کریم پورہ میں ایک جاننے والی ایک خاتون جس کے نو سالہ بیٹی ' بارہ سال کا ایک بیٹا اور چودہ سال کا بیٹا پرائیویٹ سکولز میں پڑھ رہے ہیں نے خوف کے باعث اپنے بچوں کو سکول سے اٹھا دیا ہے خاتون کے بقول اب سکولوں کے حالات خراب ہیں اور اپنے بچوں کو مرنے نہیں بھیج سکتی اس لئے نو سالہ بیٹی کو گھر میں بٹھا دیا کہ گھر کے کام کاج کرو جبکہ دو بیٹوں جن کی عمریں بارہ اور چودہ سال ہیں میں ایک کو ٹیلر اور دوسرے کو مستری کے پاس بٹھا دیا۔ تاکہ یہ کچھ سیکھ سکیں۔ خاتون کے بقول ایک طرف سے ذہنی تناؤ بھی کم ہوگا اور دوسری طرف اخراجات بھی کم ہو جائینگے اور میرے بچے بھی کچھ نہ کچھ سیکھ لیں گے۔یہ ایک حقیقی واقعہ ہے ' ایسے ہی کتنے واقعات ہمارے ارد گرد پشاور اور خیبر پختونخواہ کے مختلف علاقوں میں ہو رہے ہیں۔دوسری طرف سرکار نے سیکورٹی کے نام پر نئی سیکورٹی

پلان سکولوں کیلئے تیار کرلیا ہے جس کے تحت سکولز خصوصا پرائیویٹ سکولوں کیلئے نئی ہدایات جاری کی گئی ہیں-

سولہ دسمبر 2014ء کو آرمی پبلک سکول میں پیش آنیوالے واقعے کے بعد صوبائی حکومت نے سکولوں کی سیکورٹی بہتر بنانے کیلئے نئی حکمت عملی تیار کرلی ہے جس میں نجی سکولوں کی سیکورٹی بہتر بنانے سمیت سکول میں داخلے اور اخراج کے راستے' سیکورٹی گارڈ کی تعیناتی' سی سی ٹی وی کیمروں کی تنصیب 'واک تھرو گیٹ' مہمانوں کی اندراج کیلئے کاغذات اور الارم سمیت سرچ لائٹس لگانے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں 23 نکات پر مشتمل ان سیکورٹی احکامات پر عملدرآمد کرنے کیلئے پولیس نے مختلف علاقوں میں نجی سکولوں کو ہدایات جاری کردی ہیں تاکہ خدانخواستہ آرمی پبلک سکول پشاور جیسا واقعہ رونما نہ ہو- انتظامیہ کی جانب سے سیکورٹی کیلئے اٹھایا جانیوالا یہ اقدام کسی حد تک بہتر ہی ہے- لیکن کیا موجودہ صورتحال میں پرائیویٹ سکولز مالکان اس پوزیشن میں ہیں کہ اتنے اخراجات کرسکیں' اور اگر یہ سب کچھ ہو بھی تو اس کے سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے ذہنوں پر کیا اثرات مرتب ہونگے' اور اگر پرائیویٹ سکولز مالکان اس پوزیشن میں نہیں کہ اس طرح کے سیکورٹی اقدامات اٹھائے تو کیا ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جائیگی -اور اگر کارروائی ہوگی تو اس کے اثرات ہمارے معاشرے میں کیسے پڑیں گے اس کا اندازہ کسی نے لگایا بھی ہے کہ نہیں-

حکومت ایک طرف تعلیم کی شرح کو بلند کرنے کیلئے بلند و بانگ دعوے کررہی ہیں دوسری طرف سرکاری سکولوں کا یہ حال ہے کہ ایک کلاس میں سات سے آٹھ سیکشن ہوتے ہیں جس میں چالیس سے ساٹھ کے قریب بچے پڑھتے ہیں پشاور جیسے شہر میں بھی ایسے سکولز موجود ہیں جہاں پر بچے آج بھی ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں - ان میں طالبات کے سکولز بھی موجود ہیں جہاں پر پینے کا پانی تو درکنار واش روم کی سہولت تک موجود نہیں-دوسرے ان سکولوں میں پڑھایا جانیوالا نصاب 1980 کا پڑھایا جارہا ہے- جبکہ ایسے علاقے اب بھی موجود ہیں جہاں پر سرکاری سکول کا تصور کرنا بھی محال ہے- دوسری طرف سرکاری سکولوں میں سیاسی بنیادوں پر بھرتی ہونیوالے بیشتر اساتذہ بھی ایسے ہیں جنہیں پڑھانے کے علاوہ سب کچھ آتا ہے ان میں سیاست سے لیکر پروموشن کیلئے وزیر ' ایم پی اے کے گھر کا دورے اور تحائف دینا بھی شامل ہیں-ایسے میں اگر پرائیویٹ سکولز جو کسی حد تک تعلیم کی شرح کو بلند کرنے کیلئے کوشاں ہیں ان میں سہولتیں بھی سرکاری سکولوں کے مقابلے میں بہتر ہیں اور پڑھایا جانیوالا نصاب بھی کسی حد تک اپ ڈیٹ ہیں ان حالات میں اگر 23 نکات پر مشتمل سیکورٹی اقدامات یہ پرائیویٹ سکولز مالکان اٹھائیں بھی تو اس کے اثرات نہ صرف بچوں پر پڑیں گے کیونکہ سکول میں داخلے کے وقت کیمرے ' سیکورٹی گارڈ ' بسوں کی سیکورٹی کیلئے علیحدہ سٹاف دیکھ کر بچے کیا سوچیں گے کہ یہ سکول ہیں یہ پھر قید خانہ ہیں-

جہاں پر سیکورٹی کے اتنے سخت انتظامات کئے گئے ہیں - بچے تو ویسے بھی سکولوں سے ڈرتے ہیں ایسے میں ان کی ذہنی نشوونما اور تربیت کیسے ہوگی یہ سوچنے کی بات ہے۔ دوسری طرف اگر پرائیویٹ سکولز مالکان 23 نکات پر مشتمل سیکورٹی کیلئے اقدامات اٹھائیں گے بھی تو اس کا زور بچوں کے والدین سے نکالیں گے آج اگر کوئی والد اپنے بچے کی فیس دو ہزار روپے جمع کرا رہا ہے تو پھر یہ فیس پانچ ہزار روپے تک بڑھ جائیگی کیونکہ پرائیویٹ سکولز کے مالکان اپنا منافع تو کم نہیں کر سکتے ہاں البتہ بچوں کے والدین کی جیبیں ہلکی کرنے کیلئے انہیں یہ مواقع بھی حکومت خود ہی فراہم کر رہی ہیں۔ اگر پرائیویٹ سکولز مالکان سیکورٹی کیلئے اٹھائے جانیوالے 23 نکات پر عملدرآمد نہیں کرتی تو پھر لازما ان سکولوں کے خلاف کارروائی ہوگی ایسے میں نقصان سب سے زیادہ ان سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کا ہے کیونکہ سکول مالکان آخری حربے کے طور پر سکولز بند کرینگے اور پھر بچے گھروں تک محدود رہینگے۔ میلینیم ڈویلپمنٹ گول کے اہداف کو پورا کرنے کی کوشش کرنے والے ملک میں اس طرح کا اقدام نہ صرف بچوں کیساتھ دشمنی ہوگی بلکہ تعلیمی شعبے میں اپنے آپ کو مزید نیچے گرانا ہی ہوگا۔ صوبائی حکومت نے سیکورٹی کیلئے جو 23 نکات جاری کئے ہیں ان میں واک تھرو گیٹ لگانا بھی شامل ہے۔واک تھرو گیٹ کی قیمت کا اندازہ کسی کو ہے اور کتنے سرکاری دفاتر ہیں جہاں پر واک تھرو گیٹ لگائے

گئے ہیں ایسے میں پرائیویٹ سکولز سے واک تھرو گیٹ کا مطالبہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ تبدیلی کے دعویداروں کا یہ اقدام سمجھ سے بالاتر ہے۔ صوبائی حکومت اگر سیکورٹی کے حوالے سے اتنے ہی فعال ہے تو پھر اس سانحہ کے ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کرتی ابتدائی رپورٹ میں تو پولیس کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے جن کے ناکے تو اس شہر میں ہر جگہ ہیں لیکن اس سے فائدہ عوام کو تو نہیں البتہ ان ناکوں پر موجود اہلکاروں کو خوب ہوتا ہے جو شہریوں کا جیب ہلکا کرنے کے فرائض انجام دیتے ہیں جیب ہلکی کرنے سے انکار کرنے والوں کو حوالات میں رات گزارنی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی سیکورٹی بھی حکومت بہتر کرے اور ساتھ میں کچھ اقدامات پرائیویٹ تعلیمی ادارے بھی اٹھائے تو نہ صرف آرمی پبلک سکول جیسے واقعات رونما نہیں ہونگے بلکہ بہت سارے والدین بھی اپنے بچوں کو سکولوں سے خوف کے مارے نہیں اٹھائیں گے اور وہ تعلیم حاصل کرینگے ۔

اظہار ہمدردی یا معاشرتی بے حسی کا پرچار

خدانخواستہ اگر آپ کسی حادثے میں زخمی ہو جائیں یا آپ کا کوئی قریبی شخص حادثاتی موت کا شکار ہو جائے تو آپ کی کوشش ہو گی کہ لگنے والا زخم جلدی ٹھیک ہو جائے یا جو شخص انتقال ہوا ہے اس کے غم کو بھلا دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزانہ آپ کے پاس آ کر بیٹھ جائے ہو اور گپ شپ میں آپکے زخم پر نمک مرچ ڈالتا ہو یا پھر نئے سرے سے زخم کو تازہ کرتا ہو اور جاں بحق ہونیوالے شخص کی اچھی یا بری باتیں روزانہ آپ کو یاد دلاتا ہو تو آپ کیا سوچیں گے۔ یہی کہ یہ شخص پاگل ہے جو میرے ذہن کو تازہ کرتا ہے بلکہ مجھے مزید اذیت میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ان حالات میں آپ کی کوشش ہو گی کہ ایسے شخص سے دور رہا جائے جو آپ کے زخموں کو تازہ کرنے کے چکر میں ہو۔کچھ یہی حال ہماری میڈیا اور خصوصا الیکٹرانک میڈیا کا بھی ہے ۔ سولہ دسمبر 2014 ء کو پیش آنیوالے اندوہناک واقعے کی رپورٹنگ کچھ اس انداز میں کی جارہی ہیں کہ اس واقعے سے متاثر ہونیوالا ہر شخص اپنے زخم بھول نہیں رہااور حال یہ ہے کہ روزانہ کی نیوز بلیٹن / اخبارات میں نئے نئے کیریکٹر ڈھونڈے جا رہے ہیں اوران پر نئی نئی کہانیاں چھپ رہی ہیں جسے پورا ملک پڑھ رہا ہے ۔ اذیت کے اس احساس کو رپورٹ کرنا بھی میڈیا کی ذمہ داری ہے لیکن آج کل میڈیا کچھ حد سے زیادہ ہی یہ ذمہ داری پوری کر رہا ہے اس کے ذمہ دار کیا

فیلڈ میں کام کرنے والے صحافی ہیں یا میڈیا دفاتر میں بیٹھے ہوئے چند افراد یا پھر اس ملک کے بیشتر شہری۔

پشاور میں پیش آنیوالے سولہ بارہ چودہ کے افسوسناک واقعے کے بعد ہر ایک اخبار / ٹی وی چینل نئے انداز سے رپورٹنگ کر رہا ہے۔ روزانہ کے بلیٹن / چھپنی والی خبروں میں میں موم بتیوں کے چلانے کا ذکر مرنے والے بچوں کی ماؤں کی آہ و بکا ریکارڈ / شائع کرکے کیا صحافی اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ یقیناً نہیں اس واقعے کو دو ہفتے گزر جانے کے باوجود آج بھی اس سکول میں آنے جانیوالوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔آنے جانیوالے والوں میں زیادہ تر معصوم بچے اور خواتین شامل ہیں۔میں نے ذاتی طور پر ایسی خواتین بھی دیکھی ہیں جو کہ حاملہ تھی اور اس حالت میں شوہر کے ہمراہ اس مقام کو دیکھنے کیلئے آئی تھی۔ایسے خاندانوں کے گروپ بھی دیکھے جو گاڑیوں میں بھر کر آئے جیسے یہ سکول کسی ٹرپ کی جگہ ہو۔ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو موبائل فون کسی شخص کو دیکر کہتے ہیں کہ فیس بک کیلئے میری تصویر اس جگہ پر بناؤ۔ شائد سکول میں آنا ان کیلئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔

گذشتہ روز ایک سرکاری صحافی سے سال میں دوسری مرتبہ ملاقات ہوئی جو پریس کلب کے انتخابات کے سلسلے میں ووٹ مانگنے کیلئے آئے ۔ موصوف نے زور سے گلے

ملتے ہوئے کہا کہ جناب آپ کی وہ ویڈیو مجھے بہت پسند ہے جس میں آپ آرمی پبلک سکول میں رپورٹنگ کرتے ہوئے روپڑے ہیں.برائے مہربانی آپ اس ویڈیو کو فیس بک پر شیئر کیجئے- بڑی مزیدار ویڈیو ہے- اس بے حسی کے مظاہرے پر میں اسے دیکھتا رہ گیا کہ اسے کیا جواب دوں؟ لوگوں کو وروتے ہوئے دیکھنا شائد ہماری فطرت بن گئی ہے ہم ہنستے ہوئے چہرے نہیں دیکھ سکتے یا پھر ہنستے ہوئے چہرے دیکھنا نہیں چاہتے ہاں روتا ہو اہر چہرہ ہمیں اچھا لگتا ہے-کیا یہ عمل اذیت پسندی نہیں- وہ معصوم بچے جو اس واقعہ سے متاثر ہوئے ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کیلئے صرف شمعیں جلانا؟ اس سکول پر آنا کافی ہے اور معصوم بچوں کو اس مقام پر لانا جہاں دہشت گردوں نے خونی کھیل کھیلا بچوں کیساتھ کھیلا ان کے ذہنوں پر کیا اثر ڈالے گا-یہ وہ سوال ہے جو اس سکول میں آنیوالے ہر شخص کو اپنے آپ سے کرنے کی ضرورت ہے خواہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو یا پھر عام شخص ہو یا خواتین ہو جو بچوں کو سیر کی جگہ سمجھے ہوئے بچوں کو اس سکول میں لاتی ہیں-

کیا اس ملک / شہر کے بیشتر مسائل حل ہو چکے ہیں- تعلیم کے شعبے سے لیکر؟ زراعت؟ بڑھتی آبادی؟ کم عمری میں بچوں کی شادی؟ صفائی؟ غیرت کے نام پر قتل؟ لڑکیوں کی تعلیم؟ سرکاری اداروں کی کرپشن؟ انصاف تک رسائی میں مسائل؟ سرکاری گاڑیوں کا بے دریغ استعمال؟ سیاسی پارٹیوں میں وراثتی

کردار، بجلی گیس بلوں میں اضافہ، کرایوں میں اضافہ، جہیز جیسی لعنت، تھر میں بھوک سے ہونیوالی اموات سمیت ماحول کی بربادی سے لیکر آبی وسائل کا بے دریغ استعمال جیسے مسائل ختم ہوگئے ہیں اور راوی چین کی نیند سو رہا ہے جو ہم گذشتہ دو ہفتوں سے آرمی پبلک سکول میں پیش آنیوالے بچوں، ان کے خاندانوں کے رونے دھونے اور مایوسی کی باتیں میڈیا پر دیکر پورے ملک کو ذہنی تناؤ کا شکار کر رہے ہیں-

اس واقعے کے بعد مختلف اداروں نے متعلقہ سکول میں پڑھنے والے بچوں کی ذہنی تناؤ کو کم کرنے اور انہیں دوبارہ معمولات زندگی میں لانے کیلئے سائیکالوجیکل علاج بھی شروع کردیا ہے لیکن موجودہ حالات میں اس ملک کے بیشتر لوگوں کا ذہنی علاج کرنے کی ضرورت ہے بشمول صحافتی اداروں سے وابستہ افراد کیلئے جو تنازعات کی رپورٹنگ بھی کررہے ہیں اور اپنی رپورٹنگ کے ذریعے لوگوں میں ذہنی تناؤ بڑھانے کا باعث بن رہے ہیں - بجائے اس کے کہ اس ملک کے لوگوں میں جینے کی امنگ اور امید و مثبت سوچ پیدا کریں، ویسے بھی بحیثیت مسلمان ہمیں اس بات پر یقین ہونا چاہئیے کہ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا ویسے بھی موت ہر ایک کو آنی ہے - اور شہادت کی موت خوش نصیب افراد کو نصیب ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان کے والدین کی بھی بخشش ہوگی-دہشت گردی سے زخم خورد حوصلے دکھانے اور اذیت پسندی اور بے حسی کے مظاہرے کی بجائے ہمیں دہشت گردی

-کا راستہ روکنے کیلیے آواز اٹھانی چاہیئے

آخر لوگ کیا کہیں گے

میں گنجا ہونا چاہتا ہوں۔ایسا گنجا جس کے سر پر بال بالکل نہیں ہوں اور اسے صاف پشتو زبان میں " شنیگری سرے" کہا جائے ۔ لیکن معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے رویئوں سے بھی ڈرتا ہوں کہ "آخر لوگ کیا کہیں گے" یقیناًپڑھنے والوں کیلئے یہ بات عجیب ہوگی کہ اس میں کونسی بڑی بات ہے جب دل چاہا سر کو بالوں کی قید سے آزاد کرادو لیکن میں اپنی یہ خواہش گذشتہ چالیس سالوں سے دل میں لئے پھر رہا ہوں کہ کب ایسا دن آئیگا جب میں " شینگری سرے" بن جاؤنگا۔

بچپن میں سرکاری سکول میں ٹاٹ پر پڑھا ہوں ایسے کلاس میں جہاں پر کلاس میں ساٹھ سے زائد بچے ایک کلاس میں ٹھونسے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے کلاس دوئم میں ہم کلاس فیلو بیٹھے تھے کہ میرے ایک ساتھی نے میرے سکول کے ملیشیا کپڑوں پر رینگنے والی ایک " جوئیں " پکڑی اور زمین پر رکھتے ہوئے اعلان کردیا کہ آجاؤ مسرت کے کپڑوں سے جوئیں نکلی ہیں اسے دیکھ لو" اف اتنی شرمندگی اور میں جلدی سے جوئیں کو دیکھنے کیلئے بیٹھ گیا اس دوران دوسرے کلاس فیلو جوئیں کو دیکھنے کیلئے آرہے تھے کہ میں نے زمین نے پھونک مار دی اور کہا " کہاں ہیں جوئیں جھوٹ بولتے ہوں" میرے پھونک سے جوئیں تو غائب

ہو گئی اور جو کلاس کے دوسرے ساتھی آ رہے تھے میری چالاکی سمجھے بغیر میرے کپڑوں سے جوئیں نکالنے والے ساتھی پر پل پڑے کہ " تم ہر وقت مسرت غریب کو تنگ کرتے ہوں" اور وہ میرا ساتھی خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ چلو اپنی چالاکی سے جان تو بچا لی ۔ لیکن اس ذہنی تناؤ کا شکار بھی رہا کہ آخر یہ جوئیں میرے کپڑوں میں کیسے آ گئی کیونکہ ہر روز تو میری والدہ میرے بالوں میں کنگھی اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر بھیجا کرتی تھی آخر یہ جوئیں کہاں سے آ گئی ۔ خیر آئندہ کے ڈر سے میں نے گھر آ کر والدہ کو کہا کہ میری بالوں میں جوئیں دیکھ لو اگر ہیں تو نکال دو تو والدہ نے کہا کہ ابھی وقت نہیں تو میں نے پھر کہا کہ " امی مجھے شینگری سرے" کر دو کہ نہ رہینگے بال اور نہ ملیں گے جوئیں" لیکن میری والدہ نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا کہ نہ بیٹا " گنجے مت بنو" عجیب لگوگے اور پھر لوگ کیا کہیں گے " میں اس وقت تو نہیں سمجھا لیکن یہ بات ذہن میں آ گئی کہ " آخر لوگوں کو میرے بالوں سے کیا مطلب ہے" لیکن میرے گنجے ہونے کی خواہش دل میں ہی رہی۔

سکول کے دور سے فارغ ہوا تو پھر کالج کے دور میں بالوں کا شوق رہا لیکن پھر بھی گنجے ہونے کی خواہش دل میں ہی رہی ۔ کچھ دن زندگی میں ایسے آئے جب میرا دل کرتا تھا کہ میں گنجا ہو جاؤ لیکن ان دنوں ہمارے علاقے میں ایک نیا ایس ایچ او آیا تھا جس نے ہمارے محلے میں دکانوں پر وی سی آر دیکھنے والوں کو

پکڑنے کے بعد گنجا کردیا اور پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا کہ جسے بھی پکڑا جاتا اسے گنجا کردیا جاتا اور میں نے خوف کے مارے گنجا ہونے کی خواہش کو قربان کردیا کہ آخر " لوگ کیا کہیں گے " کہ یہ لڑکا فلم دیکھتے ہوئے پکڑا گیا کیونکہ ایسے بہت سارے معزز افراد کو ان دنوں میں " شینگری سرے " کردیا گیا تھا اسی وجہ سے میں گنجا ہونے کی خواہش لئے عملی زندگی میں داخل ہوا۔

دوران ملازمت مختلف لوگوں سے رابطہ رہا اور بہت سارے گنجے دوست بھی دیکھے ایسے گنجے جن کی خواہش نہیں تھی کہ وہ گنجے ہو جائیں بلکہ وہ قدرتی طور پر گنجے پن کا شکار ہو گئے تھے یہ لوگ گنجا ہونے کی وجہ سے ہر وقت ذہنی تناؤ کا شکار رہتے اور مجھے کہتے کہ تمھارے بال کیوں نہیں گرتے 249 تم خوش قسمت ہو کہ تمھارے بال نہیں گر رہے اور میں اپنی برتری ان پر قائم رکھنے کیلئے اپنے گنجے ہونے کی خواہش دل میں ہی رکھتا۔ قدرتی طور پر گنجے ہونے والوں کی ایک عجیب سی منطق جو آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ لوگ اپنے ساتھ ہر وقت کنگھی جیب میں لئے پھرتے ہیں میں نے آج تک کسی بالوں والے شخص کے پاس کنگھی نہیں دیکھی ہاں جن کے بال نہیں ہوں یا پھر گنے چنے ہوں وہی کنگھی ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں۔ خیر غم روزگار میں جب بھی میں نے گنجے ہونے کا ارادہ کیا تو دوست کہتے کہ '' شینگری سرے " مت بنو کیونکہ پھر لوگ کیا کہیں گے اور میں لوگوں کے ڈر کے مارے بال گنجا کرنے سے محروم ہی رہا۔ ساتھ میں

دوست شرارت سے کہتے کہ " شینگری سرے" مت بنو کیونکہ پھر کوئی لڑکی لفٹ نہیں کروائیگی اور میں " لفٹ" لینے کے چکر میں بالوں پر توجہ دیتا رہتا۔

زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا جب میری منگنی کردی گئی منگیتر کو میں نے ایسی تصویر بھیجی جس میں میرے بال تھے جب منگنی ہو گئی تو پھر میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اپنے آپ کو بالوں سے محروم کروں لیکن جب میرے ارادے کا گھر والوں اور دوستوں کو پتہ چلا تو پھر کہنے لگے " تمھاری منگیتر کیا کہے گی کہ یہ " چھلا ہوا آلو" ہے اور میں منگیتر اور سسرال والوں کے ڈر سے بالوں کی قربانی دینے سے محروم رہ گیا۔

دوران ملازمت ایک تربیتی پروگرام میں تھائی لینڈ جانے کا موقع ملا بنکاک ائیرپورٹ پر اترنے کے فورا بعد وہاں پر ایک ہیر ڈریسر کی دکان میں گھس گیا کہ یہاں پر آکر اپنے آپ کو گنجا تو کردو لیکن وائے رے قسمت یہاں پر خاتون ہیئر ڈریسر نے گنجا کرانے سے معذرت کی اور کہا کہ وہ صرف مشین سے مجھے بالوں سے فارغ کرسکتی ہیں اور میں نے اسی پر اکتفا کیا کہ چلو " شینگری سرے" نہ سہی بلکہ " مشین سرے" ٹھیک ہے لیکن یہ خواہش دل میں رہی کہ میں شینگری سرے رہوں

بنکاک میں دو ہفتے گزارنے کے دوران مجھے احساس ہوا کہ " لوگ کیا کہیں گے والا، حساب" صرف ہمارے ہاں ہی چلتا ہے وہاں تربیتی پروگرام میں بھی کسی نے

توجہ ہی نہیں دی کہ پاکستان میں تو میرے میرے بال تھے اور ی 58اں آ کر میں نے مشین سے کاٹ دیئے" دو ہفتے گزرنے" مشین سرے "رہنے کے بعد بنکاک سے واپس پاکستان آگیا اور پھر میری یہ خواہش دل میں ہی رہی۔ لیکن دو ہفتوں میں ذہنی تناؤ سے بچا رہا کیونکہ جس وقت اٹھ جاتا " مشین سے کاٹے ہوئے بالوں" پر ہاتھ پھیرتا اور وقت ضائع کئے بغیر اپنے تربیتی پروگرام میں حصہ لیتا ساتھ میں شیمپو کا خرچہ بھی نہیں ۔تھا لیکن پاکستان آ کر یہی سلسلہ پھر شروع رہا

میں جب بھی کسی انگلش فلم میں ہیرو یا ولن کو " شینگری سرے "دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر رشک آتا ہے کیونکہ نہ تو انہیں " لوگ کیا کہیں گے " کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ انہیں کوئی لڑکی لفٹ نہیں کروائیگی ۔ ایسے میں نے اپنی لالی ووڈ یا بالی ووڈ کے فلموں میں بہت کم کردار ایسے دیکھے ہیں کہ کوئی ہیرو یا ولن گنجا ہو شائد ۔ان لوگوں کو بھی " لوگ کیا کہیں گے "کا ڈر ہوتا ہے

الیکٹرانک میڈیا میں ہونے کی وجہ سے ہم صحافیوں کی سب سے زیادہ توجہ کام کے ساتھ لک " پر بھی ہوتی ہیں اور ہمارے کچھ دوستوں کے بقول " آخر لوگ تو ہمارا چہرہ ہی " تو دیکھتے ہیں" اسی ڈر کی وجہ سے میں بالوں کو فارغ کرنے سے محروم رہا کہ لوگ کیا کہیں گے ۔ کچھ عرصہ قبل تھائی لینڈ میں کی جانیوالی

خاتون ہیر ڈریسر کی "مشین سے کٹنگ" کی کہ چلو جب تک سکرین پر نہیں آتے اس وقت تک بال نئے آ جائینگے لیکن دوسرے دن سکرین پر آنا پڑا ارو پھر کچھ دوستوں نے مشین سے کٹے بالوں کو دیکھ کر کہا اوے تم عمرہ کرنے گئے تھے "اور میں نے جلدی سے ہاں میں سرہلا دیا کہ آخر لوگوں کو میرے بالوں سے کیا مقصد ہے۔اور دل میں گنجا ہونے کی خواہش پھر بھی رہی۔

ہر سال مارچ میں جب لوگ اپنے بچوں کو گنجا کرتے ہیں تو اس بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے نہ صرف بال مضبوط ہوتے ہیں بلکہ نظر بھی تیز ہوتی ہیں ان باتوں کی حقیقت جاننے کیلئے میں گنجا ہونا چاہتا ہوں لیکن پھر یہی سوچ کہ "لوگ کیا کہیں گے" اور میں کچھ نہیں کرپاتا۔ اپنی خواہش کو ختم کرنے کیلئے کچھ عرصہ قبل میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو گنجا کردیا لیکن پھر بیگم نے گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے آڑے ہاتھ لیا کہ بچے کو کیوں گنجا کردیا اپنی خواہشات بچوں پر مسلط مت کرو اور میں شرمندگی سے کچھ نہیں کہ پایا کہ میں تو اپنی خواہش کے ساتھ ساتھ اپنے بچے کے بال بھی مضبوط اور نظریں بھی تیز کرنا چاہتا تھا لیکن وہ دن اور آج کا دن ابھی بیگم مجھے اپنے بیٹوں کے بال ٹھیک کرنے کیلئے ہیر ڈریسر کے پاس نہیں بھجواتی کہ " کہیں یہ اپنی ناآسودہ خواہش " شینگری سرے" بننے کا خواب اپنے بچوں پر پورا نہ کریں۔ اور یہاں بھی میرے دل کی خواہش میرے دل میں ہی رہتی ہیں۔

لوگ کیا کہیں گے ایسا جملہ ہے جس کیلئے میں نے کئی مرتبہ دوستوں کیساتھ شرط بھی لگائی کہ اگر تم کہو تو میں گنجا ہوتا ہوں لیکن اس میں تمھیں کچھ " شرط " لگانی پڑیگی لیکن میرے ساتھی بھی شائد مجھے سمجھتے ہیں اسی لئے وہ گنجا ہونے کی شرط میرے ساتھ نہیں لگاتے - میرے ذہن میں تھا کہ اگر کوئی دوست شرط لگاتا ہے اور میں نتیجے میں شینگری سرے بن جاتا ہوں تو پھر لوگوں کو یہی کہہ سکوں گا کہ میں نے شرط لگائی تھی اور گنجا ہوگیا لیکن وائے رے قسمت-

مریض، پرائیویٹ ہسپتال اور ٹیلی میڈیسن

"ابئ تہ لامڑہ نہ ئے" یہ مکالمہ ہے ایک ہسپتال میں داخل ہونیوالے مریض سے ڈاکٹر کے دروازے پر تعینات اہلکار کا، اور ہسپتال بھی ایسی جماعت کے زیر انتظام جو ملک بھر میں اسلام اور غریبوں کی حقوق کے دعویدار ہیں۔ تبدیلی لانے کی بات کرتے ہیں اور صوبہ خیبر پختونخوامیں "تبدیلی والی سرکار کیساتھ اتحادی بھی ہیں" ان الفاظ کا اردو میں ترجمہ کچھ یوں ہے کہ "اماں جی تم ابھی تک مری نہیں" اور وہ بزرگ خاتون اس داڑھی والے شخص کو دیکھ رہی تھی جو اسے پشتو زبان میں یہ بتا رہا تھا۔ راقم اپنے ایک دوست کیساتھ چیک اپ کیلئے گیا تھا اور اس دوران بزرگ خاتون وہاں پر آئی اور جنرل او پی ڈی میں داخل ہونے لگی تو دروازے پر تعینات اہلکار نے متعلقہ خاتون کو یہ بات کی، خاتون نے اسے کہا کہ میری طبعیت اب بھی ٹھیک نہیں ہو رہی، اس لئے آئی ہوں، تو اس اہلکار نے یہ کہتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دیدی کہ " مر جاؤ تو اچھا ہے کیونکہ تم تو ایک وقت کی بہت زیادہ روٹیاں کھاتی ہو" ۔ جس کے بعد خاتون بزرگ تو جنرل او پی ڈی میں چلی گئی اور وہ اہلکار ایک دوسرے ساتھی کو آنکھ مارتے ہوئے کہنے لگا کہ "میری ان سے گپ شپ ہے" ۔ کیا یہی شخص اپنی والدہ کو بھی یہی الفاظ کہہ سکتا ہے، کیونکہ خاتون اس کی والدہ کی ہم عمر تھی۔

اسی ہسپتال میں کچھ دیر بعد ایک میڈیسن کمپنی کا اہلکار داخل ہوا تو اسے ایک ہی اہلکار نے روک لیا جس پر میڈیکل ریپ نے اپنا بیگ کھولا اور پانچ چھ ڈبے میڈیسن کے نکال کر اسے دیئے تو پھر اسی اہلکار نے میڈیکل ریپ کو جنرل او پی ڈی میں جانے کی اجازت - دیدی- حالانکہ اس وقت مریضوں کا رش بڑا تھا

راقم نے اپنے ساتھی جو کہ صحافی تھا کو بتایا کہ کاش ایسا کیمرہ ہوتا کہ اس کو ریکارڈ کرتے تو پھر مزہ آتا، کہ یہ پشاور شہر میں وہ ہسپتال ہے جسے کسی زمانے میں افغانستان میں زخمی ہونیوالے لوگوں کیلئے بنایا گیا تھا سعودی اور کویت کی فنڈنگ سے بننے والے اس ہسپتال میں ان لوگوں کا علاج مفت ہوتا تھا جو کہ ایک مخصوص جماعت کے کہنے پر افغانستان میں جہاد کرنے جاتے تھے افغانستان جہاد میں ٹینکوں سے سکریپ بنا کر کباڑ میں فروخت کرنے والے اسی پارٹی کے کچھ لوگوں نے حالات بہتر ہونے کے بعد یہ ہسپتال اپنے پارٹی کے نام کردیا اور " خدمت" کا دعوی کرتے ہوئے "دکانداری" شروع کردی ان کی یہ خدمت ابھی بھی جاری ہے- راقم کے صحافی دوست نے افسوس کا اظہار کیا اسی دوران ہمارے ساتھ انتظار گاہ کی کرسی پر ایک بوڑھا شخص جو بہت پہلے سے بیٹھا ہوا تھا، نے ہ جنرل او پی ڈی پر تعینات ایک اہلکار کو بلایا اور کہا کہ بیٹا میرے معدے کا مسئلہ ٹھیک نہیں ہوا، اور مجھے جلدی فارغ کردو، وہ ٹیکنیشن

بزرگ بابا کو یہ کہنے لگا کہ میں نے کہا تھا کہ آٹھ بجے آجاؤ لیکن تم ابھی آئے ہو، ابھی انتظار کرو، تو بابا نے جواب دیا کہ اور انتظار نہیں کر سکتا کیونکہ معدے میں کافی تکلیف ہے، تو ٹیکنیشن مسکراتے ہوئے پشتو زبان میں کہنے لگا" بابا مزے لو، دیکھ لو کتنی خوبصورت لڑکیاں آئی ہیں انہیں دیکھ کر گزارا کرو" یہ الفاظ کہہ کر وہ وہاں سے جانے لگا-اور راقم دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی اپنی بہن، ماں، بیٹی اسی طرح ہسپتال "میں مجبوری کی وجہ سے آئی ہوتی تو کیا وہ ایسے الفاظ کہہ سکتا تھا

اسی ہسپتال میں راقم خون کے ٹیسٹ کیلئے گیا لیبارٹری میں تعینات افراد نے خود ہی خون لیا لیکن جب کاغذ دینے لگے تو اسے پر جنس کی جگہ " فیمیل " لکھا ہوا تھا حالانکہ لیبارٹری میں تعینات اہلکاروں نے کھلی آنکھوں سے خون لیا تھا اور دیکھا تھا کہ راقم کوئی خاتون نہیں بلکہ مرد ہے، لیکن کاغذ میں فیمیل لکھ دیا، جسے بعد میں ایک بہت کاٹ دیا تاکہ " fe " بڑے ہسپتال میں دکھانے کیلئے راقم نے بال پوائنٹ سے شرمندگی نہ ہو-یہ واقعات ایک پرائیویٹ ہسپتال کے ہیں اور ہسپتال بھی ان لوگوں کا جن کے لیڈروں کے "اسلام" " عوامی خدمت" اور "برابری" لانے کے نعرے ہوتے ہیں لیکن اپنے ادارے میں ان کا یہ حال ہے، حالانکہ راقم نے اس بارے میں ایک ایس ایم ایس پیغام بھی اسی پارٹی کے متعدد افراد کو بھیجا لیکن مجال ہے کہ کسی نے اس بارے میں رابطہ کرنے

۔ یا پھر غلطی کو دیکھنے کیلئے رحمت بھی کی ہو

ان حالات میں ہمارے صوبے کے وزیر اعلی " پی کے " نے دعوی کیا کہ صوبے میں " ٹیلی میڈیسن" کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے اور مریض فون پر ڈاکٹروں سے مرض کی معلومات اور ادویات لے کر علاج کر سکیں گے۔ منصوبہ تو اچھا ہے لیکن ایسے صوبے میں جہاں پر پرائیویٹ ہسپتالوں کا حال یہ ہو ، اور ایسے ہسپتال جو " تبدیلی والی سرکار" کے اتحادی بھی ہوں ، ساتھ میں سرکاری ہسپتالوں میں تعینات ڈاکٹر ہسپتال آنیوالے مریضوں کو پرائیویٹ کلینکوں کی راہ دکھاتے ہوں ،کاغذات میں دکھانے کیلئے مفت ادویات ہوں اور جعلی ڈاکٹر بن کر عوام کو لوٹتے ہوں ایسے میں ٹیلی میڈیسن منصوبے سے عوام کو فائدہ ہونے سے رہا لیکن ہاں " پی کے " کے پارٹی کے کچھ کارکن اور ڈاکٹر ہسپتالوں میں بیٹھ کر فون پر گپ شپ بھی کر سکیں گے اور اگر غلطی سے کسی نے علاج کیلئے فون کر بھی دیا تو پھر ایسی ادویات بھی تجویز کر سکیں گے جن سے انہیں زیادہ اور مریض کو کم فائدہ ہو ، احتساب کے دعوے کرنے والے " پی کے " اور تبدیلی والی سرکار یہ بھی ذہن میں رکھ لے کہ موجودہ حالت میں تو شہری کبھار کبھار ڈاکٹر کے کسی غلط اقدام پر اسے عدالت لے جا سکتے ہیں لیکن اگر فون پر غلط میڈیسن ملنے سے کسی کو کچھ ہو تو پھر عوام کس کو " عدالتوں میں " لائیں گے ۔

تبدیلی والی سرکار یا بیروزگاری والی سرکار

بازار میں ہلچل مچ گئی تھی ، ہتھ ریڑھی والے ایک سائیڈ پر بھاگ رہے تھے جبکہ زمین پر بیٹھ کر سبزی فروخت کرنے والے الگ بھاگنے کی کوششوں میں مصروف تھے ، اس بھاگ دوڑ میں سفید ریش بھی شامل تھے جو چھابڑی سر پر اٹھا کر محفوظ مقام تلاش کررہے تھے اور ایسے بچے بھی شامل تھے جن کی عمریں بہ مشکل دس سے چودہ سال کے مابین ہونگی جو مختلف اشیاء کو لیکر پولیس والوں کے ڈر اور ان سے جان بچانے کیلئے کونوں کھدروں کی جانب بھاگ رہے تھے۔

یہ منظر پشاور کے معروف بازار ہشتنگری کا ہے اور یہ خیبر پختونخوا میں تبدیلی آنے کے بعد کا واقعہ ہے میں ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد اپنے دوست کیساتھ بیٹھ کر قہوہ پی رہا تھا کہ یکدم جیسے بازار میں طوفان آگیا اور ہر کوئی بھاگ دوڑ کررہا تھا قہوے کی آخری پیالی کو ختم کرنے کے چکر میں بیٹھا ہوا تھا اسی دوران ایک ٹریفک اہلکار جو ہاتھ میں کلاشنکوف اٹھائے چل رہا تھا اور تکبر سے اس کی آنکھیں سر پر چڑھی ہوئی تھی بپھرے سانڈ کی طرح آیا اور سڑک کنارے کھڑے ہتھ ریڑھیوں کے مالکان کو لات مارتا ان کے سامان گراتا اور آگے چل پڑتا یہی عمل اس نے دو تین افراد کیساتھ کیا ہتھ ریڑھی والے سامان چھوڑ

کر بھاگے تاکہ دوسری لات سے بچ نکلے اسی معمولی کانسٹیبل جو اسی عوام کے ٹیکسوں سے حاصل ہونیوالی رقم سے تنخواہ وصول کررہا تھا نے ایک اور بوڑھے کو لات مار دی۔
میں نے جلدی سے کیمرہ اٹھایا کہ چلو فوٹیج مل جائیگی لیکن پولیس اہلکار کی خوش قسمتی کہ وہ گالیاں دیتے ہوئے وہاں سے نکل گیا اور میری سستی کی وجہ سے مجھ سے اچھی ویڈیو رہ گئی البتہ زمین پر پڑے ٹماٹر اور سبزی کو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔جس کے بعد ہتھ ریڑھی والے اپنا سامان اٹھانے آئے ساتھ میں عمران خان اور اس کی تبدیلی کو وہ باتیں اور صلواتیں سنا رہے تھے جو کہ لکھنے کے قابل بھی نہیں۔
میرا دوست مجھے کہہ رہا تھا کہ یہ ہتھ ریڑھی والے بھی زیادتی کرتے ہیں کہ سڑک کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں اگر سڑک بند نہ کریں تو پولیس ان پر تشدد بھی نہ کریں، جبکہ میں اس کو سمجھا رہا تھا کہ یہ تو تعلیم سے بے بہرہ ہیں لیکن اگر ایک زیادتی کے بعد پولیس بھی اسی طرح کا رویہ اپنائے تو پھر ان میں اور عام لوگوں میں کیا فرق رہ جائیگا۔ ہاں اگر ان لوگوں کو روزگار کیلئے جگہ دی جائے تو کیا یہ لوگ ایسا کرینگے۔ جس کا جواب میرے ساتھی کے پاس نہیں تھا۔
ہتھ ریڑھیوں پر سبزی فروخت کرنے والوں کے بقول یہ منظر ایک دن کا نہیں بلکہ

انہیں روزانہ اس طرح کی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے سبزی بیچنے والے اسلام گل عرف سلامے کے مطابق وہ گذشتہ بیس سالوں سے اسی جگہ پر سبزی فروخت کر رہا ہے اور شام تک اس کے پانچ سو سے آٹھ سو روپے تک مزدوری ہو جاتی ہے جس میں ان کے بچوں اور گھر کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بقول اس کے تین بچے ہیں جنہیں وہ ایک سرکاری سکول میں پڑھا رہا ہے لیکن ان حالات میں وہ کیسے اپنے بچوں کو تعلیم دلائے عمران خان دعوے تو بہت کرتا ہے کہ بچوں کو سکول بھیجو لیکن جب میرا روزگار نہیں ہوگا، پیٹ خالی ہو تو نماز بھی نہیں ہوتی انہیں تعلیم کی پڑی ہوئی ہے اب مجبورا مجھے اپنے دو بچوں کو کہیں مستری کے پاس بٹھانا پڑے گا کیونکہ شام کو دو تین سو روپے روپے تو بچے لے آئینگے اور گھر کا خرچہ تو چلے گا۔بقول سبزی فروش کے عمران خان کی باتیں "بھرے پیٹ" کی باتیں ہیں۔

اسی ہشتنگری پھاٹک میں چھابڑی فروش خان محمد کے بقول عمران خان کو تو پتہ ہی نہیں کہ غربت کیا ہے ان کی تبدیلی یہی ہے کہ غربت کے بجائے غریبوں کو ختم کریں جس لیڈر کو دال سبزی کی قیمت اور غریب کی مشکل کا اندازہ نہیں اسے تبدیلی کے نام پر ہم پر مسلط کیا گیا۔پولیس کی لات کھانے والے خان محمد کے مطابق اس میں غلطی بھی ہماری ہی ہے کہ ہم "میراثیوں" کی طرح " تبدیلی تبدیلی" کے نعرے لگاتے رہے اوراب اسی تبدیلی کا نشانہ ہم بن رہے ہیں۔بقول

خان محمد کے اس سے قبل " خپلہ خاوّرہ خپلہ اختیار" کے نعرے لگانے والوں کے دور میں دھماکوں کا ڈر ہوتا تھا لیکن موت تو ایک دن تھی کہ جان ہی ایک مرتبہ زندگی کے عذاب سے چھوٹ جاتی لیکن اس" تبدیلی" والی حکومت میں تو روزانہ مرتے ہیں عزت نفس ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے کوئی بھی بیلٹ والا آکر سامان زمین پر گرا دیتا ہے ہم ان کی نظروں میں کتوں سے بھی بدتر ہیں-

ہشتنگری پھاٹک میں اس وقت تین سو سے زائد پاس ہولڈرز ہیں جن سے میونسپل کارپوریشن کے اہلکار بھی بھتے کی صورت میں سبزی اٹھا کر لے جاتے ہیں-روزانہ کی بنیاد پر سڑک کنارے مزدوری کرنے والے ان افراد کی زندگی کی گذر بسر اسی کے ذریعے ہوتی ہے لیکن خان کی تبدیلی کے بعد اس بازار میں روزگار کرنے والے بیشتر افراد کو تجاوزات کی بنیاد پر بیروزگار کردیا گیا فقیر آباد پل کے نیچے ان چھابڑی فروشوں سے خالی ہونیوالی زمین پر دنیا جہان کی غلاظت لوگ آکر رکھ جاتے ہیں جبکہ ہیرونچیوں نے یہاں پر ڈیرا ڈال رکھا ہے، جو روزانہ یہاں پر بیٹھ کر نشے کی لعنت بھی پورا کرتے ہیں جنہیں یہ نشہ بھی مخصوص لوگ ہی گاڑیوں میں فراہم کرتے ہیں لیکن یہاں پر تعینات پولیس اہلکاروں کو یہ نظر نہیں آتا کیونکہ ایک طرف موت کا ڈر اور دوسری طرف کرارے نوٹوں کا زور، تو انہیں فقیر آباد ہشتنگری پل کے نیچے ہونیوالا مکروہ کاروبار اور انہیں پینے والے نظر نہیں آتے البتہ بچوں کیلئے حلال رزق کمانے والے مزدور چھابڑی

فروش انہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ جن کیساتھ ان کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی اپنی کھیت میں پکڑے جانیوالے پرائے گدھے کا کرتے ہیں۔

کیا سڑک کنارے سبزیاں بیچنے والے ان افراد کا روزگار اس حلقے سے منتخب ہونیوالے ممبر اسمبلی و صوبائی وزیر کو نظر نہیں آتا، یا پھر گنڑ منڈی میں بننے والے نئے اتوار بازار جس میں تبدیلی کے سپورٹروں کو روزگار کرنے کے موقع دینے کیلئے ان غریب لوگوں کو بیروزگار کیا جارہا ہے یا پھر ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ یہ لوگ اسلحہ لیکر نکل آئے یا پھر ڈاکہ ڈالیں کیونکہ اگر کسی کو روزگار کا موقع میسر نہیں، یا روزگار کرنے نہیں دیا جاتا تو اپنے ساتھ ہونیوالی ناانصافی پر مجبوراً وہ اسلحہ اٹھا کر لوگوں کو لوٹے۔

سبزی فروخت کرنے والے ان افراد کیلئے پشاور میں کوئی جگہ ہی نہیں جہاں پر کھڑے ہو کر یہ لوگ اپنا روزگار کرسکیں یہ لوٹ بھی ٹیکس دینا چاہتے ہیں اور اپنے مطالبات کے حل کیلئے کئی مرتبہ " تبدیلی والے خان" کے پاس " بنی گالہ " کا طواف بھی کرچکے ہیں جہاں پر انہیں " تبدیلی کی نوید" سنا کر ٹرخا دیا گیا اور یہ لوگ "خان" کے لارا لپہ سن کر واپس آگئے ہیں اور اب اس حلقے سے منتخب ہونیوالے " تبدیلی والی سرکار" سابقہ دور حکومت کی "ایزی لوڈ سرکار" کی طرح انہیں دلاسوں سے خوار کررہے ہیں۔

کیا یہی تبدیلی ہے، دوسروں پر الزامات لگانے والے اگر پہلے اپنے دامن پر لگے داغ صاف کرے تو بہتر ہوگا غریب آدمی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان پر مسلط کیا جانیوالا " تبدیلی" یا " لنڈی لوڈ سرکار" ہے انہیں اس بات سے غرض ہے کہ ان کی دال روٹی کا سلسلہ چل رہا ہے اور اس میں انہیں مشکلات درپیش نہیں، ہاں اگر ایسی صورتحال رہی تو یقیناً دھاندلی کا رونا رونے والے "خان اور اس کے ارد گرد جمع ہونیوالے خانوں"کا حال بھی ان سے بھی بدتر ہوگا جو کسی زمانے میں ظالموں قاضی آرہا ہے یا پھر لنڈی لوڈ سرکار جیسا، جنہیں اس صوبے کے عوام نے ایسا مسترد کردیا کہ آج صرف اخبارات میں چھپنے والی تصاویر پر سیاست کی دنیا میں زندہ ہیں-

غریب حکومت کے مالدار حکمران

ضیاء الحق کی اسلامائزیشن سے اور بے نظیر بھٹو کی روٹی کپڑا اور مکان کے بعد نواز شریف کے نواز شریف آئیگا روزگار لائیگا جیسے نعروں سے لیکر پرویز مشرف کے سب سے پہلے پاکستان اور متحدہ مجلس عمل جسے ملا ملٹری الائنس بھی کہا گیا کے اسلام کے دعووں اور صوبائی خودمختاری کے دعوے کرنے والے افراد کے بعد اب ہم پر تبدیلی والی سرکار مسلط ہے -گذشتہ چالیس سال میں نہ تو ہم نے اس ملک میں اسلام دیکھا ، نہ ہی روٹی کپڑا اور مکان ، کیونکہ جس کے پاس روٹی ہے اس کے کپڑے نہیں اور جس کے پاس کپڑے ہیں تو مکان نہیں اور جن کے پاس یہ تینوں ہیں انہیں عام آدمی سے کوئی سروکار نہیں- جبکہ اب تو تبدیلی بھی آگئی ہے ایسی تبدیلی کہ اب ہمارے شہر میں ہیروئنچی کھلے عام جی ٹی روڈ پر کے پی حکومت کی جانب سے بنائے گئے فلائی اوورز کے نیچے منشیات استعمال کرتے نظر آتے ہیں- اسے بھائی چارہ کہا جائے یا اخوت کا مظاہرہ لیکن یہ تبدیلی پشاور میں ہر کسی کو نظر آتی ہے-- ان چالیس سالوں میں عام شہری جس طرح روٹی ، کپڑے ، مکان ، روزگار ، خودمختاری اور اسلام کے پیچھے بھاگتے رہے انہیں کچھ نہیں ملا - اوراب جس طرح یہ ناچ ناچ کے تبدیلی لانے کے خواہشمند ہیں انشاء اللہ چالیس سال اور بھی گزر

جائینگے لیکن ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں آیگا اور پشتو مثل کے مصداق " لالے مے سوداگر
-دے ، تش زئی اور رازئی، " والا کام ہوتا رہیگا

لیکن ہاں ایک تبدیلی جو ضیاء کے دور سے شروع ہوئی اور ابھی تک دیکھنے میں آرہی ہے وہ یہی ہے کہ کروڑوں روپے کی جائیدادیں رکھنے والے اربوں کے مالک بن گئے اور اس کار خیر میں سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ملا نے اگر ڈیزل کے پرمٹ لیکر اسلام کا سودا کیا، تو صوبائی خود مختاری کے دعویدار بھی تیل کے کارخانوں کے مالک بن گئے۔ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کے دعویدار جو کسی زمانے میں ظالمو قاضی آرہا ہے جیسے نعرے لگاتے تھے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے گریز نہیں کررہے۔ بس ہمت کی بات ہے جو جتنا لے سکتا ہے لے رہا ہے۔ یہی صورتحال اب تبدیلی والی صورتحال کی بھی دیکھنے میں آرہی ہے۔ جن کے اثاثوں میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کاروبار کیا ہے اور یہ کیسے قارون کے خزانے پر بیٹھے ہیں کہ ایک سال میں کروڑوں روپے کما لیتے ہیں۔حالانکہ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بطور وزیر تنخواہ نہ لینے کا اعلان کرتے رہے ہیں لیکن پھر بھی سرکار کے خزانے سے اور غریب عوام کے جیبوں سے بہت کچھ نکال چکے ہیں۔ تبدیلی والی سرکار کے کچھ عہدیداروں کے سال 2013 ء سال 2014 ء میں الیکشن کمیشن میں جمع کرائے گئے گوشواروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کروڑوں روپے ان کی جائیدادوں میں اضافہ

ہوا ہے۔ جبکہ بعض اسلامی بھائی چارے کا دعوی کرنے والے وزیروں کی زمینوں کی قیمتیں گر گئیں یعنی اپنے آپ کو خسارے میں ظاہر کیا ہے۔ ان میں بہت سارے اسلامی شریعت کے دعویدار بھی شامل ہیں ۔

عوامی نمائندگی کا نعرہ لگانے والے صوبائی اسمبلی کے حلقہ پی کے 3 سے منتخب ہونیوالے جاوید نسیم نے ایک سال میں پینتیس لاکھ کا گھر حاصل کیا۔ صوبائی اسمبلی کے حلقہ پی کے تھری سے منتخب ہونیوالے ممبر صوبائی اسمبلی جاوید نسیم نے سال 2013 ء میں الیکشن کمیشن کو دیئے گئے اثاثوں میں اپنے گھر کو ظاہر نہیں کیا تھا جبکہ سال 2014 ء میں انہوں نے پینتیس لاکھ روپے کا گھر اپنے اثاثوں میں ظاہر کیا تاہم اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی کہ یہ پینتیس لاکھ روپے کہاں سے آئے اور کس طرح انہوں نے گھر خریدا۔ اسی طرح سال 2013 میں ان کے پاس گاڑی نہیں تھی اور الیکشن کمیشن کو دیئے گئے گوشواروں میں جاوید نسیم نے nil لکھا تھا تاہم سال 2014 ء میں انہوں نے ٹویوٹا کرولا 2009 ء کو اپنی گاڑی ظاہر کیا جسے بقول جاوید نسیم کے انہوں نے پرائیویٹ کمپنی سے حاصل کیا تاہم اس گاڑی کی قیمت ظاہر نہیں کی گئی۔ جاوید نسیم کی بیگم کے پاس سال 2013 ء میں پچیس تولہ سونا تھا جو کہ سال 2014 ء میں کم ہو کر بیس تولے رہ گیا۔ سال 2013 ء میں جاوید نسیم نے ذاتی رقم الیکشن کمیشن کے گوشواروں میں بیالیس ہزار روپے ظاہر کی تھی جو کہ سال 2014 ء کے گوشواروں میں نہیں

رہی۔ ممبر صوبائی اسمبلی کے گھر کے فرنیچر کی قیمت بھی گر گئی سال 2013 ء میں ان کے گھر میں رکھے گئے فرنیچر کی قیمت ایک لاکھ ستر ہزار روپے تھی جس کی مالیت کم ہو گئی اور سال 2014 ء میں ڈیڑھ لاکھ روپے تک رہ گئی۔

تبدیلی کے نام پر صوبے میں حکومت کرنیوالی پی ٹی آئی کے وزیر معدنیات نے ایک سال میں ستاون لاکھ روپے کے پرائز بانڈ حاصل کئے خیبر پختونخواہ اسمبلی کے حلقہ پی کے ون سے منتخب ہونیوالے پی ٹی آئی کے ضیاء اللہ آفریدی جو کہ اس وقت صوبائی کابینہ میں وزیر معدنیات ہیں نے الیکشن کمیشن میں سال 2013 ء میں جمع کئے گئے کاغذات میں کسی قسم کی پرائز بانڈ ظاہر نہیں کئے تاہم سال 2014 ء میں ستاون لاکھ کے پرائز بانڈ ظاہر کئے گئے سال 2013 ء میں ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکیٹ جو کہ الیکشن کمیشن کو جمع کرائے تھے کی مالیت 4000000 تھی جسے 2014 ء میں ظاہر نہیں کیا گیا۔ سال 2013 ء میں کیش اینڈ ہینڈ میں 14463138 روپے تھی جو کہ سال 2014 ء میں بڑھ گئی اور الیکشن کمیشن کو جمع کئے گئے اثاثوں کی مالیت میں یہ 15148783 روپے تک پہنچ گئی ضیاء اللہ آفریدی نے سال 2013 ء میں بینک میں کوئی کیش نہیں دکھائی گئی تاہم سال 2014ء کے ریکارڈ میں انہوں نے بینک میں 79354 روپے بینک میں ظاہر کئے۔ صوبائی وزیر معدنیات کے سال 2013 ء کے ریکارڈ کے مطابق دیگر اثاثہ جات کی مالیت 35014403 روپے تھی جو کہ سال 2014 ء میں بڑھ کر 37478137 تک پہنچ

گئی یعنی ایک سال میں صوبائی وزیر معدنیات خیبر پختونخواہ نے 2463734 روپے
-دیگر اثاثہ جات کی مد میں بھی کمائے

خیبر پختونخواہ کے وزیراعلی کے اثاثوں میں گذشتہ ایک سال میں اضافہ ہوا-صوبائی اسمبلی کے حلقہ پی کے تیرہ سے پاکستان تحریک انصاف کے منتخب ہونیوالے ممبر اور وزیراعلی خیبر پختونخواہ نے گذشتہ ایک سال میں اپنے اثاثوں میں اضافہ کیا ہے- سال 2013 ء میں جمع کئے گئے الیکشن کمیشن کے گوشواروں کے مطابق ان کے اثاثوں کی مالیت 221240780 تھی جو کہ سال 2014 ء میں 257261689 تک پہنچی پرویز خٹک کے پاس ذاتی نقدی سال 2013 ء میں 3137341 تھی جبکہ سال 2014 ء میں کم ہو کر2442360 تک رہ گئی اسی طرح بینک میں سال 2013 ء میں 147883 رقم تھی جو کہ سال 2014 ء میں بڑھ کر 9528597 تک پہنچ گئی وزیراعلی پرویز خٹک کے راولپنڈی کے شیرپاؤ کالونی میں پلاٹ نمبر 28 جو کہ زیر تعمیر تھی کی سال 2013 ء میں مالیت 120300000 تھی جس میں ان کا شیئر 37.5 فیصد تھا جس کی سال 2014ء میں قیمت 146004650 تک پہنچ گئی سوات میں پرویز خٹک کی زمین کی مالیت سال 2013 ء میں 1815000 تھی جس میں 2014 ء میں اضافہ ہوا اور اس زمین کی قیمت 1996500 تک پہنچ گئی لاہور میں بدین روڈ پر واقع پرویز خٹک کی اہلیہ کے نام سال 2013 ء میں پلاٹ کی قیمت 7000000 تھی جس میں سال 2014 ء میں اضافہ ہوااور پرویز خٹک کی اہلیہ کی -پلاٹ کی قیمت 7700000 تک پہنچ گئی

بطور وزیر تنخواہ نہ لینے کا اعلان کرنے والے شوکت یوسفزئی سال 2013 ء میں 62 ہزار روپے بطور وزیر صحت لیتے رہے ہیں ۔خیبر پختونخواہ اسمبلی کے حلقہ پی کے ٹو سے منتخب ہونیوالے شوکت یوسفزئی نے سال 2014 ء میں جمع کئے گئے اپنے گوشواروں میں اپنے اخبار روزنامہ سرخاب کو مکمل طور پر غائب کر دیا ہے۔جس کی مالیت سال 2013ء کے گوشواروں میں 1500000 روپے تھی اسی طرح جب وہ صوبائی وزیر صحت رہے تو سال 2013 ء میں باسٹھ ہزار روپے اعزازیہ لیتے رہے جس کا ذکر بھی سال 2013ء کے الیکشن کمیشن کو جمع کئے گئے گوشواروں میں کیا گیا۔سال 2013 ء میں شوکت یوسفزئی کے پاس 200000 روپے ذاتی تھے جس میں کمی ہوئی اور سال 2014ء میں یہ رقم 264476 تک پہنچ گئی - سال 2013 ء میں الیکشن کمیشن کو جمع کئے گئے گوشوارے میں ایک اکاؤنٹ میں 240000 روپے تھے جس کا ذکر سال 2014ء میں جمع کئے گئے گوشواروں میں بالکل نہیں۔شوکت یوسفزئی کے دوسرے اکاؤنٹ میں سال 2013 ء میں 2900 روپے تھے جو سال 2014 ء میں بڑھ کر تیس ہزار روپے تک پہنچ گئے۔وزیر صحت کے طور پر کام کرنے والے شوکت یوسفزئی کے سال 2013 ء کے گوشواروں میں فرنیچر کی قیمت نہیں تھی جو کہ سال 2014 ء میں 75000 روپے تک دکھائی گئی یعنی ایک سال میں شوکت یوسفزئی نے پچھتر ہزار روپے کا فرنیچر گھر کیلئے خریدا۔ سال 2013 ء میں جمع کئے گئے گوشواروں میں شوکت یوسفزئی نے اپنے آپ کو قرضدار ظاہر کیا جو کہ 64000 تھی جو کہ انہوں نے ایک سال میں ختم کیا اور سال 2014 ء میں ان پر کوئی قرضہ

نہیں رہا۔

یہ تبدیلی والی سرکار کے دو چار افراد ہیں۔جو اکثر میڈیا پر آ کر صوبے کے سادہ لوح عوام کو مزید بے وقوف بنانے کی کوششوں میں مصروف عمل رہتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ ڈھول کے آگے ناچنے والے یہ لوگ " صرف آوے اور جاوے" کیلئے ہی زندہ ہیں ۔ ایسے صوبے میں پر جہاں پر عام لوگ پانچ سو روپے مزدوری کیلئے بھی خوار ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ لوگ نہ تو ماضی سے سبق سیکھتے ہیں اور نہ ہی ماضی کو یاد رکھتے ہیں اور یہی وجہ بھی ہے کہ ان کا کاروبار اور بینک بیلنس بڑھ رہا ہے اور عوام تبدلی کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ جس پر کسی کو کوئی پابندی نہیں۔ جبکہ حقیقت میں یہی اور اس طرح کے بہت سارے لوگ اپنے اثاثے بڑھا کر تبدیلی لا رہے ہیں۔

بھولی بھالی ماڈل اور اس کی اپروچ

ماڈل ایان علی کی گرفتاری سے قبل راقم کو جسم کو لچکا کر اور مٹکا کر چلنے والی ان ماڈلز کی زندگی پر ترس آتا تھا کہ یہ کس طرح اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں نیم برہنہ انداز میں آتے جاتے ہیں اور انکی زندگی بھی کوئی زندگی ہے دوسروں کے سامنے اپنے جسم اور حسن کی نمائش کرکے روزی روٹی کمانے والے یہ لوگ انتہائی گھٹیا لگتے ہیں شائد راقم اتنا ماڈرن نہیں یا پھر چونکہ پینڈو ہے اس لئے راقم کے خیالات دقیانوسی قسم کے ہیں - ایان علی کی گرفتاری سے قبل راقم کا خیال تھا کہ ان ماڈلز کی زندگی مشکل سے گزرتی ہوگی اور قابل رحم ہوگی ساتھ میں ان کا کوئی پوچھتا بھی نہیں ہوگا۔
لیکن ایان علی کی گرفتاری کے بعد پتہ چلا کہ یہ تو بہت پہنچ والے لوگ ہیں اور جن لوگوں کو ہم لچکا کر اور مٹکا کر چلنے والیاں کہتے ہیں ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہوتی ہے اتنی کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔جس کی تصدیق سابق وزیر داخلہ سندھ ذوالفقار مرزا نے بھی کردی یہ الگ بات کہ بیان انہوں نے اس وقت دے دیا جب ان کے اپنے سر پر آن پڑی اس سے قبل اپنے کلاس فیلو کے بارے میں بات کرنا شائد ذوالفقار علی مرزا کے مفاد میں نہیں تھا۔

ذوالفقار مرزا کے ایان علی کے بھابھی بننے اور سابق صدر زرداری کیساتھ تعلق اور بلاول کے اس معاملے پر اختلافات کی خبروں میں صداقت کتنی ہے اس کا اندازہ عام قاری خود بھی کر سکتا ہے کہ اب تک پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے عام قاری کی آنکھیں ، دماغ اور ذہن بہت زیادہ روشن کر دیئے ہیں - سابق گورنر پنجاب اور پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری کے دست راست لطیف کھوسہ ایان علی کے وکیل بن کر عدالت پہنچ گئے اور جو دلائل انہوں نے دیئے ہم ان کی روشن خیالی ، وکالت اور قابلیت کے زیادہ معترف ہو گئے -

ایان علی کے وکیل نے عدالت میں اپنی موکلہ کے حق میں بیان دیا کہ ان کی موکلہ ایک شو کیلئے ساڑھے پانچ لاکھ ڈالر معاوضہ لیتی ہیں اور اسے سکینڈلائز کیا جا رہا ہے - تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے لیکن تفتیش کاروں کو یہ بھی معلومات اگر دی جائیں کہ یہ کونسے شوز ہیں جس کی پیمنٹ ایان علی کو لاکھوں ڈالر میں ہوتی تھی اور ایسا کونسا سخی ارسلا خان ہے جو ڈالروں میں لچک ، مٹک کر چلنے والیوں کو ادائیگی کرتا ہے- ویسے ایان علی میں کونسی ایسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر اسے ساڑھے پانچ لاکھ ڈالر معاوضہ ایک شو کا ملتا ہے - جبکہ جو لوگ اسے ادائیگی کرتے ہیں ان کا کاروبار کیا ہے اور وہ کتنا ٹیکس ادا کرتے ہیں اسی کے ساتھ لاکھوں ڈالر معاوضہ لینے والی ایان علی

ہے ٹیکس کے گوشوارے بھی دیکھے جائیں کہ اس نے اب تک کتنا ٹیکس جمع کروایا ہے -
میٹرک میں اوسط درجے کی طالبہ ایان علی اتنی معصوم بھی نہیں کیونکہ اب تک جتنی
مرتبہ وہ پیشیاں بھگتا چکی ہیں اس کے آنے اور میک اپ کے سٹائل سے پتہ چلتا ہے کہ
اسے اندازہ ہے کہ اسے کچھ ہونے والا نہیں ، اور منی لانڈرنگ کرانے والے اسے بچا
لیں گے- عدالت میں پیشی کے موقع پر ایان علی کے وکیل کا موقف سامنے آیا کہ
موصوفہ نے پلاٹ بیچا تھا- اب کوئی یہ پوچھے کہ یہ " مخصوص" پلاٹ کہاں پر ہے اور
کیااس کی لوکیشن " کسی سنٹرل" علاقے میں ہے جو اتنا مہنگا پلاٹ اس نے بیچا تھا-
ماڈل گرل ایان علی نے اپنے پہلے بیان میں اعتراف کیا تھا کہ اس نے اپنے والدہ کا بحریہ
ٹاؤن میں واقع پلاٹ بیچا تھا اور یہ رقم اس کی تھی جبکہ دوسری مرتبہ بیان تبدیل کرتے
ہوئے کہا کہ اس کا دبئی میں ریسٹورنٹ ہے جبکہ اس کی والدہ سی فوڈ اور کیٹرنگ کا
کاروبار کرتی ہیں -یہ وہ تین ابتدائی بیانات ہیں جو خبارات کی زینت بنے -پیپلز پارٹی کے
رہنما اور سابق وزیر داخلہ رحمان ملک کے بھائی خالد ملک کے حوالے سے بھی بڑی
خبریں آئی لیکن پھر خاموشی چھا گئی- شائد !
تفتیش کاروں کو ایان علی کے 41 بیرون ملک دوروں کا ریکارڈ بھی مل گیا ہے جو

اس نے کراچی سے دوبئ تکٹ کئے اور پہلی مرتبہ ایان علی کراچی کے بجائے اسلام آباد سے دوبئ جارہی تھی کیونکہ کچھ کسٹم افسران کو کراچی سے تبدیل کیا گیا تھا اسی باعث -ایان اسلام آباد ائیرپورٹ پر دھر لی گئ

ایان علی کی وکالت کرتے ہوئے ان کے وکیل کا موقف تھا کہ اس کی موکلہ کو پتہ نہیں تھا کہ پانچ لاکھ ڈالر لیکر بیرون ملک جانا جرم ہے اسی بناء پر "معصوم" موکلہ کو ضمانت دی جائے- جبکہ کسٹم کے وکیل کا موقف تھا کہ ایان علی کے بیگ سے یہ رقم برآمد ہوئی تھی اور اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا-تاہم جج نے دلائل سننے کے بعد "بھولی -بھالی" ماڈل کی درخواست ضمانت خارج کردی

جس وقت کیس کی سماعت ہورہی تھی اسی وقت راولپنڈی کے علاقہ ڈھوک کھڈا میں نامعلوم افراد نے فائرنگ کرکے کیس کے تحقیقاتی آفیسر اعجاز چوہدری کو فائرنگ کرکے شہید کردیااور آرام سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے-کیا یہ اتفاقی حادثہ تھا، سوچا سمجھا منصوبہ یا پھر معمول کا واقعہ- جس میں ایک اعلی سرکاری اہلکار کو بغیر کسی وجہ کے فائرنگ کا نشانہ بنا کر شہید کردیا گیا-کیا یہ انصاف کا خون نہیں، اور کیا اس ملک میں ایمانداری سے ڈیوٹی کرنے والوں کا یہی حال ہوگا کیا اپنے آپ کو اسلامی فلاحی اور قانونی حکمران

کہلوانے والے حکمرانوں کے منہ پر یہ طمانچہ نہیں کہ ایک کسٹم انسپکٹر جو ڈیوٹی پر تھا اسے شہید کردیا گیا۔
دوسری طرف جیل میں عام قیدیوں سے بہتر زندگی گزارنے والی ایان علی نے جیل مینو کے مطابق کھانے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ قیدی نہیں ، ماڈل ہے اس لئے اسے جوس اور بسکٹ فراہم کئے جائیں اور اڈیالہ جیل کے حکام کو اس کی ادائیگی کرینگی۔ جبکہ رمضان میں بھی اس نے اپنے لئے خصوصی کھانے کا اہتمام کرانے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنے کھانے کی ادائیگی خود کرینگی ۔ کیا یہ قانون صرف اس کیلئے ہیں کہ اپنی مرضی سے کھائے پیے یا پھر عام قیدیوں کو بھی یہ سہولت حاصل ہے اور کیا ریاست "کا کام نہیں کہ اپنے شہریوں کو تحفظ فراہم کرے اور اگر تحفظ فراہم نہیں " کرسکتی تو پھر ان لوگوں کو کوئی اختیار نہیں کہ اقتدار کے مزے لیں۔
لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب حکمرانوں کے اپنے دامن صاف ہوں ، یاریاں ، دوستیاں نبھانے والے " جمہوریت " کو بچانے کے نام پر بہت کچھ کرتے ہیں لیکن جمہوریت تو تب ہے جب " جمہور " کی حالت بہتر ہو اور انہیں انصاف ملے ورنہ لعنت ہے ایسے " جم ہوریت " پر جہاں پر ایک چور دوسرے چور کو صاف کرنے اور کلین چٹ دینے کیلئے بہت کچھ کرے ۔ لیکن

یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہے گا !

پشاور کا سرکاری ہسپتال اور تبدیلی کے دعویدار

شبقدر کے دور دراز علاقے بٹگرام سے تعلق رکھنے والی خاتون اپنے گردوں کی درد میں مبتلا پندرہ سالہ بیٹی کو جو عید کے دوسرے روز درد کا شکار ہو گئی تھی ایمبولینس میں ڈالکر پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں علاج کیلئے لے آئی - خاتون کو رشتہ داروں نے کہا کہ سرکاری ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہی نہیں شبقدر میں کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھادؤ لیکن خاتون کو امید تھی کہ اس کی جواں سال بیٹی کا علاج پشاور کے سرکاری ہسپتال میں ہو سکے گا- خاتون نے دو ہزار روپے ایمبولینس کو بھی دیئے تاکہ اس کی بیٹی کو آسانی ہوئ بیٹی کی آہ و بکا سن کر راستے میں خاتون یہی دعا کرتی رہی کہ خدا کرے کہ اس کی بیٹی کا علاج ہو اور بیٹی کو سکون ملے - جب وہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچی تو ایمرجنسی میں لائے جانے کے باوجود کوئی اس کی بیٹی کیلئے سٹریچر دینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ عید کا دوسرا دن تھا اور خدمت کے دعوے کرنے والے اور عوام کے ٹیکسوں پر پلنے والے اہلکاروں نے سٹریچر غائب کئے تھے۔ مجبورا خاتون کے بیٹے جو اپنی بہن کے ہمراہ آیا تھا نے اپنی بہن کو ہاتھوں میں اٹھایا اور ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا تاکہ اس کی بہن کی آہ و زاری کم ہو سکے- ایمرجنسی میں لائے جانے کے باوجود وارڈ میں تعینات دو ڈاکٹر تین نرسز کیساتھ خوش گپیوں میں

مصروف عمل تھے اسی دوران خاتون نے ڈاکٹر کو پکارا کہ اس کی بیٹی کی درد کے خاتمے کیلئے کوئی دوائی دوتاکہ اسے کچھ آرام مل سکے۔لیکن ڈاکٹر نے سرسری طور پر دیکھا اور کہا کہ وہاں پر لے جاؤ۔اسی دوران خاتون کا بیٹا جو بہن کی درد بھری چیخوں سے پاگل ہورہا تھا نے اپنی ڈاکٹر کے سامنے جا کر اسے کہا کہ اس کی بہن کو کوئی انجکشن لگا دے کہ اسے آرام مل سکے لیکن ڈاکٹر اس کی بات کو بھی نہیں سن رہا تھا۔ غصے اور مجبوری میں خاتون کے بیٹے نے ڈاکٹر کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا کہ خدا کیلئے میری بہن کو دیکھ لو ہم شبقدر سے یہاں پر آئے ہیں۔ ڈاکٹر کو یہ شبقدر سے تعلق رکھنے والے شخص کی جانب سے ہاتھ لگانے کا انداز برا لگا اس نے جھٹکا دیا اور اردلی کو پکارا کہ اسے بند کراؤ یہ طریقہ نہیں بات کرنے کا

ڈاکٹر کی غصے پر خاتون کے بیٹے نے ڈاکٹر کو منت کی کہ مجھ سے بہن کی درد بھری آوازیں سنی نہیں جاتی' ٹھیک ہے میں نے غلطی کی کہ آپ کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن آپ میری بہن کا علاج کرئے لیکن " سرکار" کی ملازمت اور ڈاکٹر ہونے کے زعم میں مبتلا شخص نے ایک نہ سنی اور اردلی کو پولیس کے ذریعے خاتون کے بیٹے کو ٹھیک کرنے کی ہدایت کی جس پر اردلی اور پولیس نے موقع پر پہنچ کر خاتون کے بیٹے جو اپنی بہن کو علاج کیلئے ہسپتال لایا تھا کو کمرے میں لے گیا جہاں پر اس سے موبائل فون لیا اور اس کی اتنی ٹھکائی کی کہ اس کے

آنکھوں چہرے سینے پر زخم آئے سب سے زیادہ مار اسے پولیس والوں نے دی جنھوں نے بوٹوں کی لاتیں مار کر زخمی کر دیا۔لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے کمرے میں اردلی اور پولیس ڈاکٹر کی شان میں گستاخی کرنے والے بہن کیساتھ تیمارداری کیلئے آنیوالے بھائی کی درگت بنا رہے تھے جبکہ باہر وارڈ میں اس کی بہن درد کے مارے چیخیں مار رہی تھی لیکن فرعونیت بھرے لہجے سے بات کرنے والے ڈاکٹر خاتون کی چیک اپ بھی نہیں کر رہے تھے۔ اسی دوران پینتالیس منٹ گزر گئے خاتون کو بیٹی کے ساتھ اب بیٹے کی فکر پڑ گئی جو ہسپتال آتے ہی غائب ہو گیا تھا۔

خاتون نے موبائل فون پر اپنے دیگر رشتہ داروں کو اطلاع کر دی کہ بیٹی کا علاج نہیں ہو رہا جبکہ بیٹا بھی غائب ہو گیا ہے اسی دوران شبقدر کی جواں سال پندرہ سالہ زینب درد کے مارے بے ہوش ہو گئی اور اسی بیہوشی میں دم توڑ گئی۔کچھ وقت گزرنے کے بعد خاتون کے رشتہ دار ہسپتال پہنچے جہاں پر معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے مریضہ کا علاج کرنے کے بجائے اس کے بھائی کی درگت بناتے ہوئے زخمی کر دیا اس کا قصور یہ تھا کہ اس کے ڈاکٹر کو ہاتھ سے پکڑا تھا۔جو نرسوں کیساتھ خوش گپیوں میں مصروف عمل ڈاکٹر کو برا لگا اور پھر اس صورتحال کے بعد خاتون کے رشتہ دار بیٹی کی لاش زخمی بیٹے کو لیکر صوبائی اسمبلی کے سامنے احتجاج کیلئے پہنچ گے تاہم ان کی دادرسی کیلئے کوئی نہیں

تھا" وی آئی پی " کی سیکورٹی کیلیے تعینات سیکورٹی فورسز نے خیبر روڈ بند کردیا کہ "گاؤں کے کمی کمین " کہیں وی آئی پی ایریا میں داخل ہو کر " صاحب" لوگوں کی نیند خراب نہ کریں. مرنے والی خاتون تو" عوام" سے تھی جن کا کام صرف " وی آئی پی" لوگوں کیلیے زندہ باد٫ مردہ باد یا پھر بھتہ) جسے عام زبان میں ٹیکس (کہا جاتا ہے -پیدا کرنا ہے تاکہ " وی آئی پی" ایریا میں موجود " ایلیٹ کلاس" کو سہولت میسر ہو دو گھنٹے گزرنے کے باوجود کوئی بھی ہسپتال میں مرنے والے خاندان کا پوچھنے نہیں آیا کہ آیا کس نے ظلم کیا اور کس طرح یہ ظلم ہو- کیونکہ صوبے کا وزیراعلی اسلام آباد میں اپنے گھر والوں کیساتھ عید کی چھٹیاں منانے گیا ہوا تھا٫ کوئی بھی وزیر٫ ممبر صوبائی اسمبلی٫ حتی کہ ایمرجنسی میں ڈیوٹی پر موجود اہلکار بھی اس متاثرہ خاندان سے بات کرنے نہیں پہنچا- صوبے میں تبدیلی لانے کے دعویدار "عمران خان" اپنی بیگم کے ہمراہ" نتھیاگلی" میں عید منانے گئے ہوئے تھے اور ان کے آگے پیچھے ہونے کیلیے" سرکاری چمچوں٫ خوشامدیوں" کی فوج ظفر موج وہاں پر تعینات تھی کہ " خان صاحب" کو -تکلیف نہ ہو

دو گھنٹے سے زائد احتجاج کے بعد جب سیکورٹی فورسز کو احساس ہوا کہ اب راستہ نہیں کھل رہا اور احتجاج کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو انہوں نے ضلعی

انتظامیہ کو اس سلسلے میں اقدامات اٹھانے کو کہہ دیا جس پر ایمرجنسی میں گھر سے ایڈیشنل اسسٹنٹ کمشنر کو بلوایا گیا جس کی سفید بالوں کا احترام کرتے ہوئے بٹگرام کے رہائشی خاتون کی ہلاکت کے بعد ان کے رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں نے روڈ کو کھول دیا۔ساتھ میں یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ متعلقہ افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائیگی . ایف آئی آر درج ہوئی کہ نہیں.اس پر عملدرآمد ہوا کہ نہیں ......

یہ وہ سوالات ہے جو بعد میں پوچھنے کے ہیں کیا" تبدیلی والی سرکار" جو صوبے میں تبدیلی لانے کی دعویدار ہے۔ کیا ان کی تبدیلی یہی ہے۔ کہ علاج کیلئے لائے جانیوالے افراد کیساتھ ایسا سلوک ہوئ حالانکہ یہی لوگ انہی "کمی کمینوں" کی خون پینے کے کمائی پر پلتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ " تبدیلی والی سرکار" کے بڑے.بڑے کیا ان کی تبدیلی یہی ہے کیا اسی ہسپتال میں آٹھ ماہ سے خراب امیج انٹی ملی فائر مشین جو کہ آرتھو پیڈک وارڈ میں پڑی ہے اور صرف کمیشن کی خاطر خراب کوالٹی کی مشین لی گئ یہی ان کی تبدیلی ہے کیا تبدیلی والی سرکار کیساتھ حکومت میں اتحادی اور اسلام کے ٹھیکیدار جنھوں نے اسی ہسپتال میں پرائیویٹ سی ٹی سکین مشین لگا دی ہے اور مریضوں سے بارہ سو روپے سی ٹی سکین کے لئے جارہے ہیں تبدلی والی سرکار نے اتحادیوں کو سپورٹ کرنے کیلئے ہسپتال کی اپنی سی ٹی مشین خراب کردی تاکہ دو سو روپے میں عام لوگوں کو سی ٹی سکین کی سہولت میسر نہ ہو اور اسلام کے ٹھیکیداروں کو بارہ سو روپے دیں تاکہ انہیں بھی.برابر کا حصہ ملتا

رہے ٔ یا پھر یہی تبدیلی ہے کہ ہسپتال کیلئے تبدیلی والی سرکار نے چیئرمین اور بورڈ آف گورنر بھی مقرر کردیئے ہیں جو" امپورٹ شدہ" ہیں جنہیں یہ نہیں پتہ کہ صوبے کے عوام کی مشکلات کیا ہۓ ڈاکٹروں کا رویہ کیا ہے اور کس بدحالی سے عوام دس روپے ہسپتال میں ایمرجنسی کی پرچی لیتے ہیں اور اب یہی پرچی "خان صاحب" کے رشتہ دار دس کے بجائے 100 روپے کرانے کے چکر میں ہیں۔کیا صوبے کے عوام اسی تبدیلی کے خواہشمند تھے۔کیا غریب عوام کیساتھ ہونیوالے سلوکٔ بدحالی کا تبدیلی والی سرکار " کچھ کر بھی لے گی" یا پھر " کروڑوں روپے دیکر" عوام کو دھرنے میں نچوانے کو ہی تبدیلی "ہی سمجھے گی

پی ٹی آئی کے چیئرمین عمران خان کے نام خط

محترم عمران خان صاحب !

میں خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والا ایک معمولی شہری ہوں ' گذشتہ انتخابات میں آپ کی تبدیلی کے نعرے پر میں نے آپ کا ساتھ دیا اور " بیٹ " کو ووٹ دیا مجھے امید تھی کہ آپ صوبے کی حالات بہتر کرینگے اور ہماری سختی بھی کم ہو جائیگی مجھے آپ کے نعروں پر یقین تھا اس لئے میں نے اپنے سارے ساتھیوں کو بھی اس بات پر قائل کیا تھا کہ آپ کے امیدواروں کو ووٹ دوں ' آپ نے جس تبدیلی کی امید دلائی تھی اس میں ہماری امیدیں آپ سے وابستہ ہو گئی تھی اور یقین تھا کہ دو سالوں میں آپ اور آپ کے ساتھی بہت کچھ کرپائینگے لیکن جس کی طرح توقع تھی اس طرح کی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی ۔ یہ بھی غلط ہوگا کہ تبدیلی نہیں آئی لیکن یہ تبدیلی اتنی نہیں تھی جتنی کہ ہم توقع کر رہے تھے ۔اور ہمیں یقین ہے کہ اگلے پانچ سال ہم آپ کی تبدیلی کے منتظر رہے تو جس بیٹ کو ہم نے ووٹ دیا تھا اسی بیٹ سے ہم سب لوگوں کی دھلائی ہو گی ۔

پشاور میں اپنے آپ کو خان اور کراچی میں مہاجر کہلوانے والے خان صاحب ! سابق دور میں ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ امن وامان کی ابتر صورتحال ' بھتہ

خوری، پولیس کی زیادتی، ہسپتالوں میں مریضوں کیساتھ پیش آنیوالے غیر انسانی سلوک، ٹرانسپورٹ کی ابتر صورتحال اور روزگار کے مواقع نہ ہونا تھے جو تبدیلی والی سرکار کے دو سال میں بھی ویسے کے ویسے ہی رہے۔سیاسی تعصب پسندوں اور لینڈ لوڈ کے دور میں بھتہ خوری کھلے عام تھی اور اب یہ بھتہ خوری چوری چھپے ہو رہی ہیں اگر آپ کو اندازہ نہیں تو جا کر قصہ خوانی، دلہ زاک روڈ، کوہاٹ روڈ، حیات آباد اور پشاور صدر کے تاجر تنظیموں کیساتھ مل بیٹھ کر بات کریں وہ آپ کو دل کی بات بتائینگے۔ محترم ! آپ یہ نہ کہیں کہ امن وامان کی صورتحال آپ کی وجہ سے بہتر ہوئی ہیں اس میں کچھ معروضی حالات اور کچھ ہمارے پڑوسی ممالک میں نیٹو افواج کی موجودگی تھی جو اب نہیں رہی اس لئے صورتحال امن وامان کی بہتر ہو گئی ہیں۔رہی پولیس کی زیادتی کی بات تو یہ سلسلہ پہلے زیادہ تھا اب کچھ کم ہوگیا ہے لیکن اس میں پہلے لوگ جب پھنس جاتے تھے تو بات ہزاروں تک تھی اب اگر پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو پھر لاکھوں کی بات ہوتی ہیں۔ کبھی آپ نے سٹریٹ کرائمز کی بڑھتی ہوئی تعداد کا پتہ کیا ہے کہ آج جس صورتحال سے پشاور اور دیگر شہروں کے لوگ سامنا کر رہے ہیں اس کا ذمہ دار کون ہیں۔ انٹرنیٹ پر آن لائن ایف آئی آر کے اندراج سے کچھ نہیں ہوتا، ہمارے صوبے میں کتنے ایسے لوگ ہیں جنھیں انٹرنیٹ کی سہولت میسر ہے اور جنھیں انٹرنیٹ کی سہولت میسر بھی ہیں ان کی انٹرنیٹ سے وابستگی اور معلومات کتنی ہیں کہ وہ ایف آئی آر آن لائن اندراج کر سکیں گے۔

! محترم عمران خان صاحب

آپ کے دعوے اپنی جگہ پر لیکن آج بھی مختلف تھانوں میں تعینات اہلکار ایسے ہیں جو پیسے لیکر کسی بھی شہری کو تحفظ پاکستان کے نام پر تھانے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر شریف آدمی " منت سماجت " اور پیسے خرچ کرکے نکل آتا ہے یہ بات ٹھیک ہے کہ کرپٹ اہلکاروں کے خلاف کارروائی اور احتساب کا سلسلہ بھی اسی حکومت نے شروع کیا ہے لیکن کیا کسی پولیس اہلکار کو برطرف کرنے سے حالات بہتر ہو سکتے ہیں کبھی آپ نے ان پولیس اہلکاروں کو جو برطرف ہوئے ہیں ان کی سرگرمیوں کو چیک کیا ہے کہ وہ اب بھی کن سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں۔ صرف برطرفی سے کچھ نہیں ہوتا ایسے اہلکار جو بھتہ خوری، کرپشن اور مختلف غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہوتے ہیں ان کے خلاف عملی اقدامات اور سزا دینے کی ضرورت ہے تبھی یہ ٹھیک ہو سکیں گے۔ صرف برطرفی سے کچھ نہیں ہوتا۔ پولیس اہلکاروں کی وردیاں تبدیل کرنے سے تبدیلی نہیں آتی ان کا کردار ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا لوڈ والوں کے دور میں ان کا جیب خرچہ سو سے دو سو روپے ہوتا تھا اور اب تبدیلی والی سرکار کے دور حکومت میں یہ خرچہ پانچ سے چھ سو روپے تک پہنچ گیا ہے۔ بس اتنی سی تبدیلی آ گئی ہیں۔

نئے خیبر پختونخواہ کے دعوے کرنے والے عمران خان اور ان کے ٹیم سے میری یہ

بھی گزارش ہے کہ ہسپتال کی نجکاری سے غریب آدمی کو کچھ نہیں ملے گا' ہاں اس سے خان صاحب آپ کے 78 سالہ کزن جو امریکی نیشنلٹی ہولڈر ہیں انہیں پشاور کے ایک بہت بڑے ہسپتال کے بورڈ آف گورنر کی چیئرمین شپ تو مل گئی ہیں جبکہ کچھ ایسے لوگ جو آپ ہی کے پارٹی سے تعلق رکھنے والے بڑے لوگوں کے کاروباری پارٹنر بھی ہیں ان کا نام بھی بورڈ آف گورنر میں شامل کیا گیا ہے ان سب کے اخراجات ' آنے جانے رہائش اور کھانے پینے کے یہی ہسپتال برداشت کرے گا ٹھیک ہے کہ آپ کے بورڈ آف ' گورنر کے ممبران اور چیئرمین پیسے نہیں لیتے لیکن لاکھوں روپے ان کے ایک وزٹ پر ہسپتال کے ضائع ہوتے ہیں جو کہ غریب شہریوں کے جیب پر ڈاکہ ہے کیا یہ آپ کو نظر نہیں آتا-یا آپ یہی تبدیلی لانے کے خواہشمند تھے- نواز شریف ' زرداری پر رشتہ داروں اور دوستوں کو نوازنے کے الزامات لگانے والے عمران خان صاحب ! خود آپ اور آپ کے ساتھی کیا کر رہے ہیں کیا یہ آپ کو نظر نہیں آتا-رمضان میں مریضوں کو افطار ڈنر کے نام پر کروڑوں روپے اڑائے گئے اور وہ بھی آپ کے تبدیلی کے نعرے والی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ممبر صوبائی اسمبلی کے بھائی کو ٹھیکہ بھی غیر قانونی طور پر دیا گیا - کبھی آپ نے چیک کیا کہ کب ٹینڈر ہوا اور کب سپلائی شروع کی گئی - کون ہے اس بات کو چیک کرنے والا-

خان صاحب ! آپ نے رائٹ ٹو انفارمیشن کا اقدام اچھا کیا لیکن آپ نے کبھی

دیکھا ہے کہ جب سے آپ کے پارٹی کے ایک رہنما اور وزیر پر کرپشن کے الزام لگے ہیں اور وہ اپنے موجودہ وزیراعلی کے بارے میں بیان دیتے ہیں اس دن احتساب کمیشن میں صحافیوں کا داخلہ بند کیا جاتا ہے کیونکہ آپ کے ساتھیوں کو ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ایسے باتیں باہر نہ نکلے کہ جس کے چھینٹے آپ کے "صاف دامن" ساتھیوں پر لگے۔ کیونکہ جس وزیر کو گرفتار کیا گیا ہے اس نے بہت سارے خرچ کئے تھے اور اپنے خرچوں کو پورا کرنے کیلئے بہت کچھ کیا۔ کبھی آپ نے احتساب کمیشن میں بھرتیوں کا ریکارڈ چیک کیا ہے کس طرح سے من پسند افراد کو لیا گیا ہے کیا اسی کو شفافیت کہتے ہیں۔اور کیا یہی لوگ احتساب کرسکیں گے جو خود احتساب کے قابل ہوں رکیا یہی وہ تبدیلی ہے جس کے بارے میں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے بڑے بڑے دعوے کئے تھے۔

نئے خیبر پختونخواہ کا دعوی کرنے والے خان صاحب ! آپ کی ٹیم نے پشاور میں شہریوں کو ٹرانسپورٹ کی جدید سہولت دینے کا دعوی کیا جدید سہولت تو آئی لیکن اس کا زور شہریوں سے ہی نکالا جانے لگا۔ مخصوص لوگوں کی نئی گاڑیاں سڑکوں پر پھرنے لگی اور جو سٹاف پہلے دس روپے میں ہوتا تھا اب بیس روپے میں تبدیلی والی سرکار کے پسندیدہ ٹرانسپورٹر کروا رہے ہیں یعنی دس روپے "بائیومیٹرک" طریقے سے لوگوں سے نکالے جارہے ہیں۔جس طرح آپ کے کزن صرف ای میل پر احکامات جاری کرکے ہسپتال انتظامیہ کو وختے میں ڈال دیتے ہیں اسی طرح تبدیلی والی سرکار کے ٹرانسپورٹ بھی بغیر کوئی سرکاری احکامات کے لوگوں

-کو لوٹ رہے ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں

!محترم نئے خیبر پختونخواہ کی اصطلاح ایجاد کرنے والے عمران خان صاحب

آپ کو لکھنے والے بہت کچھ لکھ کر بھیج دیتے ہیں جس میں سرکار کی مدح سرائی کرنے والے اور "ہر دور حکومت میں" واہ واہ کرنے والے صحافی بھی شامل ہیں جن کے اپنے مخصوص نظریات اور مفادات ہیں جس کیلئے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن خدارا آپ کو اللہ تعالی نے عقل دی ہیں جس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے -کیونکہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد بہت سارے لوگوں کی آنکھیں اور اوقات بدل جاتی ہیں-اور یہ آنکھیں تب کھلتی ہیں جب پانچ سال پورے ہو جاہیں،ابھی بھی آپ کے حکومت خیبر پختونخواہ میں تین سال مزید چل سکتی ہیں اور یہ ایک لمبا عرصہ ہے اگر کچھ کرنا ہے اور اگر کچھ نہیں کرنا تو پھر وہ وقت دور نہیں،کہ جس طرح لوگ لہزی لوڈ والوں اور روٹی کپڑا اور مکان والوں اور اسلام کے ٹھیکیداروں کو مسترد کر چکے ای خیبر پختونخواہ کے عوام آپ اور آپ کے ساتھیوں کو بھی لات مار کر نکالدینگے اور پھر کچھ نہیں ہوگا سوائے ہاتھ ملنے کے ! سو سوچ لیئجیے اور عمل کیجئے

شکریہ

ایک مخلص شہری

گورنر خیبر پختونخواہ کو خط

محترم گورنر خیبر پختونخواہ سردار مہتاب احمد خان صاحب !
امید ہے مزاج بخیریت ہونگے اور گورنر ہاؤس پشاور کے ائیر کنڈیشنڈ ماحول اور بڑے لان میں بیٹھتے ہوئے آپ کو گرمی بھی نہیں لگتی ہوگی ۔ نہ ہی آپ کو صوبے اور خصوصا فاٹا میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے والے قبائلی عوام کی مشکلات کا اندازہ ہوگا۔ تقریروں میں قبائلی عوام کیلئے دلکش اعلانات اپنی جگہ لیکن جس صورتحال سے آج قبائلی عوام دوچار ہیں۔ آپ کو اس کا اندازہ بھی نہیں اور اگر اندازہ بھی ہے تو آپ سب کو اپنی طرح گورنر ہاؤس میں زندگی گزارتا ہوا محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہر کوئی اپنے ماحول میں سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔
محترم ! وقت کی قدر کے بارے میں آپ کی اچھی باتیں گذشتہ روز ایک تقریب میں سنیں جس میں آپ نے بنگلہ دیش کا حوالہ دیا جو کہ 1971 ء میں پاکستان سے علیحدہ ہوا تھا۔اور آج آپ کہہ رہے تھے کہ پاکستانی قوم حکمرانوں کی غلطی کی سزا بھگت رہے ہے ۔ آپ کا اشارہ سابقہ حکومتوں کی طرف تھا۔محترم کبھی آپ بھی انہی حکومتوں کا حصہ رہے ہیں۔حیات آباد میں ایک تقریب میں ڈیڑھ گھنٹہ

آپ لیٹ آئے۔اس ڈیڑھ گھنٹے میں کیا سے کیا نہیں ہوتا۔لیکن آپ کو اس سے کیا۔ اگر یہ سیکورٹی کی مجبوری تھی تو آپ پہلے بھی آ سکتے تھے۔ لیکن دوسروں کو انتظار کروا کے اپنی پوزیشن بنانا اسلامی جمہوریہ پاکستان جہاں اب جمہوریت پھل پھول رہی ہے میں ایک عام سی بات ہے۔آپ نے نئے پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو کچھ عرصہ بعد نیا پاکستان بنانے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔آپ کی بات بالکل صحیح ہے لیکن آپ کے پرانے پاکستان میں کیا کچھ تبدیل ہوا۔ آپ جس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں وہاں سب کچھ موروثیت پر چل رہا ہے بھائی کے بعد بھائی اور پھر بیٹا اور بیٹی اور شائد پوتے نواسوں تک یہ سلسلہ چل نکلے۔ ساری پارٹی مخصوص لوگوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ میری بات آپ کو یقیناً بری لگے گی لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان کے نام پر عوام کو دھوکہ دینے والوں سے لیکر آپ کی پارٹی کے لیڈروں پر ٹیکس چوری کے کتنے الزامات ہیں کتنے کیسز عدالتوں میں چل رہے ہیں۔معذرت کیساتھ کیا یہ ملک صرف پنجاب اور سندھ کیلئے بنا ہے جس میں یہ لوگ حکمران ہونگے اور خیبر پختونخواہ اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے "لیس سر اور نو سر" والے ہونگے ۔اس ملک پر صرف دو صوبوں سے تعلق رکھنے والے پارٹیوں کا قبضہ ہے جن میں ایک پنجاب سے اور دوسری کا تعلق سندھ سے ہے۔ چھوٹی پارٹیاں جن میں لینڈ لوڈ والے اور مولوی بھی شامل ہیں آپ ان کو ضرورت کے وقت اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور یہ لوگ اپنے مفادات کی خاطر ہر وقت آپ کا ساتھ دیتے ہیں انہیں عوام سے کوئی

دلچسپی نہیں۔

محترم سردار مہتاب صاحب!

سابقہ حکمرانوں پر تنقید کرنے والوں کی تقلید پر آپ بھی چل نکلے ہیں۔ مخصوص لوگوں کو نوازنے کا سلسلہ "تیر" والوں نے بھی شروع کر رکھا تھا اور اب" لاہوری شیر" بھی یہی ڈرامہ کر رہا ہے۔ اور تو میں کچھ نہیں کہونگا کبھی آپ نے سرکاری وکلاء کی فہرست دیکھی ہے جنہیں لاکھوں روپے دیکر ریاست کی وکالت کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ان کی قابلیت کیا صرف " جی واہ واہ" ہی ہے۔یا پھر ہفتے میں تین مرتبہ پریس ریلیز جاری کرنا ہے جس میں" شیر آوے ہی آوے" کے فقرے شامل ہوتے ہیں اور اس کی بنیاد پر بہت سارے وکلاء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سرکاری وکیل منتخب کیا گیا ہے اور عوام کے خون پسینے کی کمائی پر آپ سمیت سب پل رہے ہیں۔

قبائلی عوام کیلئے انصاف کی فراہمی کا دعوی کرنے والے سردار مہتاب صاحب!

کبھی آپ نے قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں سے بات کی ہے ان نوجوانوں سے جو حقیقی معنوں میں ان علاقوں سے ہوتے ہیں۔ آپ کے سامنے انتظامیہ تو بہت سارے فاٹا کے نوجوانوں کو آگے لاتی ہے جنہیں رٹا لگا کر بٹھایا جاتا ہے اور پھر آل اوکے کی رپورٹ مل جاتی ہے لیکن ان قبائلی

نوجوانوں سے ملیں جنہیں پاکستانی شناختی کارڈ بنوانے کیلئے پولٹیکل انتظامیہ چکر پر چکر لگواتی ہیں۔میں آپ کو ایسے نوجوانوں سے ملوا سکتا ہوں جن کے اپنے خاندان میں ملک ہیں مگر وہ ان قبائلی علاقوں کے ملک کے کارناموں پر نفرین کرتے ہیں۔ تین سو روپے میں شناختی کارڈ فارم لینے کیلئے قبائلی نوجوانوں کو اپنے علاقوں میں جانا پڑتا ہے اور یہ فارم بھی صرف ایک ماہ کیلئے ہوتا ہے جس کی تصدیق کیلئے انہیں پشاور کا رخ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے ملک یہاں پر مقیم ہیں اپنے علاقوں میں ملک کے نام پر فنڈز لینے والے یہ مشران کس طرح نوجوان قبائلیوں سے سلوک کرتے ہیں اس کا تصور بھی آپ نہیں کر سکتے - نہ ہی پولٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں بنائے گئے نادرا کے دفاتر میں بیٹھے تحصیلدار اور اے پی اے کے رویئے کا آپ کو اندازہ ہے۔ بعض قبائلی نوجوانوں کے بقول کبھی کبھار تو دل کرتا ہے کہ خودکشی کرلیں یہ کیسی زندگی ہے ۔کہ شناختی کارڈ بنوانے کیلئے پشاور اور متعلقہ ایجنسیوں میں حاضریاں لگوانی پڑتی ہیں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ قبائلی علاقوں میں قائم نادرا کے دفاتر میں تصویر اور ویڈیو بنانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ ان کے بہت سارے کرتوت باہر نکل آتے ہیں-

قبائلی نوجوانوں کیلئے ایف سی آر میں اصلاحات کے حوالے سے بات کرنے والے گورنر خیبر پختونخوا صاحب!

قبائلی علاقوں میں کبھی آپ نے ہسپتال میں تعینات ڈاکٹروں کی ڈیوٹی چیک کی ہے کہ وہ کس وقت ڈیوٹی پر آتے ہیں اور وہاں آنیوالے ہسپتال کی ادویات کون چوری کرکے مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے۔ ڈونرز اور غیر ممالک سے خیرات اور زکواۃ' قرضے لیکر قبائلی عوام پر تعلیم کے نام پر کروڑوں روپے خرچ کرکے سکول تو تعمیر کئے جاتے مگر ان میں ملک صاحبان اپنے جانور رکھتے ہیں چوکیدار کو تنخواہ تو ملتی ہے لیکن مگر قبائلی عوام کے بچوں کو تعلیم نہیں ملتی ٹیوب ویل کے نام پر کروڑوں روپے ہڑپ کئے گئے -یہ سلسلہ سندھی وڈیرے کے دور میں بھی جاری تھااور آج پنجاب سے تعلق رکھنے والے "شیر" کے دور میں بھی جاری ہے-ہاں تبدیلی آئی ہے اور وہ بھی اتنی کہ پہلے اس کی مدح سرائی کرنے والے اچھی پوسٹوں پر تھے اور ابھی آپ کی پارٹی کی مدح سرائی کرنے والوں کے مزے ہیں-باقی غریب قبائلیوں کی حالت تبدیل نہیں ہوئی۔

وفاق کی نمائندگی کا دعوی کرنے والے گورنر صاحب!

فاٹا ٹریبونل جسے آپ قبائلیوں کیلئے انصاف کی فراہمی کا سب سے بڑا ادارہ سمجھتے ہیں کی اوقات کیا ہے- کیا ریٹائرڈ سول بیوروکریٹ اپنے افراد کے خلاف کچھ کر سکیں گے- ساری عمر عوام کا خون چوسنے والوں سے انصاف کی توقع بے وقوفی ہے-اور یہ کونسا انصاف ہے کہ ریٹائرڈ افراد کو لیا جائے کیا اس ملک کے نوجوانوں کی کمی ہے -یا پھر وکلاء کی کمی ہے- لیکن بقول کچھ وکلاء کے یہ

قبائلی علاقوں کے عوام کیلئے " لالی پاپ " ہے ایسا لالی پاپ جسے وہ دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں لیکن منہ نہیں لگا سکتے۔ ایک سو چالیس دنوں میں انصاف کی فراہمی کا دعوی کرنے والے فاٹا ٹریبونل میں 2012 سے لوگ خوار ہو رہے ہیں لیکن انہیں انصاف نہیں مل رہا۔اور ایسے لوگوں کو جنکے بچوں کو پولیٹیکل انتظامیہ نے گولیاں ماردی ہیں اور آج بھی ان کے بوڑھے والدین انصاف کیلئے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ کیا یہی انصاف ہے

۔

محترم ! لکھنے کیلئے بہت کچھ ہیں لیکن آپ بہت زیادہ مصروف انسان ہیں اگر ان گزارشات میں کچھ کی بہتری کیلئے آپ عملی اقدامات اٹھائیں اورچیک کریں کہ کیا ہو رہا ہے تو یقینا بہت سارے لوگوں کا بھلا ہوگا اور یہی بھلائی اس دن آپ کی کام آئیگی جب بڑے سے بڑا طاقتور انسان بھی اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کی بابت جواب دے گا۔

شکریہ

مخلص

ایک شہری

خوازہ خیلہ میں ایک دن، عجیب روایت اور آلودہ پانی

روز مرہ کی "بریکنگ نیوز" اور ہر وقت بھاگ دوڑ سے تنگ آ کر میں نے اپنے صحافی دوست عثمان کو فون کیا کہ جس طرح بھی ہو اس دفعہ پانچ دن کی چھٹیاں میں نے باہر ہی گزارنی ہیں۔ ایک سال سے شہر سے باہر آؤٹنگ کا موقع نہیں ملا۔ خبروں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنا آپ بھی جیسے "بریکنگ نیوز" ہی لگتا ہے۔ میرے ساتھی جس کا تعلق بھی ایک ٹی وی چینل سے ہے اور اس کا آبائی تعلق سوات کے علاقے خوازہ خیلہ سے ہے نے حامی بھر لی کہ میں تو ویسے بھی سوات جارہا ہوں آپ کیساتھ جا کر اور بھی مزہ آیگا۔

مقررہ دن پر صبح سویرے تیاری کر لی کہ جب بھی جانا ہو تو نکل جائینگے اور پھر سوار چار بجے پشاور سے مینگورہ کیلئے سفر کا آغاز ٹوڈی کار میں کیا۔ گاڑی تو نئی تھی اور ڈرائیور بھی نوجوان تھا اس لئے کچھ زیادہ ہی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا تین مرتبہ گاڑی حادثے سے بچ گئی، کیونکہ نئی گاڑی ہونے کے باوجود بریک کام نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ دو اور افراد بھی گاڑی میں سوار تھے جن میں ایک نے تو گاڑی میں سوار ہوتے ہی آنکھیں موند لی جبکہ دوسرے نے موبائل فون کے ذریعے گانے سننے شروع کر دیئے۔ اسی کے ساتھ ڈرائیور نے پشتو کے ایسے گانے لگا دیئے۔ جو میں پشتون ہوتے ہوئے بھی نہیں سن سکتا

تھا کیونکہ اس میں جنس مخالف کے جسم کے ہر عضو کے بارے میں کوئی نہ کوئی فقرہ سننے کو ملتا تھا۔ میرا ساتھی جو کہ جماعت اسلامی کا نظریاتی کارکن بھی ہے نے بھی ان گانوں پر عجیب سی بے بسی کا اظہار کیا اور مجھے احساس ہوا کہ ہم بریکنگ نیوز کے چکر میں پڑ کر اپنی پشتو شاعری کی طرف توجہ دینا ہی بھول گئے کئی ایسے چیزیں جو کہ عام طور پر ہر جگہ سنتے ہیں اگر گانوں کی ایسی صورتحال رہی تو یقینا پھر " مخصوص فلمیں دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی کیونکہ " مخصوص فلموں " کی ضرورت "آڈیو گانوں سے پورے ہوسکے گی۔

درگئی کے مقام پر سیکورٹی اہلکاروں نے شناختی کارڈ دیکھ لئے اور سوالات کئے - یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد احساس ہوا کہ سوات کا روزانہ سفر کرنے والے افراد کی حالت کیا ہوگی یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر فلائنگ کوچ میں کوئی بیٹھا ہو یا پھر خواتین اور بچے ...) ہوں تو پھر .... (کچھ کہہ نہیں سکتے - تحفظ پاکستان آرڈیننس کا ڈر ہے ساڑھے آٹھ بجے مینگورہ میں پہنچنے کے بعد پیدل سفر کیا اور یہاں پر ملنے والی مشہور لسی پی لی تبھی تروتازگی کا احساس ہوا پشاور کی گرمی اور مینگورہ کا موسم ایک جیسا تھا تاہم فرق صرف اتنا تھا کہ لوڈشیڈنگ مینگورہ میں زیادہ تھی اس لئے زیادہ تر سفر مینگورہ میں اندھیرے میں کیا۔وہاں سے

نو بجے مقامی طور پر چلنے والے نان کسٹم پیڈ گاڑی جس کی مارکیٹ میں قیمت سترہ لاکھ روپے تھی اور سوات میں چار لاکھ میں آسانی سے مل جاتی ہیں میں بیٹھ کر خوازہ خیلہ تک پہنچے۔ نان کسٹم پیڈ گاڑیاں ملاکنڈ کے علاقے سوات تک آسکتی ہیں نان کسٹم پیڈ گاڑی میں سفر کرکے ہم دوست بھی اپنے آپ کو کچھ اور ہی چیز سمجھنے لگے تھے۔ پونے دس بجے دوست کے ساتھ اس کے چچا کے گھر پہنچے وہاں پہنچنے کے بعد احساس ہوا کہ لوڈشیڈنگ صرف پشاور میں نہیں ہوتی بلکہ یہاں پر بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے لوگ اتنی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ خوازہ خیلہ میں رات کو موسم سرد رہتا ہے اور اگست کے مہینے میں دسمبر کے مہینے کی طرح کمبل اوڑھنے پڑتے ہیں ۔

میرے ساتھی صحافی عثمان اور اس کے کزن اعجاز کیساتھ رات گئے تک گپ شپ ہوتی رہی۔ سیاست پر بات کرنا یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ موضوع ہے بیشتر افراد پی ٹی آئی کے سپورٹر ہیں اور عمران خان کیلئے کچھ بھی کرسکتے ہیں لیکن اس علاقے سے منتخب ہونیوالے ممبر صوبائی اسمبلی جو کہ اس علاقے کے خان ہیں کی کارکردگی سے مطمئن نہیں کیونکہ علاقے سے منتخب ہونیوالے خان کی اپنی لندن میں مصروفیات زیادہ ہے اس ۔ لئے وہ علاقے میں پینے کے صاف پانی سے لیکر دیگر مسائل پر توجہ نہیں دے پاتے۔ بقول یہاں کے لوگوں کے انہیں پتہ تھا کہ علاقے سے منتخب ہونیوالا ممبر صوبائی اسمبلی بھگوڑا ہے اور دوسری پارٹی سے آیا ہے

لیکن اسے عمران خان نے کھڑا کیا تھا اس لئے لوگوں نے اسے ووٹ دیکر منتخب کیا۔ سطح سمندر سے گیارہ سو فٹ بلندی پر واقع خوازہ خیلہ بازار میں ہونیوالے تجاوزات کے خلاف آپریشن پر بازار کے دکاندار تو پی ٹی آئی کو گالیاں دیتے ہیں لیکن یہاں کے ٹرانسپورٹر اور مقامی لوگ بہت زیادہ خوش ہیں کہ تجاوزات کے خلاف آپریشن کیا گیا۔ صبح سویرے دوست عثمان کیساتھ کھیتوں کا رخ کیا۔ سرسبز پہاڑ اور کھیت دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے اور پھر جب ساتھ میں چشموں سے پانی بھی آتا ہو تو یہ روح کو جیسے تروتازہ کرتا ہے' عجیب سی طاقت رکھنے والا قدرتی چشموں کا پانی مختلف پہاڑوں سے ہوتا ہوا دریائے سوات میں جا گرتا ہے' اب بھی جا بجا مقامی لوگ روایتی طور پر چشموں سے نکلنے والے پانی میں کپڑے دھوتے ہیں۔ ساتھی عثمان کے ہمراہ ایک ایسے ٹیوب ویل پر پہنچے جہاں کے گیٹ پر کاغذ لکھا تھا کہ " صاحب میں چائے پینے کیلئے گیا ہوں" میں پھر آجاؤنگا میری ڈیوٹی پوری لگا دیں۔ یعنی ٹیوب ویل آپریٹر جب بھی نکلتے تو یہ کاغذ لگا کر نکل جاتے تھے جس وقت میں اس کاغذ کی تصویر لے رہا تھا اس کی خوش قسمتی اور میری بد قسمتی کہ ایک گھنٹے میں ٹیوب ویل آپریٹر وہاں پر موجود نہیں تھا اور جب تصویر نکال رہا تھا تو آکر کھڑا ہوگیا ساتھ میں اردو میں بات کرنے کی کوشش کی تو میں نے پشتو میں جواب دیا تو کہنے لگا کہ میں تو ایسے ہی نکل گیا

تھا۔ ماشاء اللہ وہ شریعت کے مطابق بھی تھا یعنی داڑھی بھی رکھی تھی لیکن..... خیر
۔چائے پینے کی آفر کی جو ہم نے ٹھکرا دی اور پھر نکل آئے

سرسبز کھیتوں میں ایسے لوگ بھی دیکھنے کو ملے جو گھر میں جلانے کیلئے درخت کاٹ کر لے جارہے تھے۔ ٹھیک ہے کہ اس علاقے میں گیس کی سہولت نہیں لیکن اگر کوئی ایک درخت کاٹ لے تو کم از کم تین نئے درخت لگا دے تو پہاڑوں پر سبزہ تو ختم نہیں ہوگا۔

ہم بھی عجیب لوگ ہیں لاکھوں' کروڑوں روپے گھر پر لگا دیتے ہیں لیکن گھر میں ہزاروں روپے کی درخت نہیں لگاتے ۔درخت کاٹنے کا سلسلہ ہر جگہ پر جاری ہے کیا شہر اور کیا پہاڑی علاقے..... (ہم کب سمجھیں گے خدا جانے)

مختلف مقامات پر لوگوں کی سہولت کیلئے پاک فوج نے پل تعمیر کئے ہیں جس سے لوگوں کو آنے جانے میں بہت سہولت ہو گئی ہیں اور مقامی لوگ اس کام پر پاک فوج کو سراہتے ہیں۔ صحافی دوست کے کزن کی شادی میں بھی شرکت کی۔ شادی میں آنیوالے بیشتر سراج الحق اور عمران خان کے فین نکلے۔ بیشتر لوگ سیاست پر بات چیت اور بجلی کے بلوں میں اضافے سے پریشان تھے۔ ان کے بقول پہلے چھ سو روپے بل آتا تھا اور اب دو ہزار روپے بل آگیا ہے یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہے--- ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر ہمارے تو ہوش ٹھکانے آگئے۔ کیونکہ ہمارے

ہاں پشاور میں تو بل دس ہزار تک آتے ہیں۔ اور یہ ہم جیسے تنخواہ دار لوگ کس طرح پورے کرتے ہیں اللہ ہی جانتا ہے۔ سوات میں شادی والے دن دلہا کو کام کرتا دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا' یہاں پر ایک عجیب رسم بھی ہے یعنی دلہا بارات کے ساتھ نہیں جاتا' اس کے گھر والے دلہن کو لیکر آتے ہیں۔ دلہا بارات کیساتھ جائے تو برا مانا جاتا ہے ہمارے صحافی دوست کے کزن کی فیملی جو کہ کراچی سے آئی ہوئی تھی نے اپنے دلہے کو دوستوں کیساتھ چھوڑا کہ یہ گھر میں رہیگا یا پھر دوستوں کیساتھ کہیں نکل جائیگا اور پھر ایک یا دو دن بعد واپس گھر آ جائیگا اس کے شیطان دوستوں نے دلہا کو گاڑی میں بٹھایا اور بارات میں شامل کردیا۔ دلہا نے بہت چیخیں ماری کہ کیا کر رہے ہو لیکن

....

بارات کے بعد خوازہ خیلہ بازار کا رخ کیا اس علاقے کے بیشتر رہائشی بیرون ملک مقیم ہیں اور مزدوری کرتے ہیں یعنی فیملی کے چار افراد میں سے دو افراد لازما مشرق وسطی میں ملازمت کرتے ہیں۔ خوازہ خیلہ بازار کے درمیان سے گزرنے والے نالے جس میں چشموں کا پانی آتا ہے کے سائیڈ پر گندگی کے ڈھیر اور بدبو سے میرا برا حال ہوگیا۔ بچوں کے پمپرز' سگریٹ کے استعمال شدہ ڈبے' سرنجیں' مختلف ادویات' خون اور جانوروں کے مختلف اعضاء اور بول براز دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا کہ یہ سب کیا ہے۔ دنیا بھر میں اس علاقے کی قدرتی اور حسین نظاروں کی باتیں کی جاتی ہیں لیکن پاکستان کے سوئٹزرلینڈ میں آلودگی

کی صورتحال کیا ہے اور خاص طور پر آلودہ پانی ' جو نہ صرف انسانی جانوں بلکہ آبی حیات بھی کیلئے خطرہ ہے لیکن یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

مقامی دکاندار اپنے دکانوں کا کچرا یہاں آکر پھینک جاتے ہیں جبکہ قصائی جن کیلئے ذبیحہ خانہ بنایا گیا ہے یہاں پر آکر جانوروں کو ذبح کرتے ہیں تاکہ انہیں صاف پانی میسر ہو اور وہ اوجھڑی اودیگر گند یہاں صاف کرے۔ مقامی لوگوں کے مطابق خوازہ خاوٴن میونسپل ایڈمنسٹریشن کا عملہ بھی بازار کا سارا گند یہاں آکر پھینک جاتا ہے بعض مقامات پر لوگوں نے گٹر کے پائپ بھی چشموں سے آنیوالے اس نالے کی طرف کردیئے جس سے سارا گند اسی نالے میں سے گزر کر دریائے سوات میں جا گرتا ہے۔ جب اس حوالے سے بعض لوگوں سے بات کی تو انہوں نے عجیب سی منطق پیش کی کہ " جو پانی رواں (چلتا) ہو وہ ہمیشہ صاف رہتا ہے... یعنی بھلے سے آپ دنیا جہان کا گند گرا دیں لیکن یہ پھر بھی صاف ہی رہے گا۔

دل میں عجیب سی اداسی لیکر بازار میں گئے جہاں پر لسی پی ' اسی دوران بارش ہوئی اور موسم اور بھی سرد ہوگیا لیکن اس بارش نے بجلی کا بیڑہ غرق کردیا اور ہم ساری رات موبائل فون ' کیمرہ اور ویڈیو کیم کو چارج کرنے کے چکر میں سونے سے بھی رہ گئے۔ لیکن مچھروں کی محبت نے یہ رات بھی یادگار بنادی۔

پہاڑی چشموں سے نکل کر آنیوالے ٹھنڈے پانی میں نہانا کتنا مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ وہ لوگ زیادہ کر سکتے ہیں جو گھر میں غسل خانوں میں نہاتے ہوں ۔ خوازہ خیلہ میں میرے ساتھی صحافی دوست عثمان نے صبح سویرے مجھے اس بات پر قائل کیا کہ نہانا وہ بھی چشموں کے پانی سے بہت زبردست ہے ، ۔ ساتھی کی بات تو میں نہیں مان رہا تھا لیکن جس وقت احساس ہوا کہ ان کے گھروں میں پانی پینے کیلئے بھی مشکل سے آتا ہے ایسے میں نہانا بہت بڑی عیاشی ہے۔ خوازہ خیلہ کے بیشتر رہائشیوں نے بڑے بڑے پائپ چشموں سے نکلنے والے پانی میں رکھے ہیں اور جب انہیں ضرورت ہوتی ہیں تو وہ مشین لگا کر ان پائپ کے ذریعے گھروں تک پانی پہنچاتے ہیں جسے بعد میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ میں غسل خانے میں نہانے والا بندہ ہوں اور کھلے عام نہانا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن صحافی دوست عثمان کی بات پر مجبورا ہاں کرتے ہوئے خوازہ خیلہ سے گزرنے والے پہاڑی چشموں کے نالے کا رخ کیا۔ صبح سویرے چشموں کے پانی سے نہانا ۔ اللہ اکبر.... لیکن میں نے بھی بہت ہوشیاری کی پہلے ٹھنڈے پانی میں پائوں رکھ دیئے ، پھر آہستہ سے جسم پر پانی ڈالا اور جب جسم سردی سہنے کے قابل ہوا تو یکدم پانی میں ڈبکی لگائی ۔ جس سے سردی کا احساس بھی کم ہوا اور پھر اتنا مزہ آیا کہ صحافی دوست مجھے منتیں

-کرتا رہا کہ چلو کتنا نہائو گے لیکن پھر نکلنے کو دل نہیں کر رہا تھا
گھر میں واپس جا کر میں نے جینز پہن لی جبکہ ساتھی دوست کو جینز پہنی لیکن بعد میں تبدیل کر دیا جب میں نے وجہ پوچھی تو بتا دیا کہ لوگ کیا کہیں گے کیونکہ یہاں کے لوگ جینز اور شرٹ کے استعمال کو معیوب سمجھتے ہیں خصوصی طور پر ایسے لوگوں کیلئے جو یہاں کے مقامی ہوں ، صحافی دوست کے بقول اس کا دل تو بہت کر رہا ہے کہ جینز پہنے لیکن لوگوں کی وجہ سے نہیں پہن رہا- میں دوست کو چھیڑنے کیلئے اسے کہتا کہ تم نظریاتی طور پر جماعت اسلامی کے ہو لیکن تمھاری حرکات اور کپڑوں کا سٹائل پی ٹی آئی کے -کارکنوں کی طرح ایڈوانس ہے
ناشتہ کرنے کے بعد پشاور سے آنیوالے دو ساتھیوں نے فون کیا کہ وہ گاڑی میں صبح سویرے روانہ ہوئے ہیں اور دس بجے تک وہ بھی خوازہ خیلہ پہنچ جائینگے- یہ دوست بھی صحافی تھے جب ان سے فون پر بات کی کہ جلدی پہنچ جائو کیونکہ ناشتے پر انتظار ہو رہا ہے تو آفتاب احمد جس کے بال زیادہ عقلمندی کی وجہ سے گر گئے ہیں نے اپنے مخصوص سٹائل میں کہہ دیا کہ صبح سویرے پانچ بجے سے سفر شروع کیا اور پہلی مرتبہ اتنی اچھی باتیں سننے کو مل رہی ہیں یعنی ناشتہ تیار رکھو ہم ڈٹ کر ناشتہ کرینگے اور واقع پہنچ کر ان دوستوں میں صرف آفتاب احمد نے ڈٹ کر ناشتہ کیا- یعنی دوسرے صحافی دوست کے حصے میں آنیوالا ناشتے

کا انڈہ بھی ڈکار لیا۔ سوات کے رہائشیوں کی عجیب سی بات ہے کہ یہ لوگ چینی کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں، لسی پینی ہو گھر پر یا بازار میں، چائے پینی ہو گھر پر یا کسی ہوٹل میں، چینی اتنے ڈالتے ہیں کہ ہونٹ آپس میں چپک جاتے ہیں۔ خیر شائد یہ ان کی آب و ہوا کا اثر ہو، اتنی چینی تو ہم پشاور میں استعمال کریں تو پھر اللہ ہی ہمارے صحت پر رحم کرے۔

صحافی دوست عثمان کے کزن اعجاز خان جو کہ مقامی طور پر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ سے ہم نے پہلے بات کی تھی کہ پشاور سے آنیوالے صحافی دوست آفتاب احمد کو یہ کہنا ہے کہ میری سرخ و سفید رنگت کا راز چشموں میں نہانے پر ہیں اگر تم ایک مرتبہ نہالو تو تمھاری کالی رنگت سفید ہو جائیگی۔ ہم چار دوستوں نے آفتاب کیلئے پلان بنایا تھا لیکن وہ ایسا ڈھیٹ نکلا کہ یہ کہتے ہوئے چل پڑا کہ میری اوریجنل کلر ہے اس کیساتھ میں زیادتی نہیں کرسکتا۔

خوازہ خیلہ بازار کی سیر کرتے ہوئے لکڑی پر خوبصورت ڈیزائن بنانے والے کاریگر سے ملاقات ہوئی جو مقامی طور پر بننے والی چوکی) بیٹھنے کیلئے استعمال ہونیوالا کرسی (پر خوبصورت نقش و نگار بنا رہا تھا اس نے بتایا کہ وہ گذشتہ پینتیس سال سے اسی کاروبار سے وابستہ ہے، اور یہ اس کا آبائی پیشہ ہے بقول اس کے بچوں نے بھی یہ فن سیکھا ہے لیکن وہ اسے نہیں کر رہے

کیونکہ یہ بہت محنت طلب کام ہے اور روزانہ وہ تین چوکیاں بناتا ہے جس کی بنائی بکری کے چمڑے سے کی جاتی ہیں اور اس کیلئے بھی مخصوص ماہر کاریگر آتے ہیں خوبصورت ڈیزائن اور کلر میں دستیاب ان کرسیوں کو مقامی طور پر لوگ جہیز میں دیتے ہیں اور یہ ایک طرح سے روایت ہے یہاں بننے والے اس کرسی میں بیشتر جنگلات کی لکڑی استعمال ہوتی ہیں اور یہ ڈھائی ہزار سے تین ہزار روپے میں ملتی ہیں اور یہ یہاں پر بننے والی کرسی مخصوص ڈیزائن کی وجہ سے ہر جگہ پر پسند کی جاتی ہیں خصوصا سیاحت کیلئے مختلف علاقوں سے آنیوالے افراد اسے اپنے لئے خریدتے ہیں۔

مہمانوں کے سیر کے دوران عثمان اور اس کے کزن اعجاز نے شانگلہ کیلئے تیاری کرلی تھی اور کھانے پینے کا سامان او چکن بھی خرید لیا تھا۔ شانگلہ کا علاقہ خوازہ خیلہ سے تقریبا چالیس منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ گاڑی میں سفر شروع ہوا تو احساس ہوا کہ سی این جی کا استعمال صرف شہر میں کیا جاسکتا ہے کیونکہ سی این جی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ پہاڑی موڑ اور چڑھائی پر گاڑی دوڑے۔اسی باعث پٹرول کا استعمال صحافی دوست عمران نے شروع کیا۔ لیکن کچھ دیر بعد پٹرول گرنے کا احساس ہوا۔ گاڑی جلدی سے سڑک کنارے روک دی تو پتہ چلا کہ انجن تک آنیوالی پٹرول کی پائپ لیک ہوئی ہیں اور پٹرول مسلسل ضائع ہو رہا ہے۔جلدی سے ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کی۔ بہت کوشش کی کہ پائپ ٹھیک ہو

لیکن شکر ہے کہ ایک دکان پر بیٹھے شخص جو کہ مستری تھا نے جلدی آ کر پٹرول کی پائپ میں ایلفی اور کھانے میں استعمال ہونیوالا سوڈا اور سلوشن ٹیپ کا ایسا استعمال کردیا کہ گاڑی سے پٹرول کی لیکج بھی بند ہو گئی اور ہمیں شانگلہ سے لیکر واپس پشاور تک پہنچنے میں کسی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ مستری نے جب یہ جانا کہ ہم مہمان ہیں تو اس نے پیسے لینے سے بھی معذرت کی لیکن ہمارے کنجوس دوست آفتاب نے بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچاس روپے اس کو تھما دیئے۔

خوازہ خیلہ سے شانگلہ کا بیشتر سفر چڑھائی کا تھا اور ہماری چھوٹی سے مہران گاڑی پانچ بندوں کا بوجھ اٹھائے جارہی تھی راستے میں مختلف پہاڑ دیکھے جو کبھی اتنے سرسبز تھے کہ جنگلات اس پر دکھائی دیتے تھے لیکن اب جنگلات کی کٹائی کے باعث بہت کم درخت دیکھنے کو ملتے لمبے درخت اور ہوا میں انوکھی خوشبو، دل کو بھلا لگنے والا یہ منظر انسان کی ساری تھکان دور کردیتا ہے اور جب ساتھ یں‌دوست بھی صحافی ہوں تو بہت مزا آتا ہے۔ میں توآفتاب کو چھیڑنے کیلئے کہتا کہ دیکھ لو کتنی زبردست خوشبو ہے، موسم کتنا پیارا ہے اور میں نہایا بھی چشمے کے پانی سے ہوں اس لئے لگتا ہے کہ میری عمر تیس ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر نوجوان بن گیا ہو۔ جس پر آفتاب غصے میں آکر کہتا کہ " پریگدہ مڑہ" تم تو بیوی سے بھاگ کر آئے ہو۔ نوجوان ہوگئے ہو تو دوبارہ

شادی تو نہیں کر سکتے اور اسی گپ شپ میں شانگلہ کے علاقے ٹوپسین پہنچے جہاں پر آرمی چیک پوسٹ پر تعینات پولیس اور آرمی اہلکاروں نے ہماری شناخت دریافت کی اور پھر جانے دیا ٹوپسین سے اترائی کا منظر بہت دلفریب ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر سیاحوں کو دیکھا جو اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء لیکر آئے تھے اور وہ اس کو پکانے میں مصروف عمل تھے ۔ ایک جگہ رک کر پہاڑی چشموں سے آنیوالا پانی پیا جسے مقامی دکاندار نے ایک حوض میں بند کرکے اس میں کولڈ ڈرنکس کی بوتل، آم اور دوسرے فروٹ رکھ دیئے تھے اور اتنے ٹھنڈے ہوگئے تھے کہ کولڈ ڈرنکس کو پینا اور فروٹ کھانا ۔جو کہ انتہائی سرد تھا اثرے دل گردے کا کام تھا

یخ تنگی کے مقام پر ایک جگہ ٹنگ ٹکور) میوزک (کا پروگرام نظر آیا ہم تمام ساتھی وہاں گئے تو پتہ چلا کہ رباب منگی کا پروگرام ہے جسے دیکھنے کیلئے لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی جس میں زیادہ تر سیاح تھے اور موسیقی اور گانے والے بھی سیاح تھے۔ جو یہاں آکر اپنے فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ پشتو زبان میں شاعری اور پھر رباب کیساتھ موسیقی نے اپنا ہی مزہ کیا۔ بعض من چلے جو کہ دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تھے نے تیز موسیقی بھی لگادی تھی۔ چونکہ اس سے پہلے ہم نے مقامی طور پر لوگوں سے سوالات کئے تھے جس سے انہیں اندازہ ہوا تھا کہ ہم صحافی ہیں اس لئے وہ لوگ بہت عزت دے رہے تھے

ایسے میں تیز موسیقی سن کر ہماری بھی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ جس طرح پرویز خٹک نے نشتر ہال میں میوزک پر ڈانس کرنے والے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ " یہ ہمارے رواج ہیں اور خٹک تو موسیقی کے سامنے مشکل سے ٹھہرتے ہیں" اور پھر ہم نے دل پر بہت جبر کیا کہ آخر " لوگ کیا کہیں گے" ۔ اور یوں ہم نے اپنی معصوم سی خواہش کا گلہ گھونٹ دیا۔

یخ تنگی کے مقامی لوگوں کے مطابق اس علاقے میں چار سے چھ ماہ تک مکمل طور پر برف پڑی رہتی ہیں جبکہ اس علاقے میں کوئی سکول نہیں اور یہاں کے بچے چار کلومیٹر دور سکول کیلئے روزانہ جاتے ہیں۔ روزگار کے کوئی مواقع نہیں بیشتر لوگ کراچی اور اسلام آباد میں کام کرتے ہیں اور اپنے گھر والوں کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہاں پر "ککوڑی" بھی کھائی ۔ بکٹ کو مقامی طور پر لوگ "ککوڑی " بھی بولتے ہیں۔ کہیں کہیں پر دکانیں ہیں۔ بی ایچ یو نام کی کوئی چیز نہیں۔ بیمار ہونے کی صورت میں مقامی لوگ اپنے بیمار کو چارپائی پر ڈال کر خوازہ خیلہ یا شانگلہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ جلانے کیلئے لکڑی کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ بیشتر بچیاں ہاتھوں میں دنداسہ لئے سیاحوں کو بیچنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ دنداسہ یہاں مقامی طور پر پیدا ہوتا ہے اور ہمارے ہاں خواتین اسے دانتوں کی صفائی کیلئے استعمال کرتی ہیں۔ ایک مقامی شخص نے علاقے میں سکول نہ ہونے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس علاقے کے بڑے امیر

مقام یا اس کے بھائی عباد اللہ جو اسی علاقے سے منتخب ہوئے ہیں اگر کوئی اقدام اٹھائیں تو وہ اپنی زمین سکول کو دینے کیلئے تیار ہیں لیکن.............

ہمارے گپ شپ کے دوران آفتاب اور اعجاز نے چکن کی ترکاری بنانے کا آغاز کیا اور صحافی دوست کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چکن کا اپنا مزہ تھا۔ پتہ نہیں کس ترکیب سے بنایا تھا لیکن میرے سامنے تو اس نے چکن مصالحہ ، ٹماٹر ، پیاز ، ہلدی ، لہسن ، گھی ، مصالحہ سب کچھ مکس کرکے ڈال دیا تھا جو تقریبا چار بجے تک تیار ہوا مقامی طور پر بننے والی روٹیاں ہم نے خرید لی تھی دکاندار ایک روٹی کی قیمت پندرہ روپے وصول کرتے ہیں چونکہ یہاں پر روٹی بنانے والے تندوروں کی دکانیں کم ہیں اس لئے زیادہ رش یہاں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں آکر زیادہ تر لوگ کھانا کھانے کو ترجیح دیتے ہیں بعض لوگ اپنے ساتھ فروٹ لیکر آتے ہیں جسے ٹھنڈے چشموں کے پانی میں ٹھنڈا کرکے کھاتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد واپسی کا آغاز کردیا۔ مانڑی کے مقام پر ایک لفٹ دیکھی جس پر دو پہاڑوں کے مابین بسنے والے افراد اپنے رابطے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ 2003 ء میں بننے والے اس لفٹ کے ذریعے مقامی لوگوں کو بہت سہولت ہوگئی ہیں اور وہ چار ہزار اونچائی پر پینتیس سو فٹ کا راستہ دس منٹ میں اسی لفٹ

کے ذریعے طے کرتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے ساتھ سیاحت کیلئے آنیوالے افراد بھی اسی پر سفر کرتے ہیں۔ میں تو خود ڈر رہا تھا کیونکہ ایک شخص نے کہا کہ ایک دفعہ کتا گر گیا تھا تو اس کی ہڈیاں تک نہیں ملی تھی۔ جب لفٹ آپریٹر سے پوچھا کہ کوئی حادثہ ہوا ہے تو اس نے بتایا کہ تیرہ سال میں کوئی حادثہ نہیں ہوا البتہ آج کچھ ہو جائے تو آپ کی قسمت ہے۔ اور پھر ہم چار دوست یہ کہتے ہوئے ایک دوست کو پیچھے چھوڑ گئے کہ اگر کچھ ہو جائے تو بریکنگ تو تم دیدوگے۔ لفٹ میں بیٹھ کر ایک پہاڑی سے دوسرے پہاڑی تک جانے کا انوکھا مزہ ہوتا ہے جس کیساتھ ڈر بھی ہو۔ساتھی آفتاب احمد نے جلدی سے موبائل فون سے اپنی سیلفیاں بھی بنوائیں۔ دوسرے پہاڑی پر واقع کوکلے تک پہنچے جہاں پر رہائش پذیر لوگوں نے مسلم لیگ ن کے امیر مقام اور اس کے بھائی عباداللہ جو اس علاقے سے منتخب ہوئے ہیں کے حق میں "دعائے خیر" کی کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی بیس ہزار آبادی پر مشتمل اس علاقے کے لوگوں کیلئے نہ کوئی سڑک ہے اور نہ ہی کوئی راستہ ہے اور وہ روزانہ چالیس روپے آنے جانے کیلئے لفٹ آپریٹر کو دینے کیلئے دیتے ہیں۔ ان کے بقول روزگار ہے نہیں اور ایسے میں اگر پیدل جائے تو چار گھنٹے لگتے ہیں ساتھی دوستوں نے تصاویر بھی بنوالیا اور پھر واپسی کا آغاز کیا۔واپس خوازہ خیلہ تک آتے آتے عمران ایاز اور آفتاب احمد نے مجھے قائل کیا کہ بس بہت ہوگیا گھر جاؤ۔

کونسے تمھاری نانی کا گھر یہاں پر ہیں ۔ عمران ایاز کا بھی کچھ کام تھا اور میں اپنے لمبی چھٹی کی قربانی

دیتے ہوئے شام سات بجے خوازہ خیلہ سے روانہ ہوئے اور رات ایک بجے واپس پشاور پہنچا۔

محترم ڈائریکٹر جنرل نیب/احتساب کمیشن خیبر پختونخواہ

جناب عالی!

گزارش ہے کہ آپ لوگ کرپشن کے خاتمے کیلئے کوشاں ہیں اور اس کے خاتمے کے دعوے بھی بہت کرتے ہیں۔ پشاور کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں غریب عوام کیساتھ کیسا گھناونا کھیل کھیلا جارہا ہے اس بارے میں آپ کو معلومات ہی نہیں۔ حالانکہ سرکاری ہسپتال ان غریب عوام کے پیسوں سے چلتے ہیں جو اپنی خون پسینے کی کمائی ٹیکسوں کی مد میں ریاستی حکام کو جمع کرتے ہیں تاکہ انہیں صحت کی سہولت فراہم ہوں۔ لیکن کیا ریاست یہ سہولت فراہم کر رہی ہیں یا صحت کے نام پر ان کے پشاور کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں کیا فراڈ کیا جارہا ہے یہ آپ کو اس خط سے مندرجات پڑھنے کے بعد ہی اندازہ لگ سکے گا۔

محترم! ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز خیبر پختونخواہ نے سال 2012ء میں نئے ایمرجنسی بلاک کیلئے مختلف سامان کی خریداری کیلئے اشتہار دیا تھا جو کہ ایک مقامی اخبار میں شائع ہوا جس میں 27 اگست 2012ء کو ٹینڈر کھولنے کی تاریخ دی گئی تھی۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لگائے جانیوالے سامان میں سی ٹی سکین مشین بھی شامل تھا۔ ایمرجنسی وارڈ اس وقت زیر تعمیر تھا اور کنٹریکٹر جو موجودہ حکومت میں عہدے پر فائز تھا اور آج کل زیر عتاب ہیں کے

زیر سایہ بننے والے ایمرجنسی وارڈ میں لگایا جانا تھا سی ٹی سکین مشین کیلئے مخصوص کمرہ بھی تعمیر کیا جانا تھا۔ سی ٹی سکین مشین چار سلائس کی مشین کیلئے دو کمپنیوں نے مقابلہ کیا دبئی کی ایک فرم نے ہسپتال انتظامیہ کی چار سلائس مشین کے مقابلے میں سولہ سلائس والی مشین دکھائی جس کی قیمت تین کروڑ ساٹھ لاکھ روپے تھی جبکہ دوسری کمپنی دو کروڑ ستر لاکھ روپے میں چار سلائس والی مشین دے رہی تھی تاہم انتظامیہ کے اصرار پر مذاکرات کے بعد سولہ سلائس کی مشین دو کروڑ ستر لاکھ روپے لیڈی ریڈنگ ہسپتال کو دیدی گئی اکتیس اگست 2013 ء کو مشین ہسپتال کو فراہم کردی گئی جس وقت ہسپتال کی سی ٹی سکین کیلئے سائٹ بھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ ہسپتال کی ریڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ نے کمپنی کی جانب سے دیئے جانیوالے سولہ سلائس کی مشین کو بہتر قرار دیا تھااور اس بارے میں سرٹیفیکیٹ بھی جاری کیا گیا جبکہ پاکستان نیوکلیئر ریگولیٹر اتھارٹی نے اس کیلئے باقاعدہ این او سی بھی جاری کیاتاہم ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لگائے جانیوالا سی ٹی سکین صرف ایک مرتبہ استعمال کیا گیاجو کہ 18 فروری 2014ء جس کے بارے میں کمپنی نے بھی رپورٹ جاری کردی تاہم مخصوص مفادات اور کمیشن کی لالچ میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی انتظامیہ نے آرمی پبلک سکول میں زخمی ہونیوالے سکول کے بچوں اور یہاں پر ایمرجنسی میں لائے جانیوالے افراد کیلئے اسے استعمال نہیں کیا۔ جو بذات خود ایک بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

محترم ! جس کمپنی نے سی ٹی سکین مشین ہسپتال کو فراہم کردی ہیں انھوں نے سی ٹی سکین مشین گارنٹی بھی دی کہ اگر اس میں کوئی خرابی سامنے آئی تو وہ اسے ٹھیک کرنے کے ذمہ دار ہونگے ۔ ہسپتال انتظامیہ نے ابھی تک نہ تو متعلقہ کمپنی کو سی ٹی سکین مشین کی ادائیگی کی ہیں اور نہ ہی اس کی خرابی سے متعلق کمپنی کو آگاہ کیا ہے تاکہ وہ آ کر اسے دیکھ سکیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور کی انتظامیہ نے ایک مخصوص جماعت سے تعلق رکھنے والے شخص کو جو کہ خیبر پختونخواہ میں صوبائی حکومت کی اتحادی ہے کو پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے نام پر سی ٹی سکین مشین کی سہولت فراہم کرنے کیلئے معاہدہ کیا ہے جو کہ زائد المعیاد بھی ہو چکا ہے لیکن " ہسپتال کی مخصوص " مافیا اور محکمہ صحت خیبر پختونخواہ کے " مخصوص لوگ " جنہیں کمیشن اور کرپشن کی عادت ہے نہ صرف زائد المعیاد معاہدہ کو مستقل دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں بلکہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پڑے ٹھیک سی ٹی سکین مشین کو خراب کرنے کا دعوی کر رہی ہیں ۔ اس بارے میں میڈیا کی ٹیموں نے جب بھی وہاں پر جانے کی کوشش کی تو معلومات تک رسائی " دعویدار حکومتی عہدیداروں نے اس بارے میں بات کرنے " سے بھی گریز کیا بلکہ ایمرجنسی میں پڑے سی ٹی سکین مشین کو تالے لگا دیئے کہ ان کی " کارکردگی " کسی کے سامنے نہ

آئے۔ اور اب ہسپتال میں یہ مشہور کیا جارہا ہے کہ سی ٹی سکین مشین کا رزلٹ ٹھیک نہیں آتا۔ حالانکہ اسی ہسپتال کے ریڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے انچارج نے باقاعدہ رپورٹ بھی دی ہیں کہ سی ٹی سکین کی سولہ سلائس کی مشین چار سلائس کی مشین کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔

محترم جناب! کچھ سوالات ہیں جن میں

اگر ایمرجنسی میں لگایا جانیوالا سی ٹی سکین مشین خراب تھا تو لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے* انچارج نے کس پوزیشن میں کمپنی کو لیٹر جاری کیا کہ سی ٹی سکین مشین ٹھیک حالت میں ہیں اور کام کر رہا ہے

پاکستان نیوکلیئر ریگولیٹری اتھارٹی نے کیوں اور کس بنیاد پر این او سی جاری کیا*

اگر مشین خراب ہوئی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہیں۔ اور کیا اس بارے میں کمپنی کو* کوئی تحریری لیٹر جاری کیا گیا کہ آیا اس میں متعلقہ فالٹ کو دور کیا جائے۔

فروری 2014 ء میں انسٹال کئے جانیوالے ایمرجنسی کے سی ٹی سکین مشین فراہم* کرنے والے ادارے کو کس بنیاد پر یہ کہا گیا کہ سابقہ کنٹریکٹر جو کہ اب " تبدیلی والی سرکار "کا ساتھی ہے نے ایمرجنسی وارڈ میں سی ٹی سکین مشین کیلئے جگہ نہیں بنائی اس لئے متعلقہ کمپنی ہی سی ٹی سکین مشین کیلئے کمرہ

تعمیر کرے۔ کیونکہ محکمہ صحت کے حکام اس بارے میں متعلقہ شخصیت سے بات کرتے
ہوئے ڈرتے تھے ۔

سی ٹی سکین فراہم کرنے والی کمپنی کو ادائیگی اب تک کیوں نہیں کی گئی ' اور اگر کی گئی*
ہیں تو متعلقہ کمپنی کو پیسہ کیوں نہیں ملا۔ اور اگر پیسے جاری ہوئے ہیں تو کونسے شخصیت
نے بینک میں رکھے ہیں کہ ڈھائی سال سے سود کا منافع اسے مل رہا ہے ۔

کیا ہسپتال انتظامیہ نے اس وقت آنکھیں بند کر رکھی تھی جب سی ٹی سکین مشین فراہم *
کرنے والے کمپنی نے ہسپتال انتظامیہ کو دیئے گئے بروشرز میں لکھا تھا کہ یہ مشین امریکہ
میں نہیں ۔

کیا یہ ضروری ہے کہ جو حکومت کا اتحادی ہو اسے ہی ہسپتال کے اندر جگہ فراہم کی*
جائے کہ وہ مریضوں کو ہسپتال میں لوٹ سکیں ۔

ڈھائی سال سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود متعلقہ سی ٹی سکین مشین کو کیوں بند*
رکھا جارہا ہے ۔ کیا یہ عوامی پیسے کا ضیاع نہیں۔ اور اگر ہاں تو اس کا ذمہ دار کون ہیں ۔

جتنے اموات آرمی پبلک سکول سمیت دیگر ایمرجنسی میں لائے جانیوالے افراد کی *
ایمرجنسی میں سی ٹی سکین نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہیں اس کے ذمہ داروں کا تعین کون
کریگا۔ اور کیا ان کو سزا ملے گی

اور کیا یہ سب کچھ "کمیشن "کا چکر تو نہیں جس کی وجہ سے گذشتہ ڈھائی *

-سالوں سے لاکھوں افراد لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں آ کر خوار ہوئے

یہ وہ سوالات ہیں۔ جن کا جاننا صوبہ خیبر پختونخواہ کے عوام جاننا چاہتی ہیں اور اگر یہ سب کچھ سچ ہیں تو پھر آپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے کرپٹ حکام کے خلاف کاروائی کرے۔ ثبوت اگر آپ کو چاہیئے تو بس ذرا سی خواری کرنے پڑیگی۔ دوسری صورت میں " اللہ تعالی "کی عدالت میں جب آپ حاضر ہونگے تو اسے ۔ ثبوتوں " کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ۔کیونکہ انسانی جسم خود اپنے اوپر گواہی دیگا "

والسلام

ایک شہری

! کیا اس جہان میں سارے بکاؤ ہے

موبائل فون پر میسج آگیا کہ آپ کے اکاؤنٹ میں پانچ سو روپے لیزی لوڈ ڈال دیا گیا ہے ، جو گھنٹے میں آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائینگے اور پھر آپ اسے استعمال کر سکیں گے- یہ وہ میسج ہے جسے مہینے کے آخری ہفتے جب ملازمت پیشہ شخص کی تنخواہ بھی دوسرے ہفتے میں آتی ہو جب مل جائے تو یقیناً خوشی ہوتی .ہے میں بھی اسی خوشی کا شکار ہوگیا کہ چلو اللہ نے مہربانی کی کسی نے غلطی سے موبائل میں پیسے ڈال دیئے لیکن ساتھ ہی میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھ میں کونسے سرخاب کے پر لگے ہیں یا پھر کونسا میں نے اتنا بڑا تیر مارا ہے کہ مجھے پانچ سو روپے کا لیزی لوڈ کوئی کرے ، دماغ پر زور دیا تو یاد آیا کہ آدھے گھنٹے پہلے ایک پولیس اہلکار نے موبائل فون پر کہا تھا کہ " آپ نے جو رپورٹ بنائی ہے " بھائی کی حیثیت سے میرا خیال کریں اور کچھ نہ کریں - دل میں یہی سوال گونج رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ پانچ سو روپے کا لیزی لوڈ اسی پولیس اہلکار نے کیا ہوگا- اسی لمحے موبائل فون پر رنگ آئی اور پوچھا گیا کہ " سر جی پانچ سو روپے کا لیزی لوڈ مل گیا" میں نے سوال کیا کہ کون ہو تو اس نے جواب آیا کہ آپ کا بھائی ہو ، ابھی آپ سے بات ہوئی تھی میں نے بھائی ہوتے ہوئے پانچ سو روپے لیزی لوڈ آپ کو کر دیا ہے- میں نے جواب دیا کہ مجھے تو بہت پہلے سے جانتے ہو

اس نے جواب دیا کہ بالکل، پھر میں نے دوسرا سوال کیا کہ کبھی میں نے آپ سے، پیسوں کا مطالبہ کیا ہے اس نے کہا کہ نہیں، اس کا جواب سن کر میں نے دوبارہ اس سے کہا کہ بھائی آج پھر کس کھاتے میں بھائی بن گئے ہو کہ پانچ سو روپے لنڑی لوڈ کردیا۔ اس نے کہا کہ آج ایسے ہی دل کررہا تھا کہ تمھیں پیسے بھیج دو۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی میرے ہر دو ہفتے بعد میں اپنے موبائل فون پر میسجنگ کیلئے ڈھائی سو روپے اپنی جیب سے ڈالتا ہوں اور یہ سلسلہ گذشتہ پانچ سال سے جاری ہے اور تمھارے پولیس کے بہت بڑے بڑے آفیشل کو میں میسج کرتا ہوں کہ تمھارے ادارے میں یہ چل رہا ہے اب تم مجھے پانچ سو روپے میں خریدنے کی کوشش کررہے ہو، جس پر متعلقہ پولیس اہلکار نے "غلطی ہوگئی جناب" کہہ کر فون بند کردیا-

یہ اس خیبر پختونخواہ پولیس کا قصہ ہے جس کے بارے میں عمران خان "منہ پھاڑ" کر اعلان کرتے ہیں کہ تبدیلی آگئی ہے۔ ہم نے اصلاحات کے عمل کا آغاز کردیا ہے -یہ تبدیلی شائد ان کی نظر میں آئی ہوگی لیکن اس کے ثمرات عوام کو کہاں مل رہے ہیں اس کیلئے بھی " پی ٹی آئی کارکن" ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کی نظر میں ہر چیز تبدیل ہوچکی ہیں۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک ممبر قومی اسمبلی خیبر پختونخواہ میں آکر پولیس پر ڈاکومنٹری بنا کر سوشل میڈیا پر پھیلا دیتے ہیں جنہیں لوگ نیٹ پر دیکھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ واقعی خیبر

پختونخواہ میں پولیس کلچر تبدیل ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ تبدیل نہیں ہوا ہوگیا ہے لیکن سو فیصد میں صرف 12 فیصد، وہ بھی ہاتھی کے دانت ہیں جو کہ کھانے کے اور ہیں اور دکھانے کے اور ہیں۔

تین دن قبل پشاور کے تھانہ تاتارا پولیس کی ایک وین جس میں پولیس اہلکار سوار تھے نے کارخانو مارکیٹ سے گنڈا مار) مقامی زبان (کپڑا لے جانیوالے کچھ موٹر سائیکل سواروں کو روکنے کی کوشش کی تاکہ انہیں بھی اپنا "رزق "مل سکے۔ روزانہ پولیس اہلکاروں کو "دانہ پانی "ڈالنے والے تین گنڈا ماروں میں سے دو نے موٹر سائیکل بھگا لی تاکہ دو سو روپے بچ سکیں جبکہ ایک جس کا تعلق تہکال سے تھا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھانے کی حدود میں رائیڈنگ کرنے والے متعلقہ اہلکاروں نے اپنا غصہ آخری موٹر سائیکل سوار گنڈا مار پر نکال دیا اور گاڑی کی ٹکر سے گرا دیا جس کے نتیجے میں گنڈا مار کے دونوں ہاتھ، چہرہ زخمی ہوگئے جبکہ اس کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ پولیس اہلکاروں نے موقع سے گرفتار کئے جانیوالے گنڈا مار کی وہ حالت کردی کہ اسے ہسپتال لے جانا پڑا اور آج بھی وہ حیات آباد میڈیکل کمپلیکس کے وارڈ میں زیر علاج ہے۔ تاہم پولیس اہلکاروں نے واقعے کو دبانے کا سلسلہ جاری رکھا چونکہ زخمی ہونیوالا افغان مہاجر تھا اور اسی کے ذریعے وہ اپنے گھر والوں کیلئے روزی روٹی کا بندوبست کرتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اپنے والد کی زخمی ہونے کی اطلاع ملتے ہی ہسپتال

پہنچ گئے۔ جہاں پر عوامی ٹیکسوں پر پلنے والی "پولیس کے جوانوں "کا موقف تھا کہ چونکہ غریب گنڈا مار نے پولیس کی وین کو بھی "زخمی "کیا ہے اس لئے اس حالت میں بھی " خرچے پانی "کا بندوبست کردو، ورنہ کچھ کر سکتے ہو تو کرلو، اور وہ غریب گنڈا مار اپنے بچوں کو دیکھ کردل ہی دل میں کھول رہا تھا کہ ان بچوں کا پیٹ بھروں یا ان "حرام خوروں" کا جو اتنی زیادتی کے باوجود بھی بدمعاشی پر تلے ہوئے ہیں۔

ہمارے کچھ دوستوں کو اطلاع ملی جنہوں نے موقع پر پہنچ کر زخمی ہونیوالے شخص کا بیان ریکارڈ کردیا اور ساتھ میں اس کی تصاویر لی۔ساتھی وہاں پر ہسپتال میں تھے کہ مجھے افغان مہاجر کو زخمی کرنے والوں کا فون آیا کہ ہم تو زخمی کا بہت خیال کر رہے ہیں اور اپنے جیب سے اس کا علاج کر رہے ہیں لیکن اپنا بھائی سمجھ کر ہمارا خیال کریں، میں نے بھی روٹین کی بات سمجھ کر ہاں کہہ دیا کہ چلو "ہاتھ ہولا رکھینگے"۔کچھ دیر بعد ایک جونیئر کا فون آیا کہ بھائی میں آپ کے فلاں دوست کا بھائی ہو، جس بندے سے یہ واقعہ پیش آیا ہے وہ میرا دوست ہے اور اس کا خیال رکھیں، میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی میرے میں تو یقین دہانی کرا چکا تھا لیکن تمھیں پتہ ہے کہ وہاں پر کیا ہوا ہے کہ تو جونیئر صحافی نے جواب دیا کہ گنڈا مار نے پولیس وین کو ٹکر مار دی۔ میں نے جواباً اس سے پوچھا کہ تم بھی اسی معاشرے کا حصہ ہو، کیا گنڈا مار پولیس

وین کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر موٹر سائیکل پولیس وین سے ٹکراتا ہے۔
تم اس دوست اور میرا خیال کئے بغیر خدا کے خوف سے صحیح جواب دو، جس پر اس صحافی نے کہا کہ "سرجی آپ کی بات ٹھیک ہے" میں نے پھر اس سے کہا کہ اگر ایسا میرا بھائی بھی کرتا تو جو کچھ میں کر رہا ہوں ایسے ہی میں اس کے ساتھ بھی کرتا۔ بھائی ہونا اپنی جگہ لیکن کیا خدا کے سامنے میرا بھائی میرے لئے کھڑا ہوگا جس کے جواب میں جونیئر صحافی نے موبائل فون بند کر دیا۔
اور پھر موبائل فون میں پولیس کانسٹیبل نے پانچ سو روپے کا لنزی لوڈ کر دیا جیسے اس نے مجھے خریدنے اور منہ بند رکھنے کی کوشش کی کہ بھائی یہ پانچ سو روپے کا لنزی لوڈ لو اور خاموش ہو جاؤ-یقیناالله تعالی کے اس خوبصورت جہان میں قیمت ہر کسی کی لگتی ہیں یہاں ہر شخص دوسرے کو اپنے نظر میں تولتا ہے اور اس کی قیمت لگا دی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ یقیناًخریدار کی دی ہوئی رقم پر بک بھی جاتے ہیں کچھ ڈیل کر جاتے ہیں، کچھ خریدے جانے کی آس پر ساری عمر رہتے ہیں جبکہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں خریدا ہی نہ جائے۔) میں صحافی ہوں ہمیشہ اپنی نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہو اگر کچھ لوگوں کو مسئلہ ہو تو وہ حکومتی ترجمان بننے کے بجائے متعلقہ پریس انفارمیشن افسران) کو ایکٹیو کریں

--- بچے ہمارے عہد کے، ذمہ داری کس کی

میں نے دکاندار سے قلم مانگا اور کہا کہ ساتھ میں تختی اور گاچی بھی دے دینا۔ دکاندار میری بات سن کر اندر چلا گیا۔ ساتھ موجود بیٹیاں حیران ہو گئی کہ پپا کو کیا ہو گیا ہم نے تو بلیک اور بلیو انک) سیاہی (لے لی ہیں ساتھ میں پین اور انک ریمور بھی لیا ہے اب یہ کیا چیز مانگ رہے ہیں۔ میری گڑیا ماہین سے صبر نہ ہو سکا آخر کار پوچھ ہی لیا کہ پپا یہ قلم کیا چیز ہے۔ اور گاچی کس چیز کو کہتے ہیں اس کا کام کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ صبر کرو ابھی دیکھ لو گی۔ دکاندار نے تختی، قلم اور گاچی رکھ دی۔اور میں نے بیٹیوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ اس پر لکھائی کرکے تمھاری رائٹنگ اچھی ہو جائیگی۔ اور وہ حیران نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ میری بڑی بیٹی مشعل نے ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ یہ "وہ چیزیں" ہیں جو ہم ٹی وی پر دیکھتے ہیں اور لوگ اس پر لکھتے ہیں۔اور جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔ یہ نہیں کہ میری بچیاں چھوٹی ہیں یا سکول نہیں پڑھ رہی۔الحمد اللہ میری دس سالہ جڑواں بیٹیاں مشعل، ماہین کلاس فائیو کی طالبات ہیں جبکہ اس سے دو سال چھوٹی مناہل کلاس تھری کی طالبہ ہیں اور ایک مقامی پرائیویٹ سکول میں پڑھ رہی ہیں۔ٹیوشن اور قرآن پاک کی پڑھائی سے جب بھی موقع ملتا ہے تو کمپیوٹر پر گیمز کھیلنا شروع کر دیتی ہیں۔ سکول کی

چھٹیوں میں جوڈو کی کلاسز بھی لیتی رہی ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ قلم اور تختی انہوں نے بچپن سے لیکر گذشتہ روز تک نہیں دیکھی۔

میں ان کے ساتھ ان کے امتحان کیلئے پین اور پنسل لینے کیلئے بازار آیا تھا۔ کہ اس دوران بیٹیوں کی خوشخطی کا خیال ذہن میں آگیا اسی بناء پر میں نے دکاندار سے قلم اور تختی کی ڈیمانڈ کردی۔دکاندار سے تختی ، قلم اور گاچی لیکر میں گھر آگیا اور پھر میں نے اپنے بچوں کو سمجھانا شروع کردیا کہ قلم سے لکھائی کیسی کی جاتی ہیں اور تختی پر گاچی کس طرح استعمال کی جاتی ہیں ور کس طرح پنسل سے اس پر لائن ماری جاتی ہیں۔ سب بچوں کو سمجھ آگی اور پھر میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا کہ بچے اپنا کام خود کرینگے بعد میں دیکھ لونگا۔

کچھ دیر بعد میں نے اپنی بھانجی کو دیکھا جو کہ بائیں ہاتھ سے لکھ رہی تھی اور اب پ کے بجائے اے بی سی اور ایک دو کے بجائے ون ٹو کہہ کر لکھ رہی تھی جب میں اس سے سوال کیا کہ کیا اردو میں الفاظ بولنا نہیں آتا تو وہ خاموشی سے میرا منہ دیکھ رہی تھی یہی کیفیت میرے بیٹے حاشر کی بھی تھی جو کہ تختی پر ایک لفظ غلط لکھنے کے بعد اسے مٹانے یا ٹھیک کرنے کے بجائے دوسرے لائن میں لکھنے بیٹھ گیا یعنی ایک جگہ چھوڑ دی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا اس

طرح نہیں کرتے کہ غلطی اول تو کوشش کرو کہ نہ ہو۔اگر ہو جائے تو اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔

یہ میرے اپنے گھر کا قصہ ہے۔، کتنے ایسے گھرانے ہیں جو ہمارے ارد گرد رہائش پذیر ہیں اور ایسی ہی صورتحال سے دو چار ہیں۔ہم اپنے بچوں کو پرائیویٹ سکول میں پڑھا رہے ہیں اور انگریزی زبان پر ہماری پوری توجہ ہے لیکن ہماری اپنی مادری زبان پشتو، قومی زبان اردو کے بارے میں آنیوالی نسلوں کو کچھ معلوم ہی نہیں۔اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو پشتو بول سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے یا پھر پڑھ نہیں سکتے۔لیکن اس سے بدتر تو ہماری آنیوالی نسل ہوگی جنہیں ون، ٹو، تھری کا پتہ ہوگا لیکن اردو اور پشتو زبان میں انہیں نہ تو حروف تہجی کا پتہ ہے اور نہ ہی ہندسوں کا، کہ کس طرح بولتے ہیں انہیں سمجھ ہی نہیں آتی۔ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ "کوا چلا ہنس کے چال اپنی بھی بھول گیا "۔

ٹھیک ہے کہ ہمارے عہد کے بچے تعلیمی شعبے میں میں بہت تیز ہیں۔کمپیوٹر کے دور میں پیدا ہونیوالے بچے موبائل فون بھی دو سال کی عمر سے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی کے استعمال نے انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ جو کام ہم لوگ مہینوں میں کرتے تھے آج ہمارے بچے ہفتے

میں کر لیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہماری آنیوالی نسل پیدل نہیں چل سکتی، موٹر سائیکل ،گاڑی کی سواری نے جیسے انہیں اپاہج بنا دیا ہے ۔ اس میں صرف قصور وار والدین نہیں کہ بچوں کو کھیلنے کودنے کے مواقع نہیں دیتے بلکہ حکومت بھی برابر کی شریک ہیں کہ سکولوں میں کھیلنے کے میدان تک نہیں۔ بچے فیس بک پر فرینڈشپ تو کر سکتے ہیں لیکن عملی میدان میں گلیوں میں پھر نہیں سکتے، دوستیاں نہیں کر سکتے۔

اگر بچے کو کسی سمندر میں پھینک دیا جائے تو دو چیزوں کا خطرہ ہے یا تو وہ اس میں ڈوب جائیگا یا پھر سمندر کے لہریں اسے اتنا بے حال کریگی کہ اگر وہ بچ بھی نکلے تو وہ کم از کم اسے اپنی معمول پر آنے میں بھی بہت زیادہ وقت لگے گا۔یہی حال ہمارا بھی ہے ہم نے اپنے بچوں کو ایسے سمندر میں پھینک دیا ہے جہاں سب کچھ ہے لیکن انہیں ہم نے تیرنا ہی نہیں سکھایا۔تو لازما ہمارے بچے یا تو ڈوب جائینگے یا پھر ایسے بے حال ہونگے کہ انہیں اپنی معمول پر آنے میں بھی زمانے لگیں گے۔

عوام اور حکومت کی توجہ ان چیزوں کی طرف کون دلائیگا۔ کیونکہ ہر ایک شہری کو غم روزگار ذہنی تناؤ نے اور حکمرانوں کی "مال بناؤ" مہم نے بنیادی نکات کی طرف سے لاپرواہ کر دیا ہے کیا ہمارا میڈیا اس میں کوئی کردار ادا کر سکتا

ہے اور اگر کر سکتا ہے تو کیا کردار اور یہ کب ہو گا اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ورنہ پھر..............کچھ نہیں بچے گا

خواجہ سرائوں سے متعلق سیمینار ' تحقیر اور مذاق

جب کسی شخص کو اس کی جسمانی ساخت کی بناء پر مخصوص روزگار کیلئے مختص کیا جائے اور اس پر دیگر کاروبار اور ملازمت کے مواقع بھی بند ہوں ساتھ میں ستم ظریفی یہ ہو کہ اسے معاشرے میں وہ مقام حاصل نہ ہو جو کہ عام لوگوں کو حاصل ہوں ' ویسے ہمارے معاشرے میں عام شہری کو کونسے حقوق حاصل ہے لیکن پھر بھی جتنے حقوق حاصل ہے اس جیسے نارمل انسانوں کے حقوق حاصل نہ ہو تو ایسے لوگ کیا کرینگے۔ میں ذکر کررہا ہوں اپنے معاشرے میں اردگرد پھیلے ہوئے خواجہ سرائوں کا، جن کا اس طرح کی پیدائش میں ان کا کوئی دوش نہیں ۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ان جیسے لوگوں کو کن القابات اور کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے اس کا مزید اندازہ گذشتہ روز پشاور پریس کلب میں منعقدہ ایک سیمینار میں ہوا۔ جس میں صوبہ بھر کے مختلف علاقوں سے آنیوالے خواجہ سرائوں نے شرکت کی اور اپنی مشکلات سے آگاہ کیا۔

پریس کلب کے پروگرام میں شرکت کے دوران میں خواجہ سرائوں کی مشکلات سنتے ہوئے اپنے بچپن کی یادوں میں پہنچ گیا جب ہماری سکولنگ کے دوران چھٹی کلاس میں ایک لڑکا جو انتہائی شریف تھا وہ بھی ایسا ہی تھا اس کے ہاتھ ہلانے کا انداز ' بات کرنے کا انداز ' اس بات پر لوگ اسے چھیڑتے تھے اور وہ کھیل کے میدان میں ایک سائیڈ پر بیٹھ کر ہمیں دیکھتا تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہوگا

لیکن اپنے کلاس میں سب سے زیادہ گپ شپ کرنے والا اور شریف لڑکا وہی تھا کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی لوگ اسے چھیڑتے اور میں کبھی کبھار اس کی سائیڈ بھی لیا کرتا تو میرے ساتھی مجھے بھی چھیڑتے کہ خیر تو ہو کہ اس کی سائیڈ لے رہے ہوں اور میں شرمندگی کے مارے کھل کر اس کا ساتھ بھی نہیں دے پاتا تھا۔
پھر غم روزگار کے چکر میں ایک اخبار میں ایسے ہی فرد سے ملاقات ہوئی جو میرے ایک نزدیکی دوست کا انتہائی قریبی ساتھی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اسکے اطوار و انداز زمانے کے مروجہ اصولوں سے مختلف تھے لوگ اسے چھیڑتے مگر میرا ساتھی اس کا ساتھ دیتا۔ اس کی بدقسمتی یہی تھی کہ آٹھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور بہنوں کے سائے پلتے بڑھتے اس کی چال ڈھال میں تبدیلی آ گئی اسی بناء پر لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے اور تنگ کرتے لیکن بڑے دل کا مالک تھا کسی کی برائی نہیں کرتا تھا۔ اپنے دوست کے توسط سے میری اس سے دوستی ہوئی اور یہ دوستی آج تک قائم و دائم ہے میرا وہ دوست آج دو بچوں کا والد ہے اور اچھی پوسٹ پر تعینات ہیں لیکن پھر بھی معاشرے میں اسے وہ مقام حاصل نہیں کیونکہ جہاں بھی وہ جاتا ہے اسے تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔
سول سوسائٹی کی جانب سے پشاور پریس کلب میں ہونیوالے سیمینار میں شرکت

کیلئے جب میں دفتر سے نکلنے لگا تو میرے کچھ ساتھیوں نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا کہ خیر تو ہو آج پھر سرپرست بنے ہوئے ہو اور میں اپنے دوستوں کی باتیں سنی ان سنی کرتا ہوا پریس کلب پہنچا جہاں پر معاشرے کے دھتکارے ہوئے بہت سارے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہیں ہم خواجہ سراء کہتے ہیں ان میں کچھ بزرگ خواجہ سراء بھی موجود تھے' جنھوں نے اپنے مسائل بیان کئے جن کا کہنا تھا کہ ان کی پیدائش میں ان کا کوئی قصور نہیں اللہ تعالی نے ہمیں ایسے پیدا کیا ہے کوئی شوق سے خواجہ سرا نہیں بنتا' ایک خواجہ سرا اپنی مشکلات بیان کرتے ہوئے رو پڑا اور کہا کہ اگر کوئی خواجہ سرا بننا چاہے ت وہ ایک کروڑ روپے دینے کو تیار ہے کوئی خواجہ سرا تو بنے۔ تا کہ اسے پتہ چلے کہ یہ کیسا دکھ ہوتا ہے کہ نہ تو ہمیں مرد اپناتے ہیں اور نہ ہی ہمیں عورت ذات اپناتی ہیں۔ اگر حکومت بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کرتی تو ہمارے لئے خواجہ سرا کا لفظ شناختی کارڈ میں لکھے اور ہمارے شناختی کارڈ بنائے۔ لیکن حکومتی عدم تحفظ کا رونا رونے والے ان خواجہ سرائوں کا موقف ہے کہ عام لوگوں کی بہ نسبت ہمارا شناختی کارڈ بھی نہیں بنتا اور اگر کاغذات مکمل بھی ہوں تو پھر ہماری تصدیق کوئی نہیں کرتا۔ پختون معاشرے میں رہتے ہوئے ہم گھر والوں سے دور رہتے ہیں کیونکہ ہماری وجہ سے ہمارے بہن بھائیوں 'ماں باپ اور رشتہ داروں کو لوگ طعنے دیتے ہیں کہ تمھارا یہاں ہیجڑا ہوا ہے جسے سن کر بعض اوقات ہمارے گھر والے ہمارے مارتے ہیں اور بعض اوقات ایسی نظروں سے دیکھتے

ہیں کہ اپنے آپ سے گھن آتی ہیں لیکن ہم کریں بھی تو کیا کریں۔ایسے معاشرے میں جہاں ہر کوئی روزگار کیلئے بھاگ دوڑ میں مصروف عمل ہے اب خواجہ سرا روزگار کیلئے نکلتے ہیں تو انہیں روزگار نہیں ملتا۔ انہیں اتنا تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ مجبورا میوزک اور ڈانس تک محدود رکھا جاتا ہے یا پھر ہمارے کچھ مخصوص ذہنیت کے لوگ انہیں "جنس" کی منڈی سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ اپنی جنسی ہوس بجھانے کیلئے کہیں پر انہیں زبردستی زیادتی کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔

سیمینار کے دوران پتہ چلا کہ پشاور میں اس وقت چھ سو کے قریب خواجہ سراء موجود ہیں اور صوبے کے اٹھارہ اضلاع میں کئے گئے سروے میں ہزاروں خواجہ سراء ہیں جن کی اپنی اپنی چھوٹی تنظیمیں ہیں لیکن سرکاری طور پر انہیں پوچھنے والا نہیں نہ ہی رجسٹرڈ طور پر ان کی تعداد سرکاری کاغذات میں موجود ہیں۔ ایک خواجہ سراء جس کی بینائی ختم ہو چکی تھی اور شادی شدہ تھا وزیر اعلی خیبر پختونخواہ کے علاقے سے تعلق تھا آج وہ روزگار کیلئے رو رہا تھا نہ تو اسے نوجوانی میں کوئی روزگار ملا مجبورا میں ڈانس اور میوزک کی جانب چلا گیا اور آج اس حال میں ہے کہ وہ بے نظیر انکم سپورٹ اور زکواۃ کی امداد کیلئے بھی دہائی دے رہا تھا۔ صوبے کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے خواجہ سرائوں نے بتایا کہ پاپی پیٹ ہر ایک کیساتھ لگا ہوا ہے اگر معاشرے کا

کوئی شخص انہیں رقم دے سکتا ہے تو وہ گھر بیٹھنے کو بھی تیار ہے لیکن کوئی انہیں مہینے کے ایک ہزار روپے دینے کو بھی تیار نہیں-ایک خواجہ سرا نے کہہ دیا کہ " ہیجڑے سے ہم خواجہ سرا" ہو گئے ہیں یعنی ہماری عزت ہو گئی ہیں ورنہ پہلے تو ہم ہیجڑے کہلائے جاتے تھے۔

کچھ عرصہ قبل ایک اخبار کے کلر ایڈیشن کیلئے کئے جانیوالے خواجہ سرائوں کے انٹرویو میں ایسے خواجہ سرا سے بھی ملاقات ہوئی تھی جس کا تعلق ایسے ضلع سے ہے جن کے لوگ سیاست کے میدان میں نمایاں مقام رکھے ہیں وہ خواجہ سرا اپنی بہنوں کیلئے پشاور میں ڈانس اور میوزک کے کاروبار سے مجبورا وابستہ تھا بقول اس کے گھر والوں کو اس کے روزگار کے بارے میں نہیں پتہ ' گریجویشن تک تعلیم حاصل کرنے والا وہ خواجہ اپنے گھر والوں کی پیٹ کی خاطر پشاور میں موسیقی اور ڈانس کا کام کرتا تھا۔ اس کے بقول مہینے میں دو دن وہ گھر گزارتا اور باقی وہ پشاور میں کام کرتا اور جب وہ گھر جاتا تو یہی ظاہر کرتا کہ اسے پنجاب میں کسی ہوٹل میں ملازمت ملی ہیں ۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ اسے روزگار کسی ہوٹل میں ملے لیکن نہیں ملی تھی اور وہ مجبورا یہاں پشاور میں موسیقی سے وابستہ تھا مہینے میں وہ گھر والوں سے جا کر چپکے سے ملتا اپنی ایک مہینے کی کمائی والدہ کو دیتا-تاکہ اس کی گھر بیٹھی بہنوں اور والدین کی زندگی آرام سے گزرے-یعنی اس خواجہ سراء میں اتنا ایثار تھا کہ گھر والوں کی اہمیت اس کی زندگی میں تھی لیکن ہمارے معاشرے میں اس کی قربانی کو

کوئی دیکھنے والا نہیں تھا ہاں اسکے انداز کو تحقیر اور مذاق کا اڑانے والے ہم سب لوگ ہی تھے۔

سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ اس معاشرے میں جہاں ہر ایک شخص اپنا آواز ' احتجاج اٹھا سکتا ہے یہ واحد طبقہ ہے کہ ان کی آواز کو بھی مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے میڈیا بھی ان جیسے لوگوں کو وہ مقام نہیں دیتا۔ انہیں معاشرے میں مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں ان کیساتھ ہونیوالی زیادتیوں کی نشاندہی کے بجائے ان کے مذاق اڑانے والے پوز دکھائے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ خواجہ سرا ہے لیکن کیا یہ لوگ انسان نہیں۔ بچپن میں کان میں سنائی جانیوالی ایک اذان سے مسلمان ہونیولے ہم سب انہیں مسلمان ماننے کو بھی تیار نہیں۔اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں اگر کبھی کوئی خواجہ سرا نماز پڑھنے کیلئے مسجد آئے تو ہم لوگ کیسے اور کن نظروں سے انہیں دیکھتے ہیں۔اپنی روح کی زبان سمجھنے والوں کو "ہم" برا کہنے والے کون ہیں۔

سپریم کورٹ نے ملازمتوں میں ان خواجہ سراؤں کو دو فیصد کوٹہ دینے کے احکامات بھی جاری کئے ہیں ' شناختی کارڈ کے حصول سمیت انہیں بنیادی انسانی حقوق دینے کے احکامات بھی جاری کئے گئے ہیں لیکن اس پر عملدرآمد نہیں ہورہا اور یہ لوگ 2011 ء میں کئے گئے فیصلے پر عملدرآمد کیلئے خوار ہورہے

ہیں۔

سیمینار میں کافی اچھی باتیں ہوئی لیکن سب سے اچھی بات کہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر نے شناختی کارڈ کی تصدیق کی یقین دہانی بھی خواجہ سرائوں کو کرائی اور ساتھ میں کہا کہ اگر کسی کو مسئلہ ہے تو خواجہ سرا اپنے مشکلات لیکر ان کے پاس آ سکتے ہیں۔

سیمینار منعقد کرانے والے ادارے کی کاوشیں بھی قابل تحسین ہیں جنہوں نے معاشرے کے اس دھتکارے ہوئے طبقے کی آواز بننے کی کوشش کی۔ یقینا اس میں انہیں کافی مشکلات بھی سامنے آئینگی لیکن کسی بے آواز کیلیئے آواز اٹھانا کتنی بڑی بات ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس کا پتہ ہو۔ آخر میں ایک بات جو میں ایک خواجہ سرا نے انٹرویو کے دوران مجھے بتائی تھی کہ جو لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں تو ہم اپنی چپل الٹی کرکے بددعا دیتے ہیں کہ اے اللہ ان لوگوں کے گھر میں بھی خواجہ سرا پیدا کرتا کہ ان لوگوں کو بھی احساس ہو کہ یہ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ (سمجھدار کیلیئے اشارہ ہی کافی ہے)

کون بنے گا مسیحا ایک معصوم طالب علم کیلئے

تیرہ سالہ سلمان کو سکول سے نکلنے کے بعد آج دکان پر جانے کی بہت جلدی تھی کیونکہ آج مہینے کا آخری دن تھا اور اسے پتہ تھا کہ اسے استاد مہینے کے پیسے ادا کریگا اس لئے وہ بہت خوش خوش دکان جارہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جو پیسے سکول کی فیس سے بچ جائیں گے اس میں وہ اپنی لئے سکول کی نئی یونیفارم بھی خریدے گا۔ مقامی پرائیوٹ سکول میں آٹھویں کلاس میں پڑھنے والا سلمان آفریدی اپنے کلاس کے تیز ترین اور قابل بچوں میں سے تھا۔ ذہن میں اپنی نئی یونیفارم اور سکول فیس کی گردان کرتے ہوئے سلمان آفریدی دکان پر گیا جہاں پر اسکے استاد جو کہ اس کا کزن بھی تھا اور یو پی ایس کا کاروبار کرتا تھا نے اسے بستہ دکاندار پر رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ جلدی آجاؤ بازار سے روٹیاں لے آؤ۔ تم بھی تھکے ہوئے ہو کھانا بھی ساتھ کھالیں گے اور پھر کام بھی کرینگے۔

تیرہ سالہ سلمان آفریدی جسے اس کے والد نے اس کی سکول کے اخراجات کم کرنے اور ہنر سیکھنے کیلئے دکان پر بٹھایا تھا۔ سلمان نے استاد سے پیسے لئے اور بازار سے روٹی لینے کیلئے نکل پڑا۔ دکان سے نکلنے کے ساتھ وہ روڈ کنارے کھڑا ہوگیا کہ گاڑیوں کا رش کم ہو اور وہ سڑک عبور کرکے روٹیاں لے آئے۔ اس

وقت بازار میں آرمی کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلہ گزرنے کے ساتھ ہی جیسے ہی سلمان نے قدم اٹھایا کہ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ اور پھر سلمان کو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں آگ لگی ہو اور خون کے فوارے بہ رہے ہوں۔

بم دھماکے سے نکلنے والے زور نے سلمان آفریدی کو اس اپنے دکان میں گرا دیا اور سلمان نے اپنے استاد کو دیکھا اور پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔ استاد نے اسے اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے نکلنے والے خون سے اس کے استاد کو بھی بدحواس کر دیا کیونکہ بم کیساتھ لگے دھات نے معصوم طالب علم سلمان کی سانس کی نالی بھی کاٹ دی تھی اور زیادہ خون بہہ جانے سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کا استاد اسے لیکر جلدی سے ہسپتال پہنچانے کی چکر میں تھا لیکن اس دوران سیکورٹی فورسز نے فائرنگ شروع کر دی اور پھر فائرنگ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا اور تقریبا بیس منٹ سلمان کا استاد نکلنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ سلمان کو نکال کر ہسپتال پہنچائے۔ اور آدھ گھنٹے بعد ستاد سلمان کو لیکر ہسپتال لیکر پہنچ گیا۔ جہاں پر اسے ابتدائی طبی امداد دی گئی اور بم دھماکے کے زخمی اور چھلنی جسم رکھنے والے سلمان آفریدی کے آپریشن کئے گئے لیکن اس کی حلق جو کسی تیز دھار چیز سے کٹ گئی تھی کی سانس کی نالی کو متاثر کر گئی ہسپتال میں کچھ عرصہ ڈاکٹروں نے علاج کروایا پھر معصوم سلمان آفریدی کو نکال دیا کہ بہت ہوگیا فری کا علاج اب مزید علاج نہیں

ہوگا۔طالب علم سلمان آفریدی کا واحد رضا خان جو خود بھی ایک دکاندار کیساتھ بحیثیت مزدور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا نے اپنی اوقات سے بڑھ کر اپنے بچے کا علاج کروایا۔ منت سماجت کرکے لوگوں سے قرض لئے۔ سلمان آفریدی کے والد نے اپنے بیٹے کی خاطر اضافی کام بھی کیا تاکہ اس کے بیٹے کا علاج ہو۔پشاور کے پرائیویٹ ہسپتالوں سے لیکر اسلام آباد کے بڑے ہسپتالوں کے چکر لگائے کہ اس کے بچے کا علاج ہو۔ اور یوں سلمان کے پندرہ آپریشن ہوگئے جس سے اس کا بم دھماکے سے متاثرہ جسم جو چھلنی ہوچکا تھا تو ٹھیک ہوگیا لیکن اس کی سانس کی نالی اور آواز دونوں بند ہو چکے ہیں

سلمان آفریدی کا والد رضا خان مختلف لوگوں کے در پر حاضری لگا کر تھک چکا ہے سلمان آفریدی کے جسم پر بنے زخم تو ٹھیک ہوگئے ہیں لیکن اس کی آواز بند ہیں اور اس کی سانس کی نالی بند ہے۔سلمان کے والد نے تبدیلی کا دعوی کرنے والے عمران خان اور اس کی بیوی ریحام خان تک رسائی حاصل کرنے کیلئے بنی گالے کے دورے کئے تاکہ اس کے بچے کا علاج ہو ایک دن اللہ تعالی نے مہربانی کی اور عمران خان نے اس سے ملاقات کی سلمان کے والد نے اپنے ساتھ پیش آنیوالے واقعے کی بات کی اور بچے کے علاج کیلئے کہا۔ جنہوں نے وزیراعلی خیبر پختونخواہ کو متاثرہ بچے کی امداد کرنے کو کہا۔ وزیراعلی خیبر پختونخواہ کی ہدایت پر بچے کے علاج کیلئے کمیٹی بن گئی جنہوں نے اپنی رپورٹ

دی کہ سلمان آفریدی کا علاج پاکستان میں ممکن نہیں اور اس کا علاج برطانیہ یا آسٹریلیا میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے صوبائی حکومت اس طالب علم کو جو بم دھماکے میں اپنی سانس کی نالی گنوا چکا ہے کو علاج کیلئے بھیجا جائے۔ کمیٹی یہ رپورٹ دیکر بری الذمہ ہو گئی۔ سلمان آفریدی کے والد رضا خان نے وزیراعلی خیبر پختونخواہ نے دوبارہ بڑی مشکل سے آپروچ کیا اور بچے کے حوالے سے بات کی۔ تو صوبے میں "تبدیلی کے چکر میں گلیوں محلوں میں شہد کی نہریں" بہانے کے دعویدار نے اسے موبائل فون نمبر دیتے ہوئے کہا کہ اس حوالے سے جب بھی ضرورت ہو مجھ سے رابطہ کیا جائے۔ معصوم طالب علم کا والد وزیراعلی خیبر پختونخواہ کی یقین دہانی پر واپس آگیا لیکن کچھ نہیں ہوا اور پھر جب سلمان آفریدی کے والد نے وزیراعلی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو موبائل فون اٹھانے والے شخص نے اسے کہا کہ "بھائی میں وزیراعلی کا ڈرائیور ہوں" تنگ مت کرو۔اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ وعدے وعید کا سلسلہ جاری ہے اور معصوم سلمان آفریدی آج پندرہ سال کا اپنے گھر میں پڑا ہے اس کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ غریب ہے۔کیونکہ وہ غریب شہری ہے اور ایسے معاشرے میں جہاں پر غریب ہونا انسان کا سب سے بڑا جرم ہو وہاں پر اپنے حق کیلئے آواز اٹھانا بھی بڑا جرم ہے۔

دوسری طرف حال یہ ہے کہ سلمان آفریدی کو مہینے میں ایک مرتبہ گردن میں

مخصوص سٹرپ حلق پر لگانا پڑتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے۔اگر یہ نہ ہو تو اسے نہ صرف سانس میں تکلیف ہوتی ہیں بلکہ اس کا تڑپنا اس کے والدین کو بھی پاگل کر دیتا ہے چار بھائیوں اور تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر آنیوالا سلمان سے اس کے والد کو ۔ بہت امیدیں تھی کہ میرے بڑھاپے کا سہارا بنے گا اور بہن بھائیوں کو مشکل حالات میں کندھا دے سکے گا لیکن حال یہ ہے کہ سلمان کے نہ ختم ہونیوالے دکھ اور درد نے اس کے والد کو بے وقت بوڑھا کر دیا ہے زندگی کے مسلسل امتحان نے جیسے رضا خان کو ہی دیکھ لیا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت مزدوری سے صرف اتنا کما لیتا ہے کہ اپنے بچوں کے حصے کا رزق بمشکل پوری کرتا ہے جبکہ سلمان کے ایک سٹرپ کا خرچہ پندرہ سو روپے ماہانہ ہے اور ادویات کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔اگر سلمان کو حلق کی جگہ پر سٹرپ نہ لگے تو نہ صرف اسے سانس میں مشکلات درپیش آتی ہیں بلکہ اسے کھانے پینے میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔

فوج میں کمیشن لیکر دہشت گردوں کے خلاف لڑنے کا عزم رکھنے والا پندرہ سالہ قبا کلی زخمی حالت میں بھی آج بھی " تبدیل شدہ خیبر پختونخواہ کے شہر پشاور" میں موجود ہیں لیکن اسے سپورٹ کرنے والا کوئی نہیں۔ اس کا علاج کرنے والا کوئی نہیں اس کیلئے آواز اٹھانے والا کوئی نہیں۔ کیا صوبے میں تبدیلی کے نام پر" شہد اور دودھ کی نہریں" لانے والے حکمران اپنے "نشے "کا کچھ حصہ پاکستان کے اس مستقبل پر خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ویسے بھی یہ ان کی ذمہ داری

ہے بحیثیت ریاست بھی اور بحیثیت حکمران کے بھی۔

ڈاکٹر شکیل آفریدی۔ حقیقت، فسانہ اور امریکی انتخابات۔

خیبر پختونخواہ کے قبائلی علاقہ خیبر ایجنسی میں 1962 ء میں پیدا ہونیوالے ڈاکٹر شکیل آفریدی فزیشن کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں قبائلی علاقہ خیبر ایجنسی کے کے قبیلے آفریدی قبائل سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر شکیل آفریدی نے 1990 ء میں پشاور کے خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی ۔ محکمہ صحت خیبر پختونخواہ میں مختلف عہدوں پر تعینات رہا اور اس کی آخری نوکری خیبر ایجنسی میں انچارج سرجن کی تھی امریکہ کیلئے ہیرو کی حیثیت رکھنے والے ڈاکٹر شکیل آفریدی پاکستان میں بہت سارے لوگوں کیلئے غدار کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اسامہ بن لادن کی تلاش میں ڈاکٹر شکیل آفریدی نے ان کی مدد کی تھی۔ خیبر ایجنسی میں چیف سرجن کی حیثیت سے کام کرنے والے ڈاکٹر شکیل آفریدی کے بعض ساتھی جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے بھی اسے مشکوک سمجھتے تھے کیونکہ وہ ہسپتال سے چھٹی کرتے وقت یہی بہانہ کرتا تھا کہ اپنے تجارت کے سلسلے میں وہ ایبٹ آباد جاتے ہیں اور جاتے وقت اپنے ساتھ نصف درجن ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی مختلف رنگوں کے بکسز بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا جس سے اس کے ساتھ کام کرنے والے شش و پنج میں مبتلا ہوتے کہ یہ کیسی تجارت ہے کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی اپنے ساتھ

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی مختلف رنگوں کے ڈبے بغیر کسی اجازت کے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اور یہ سارے ڈبے ایمیونائزیشن کیلئے استعمال ہوتے تھے حالانکہ ان دنوں ایبٹ آباد میں کسی قسم کی مہم نہیں چل رہی تھی۔

پاکستان میں اسامہ بن لادن کی موت کی تحقیقات کرنے والے کمیشن نے چھ اکتوبر 2011ء کو ڈاکٹر شکیل آفریدی کے خلاف موجود شواہد کی بنیاد پر اسے ریاست پاکستان کیساتھ غداری کی سزا دینے کی تجویز دی تھی۔حکومت نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کی سارے اثاثے سیل کر دیئے اس کا گھر سیکورٹی حکام نے سیل کر دیا جبکہ حکام کے ڈر سے اس کے گھر والے بھی نامعلوم مقام پر منتقل ہوگئے۔ڈاکٹر شکیل آفریدی کے ساتھ کام کرنے والے پندرہ مرد و خواتین ہیلتھ ورکرز جو ڈاکٹر شکیل آفریدی کے ساتھ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کرتے تھے اور جعلی مہم چلانے میں مددگار ثابت ہوئے تھے انہیں بھی ملازمت سے برخاست کرکے مستقبل میں بھی کسی بھی سرکاری ملازمت کیلئے "ان فٹ" قرار دیا گیا۔ پاکستان سیکورٹی ایجنسیوں کی جانب سے مرتب کردہ ایک رپورٹ جو کہ جولائی 2012ء میں ریلیز کر دی گئی تھی میں بتایا گیا کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی نے پچیس مرتبہ غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹوں سے ملاقات کی جنہوں نے انہیں ہدایات دی اور ڈاکٹر شکیل آفریدی نے حساس معلومات ان ایجنسیوں کو فراہم کر دی۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی نے ایک بین الاقوامی این جی او کا نام لیکر پاکستان کی سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو معلومات میں بتایا کہ بین الاقوامی این جی او نے اسے ان سیکرٹ

ایجنٹوں سے ملاقات کیلئے سہولت فراہم کی۔ جسے امریکی این جی او نے بعد میں غلط قرار دیتے ہوئے اس کی تردید کی ۔پاکستان سیکورٹی ایجنسیوں کی جانب سے مرتب کردہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ امریکی این جی او کے ڈائریکٹر نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو ایک خاتون کیساتھ ملایا تھا جو بعد میں ڈاکٹر شکیل آفریدی سے مستقل ملاقات کرتی رہی۔ مئی 2011ء کو گرفتار ہونیوالے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو تیس مئی 2012ء کو تینتیس سال کی سزا اور دو لاکھ تیس ہزار روپے جرمانے کی سزا سنا دی گئی اور یہ سزا بھی اسے کالعدم تنظیم لشکر اسلام جو کہ خیبر ایجنسی میں بہت سرگرم عمل تھی کیساتھ روابط کے الزام میں سنا دی گئی۔ خیبر ایجنسی کے اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کی عدالت نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو ایف سی آر ایکٹ کے تحت سزا سنائی تھی 2011 سے 2012ء تک ایک سال تک وہ نامعلوم مقام پر قید رہا جس کے بارے میں ڈاکٹر شکیل آفریدی نے بعد میں ایک انٹرویو بھی دیا ڈاکٹر شکیل آفریدی نے امریکی خبر رساں ادارے کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا تھا کہ اسے پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی تشدد کا نشانہ بناتی رہی ہیں اور باقاعدہ سگریٹ کے داغ سمیت اسے بجلی کے کرنٹ بھی دیئے جاتے تھے ڈاکٹر شکیل آفریدی نے انٹرویو میں اعتراف کیا کہ اس وقت آئی ایس آئی کے آبپارہ میں واقع ہیڈ کوارٹر میں قید تھا۔تاہم مئی 2012ء سے اسے سنٹرل جیل پشاور منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر شکیل آفریدی کے بارے میں لشکر اسلام کے ایک کمانڈر نے اکتیس مئی 2012 ء کو بین الاقوامی خبر رساں ادارے سے رابطے میں بتایا کہ لشکر اسلام کا ڈاکٹر شکیل آفریدی سے کوئی لینا دینا نہیں اور اگر انہیں موقع ملا تو وہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرینگے کیونکہ بقول ان کے اگر یہ بے شرم آدمی ان کے ہاتھ لگا تو وہ اسے زندہ چبا لینگے ۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو عدالت نے جو سزا سنائی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ اس نے دو ملین روپے) بیس لاکھ (خیبر ایجنسی سے تعلق رکھنے والے لشکر اسلام کے ایک کمانڈر کو دیئے تھے اوراس کی میڈیکل اسسٹنٹس بھی کی تھی۔تاہم اس حوالے سے لشکر اسلام کے کمانڈر کا موقف تھا کہ لشکر اسلام نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو جرمانہ کیا تھا کیونکہ وہ مریضوں سے اضافی پیسے وصول کرتا تھا اور جعلی ادویات اور جعلی سرجریوں کے ذریعے قبائلی عوام کو لوٹتا تھا اسی بنیاد پر لشکر اسلام نے اسے سزا دی تھی اور لشکر اسلام کے سربراہ منگل باغ نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو لوگوں کے غیر ضروری۔ اور جعلی آپریشن جو کہ وہ باڑہ اور یونیورسٹی ٹاؤن کے علاقے میں کرتا تھا کرنے پر بیس لاکھ روپے جرمانہ کیا تھا۔

نومبر 2012 ء میں سنٹرل جیل پشاور سے یہ اطلاع آئی کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی کیونکہ وہ جیل کی حالت سے مطمئن نہیں

تھے- ستمبر 2012ء میں امریکی خبر رساں ادارے کے ایک نمائندے نے یہ دعوی کیا کہ اس نے سنٹرل جیل پشاور میں قید ڈاکٹر شکیل آفریدی کا انٹرویو کیا ہے اور یہ انٹرویو پینتالیس منٹ تک موبائل فون پر لیا گیا- یہ خبر میڈیا پر آنے کے بعد حکام نے سنٹرل جیل پشاور کے انتظامیہ کے خلاف اقدامات اٹھائے اور جیل کے دو اہلکاروں کو فوری طور پر معطل کرکے انکوائری شروع کردی گئی جن پر الزام تھا کہ اس نے موبائل فون اور کیمرہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو فراہم کردیا تھا- اس اقدام کے بعد سنٹرل جیل پشاور کی سیکورٹی مزید سخت کردی گئی - سیکورٹی اداروں کو بعض اداروں کی جانب سے اطلاعات بھی ملی تھی کہ دہشت گرد تنظیمیں ڈاکٹر شکیل آفریدی پر بھی حملہ آور ہوسکتی ہیں اسی بنیاد پر کچھ عرصہ کیلئے پاکستان آرمی کے جوان بھی سنٹرل جیل پشاور میں تعینات رہے- جبکہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کی سیکورٹی پر تعینات اہلکاروں کی تعداد بھی کم کردی گئی اور صرف مخصوص افراد کو ہی ڈاکٹر شکیل آفریدی کے سیل تک رسائی حاصل تھی.

ستمبر 2012 ء میں امریکی انتظامیہ نے پاکستان کو یہ پیشکش کردی تھی کہ اگر پاکستان چاہے تو وہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کے تبادلے میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو رہا کرنے کیلئے تیار ہیں تاہم پاکستانی حکام نے یہ تجویز مسترد کردی -سنٹرل جیل پشاور میں قید ڈاکٹر شکیل آفریدی کے خاندان والوں کو ان سے رابطے ,ملاقات کی اجازت نہیں- ڈاکٹر شکیل آفریدی کی اہلیہ جو اس وقت پشاور کے نواحی علاقے میں ایک گرلز کالج میں تعینات تھی نے اپنی ملازمت بھی چھوڑ دی

اور نامعلوم مقام پر منتقل ہو گئی ڈاکٹر شکیل آفریدی کی اہلیہ اور ان کے بچوں کو ان سے ملاقات کی اجازت ہیں۔

ایبٹ آباد میں القائدہ کے چیف اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے حوالے سے امریکی صحافی سیمور ایم ہیرش نے 12 مئی 2015 ء کو "دی کلنگ آف اسامہ بن لادن" میں لکھا ہے کہ امریکی انتظامیہ کو اسامہ بن لادن کی حوالے سے معلومات آئی ایس آئی کے ایک سابق آفیسر بریگیڈیر عثمان خالد نے دی تھی جسے یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اسے پچیس ملین ڈالر کی رقم جو اسامہ بن لادن کی سر کی قیمت رکھی گئی ہیں دی جائیگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے خاندان کو امریکی شہریت بھی دی جائیگی ۔امریکی صحافی کے مطابق اگست 2010 ء میں آئی ایس آئی میں کام کرنے والے ایک سینئر آفیسر نے پاکستان میں تعینات سی آئی اے کے سٹیشن چیف جوناتھن بینک سے ملاقات کی اور یہ آفر دی کہ وہ اسامہ بن لادن کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتا ہے تاہم اگر وہ سال 2001ء میں اسامہ بن لادن کی سر پر رکھے گئے انعامی رقم اسے دینے کی یقین دہانی کرائے ۔ تاہم امریکی حکام کو بریگیڈیر عثمان خالد پر اعتماد نہیں تھا اس لئے امریکہ سے خصوصی طور پر ایک مخصوص مشین بھجوا دی گئی جہاں پر پولی گراف مشین کے ذریعے بریگیڈیر عثمان خالد کا ٹیسٹ لیا گیا کہ کہیں یہ جھوٹ تو نہیں بول رہا اور یہ ٹیسٹ کلیئر آنے کے بعد امریکی حکام کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔امریکی صحافی کے مطابق یہ جھوٹ

ہے کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف پرویز کیانی اور آئی ایس آئی کے چیف احمد شجاع پاشا کو امریکی آپریشن کے بارے میں معلومات نہیں تھی امریکی صحافی نے لکھا ہے کہ سال 2001 سے سال 2006ء تک اسامہ بن لادن اپنی کچھ بیگمات کیساتھ ہندوکش کے پہاڑوں میں چھپا رہا- امریکی صحافی کے مطابق اسامہ بن لادن کو آئی ایس آئی نے قید کر رکھا تھا امریکی صحافی نے لکھا ہے کہ سی آئی اے نے ایبٹ آباد میں آبزرویشن پوسٹ قائم کردی تھی جبکہ تربیلا غازی میں ایک فرضی آپریشن بھی کرایا گیا تھا امریکی صحافی نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو اس آپریشن کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں تھا اور اسے بطور کور استعمال کیا گیا کیونکہ اصل حقیقت کچھ اور تھی امریکی صحافی کے مطابق پاکستان آرمی کے ڈاکٹر عامر عزیز جو کہ میجر کے عہدے پر تعینات تھے ایبٹ آباد کے بلال ٹاؤن میں واقع کمپاؤنڈ میں اسامہ کا علاج بھی کرتے رہے ہیں امریکی صحافی کے مطابق چونکہ اسامہ بن لادن سعودی شہریت رکھتا تھا اس لئے سعودی حکمران اسامہ بن لادن کو چھپانے کیلئے فنڈز پاکستانی حکومت کو دیتے آرہے تھے کہ کہیں پاکستان امریکی دباؤ میں آکر اسامہ بن لادن کی موجودگی کا انکشاف نہ کرے -امریکی صحافی نے انکشاف کیا ہے کہ اسامہ بن لادن کی ڈی این اے ٹیسٹ میں پاکستان آرمی کے میجر عامر عزیز نے کردار ادا کیا تھا اور اسے بچانے کیلئے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا ہے

امریکی سیکرٹری دفاع لیون پنیٹا جو کہ اس وقت سی آئی اے کے چیف بھی تھے نے اسامہ بن لادن کی ایبٹ آباد میں کمپاؤنڈ سے متعلق معلومات میں ڈاکٹر شکیل آفریدی کے کردار کا بھی اعتراف کیا تھا امریکی سٹیٹ سیکرٹری ہیلری کلنٹن نے بھی ڈاکٹر شکیل آفریدی کے حق میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کے پاس ڈاکٹر شکیل آفریدی کو گرفتار کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ امریکی ڈسٹرکٹ کیلیفورنیا کے ایک نمائندے نے امریکی صدر بارک اوباما کو ڈاکٹر شکیل آفریدی کے حق میں دو بل بھی پیش کئے جس میں ڈاکٹر شکیل آفریدی کو گولڈ میڈل دینے اور اسے امریکی شہریت دینے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر شکیل آفریدی کی گرفتاری پر امریکی سینٹ نے پاکستان کی امداد تینتیس ملین ڈالر تھی بند کر دی۔ امریکی انتظامیہ نے اعتراف بھی کیا کہ گرفتاری سے قبل ڈاکٹر شکیل آفریدی ملک سے نکلنے اور اپنی فیملی کو نکالنے کیلئے کوشاں تھے۔ ڈاکٹر شکیل آفریدی کی رہائی کیلئے مختلف بین الاقوامی تنظیموں نے آن لائن پٹیشن بھی مختلف ویب سائٹس پر لوڈ کی ہیں جن میں فیس بک پر اس کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ویب پیج بھی شامل ہیں جیسے " فری ڈاکٹر شکیل آفریدی نو" شامل ہیں۔ خیبر ایجنسی کے پیدائش رکھنے والے ڈاکٹر شکیل آفریدی کے نہ صرف پاکستان میں بلکہ امریکہ میں بہت سارے سپورٹرز موجود ہیں۔ جن میں عام لوگوں سے لیکر ان کے محکمہ صحت' سیاستدان' وکلاء اور بعض این جی اوز سے وابستہ افراد بھی ڈاکٹر شکیل آفریدی کے سپورٹر ہیں تاہم وہ کھل کر اس بارے میں بات کرنے سے

- ڈرتے ہیں

امریکی سیاستدانوں اور صحافی کے اب تک کئے جانیوالے انکشافات سے ڈاکٹر شکیل آفریدی پر لگائے جانیوالے الزام اور اسے دی جانیوالی سزا ایک طرف' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سال 2016 ء امریکی صدارت کیلئے ہونیوالے انتخابات کا سال ہے اور امکان ہے کہ 2016 ء میں انتخابات کے موقع پر پاکستان و امریکہ کے مابین ڈیل ہو اورڈاکٹر شکیل آفریدی کو پاکستانی جیل سے نجات ملے اور ڈاکٹر شکیل آفریدی کو خاندان سمیت امریکہ میں شہریت بھی مل جائے- ڈاکٹر شکیل آفریدی کی پاکستانی قید سے نجات سے نہ صرف پاکستان کو امداد مل سکے گی بلکہ دیگر مراعات بھی حاصل کرسکے گا اور امریکی انتخابات میں اوبامہ کے قریبی ساتھی جو بائیڈن جو اسامہ بن لادن کے خلاف کئے جانیوالے آپریشن بھی بھی اوبامہ کے ساتھ رہے کو انتخابات میں ممکنہ کامیابی بھی حاصل ہوگی کیونکہ شکیل آفریدی کی رہائی جو اس وقت امریکی عوام کیلئے ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں کی آزادی میں اوبامہ ایڈمنسٹریشن کا اقدام انہیں سیاسی طور پر مزید مضبوط کرسکے گا -